www.pkdigest.com

چینی نکتہ چینی — مدیر اعلیٰ — 11
قارئین کی کرم فرمائیاں کچھ ادائیاں نامۂ پیام، تحقیق، عنایتیں اور شکایتیں

حالاتِ ہائے برہم — محی الدین نواب — 18
ناانصافیوں، ناہموار زندگی کی مشکلات عشق، جمال اور امن کے جذبوں کی عکاس

موقع شناس — محمد عرفان آرزو — 63
ایک موقع شناس کا امتحان جو زندگی میں دوسری بار موقع ملنے پر یقین نہیں رکھتا تھا

تلاش — کاشف زبیر — 73
محبت، انتقام اور فرض کے درمیان حائل رکاوٹوں کا ستمگر ماجرا

گرداب — اسما قادر — 92
تقدیر کی ستم گری قسمت کی بازی کا کھیل ملنے اور بچھڑنے کی کہانی

لاش کی چوری — تنویر ریاض — 131
ایک لاش کی چوری کا معمہ جس نے تحقیقی پریشانی و استعجاب میں مبتلا کر دیا تھا

خونی مسیحا — آصف ملک — 141
پراسرار زندگی کی تلاش بنتے ہوئے خطرات کی حیرت انگیز کہانی

للکار — طاہر جاوید مغل — 152
محبت کے محاذ پر لڑنے والے شخص کی جدوجہد... اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

195
بدگمانی کے پردے میں پنہاں ایک عورت کی رقابت کا چونکا دینے والا قصہ

باضمیر — مریم کے خان — 201
جنگ گزیدہ نوجوان کی مشکلات جو اس کے لیے جینے کی راہیں مسدود کر رہی تھیں

احساس — ولید بلال — 215
ایک شخص کا ماجرا جس کی زندگی میں جذبات موجزن تھے... مگر؟

چراغِ آرزو — سلیم فاروقی — 221
محبت کے گلزار کی بہاراں جو دل کے ہاتھوں ہر حد سے گزر گئی تھی

سلسلۂ خواب — ساجدہ امجد — 258
خوابوں کے بھنور میں گھرے ایک جفاکش کا ماجرا جس کی سرشت میں قانع تھی

تراش خراش — ادارہ و قارئین — 000
اقتباسات، گلدستہ، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی نذر

جلد 39 • شمارہ 08 • اگست 2010 • زرِ سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 50 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021)5895313 • فیکس (021)5802551 • jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

www.pkdigest.com

نکتہ چینی

مدیراعلیٰ

قارئین... السلام علیکم!

اگست 2010ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے... آزادی اور جشنِ آزادی کی مبارکباد کے ساتھ... پاکستان اُن خوش قسمت ممالک میں شامل ہے جن کی سرزمین پر مون سون کی بارشیں جم کر برستی رہی ہیں۔ گزشتہ چند برسوں سے ان بارشوں میں بھی وہ شدت نہیں رہی تھی جو اس کا خاصہ ہے۔ اور پھر پاکستان میں پانی کی شدید کمی... خوش قسمتی ہے اس وقت جبکہ پانی کی قلت اپنے عروج پر تھی، ملک میں مون سون کا آغاز نہایت شاندار انداز میں ہوا اور 'منی پاکستان' کہلانے والا کراچی بھی پورے ملک کی طرح ان بارشوں میں خوب نہایا۔ کیا موزوں شعر یاد آیا، آپ بھی پڑھتے چلیے!

یہ کس نے پیالا ہاتھ سے ساغر موسم کی بے کلی ہے

اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

اس بار جم کر برسنے والی بارشیں جہاں خوشی کا سبب بنی ہیں... وہیں وطنِ عزیز کے صوبہ بلوچستان اور پنجاب کے بعض حصوں میں سیلاب نے بھی تباہ کاریاں مچائی ہیں۔ اُمید ہے کہ موسم کے بے رحم تھپیڑے برداشت کرنے والوں کی سرکاری سطح پر بھرپور داد رسی ہوگی۔ ساتھ ہی اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی ہوگی کہ اب جبکہ ہمارا شمار سنگین آبی بحران سے دوچار ممالک میں ہونے لگا ہے تو ہم نئے ڈیموں کی تعمیر پر صرف توجہ نہ دیں بلکہ تیز رفتاری سے انہیں بنائیں۔ اس بار بھی بُرا وقت تھا، بادل برسے تو کچھ حالت سنبھلی لیکن کب تک...؟ کب تک مون سون کے بادلوں سے آس لگائے بیٹھے رہیں گے۔ ان بادلوں کو اپنے وقت پہ برسنا ہے لیکن یہ بادل کئی سال تک بن برسے بھی جاتے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو پھر بھی۔ پھر بھی ہمیں چاہیے کہ جو ہے اسے بچانے کا انتظام کرلیں ورنہ زراعت تو درکنار، کہیں پینے کے پانی کے لیے بھی دوسروں کے در پر دستک نہ دینی پڑے... سوچنے والوں اور منصوبہ سازوں کو اب سوچنا چاہیے!... اور چلتے چلتے ایک اندوہناک خبر آگئی۔ اسلام آباد کی سرسبز پہاڑیوں میں ایک مسافر بردار طیارہ 152 افراد کے ساتھ مکمل تباہی کا شکار ہوگیا۔ کیوں اور کیسے؟ یہ سوال شاید کبھی کہیں پرانی فائلوں میں دفن نہ ہوجائیں۔ اسباب اور ذمے داری کا تعین نہ ہوا تو ایسے حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی چلتے ہیں پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں سے آئے ہوئے آپ کے خطوط کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ کس قیامت کے یہ نامے ہمارے نام آئے ہیں!!!

www.pkdigest.com

جعفر حسین کی تنقید نگاری بھوانہ سے "ذہنی اسکان سجائے نازک اور جاذبِ نظر نقوش کی مالک دوشیزہ ہمیں تو کسی ایسے دیکھے گئے خواب کی تعبیر لگی جس کا حصول ناممکن تو نہیں مگر مشکل ضرور ہوتا ہے۔ خوب صورت اور اسٹائلش لک دیتی زلفوں کے حسن کو صنفِ کرخت کے ہاتھ میں پکڑی گن نے گہنا دیا۔ عابد جان صاحب کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے کی دلی مبارک باد۔ مختصر کہانیوں میں سے پہلے آخری رقص پڑھی۔ عورت ذات کے جذبات و احساسات کا مختلف انداز میں تجزیہ کرتی اوسط درجے کی تحریر تھی۔ انجانے میں ماورائی واقعات اور سسنی خیزی کا جو تاثر کہانی کو شروع کرتے وقت بنا تھا، وہ اختتام تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔ انسانی اسمگلنگ سے وابستہ جنونیوں کے انسانیت سوز مظالم اور ان کی نفسانی تسکین کو اجاگر کرتی کاوشوں کا انتخاب کافی عمدہ رہا۔ مختلف مقاصد کے لیے مخصوص دائرے میں ازدواجی زندگی والے میاں بیوی کا احوال لیے عہد گرفتہ متاثر کن تحریر تھی۔ سمجھوتے پر مائل میری کا نبھاہ شاید ڈیوی سے اس لیے بھی ناممکن تھا کہ اس کا مطمعٔ نظر اور تھا۔ منظر کی خواہ مخواہ طوالت اور عام سے طرزِ تحریر نے بور کیا۔ سایہ پڑھ کر تشنگی اور کمی کا احساس بہت قوی تھا۔ بہت سے کرداروں کے ساتھ ساتھ مصنف نے ایک واقعے کا دوسرے واقعے سے تعلق جوڑتے جوڑتے کہانی کو کافی گنجلک بنا دیا۔ مصنف نے نہ ہی اصغر کی ذہنی اور نفسیاتی گرہ کی کھل کر وضاحت کی اور نہ ہی کہانی کو منطقی انجام تک پہنچایا۔ رنگوں میں شب ظلمات نے ذرا بھی متاثر نہ کیا۔ اِدھر اُدھر کی بے جا تفصیل اور غیر اہم چیزوں کی وضاحت نے بور کردیا۔ کہیں بھی نہیں لگا کہ یہ مصنف کی اپنی کاوش ہے۔ حسام بٹ صاحب کی تحریر کی طرح کا اسٹائل تھا۔ ایک ہی مثبت بات تھی کہ ہمارا خدا پر اعتقاد غیر متزلزل ہونا چاہیے۔ بقا کی جنگ میں سرگرداں اور شیطان کے چیلے سے بچا کے لیے برسرِپیکار لوگوں کا مسلمان ہونے کے باوجود خدا پر یقین نہ رکھنا غیر فطری سا لگا۔ غلط انتخاب کسی طرح بھی کاشف صاحب کے معیار کے مطابق نہیں تھی۔ کہانی میں واضح جھول تھے۔ موضوع پرانا اور تحریر بالکل بے جان سی تھی۔ میرے خیال میں رنگوں کو اپنی تخلیق کے لیے سرورق کا مرہونِ منت نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سالہا سال سے جاسوسی کی روایت یہی رہی ہے کہ مصنف سرورق کو ذہن میں رکھ کر رنگ تخلیق کرتے ہیں مگر اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں کو مخصوص حصار میں خواہ مخواہ مقید کرنے پر مجبور کردیے جاتے ہیں۔ سرورق کے مطابق کردار نگاری، منظر نگاری اور پچویشنز بنانے میں کافی دفعہ مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر رائٹر جداگانہ طرزِ تحریر کا حامل اور مخصوص سوچ کے زیرِ اثر ہے۔ ایسے میں سرورق کا دم چھلا لگانا حقیقت میں مصنف کے تخیل کے آگے بند باندھنے کے مترادف ہوتا ہے۔ نواب صاحب کی حالات ہائے برہم کی اٹھان تو زبردست تھی اور شان دار موضوع کا حامل پلاٹ بھی منفرد تھا مگر نواب صاحب اصل موضوع سے ہٹ کر کہانی میں ثانوی اہمیت کی حامل چیزوں کو لے کر آگئے۔ گرداب اس بار کچھ خاص نہیں رہی۔ اتنے بہت سے کرداروں کے ساتھ اسماء صاحبہ انصاف نہیں کر پاتیں۔ کردار نگاری تو ان کی جان دار ہوتی ہے مگر منظر نگاری شاید ان کے بس میں نہیں۔ کسی کردار کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں اسماء صاحبہ دوسرے کردار کو صریحاً فراموش کر

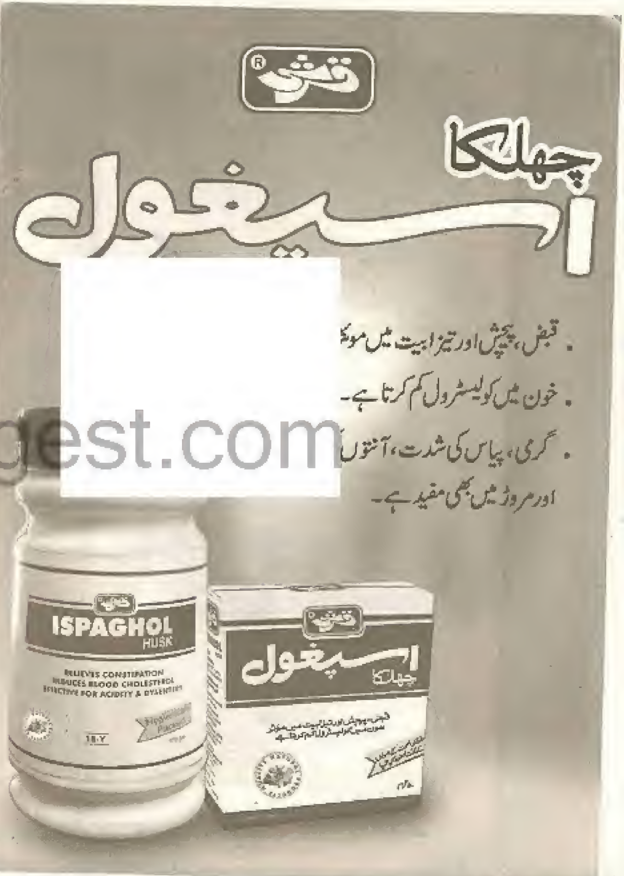

دیتی ہیں حالانکہ کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق وہ کردار تفصیلی توجہ اور وضاحت کا متقاضی ہوتا ہے۔ للکار کی تعریف کے لیے اکثر الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ منظر نگاری، کردار نگاری اور انسانی جذبات و احساسات کو لفظوں کے قالب میں ڈھالنے میں طاہر انکل یکتا ہیں۔ عمران مر گیا۔ کافی دیر تک یقین ہی نہیں آیا۔ کہانی کو جان دار اور مرکزی کردار تابی کو حالات کے سانچے اور زمانے کے سرد گرم سے روشناس کروانے کے لیے یہ اقدام بہت ضروری تھا جو مغل انکل نے بروقت اٹھایا۔ تابی انجانے اور ان دیکھے لوگوں کے درمیان پہنچ چکا ہے۔ عمران کی واپسی تو ہوگی مگر کب اور کیسے، شاید اس کے لیے کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے۔ اتنی شان دار تحریر کے لیے طاہر انکل کو دلی مبارک باد۔"

آسیہ خان کی توجیح پشاور سے "اس دفعہ جاسوسی کافی لیٹ یعنی 5 کو ملا۔ سرورق پر موجود پیاری سی لڑکی میں اپنی جھلک نظر آئی۔ اور بردو مردوں کو نظر انداز کر کے چیتی رنجیت ہی میں داخل ہوئی۔ رومیہ کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر بے تحاشا دکھ ہوا۔ رومیہ اور آمنہ کی غیر موجودگی میں محفل پھیکی پھیکی سی تھی۔ تصویر العین، رفتیش بلوچ اور عبدالسلام نے محفل کو بارونق کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ عابد جان گزارے لائق تبصرے کے ساتھ وننگ سیٹ پر براجمان تھے۔ قومی برادرو! اگر شرکائے محفل کی تعلیمی قابلیت کو کھنگالا جا رہا ہے تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟ ایک دوسرے کے بارے میں جاننے میں کیا برائی ہے؟ میں نے صرف آمنہ اور رومیہ سے بات کرنے کے لیے خط لکھا تھا۔ انہوں نے رسپانس نہیں دیا۔ اس لیے چپ رہی۔ ورنہ جاسوسی کو پچھلے 4 سال سے ایک بار بھی مس نہیں کیا۔ سب سے پہلے مغل انکل کی للکار نے متوجہ کیا۔ مغل انکل کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے مگر آپ نے عمران کو اتنی جلدی اوپر بھیج کر اچھا نہیں کیا اور یہ بش کہاں پھنس گیا؟ شاید اگلی قسط میں کلیئر ہو جائے سارا معاملہ... اس کے بعد نواب انکل کی حالات ہائے برہم پڑھی۔ حد سے زیادہ پسند آئی۔ ایک ایک سطر دل کی دھڑکنوں کو بڑھا رہی تھی۔ آخر میں جاری ہے کا ٹیگ دیکھ کر دکھ ہوا۔ کاشف زبیر اس بار ایک اور ساحلی کہانی لیے حاضر تھے۔ انجام ہماری توقعات کے عین مطابق رہا۔ کاشف زبیر آر گریٹ۔ شب ظلمات خاص رنگ نہ جما سکی۔ مختصر کہانیوں میں گاؤ جتوں اور انجانے بے تحاشا پسند آئیں۔ آخر میں معراج انکل کے لیے ڈھیر ساری دعاؤں اور نیک تمناؤں کا تحفہ۔"

اینج کے کھوکھر کی آمد ملتان سے "میں جاسوسی ڈائجسٹ کا آٹھ سال سے قاری ہوں۔ خط پچھلے مہینے لکھا جو کہ بلیک لسٹ ہو گیا۔ اس بار دوبارہ کوشش کر رہا ہوں۔ جاسوسی 3 جولائی کو ملا۔ سرورق پر نظر دوڑائی تو سب سے پہلے اوپر والے بھائی صاحب پر نظر پڑی جن کی بتیسی حد سے زیادہ نمایاں تھی۔ شاید یہ سرکاری ملازم ہیں اور حالیہ بجٹ میں ان کی تنخواہ میں 50 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ شاید اس لیے یہ صاحب حد سے زیادہ مسکرا رہے ہیں۔ نیچے والے صاحب شاید نشانہ لگانے کی پریکٹس میں مشغول تھے۔ سرورق کی حسینہ پر نظر پڑی تو ہمیں طنزیہ انداز میں دیکھنے میں مصروف نظر آئیں۔ ان کی طنزیہ نظروں کی تاب نہ لا کر ہم سیدھے اندر داخل ہو گئے۔ فہرست پر سرسری نظر ڈالی اور محفل میں شامل ہو گئے۔ کرسی صدارت پر عابد جان صاحب جلوہ افروز دکھائی دیے، مبارک ہو بھئی۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے جاسوسی کی جان للکار پڑھی۔ طاہر جاوید کی کیا بات ہے۔ کہانی پر ان کی گرفت بہت مضبوط ہے اور بندہ کہانی میں کھو جاتا ہے۔ اس بار کی قسط جہاں مار دھاڑ سے بھرپور رہی، وہاں شاید مغل صاحب نے عمران عرف ہیرو بھائی کو بھی دوسرے جہاں رخصت کرا دیا ہے۔ مغل صاحب کی کہانیوں میں کچھ چیزیں مشترک ہوتی ہیں مثلاً کہانی کی ہیروئن، ہیرو کے پاس آنے سے پہلے ایک دو شادیاں کر چکی ہوتی ہے۔ اس میں بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ بہرحال، کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ فاطمہ حسام کی شب ظلمات تھا۔ کہانی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ کاشف زبیر کی لکھی ہوئی غلط انتخاب ایک درمیانے درجے کی تحریر تھی۔ شبیر نے اینڈ میں حد سے زیادہ کمینگی کا ثبوت دیا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ بہرحال، اینڈ روایت سے ہٹ کر خاصا دلچسپ تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں سب سے پہلے آخری رقص پڑھی۔ رائے کو جو خود بھی قاتل تھا، اس عورت نے اس لیے مروا دیا کہ وہ اس سے پیار نہیں کرتا تھا۔ عہد گرفتہ ایک اچھی کہانی تھی۔ ریوی نے اپنی محبوبہ کو اپنا راز چھپانے کے لیے قتل کر دیا مگر جس کے لیے چھپایا اسے پہلے سے ہی سب علم تھا۔ کہانی پڑھ کر مغرب کے لوگوں کی قانون دوستی کا بھی اندازہ ہوا۔ قانون کے معاملے میں وہ رشتوں کو بھی اہمیت نہیں دیتے۔ باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

ٹریل ایس کے اسماعیل کی ونسٹک تحیر انگیزی شاہ کس سے "پانچ جولائی کو جاسوسی ملا۔ سرورق پر تین افراد تھے۔ دو صنفِ کرخت اور ایک صنفِ نازک۔ صنفِ کرخت ہمیشہ کی طرح بدصورت اور صنفِ نازک خوب صورت بنائی گئی تھی۔ صنفِ نازک نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالی ہوئی تھیں، بالکل سنجیدگی کے ساتھ۔ ہمیں سنجیدہ لوگ پسند نہیں ہیں اس لیے اسے چھوڑ کر آگے کی طرف روانہ ہو گئے۔ عابد خان چارسدہ سے کرسی صدارت پر موجود تھے۔ ٹوبی! اپنا منہ میٹھا کروں تو کیا ہمسایوں کا میٹھا کروں؟ جعفر حسین! دنیا بہت تیز ہے۔ شاید سینچ نہ دیکھے اس لیے سیدھا کال۔ گرداب میں شہریار کو گارڈ کے بغیر ہر جگہ نہیں جانا چاہیے ورنہ ہر جگہ ایسی مار پڑ سکتی ہے۔ ماہ پالو مصیبتوں میں گھری نظر آ رہی ہے۔ اس کو ایک مددگار عمران کی صورت میں ملا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عمران اس کو نکالنے میں کامیاب ہو جائے۔ کشور اور آفتاب کی محبت بھری ملاقات کس کے آنے سے ختم ہوگی، آئندہ مہینے پتا لگے گا۔ للکار میں آخر کار بزدل تابش کی وجہ سے عمران گیا تو دوسری طرف اس کی ماں اس سے جدا ہوگی۔ دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوگا۔"

انجانی ماہا ایمان کی تان پنجاب سے "تم سے مل کے، تم سے مل کے، ایسا لگا تم سے مل کے، کہ ارماں ہوئے پورے دل کے۔ پیارے جانی... جاسوسی نے اس خوب صورت گیت کو گنگنانے پر ہمیں مجبور کر دیا۔ فیورٹ رائٹرز سے جگمگاتا جاسوسی چودھویں کے چاند جیسا تھا اور چاند کے ہم ہمیشہ سے تمنائی ہیں۔ سرورق معمول کی طرح "گلدم" سے سجا ہوا تھا۔ کوئی نیا پن نہیں تھا۔ ہاں، خلافِ معمول مس سرورق حسینہ کہلائے جانے کی حق دار ہیں۔ محفل میں پہنچے تو اداریے کو پڑھتے ہی ایسا لگا جیسے پرانے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہوں۔ کہانیوں کی طلسم نگری میں عالمی حالات کے تناظر میں رونما ہونے والی سیاسی، نظریاتی تبدیلیوں کی غماز، عالمی طاقتوں کی مفاد پرستی اور ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرتی حالات ہائے برہم نے تو مجھے مسمرائز کر ڈالا۔ مغل صاحب کی للکار تو میں ابھی تک مارے باندھے ہی پڑھ رہی ہوں، وہ بھی عمران کی وجہ سے ورنہ کہانی میں کوئی دم نہیں ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے

گرد گھومتا آزمائشوں کا گرداب لاجواب ہے۔ اسما قادری کا قلم تو شادی کے بعد اور زیادہ نکھر گیا ہے۔ ویلڈن۔ ساری مصروفیتوں کو بالائے طاق رکھ کے کاشف زبیر کو پہلی فرصت میں پڑھنا میرا فیورٹ مشغلہ ہے اور غلط انتخاب جان بوجھ کے اندھی کھائی میں گرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہے لیکن افسوس بعض دفعہ بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔"

ہمایوں سعید راج کا تفصیلی تبصرہ جتوں سے "جاسوسی کا انتظار تو پہلے بھی بہت رہتا تھا مگر جب سے CNC (چینی نکتہ چینی) پرائمری اسکول میں داخلہ ملا ہے، تب سے شوق، جنون میں اور پسندیدگی، عشق میں ڈھل گئی ہے۔ یکم کے بعد جب سب لوگ بینک کے چکر لگاتے ہیں تو میں بک اسٹال کے آس پاس مشکوک انداز میں پایا جاتا ہوں۔ اس بار بھی ڈھیر ساری سستی اور میٹھے انتظار کی میٹھی چبھن لیے جب پانچویں بار بک اسٹال کو شکل دکھائی تو انہوں نے فوراً سے پیشتر جاسوسی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ فہرست پر نظر دوڑائی تو محی الدین نواب کا ابتدائیہ اور کاشف زبیر کو آخری صفحات پر موجود پا کر روح تک سرشار ہو گئی۔ محبت نگر میں خود کو تنہا شاگرد دار... مایوس ہو کر ہم محبت نگر سے نکلنے ہی والے تھے کہ خود کو تارے والی جی کے ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے سوچوں میں گم پایا۔ میرے آس پاس 6 دوست اور بھی تھے جنہیں محبت نگر سے ناک آؤٹ کیا گیا تھا۔ بے دلی سے دوستوں کی نوک جھونک سنتے بیٹھے تھے کہ اپنا ذکر سن کے ساری اداسی کافور ہو گئی۔ عابد جان ٹائٹل پر موجود 32 سالہ خاتون سے حد درجہ متاثر نظر آئے۔ عابد بھائی! شاید آپ چشمہ لگانا بھول گئے۔ اس لیے نہایت عام نقوش اور پختہ چہرے والی عورت کو حسینۂ عالم کہہ رہے ہیں۔ کہانیوں میں خلافِ معمول محی الدین نواب سے اسٹارٹ لیا۔ واہ نواب صاحب! کیا منظر نگاری کی ہے۔ پڑھتے وقت خود کو عراق کے گلی کوچوں میں محسوس کیا۔ عراقی حکومت اور عراقیوں کی زندگیوں کے نئے نئے پہلوؤں سے آشنائی حاصل ہوئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ للکار نے تو اس دفعہ حد سے زیادہ الجھا دیا ہے۔ ایک طرف تو مغل انکل نے کوشش کی کہ ہم عمران کو وفات شدہ سمجھ کر صدمے سے فوت ہو جائیں تو دوسری طرف تابی کو آناً فاناً انڈیا پہنچا کر ہمارے تجسس کو آسمان تک پہنچا دیا۔ سلطانہ کا کردار بے حد اچھا لگا۔ گرداب میں اے سی صاحب کو اغوا اور رہا کر دیا گیا لیکن اغوا کا محرک سمجھ میں نہ آسکا۔ چودھری صاحب اپنی فطرت کی وجہ سے کوڑیوں کے ہاتھوں الو بنتے نظر آئے۔ عمران کی کہانی نے دکھی کیا۔ اب دیکھتے ہیں کہ وہ ماہ بانو کو اس گرداب سے کیسے نکالتا ہے۔ کشور اور آفتاب اس بار بڑے پھنسے۔ مجموعی طور پر دونوں سلسلے وار کہانیاں بہترین جا رہی ہیں۔ پہلا رنگ شب ظلمات انتہائی پُرتجسس اور تیز رفتار کہانی تھی۔ شیطان ابن آدم کا ازلی دشمن ہے اور اللہ نے اسے بے پناہ ڈھیل اور طاقت دے رکھی ہے مگر جب انسان اللہ پر کامل ایمان رکھتا ہو تو شیطان اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ یہی اس کہانی میں دکھایا گیا ہے۔ (واہ بھئی... آپ نے تو کمال کر دیا)۔ غلط انتخاب کاشف زبیر کی ایک اور شاہکار تحریر ثابت ہوئی۔ میاں بیوی میں اگر ذہنی ہم آہنگی اور دلی وابستگی نہ ہو تو یہی انجام ہوگا۔ مغربی کہانیوں میں انجانے سب سے زیادہ پسند آئی۔ آخر تک سسپنس اور سنسنی برقرار رہی۔ گاؤ جتوں بھی لاجواب رہی۔ عہد گرفتہ میں ڈیوی اپنی سادہ طبیعت، کمزور اعصاب اور جلد بازی کی وجہ سے پھنس گیا۔ وہ چھوٹی مصیبت سے نکلنے کی کوشش میں بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ سایا ایک عجیب المزاج شخص کی انوکھی کہانی تھی۔ انہوں نے اپنی بیویوں کی فرماں برداری جانچنے کا عجیب و غریب طریقہ اپنایا۔ اس کہانی سے ثابت ہوا کہ انسان کو جس چیز سے روکا جائے وہ اسی کو پہلے چھوتا ہے۔ آخری رقص سر کے اوپر سے گزر گئی۔"

عابد جان کی رائے چارسدہ سے "موسم کی طرح سرورق بھی اس بار خاصا گرم تھا۔ ایک طرف اگر حسینۂ عالم قیامت ڈھا رہی تھی تو دوسری طرف مسٹر زیرو زیرو سیون چنگاریاں اڑا رہے تھے۔ یا خدا! ہر طرف آگ ہی آگ برس رہی ہے۔ یہ دیکھو بھئی کی اینٹ جیسی رنگت رکھنے والا آدمی کس بات پر مسکرا رہا ہے؟ شاید اڑتے ہوئے شعلوں نے دماغ خراب کر دیا ہے۔ گرما گرم ٹائٹل سے گرم اندوز ہوتے ہوئے محفل صد رنگاں میں جلوہ افروز ہو گئے۔ ارے یہ کیا؟ ماہ دولت ایک مرتبہ پھر مسندِ صدارت سنبھال چلے۔ کیا بات ہے بھئی انوی! ایسے لگتا ہے آپ کو اپنی ڈگریوں کی فکر پڑ گئی ہمارے سیاست دانوں کی طرح۔ کوئی بات نہیں، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ٹریل ایس کے! آپ اتنے ننھے منے ہیں جو تتی منہ سے مت بتائیے۔ زرگر صاحب! زیادہ قلابازیاں بھرنے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی نکموں کو بھی ہم موقع دیتے ہیں دل رکھنے کے لیے۔ تصویر العین! یعنی آپ بغیر کسی بہانے کے پڑھائی نہیں کرتیں۔ ویسے اچھی بات ہے پڑھائی کے لیے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا اس نام کی کسی چیز سے آپ کا واسطہ پڑا ہے کبھی؟ رفتیش بلوچ! اس گرمی میں ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہونا اور وہ بھی ملتان کے اور وہ بھی سرخ رومال لے کر، توبہ توبہ۔ کہیں کوئی پرانا قرض چکانا ہے کیا تیلی صاحب سے؟ صدیقی صاحب! لگتا ہے آپ کی جیب پر بھی خاصی بجلیاں گرتی رہتی ہیں۔ آپ تو فارغ البال ہو گئے ہوں گے بجلیاں کھاتے کھاتے۔ بھائی جواد اداس! تم کیوں اداس ہو یار ہمارے ہوتے ہوئے؟ جاسوسی کی جان گرداب میں ولن سائڈ ہواؤں میں اڑ رہا ہے جبکہ ہیرو سائڈ گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ چودھری تو ولایت میں مزے اڑا رہے ہیں جبکہ ہمارے ہیرو اور ہیروئن صفیہ کو کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا۔ اسما جی کچھ تو رحم کریں۔ آخر کو ہیرو ہیں، کوئی ایرے غیرے نہیں۔ للکار میں تو ایک اور ہی جہانِ حیرت منتظر ہے۔ تابی صاحب تو پردیس سدھار گئے وہ بھی انجانے میں... لیکن ڈیڑھ برس میں تو کایا کلپ ہو چکی ہوگی یہاں پر۔ بس اب انڈیا میں ہی ٹھیک ہو۔ بیوی کے ساتھ بچھڑا ابھی مل گیا اور کیا چاہتے ہو؟ شب ظلمات خیر و شر کی آویزش پر مبنی کہانی تھی جس میں آخری فتح خیر ہی کی ہوئی۔ حالات ہائے برہم نواب صاحب کی عراق جنگ کے تناظر میں لکھی گئی بہترین کاوش تھی۔ یاقوت کا کردار بہت ہی زبردست رہا۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ چھوٹی کہانیاں زیادہ متاثر کن نہ تھیں۔"

ناصر ملک کی جرأت وہاڑی سے "جاسوسی کی اس محفل میں پہلی مرتبہ قدم رنجہ فرمانے کی جرأت کر رہے ہیں۔ فنِ تحریر سے نابلد ہونے کے باوجود، دل میں ایک موہوم سی آس لیے بندۂ ناچیز نے مبصرین کی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش کی ہے مبادا کہ ہماری ضعیف العمری کو مدنظر رکھتے ہوئے اور اپنی وسیع الظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے محفل کے کسی کونے کھدرے میں جگہ دے کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ سرورق انتہائی خوب صورت تھا۔ صنفِ نازک کے تو ہم اسیر ہی ہو گئے۔ یقیناً ذاکر انکل فنِ مصوری پر عبور رکھتے ہیں۔ ویسے بھی قدرت نے عورتوں کو حسن و جمال سے نوازا بھی ہے۔ تمام مبصرین کے تبصرے

اچھے تھے، خاص طور پر آیس کی نوک جھونک تو قاری کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔ پہلی کہانی پہلے نمبر کی حق دار ٹھہری۔ تجسس سے بھرپور کہانی تھی۔ بقیہ حصے کا شدت سے انتظار ہے۔ للکار روایتی سمت بدل چکی ہے۔ لگتا ہے کہ تابش اب اکیلا ہی ثروت کو ڈھونڈ لے گا۔ گرداب اپنی رفتار میں ٹھیک جارہی ہے۔ ماہ بانو اب برف پوش پہاڑوں سے آزاد ہو جائے گی۔ سرورق کے رنگ اپنا جادوئی اثر چھوڑ گئے لیکن دوسرا رنگ پھیکا پھیکا سا لگا۔ بنادٹی پن سا جھلک رہا تھا۔ چھوٹی کہانیاں اپنی اپنی جگہ اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ کسی کہانی نے بور نہیں کیا۔ اس ماہ کا شمارہ مجموعی طور پر جان دار تھا۔"

سبحان اللہ صاحب کا تبصرہ میکورہ سوات سے "جولائی کا جاسوسی پڑھا۔ ٹائٹل پر بڑا اعتماد حسینہ آنکھوں میں غرور کے شعلے لیے بیٹھی ہے۔ حسینہ کے پہلو میں گن بدست جوان حسینہ کے محافظ کا کام انجام دے رہا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ جوان حسینہ کی طرف میلی نگاہ سے ہر دیکھنے والے کو شوٹ کر دے گا اس لیے ذرا خیال رکھیے گا... اور بہت دور صحرا میں ایک جھونپڑا شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور دھوئیں کے مرغولے فضا میں پھیل رہے ہیں۔ محافظ جوان کے پہلو میں ایک اکلوتا سر بھی دکھائی دے رہا ہے جو کسی ڈریکولا کے خاندان کا لگتا ہے... اب ہو جائے کچھ باتیں کہانیوں کے بارے میں... تو پہلی کہانی محی الدین نواب صاحب کی تھی... نواب صاحب نے کہانی میں عراق کے موجودہ حالات کی زبردست منظر کشی کی ہے۔ عراقی پولیس جو بظاہر خود کو مسلمان کہتے ہیں... اندر ہی اندر کیا کیا گل کھلاتے ہیں، نواب صاحب نے ان کی خوب نقاب کشائی کی ہے۔ تحویر پاشا کی آخری رقص بھی دلچسپ تھی۔ جن جن نے آستین کا سانپ والا کردار ادا کیا ہے۔ مریم کے خان کی انجانے بھی اچھی تھی۔ ثمر عباس کی گاؤ جتوں بھی اچھی تھی۔ سریاراحمد کی عہد گرفتہ زبردست رہی۔ بعض لوگ اپنی حد سے زیادہ خوف و ڈر کی وجہ سے اپنی زندگی برباد کرتے ہیں، وڈیوی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ سید احتشام کی مختصر مختصر کہانیوں میں ٹاپ پر رہی۔ اسلم کافی خوش قسمت تھی جو دوبارہ قاتلانہ حملے میں بچ گئی۔ سیماں کمال کی ساحلیہ میں اصغر حسین پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ اس بے چارے کو واقعی کسی فرماں بردار بیوی کی تلاش تھی لیکن نافرمانی کی جو سزا اس نے بیوی کو دی... وہ زیادہ معلوم ہوتی ہے... رنگوں کی دنیا میں پہنچے تو فاطمہ حسام نے شب ظلمات کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ مجھے تو لگا کوئی ہارر فلم چل رہی ہے۔ آخر میں یہ سمجھ نہیں آیا کہ پروڑ INVISIBLE ہو گیا یا نہیں؟ آخری رنگ غلط انتخاب بھی اپنی جگہ زبردست تھی۔ دولت کی ہوس نے رشتوں کا خون کر ہی ڈالا... اسما قادری سے گزارش ہے کہ گرداب میں اب تیزی سے کام لینا شروع کر دیں... کہانی زبردست ہے لیکن رفتار بہت سست ہے، ہر چیز کی وضاحت ضروری نہیں ہوتی۔ رہی للکار تو اس کے بارے میں کیا کہوں؟ ویسے عمران کی اتنی اچانک موت ہضم نہیں ہو رہی... تابش صاحب پر تو قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں بھارت میں اب وہ را والوں کے ہتھے نہ چڑھ جائیں۔"

محمد نعمان پیارے تلہ سے اپنے پیارے تبصرے کے ساتھ "اس دفعہ جاسوسی نے 3 جون کو ہی اپنی آمد کا نقارہ بجا دیا۔ ٹائٹل گرل پر نظریں دوڑائے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر زلفیں رخسار کو چھوتے ہوئے کندھوں تک آرہی تھیں۔ اس دفعہ ٹائٹل گرل کیا خوب سج رہی تھی۔ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ شرارتی آنکھیں۔ واہ جی واہ۔ اس کے عقب میں ایک صاحب جو چہرے کے جلے ہوئے بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ دوستوں کی محفل میں عابد جان کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ عابد جان صاحب! کیا خوب تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ نزہت انیس کے ساتھ کمل اور جعفر حسین صاحب بھی آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ جعفر حسین صاحب کا تبصرہ بہترین تھا۔ کہانیوں میں آخری نکتہ اچھی تھی۔ راہ کا انجام بہت عجیب ہوا۔ مریم کے خان کی انجانے میں کافی سسپنس تھا اور ہماری من پسند للکار اس کا کوئی جواب نہیں (ہچکی)۔ اس قسط میں طاہر صاحب نے کیا خوب سسپنس پھیلایا لیکن عمران کا دکھ ہے بیان نہیں اس کا کیا بنا ہے۔ مصنف صاحب سے ہماری عرض ہے کہ عمران کو کہیں سے نکال لائیں۔ کاشف زبیر کی غلط انتخاب بہت بہترین تھی۔ یوسف نے آخر کار صحیح راستے کا انتخاب کر لیا۔ اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ مکمل طور پر بہترین تھا۔"

قیصر عباس تالوری، جھنگ سے لکھتے ہیں "اب کی بار جاسوسی طویل انتظار کے بعد ملا۔ ٹائٹل بھی دیکھا۔ جلتی آگ، شیطان، پستول بردار، زرد صحرا، نشیلی آنکھوں، کھلی زلفوں اور گلابی رخساروں والی حسینہ... ایک عجیب سا منظر پیش تھا۔ ویسے انکل جی! ٹائٹل پر قیمت 50 روپے لکھنے کی کیا تک بنتی ہے؟ محفل دوستاں میں پہنچے۔ ہر ایک کی اپنی بولیاں... سب سے اونچا بولنے پر عابد جان کو مبارک ہو۔ محی الدین نواب کی حالت ہائے برہم سے کہانیوں کی ابتدا کی۔ نواب انکل کی کہانی ماضی قریب کے حالات کی عکاسی کرتی تحریر... جب شروع کی تو بقیہ اگلے ماہ پر اختتام ہوا۔ مریم کے خان کی انجانے ایک خوب صورت تحریر تھی جس کا انجام اچھا اور خوشگوار ہوا۔ طاہر جاوید مغل کی للکار میں عجیب حالات پیش آئے۔ عمران کی موت کا تو یقین نہیں آتا۔ تابش عرف تانی کی بے تابی تو اسے اٹھا لے گئی ہے۔ لگتا ہے کہانی کا اصل پلاٹ یہیں سے ہی شروع ہوا ہے۔ خیر، آگے آگے دیکھتے ہیں ہوتا ہے کیا؟ گرداب میں تو ہر چیز ہر منظر ہی الجھا ہوا ہے اور پریشانیوں کا گرداب مزید بڑھ رہا ہے۔ سید احتشام کی مختصر میں اسلم۔ اسٹیو اور ڈیوڈ جیسے ستمگروں سے بڑی خوب صورتی سے بچ نکلی۔ سیماں کمال کی ساحلیہ میں ایک ایسے شخص کو دکھایا گیا جو نفسیاتی الجھنوں کا شکار تھا۔ جس کا انجام بھی برا ہوا۔ پہلا رنگ خیر و شر کے درمیان بھٹکنے والوں کے انجام پر مشتمل ایک سبق آموز تحریر تھی۔ سکندر، سلمٰی اور ماجد کے برعکس روزی نے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی اور کامران ٹھہری۔ دوسرا رنگ مثبت اور منفی راہوں کے درمیان سفر کرنے والوں کی کہانی تھی۔ یوسف نے بروقت فیصلہ کر کے اچھا کیا۔ مجموعی طور پر جاسوسی دلچسپ تھا۔"

صمر انز شیخ، اسلام پورہ (گوجرخان) سے حاضر ہیں "یہ میرا جاسوسی کے لیے پہلا تبصرہ ہے۔ اس سے پہلے میں خاموش قاری تھا لیکن چھٹی رکھتہ چنی کی کشش نے مجھے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ سب دوستوں سے پیار کا پکا لینے کی جسارت کرتا ہوں۔ امید ہے سب دوست ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ کہانیوں میں سے للکار، حالات ہائے برہم وغیرہ سب ٹھیک ٹھاک چلے جارہے ہیں۔ گرداب بھی زبردست جارہی ہے۔ للکار میں ہمارے پاکستانی تابش کو ہندوستانی مہرو بنا دیا گیا اور وہ بھی سلطانہ کا شوہر۔ عمران ہیرو کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہوا۔ حالات ہائے برہم پہلی قسط زبردست رہی۔"

سید محی الدین اشفاق کی فرمائشیں تاج پورلیہ سے "اس مرتبہ جاسوسی 4 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی للکار پڑھی۔ انکل طاہر! آپ نے تو تابش کا برا حال کر دیا ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد نواب انکل کی پہلے صفحات پر حالات ہائے برہم پڑھی۔ یہ داستان پڑھ

کرامت مسلمہ کے مسائل کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تحریر دکھی کر گئی۔ پہلا رنگ شب ظلمات فاطمہ حسام کی تحریر تھی۔ ان کے لکھنے کا انداز حسام بٹ جیسا ہے۔ ان کا حسام بٹ سے کوئی رشتہ ہے کیا؟ (جی ہاں، یہ حسام بٹ کی صاحبزادی ہیں)۔ پہلے رنگ میں انسان کو شیطان کی پیروی کرتے دکھایا گیا ہے۔ واقعی آج کا انسان ہوس کا شکار ہے۔ اس کو پیسے کی طلب ہے۔ آخر میں روزی کا خدا سے مدد مانگنا اور اس کی دعا کا پورا ہونا ثابت کرتا ہے کہ خدا واقعی اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔ دوسرا رنگ کاشف زبیر کی کیا خوب تحریر تھی۔ اس میں بھی انسان کی ہوس جو وہ پیسے کے لیے کرتا ہے۔ سعدیہ اور یوسف کی ایمان داری اور سچائی نے ان کو بالآخر فتح یاب کیا۔ مریم کے خان کی انجانے اچھی لگی۔ عہد گرفتہ سریاراحمد کی تحریر تھی۔ ایسی تحریریں پہلے بھی جاسوسی میں چھپ چکی ہیں۔ اب آتے ہیں اپنی محفل کی طرف۔ انکل! پہلے فرمائش۔ احمد اقبال کی مزاحیہ تحریر جاسوسی میں جلد از جلد ہو۔ دوسری فرمائش میرے شہر کا نام فتح پور لازمی لکھیں۔ ذکر انکل! ٹائٹل میں گرل کی تصویر تو اچھی بناتے ہیں اور صنف وجاہت کی تصویر آپ دلہن کی طرح کیوں بناتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس اچھے چہروں کی کمی ہے تو پہلے میں پھر باقی صنف وجاہت اپنی تصاویر ہر مہینے ادارے کو بھجوا دیں گے ٹائٹل کے لیے۔ کیا خیال ہے انکل جی! عابد جان کو اتنا اچھا تبصرہ لکھنے پر مبارک باد۔"

عبدالسلام صدیقی بن عبیداللہ ہاتب کی پریشانی نظریات ملتان سے "سرورق حسب معمول آگ و خون کی منظر کشائی کر رہا تھا۔ ہم اس سے بچتے ہوئے محفل کے آنگن میں اترے۔ عابد جان صاحب بہت بہت مبارک۔ حسینہ کی حسن کشائی کرنے پر جعفر حسین صاحب! ہمیشہ ایسی بارش مانگیں جو باعث رحمت ہو نہ کہ زحمت۔ تصویر الحسن صاحب! بہنوں کی پڑھائی کی فکر بھائیوں کو نہیں تو کس کو ہوگی۔ دلنشین بلوچ صاحبہ! لگتا ہے آپ نے بھائیوں کا پیار نہیں دیکھا اس لیے مذاق اڑا رہی ہیں۔ ویسے آپ اصل سوال گول کر گئی ہیں کہ ملتان سے کون سا جذباتی رشتہ ہے۔ دلپذیر سیال صاحب آپ کا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ بالخصوص 21 سالہ چھوکری پر... انفال مرزا صاحبہ! آپ تبصرہ لکھ رہی ہیں نہ کہ اپائی منٹ لیٹر... ایس ایس ناز صاحب! آپ کہاں گم ہو گئیں؟ کیا دلنشین صاحبہ کو نہیں بتاؤ گی ہم کتنے مہمان نواز ہیں؟ للکار میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی محبت پر جو ماں اور بہن کا پیار چھین لے۔ اب تابش کے لیے بہتر یہی ہے جو بہا اور محبت مل رہی ہے اسے قبول کرے۔ گرداب مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ پکی کہانی ہے لیکن شہریار اپنی پٹائی کا بدلہ نہ لے کسی صورت میں قبول نہیں۔ حالات ہائے برہم، کتنے افسوس کی بات ہے ہم جنس پرست ہر دور میں موجود ہے۔ شب ظلمات، انسان بھی کیا چیز ہے۔ اس نے ایک بات طے کر لی ہے کہ جہاں روح یا چڑیل ہوگی وہاں تیز بارش، آندھی، کڑکتی بجلی وغیرہ وغیرہ ہوگی ہو... یہ انسانی تصورات ہیں جو مجھے ذرا اچھے نہیں لگتے اور نہ ہی اس سے وابستہ کوئی چیز۔ غلط انتخاب، یہ بہترین کہانی تھی، ٹائم پاس کرنے کے لیے... ورنہ اس میں کوئی لاجک نہیں تھی۔ بالخصوص یوسف اور ولعت کے متضاد کردار دوں ہی میں تو شادو دل میں ماشہ... آخری رقص، کتنی عجیب بات ہے۔ عورت چاہے تو امر ہو جائے اور مرد چاہے تو بے غیرت ہو جائے۔ انجانے، بندروں کو جب سے ایسی عادت پڑی کہ انہوں نے جنگیں شروع کر رکھی ہیں پہلے اپنی مادہ اور بچوں کو محفوظ کیا اور دماری مادہ... تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ہم اس کو عزت سے کہیں نہ کہیں ہمارے حقوق... سب کل مجھے ماد... مدیر صاحب! خیال اور پریشانیاں انسان کو بہت حساس بنا دیتی ہیں اور وہ چھوٹی سی بات بھی برداشت نہیں کر سکتا اور بڑے سے بڑا قدم اٹھا دیتا ہے... کیا سمجھے... بڑا قدم۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج کل میں بھی تنہا ہوں اور تھوڑا سا پریشان بھی۔ (پریشانیاں بھی زندگی کی ساتھی ہوتی ہیں... ان سے کنارہ نہیں کیا جا سکتا۔ امید واثق ہے ہر دکھ کا مقابلہ کریں گے۔)"

اختر عباس تھراج کبیر والا سے لکھتے ہیں "سب سے پہلے تبصرے کا آغاز ٹائٹل سے کروں گا۔ اس دفعہ ٹائٹل بس کچھ نارمل سا لگا۔ لڑکی اپنی زلفوں سمیت حاضر تھی جبکہ اس کے پیچھے ایک آدمی پستول تھامے کھڑا تھا جبکہ اس کے پیچھے ایک اور لوریت سے عاری چہرہ نظر آیا۔ اس کے بعد فوراً دوستوں کے تبصرے پڑھے تو بہت ہی مزہ آیا۔ عابد جان چار صدرو سے ٹاپ آف دی لسٹ تھے۔ سو ہماری طرف سے ان کو مبارک باد۔ سب سے پہلے اپنے محبوب مصنف محی الدین نواب کی حالات ہائے برہم پڑھی۔ آہ! مزہ آگیا۔ بس ذرا رومانس زیادہ تھا۔ حالانکہ باقی تو پوری ہی اسٹوری کافی مزے کی تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ بے چارے عامر پر بڑا ترس آیا۔ پھر بڑھے للکار کی جانب۔ اس دفعہ مغل انکل نے عمران کو مروا کے پوری کہانی کا بیڑا ہی غرق کر دیا۔ کاش کہ عمران نہ مرتا تو بہت ہی مزہ آتا۔ ہمیں ان کا کردار بہت پسند تھا۔ افسوس ہائے صد افسوس۔ میں نے تو بڑی مشکل سے کہانی کو ختم کیا۔ ہیرو تابش صاحب اب انڈیا نکل گئے ہیں، پتا نہیں وہ کیسے؟ گرداب بالکل اچھی جارہی ہے۔ یہ بہت اچھی کہانی ہے۔ اسما قادری ویل ڈن۔ چودھری نے شہریار کی خوب پٹائی کروائی ہے۔ ماہ بانو لگتا ہے اگلی قسط میں آزاد ہو جائے گی۔ اس دفعہ تو کشور خود بھی پھنسی اور ساتھ آفتاب بھی۔ اس کہانی کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہوگا۔ ثمر عباس کی گاؤ جتوں، مریم کے خان کی انجانے بہت پسند آئیں جبکہ رنگ ابھی زیر مطالعہ ہیں۔"

کبیر عباسی عرف شہزادہ کوہسار، مری سے اپنے جامع تبصرے کے ساتھ "اس دفعہ ابھی ڈائجسٹ لے کے چند موڑ ہی پہنچا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ جب تھوڑی بارش کم ہوئی تو اللہ کا نام لے کے ہم نے رخت سفر باندھا مگر تھوڑی دیر بعد پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اب تو رکنا ناممکن تھا۔ مجبوراً موسلا دھار بارش کو انجوائے کرتے کرتے گھر پہنچے تو لائٹ ہی نہیں تھی اور ایمرجنسی لائٹ کی بھی چارجنگ کم تھی۔ مجبوراً ڈم لائٹ میں ہی ڈائجسٹ لے کے بیٹھ

انتباہ
جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

گئے۔ ناگن گرل پہلی نظر میں تو بہت ہی پرکشش تھی مگر بغور دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ذاکر انکل اس کے میک اپ کو فنشنگ ٹچ دینا بھول گئے۔ ناگن گرل کے علاوہ ٹائٹل میں کچھ خاص بات نہ تھی۔ بہرحال پھر بھی ناگن گرل کی وجہ سے ہم نے مجموعی طور پر ٹائٹل کو ساٹھ نمبر دے کر فرسٹ ڈویژن میں پاس کر دیا۔ عابد جان، مصنف کو بخشو مغز سے اتنی مخالفت؟ لگتا ہے شادی شدہ ہو آپ۔ نوری دوست، وہ تو مدیر صاحب کی قینچی کا کمال تھا ورنہ ہم ڈرانے والی مخلوق ہیں ڈرنے والی نہیں۔ عبدالرؤف! لگتا ہے آپ ہماری تعریف کرنے لگے تھے مگر قینچی اپنا کام دکھا گئی۔ جعفر حسین! یہ بھوانہ کس شہر کا گاؤں ہے؟ ٹرپل ایس کے، عرف نھے منے بچے، اب تو تمہارا کہانیوں پر خلاصہ شائع نہیں ہوتا۔ کچھ تبصرہ کرنا بھی سیکھ لو۔ تصور! آمین! ہمارا تبصرہ بھی پسند کیا اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ تعریف کے جواب میں شکریہ کہنا چاہیے۔ تو کیا مجھے شکریہ ادا کرنا پڑے گا؟ ذیشین بلوچ! آخر آپ نے کہانیاں پڑھنا شروع کر ہی دیں۔ روشانے صنم! ہم نے تو آپ کو معصوم ہی خوشی دے دی مگر باقی لوگوں کے احمقانہ اندازوں سے آپ کو معصوم سا غم بھی ملا ہوگا۔ گرداب کی ایک اور اچھی قسط پڑھنے کو ملی۔ ماہ بانو کے واقعات میں بھی سسپنس پیدا ہو گیا ہے۔ للکار میں تو سب کچھ ہی الٹ پلٹ گیا مگر عمران کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ کہانی کے دوسرے پارٹ کے آغاز میں ہی ہمیں پتا چل گیا کہ تابش کی یادداشت کچھ عرصے بعد واپس آ گئی ہے۔ بہرحال، بہت زبردست قسط رہی۔ کاشف زبیر نے لگتا ہے بہت جلدی میں اس دفعہ کہانی لکھی۔ بہت مایوس کیا اس دفعہ کاشف زبیر نے۔ فاطمہ حسام یا حسام بٹ کا ہمیں انداز تحریر ہی پسند نہیں۔ وجہ ان کا ایک ہی واقعے کو مختلف الفاظ کا رنگ دے کر بار بار دہرانا ہے جس سے کہانی کی طوالت میں اضافہ ہوتا ہے وہاں ہماری بوریت میں بھی۔ محی الدین نواب اولین صفحات پر جلوہ افروز ہوئے اور کیا خوب ہوئے۔ ظلم، ناانصافی، عالمی سیاست، جنگ، پیار و محبت، ہوس، تجسس جیسے مختلف رنگوں سے سجی یہ خوب صورت تحریر بہت پسند آئی۔ اگلے حصے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ مریم کے خان کی انجانے بھی سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ بہت مزہ آیا پڑھ کے۔ تحریر کی خاص بات یہ تھی کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا ورنہ اس قسم کی تحریروں میں کوئی ایک دو بندے ہی بچتے ہیں۔ سید احتشام کی شکر، خوب صورت ڈائیلاگز، دماغ کی چولیں ہلا دینے والا سسپنس، حدوں کو چھوتی عیاری و خودغرضی جیسی خصوصیات کی بنا پر ایک ناقابل فراموش تحریر ثابت ہوئی۔ کبھی جاسوسی کی خاص بات اس کے رنگ ہوا کرتے تھے۔ مختصر تحریریں ہم صرف وقت گزاری کے لیے پڑھتے تھے مگر اب صورت حال مختلف ہے۔ مختصر تحریریں رسالے کی جان ہیں جبکہ رنگ کم ہی متاثر کر پاتے ہیں۔ پلیز انکل! کچھ نئے لوگوں کو سامنے لائیں تاکہ جاسوسی کا پہلے والا معیار برقرار رہ سکے۔ لطائف اس دفعہ دلچسپ رہے۔"

محمد سلیم تیلی کا شکوہ ملتان سے "جولائی کا چمکتا دمکتا شمارہ بہت تاخیر سے موصول ہوا۔ مس جاسوسی کی قاتل آنکھیں اتنی پسند آئیں کہ کیا بتائیں۔ خیر ریوالور تھامے آدمی ایسا تنگ رہا تھا کہ جیسے پوز بنوا رہا ہو جبکہ سرخ آدمی کی طرف دیکھتے ہی کراہت سی ہونے لگی۔ جلدی جلدی محفل میں انٹری دی مگر اپنا خط نہ پا کر جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے۔ عابد جان مذاکرات کا تو ہمیں کافی تجربہ ہے لیکن انڈیا سے مذاکرات ناممکن ہیں کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ نوری اے بہاولپور میں کون سی جگہ پر رہتے ہو۔ تصور! انکل صاحب آج تو پٹھانی کی باتیں سن کو جذبات میں آ گئے تھے۔ خیر آپ کی بہت بہت مہربانی ہوگی۔ ذیشین بلوچ صاحب اچھے کیسے پتا چلے گا کہ آپ ملتان آ رہی ہیں تاکہ آپ کا شایان شان استقبال کر سکوں۔ افضال مرزا اور صبا مرزا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ویسے آپ کو ہمارے تبصرے اچھے لگتے ہیں مگر نہ جانے مدیر صاحب کو کیوں اچھے نہیں لگتے؟ کہانیوں میں محی الدین نواب کی کہانی زبردست ہے۔ کہانی کا پلاٹ زبردست ہے۔ گرداب میں شہر یار کا اغوا اور واپسی جبکہ ماہ بانو لگتا ہے عمران کی مدد سے نکل جائے گی جبکہ چودھری اب گوروں کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔ للکار میں عمران کی موت نے بہت دکھی کر دیا۔ کہانی میں سارا سسپنس اور مزہ، ایڈونچر عمران کی وجہ سے تھا۔ فاطمہ حسام کی شب ظلمات اچھی کہانی تھی۔ روزی کا کردار مجھے اچھا لگا جبکہ باقی سارے اپنے برے اعمال کی وجہ سے اپنی جان گنوا بیٹھے۔"

انعم محمد اسلم کی شمولیت گوجرانوالہ سے "جاسوسی میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں لیکن پچھلے ایک سال سے پڑھ رہی ہوں۔ سرورق کی حسینہ اچھی لگی۔ لیکن سرورق کا پوسٹ مارٹم میرے بس کی بات نہیں اس کے لیے باقی دوست ہی کافی ہیں۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ تحریر للکار پڑھی۔ اتنی بڑی تبدیلی ہو جائے گی انکل! بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ بہرحال، اگلی اقساط میں پتا چلے گا کہ یہ سب کیا ہے۔ گرداب، اسما قادری کی بہت بہت خوب صورت تحریر ہے۔ سرورق کا پیلا رنگ اچھا لگا، وہ بھی ذرا زیادہ ہونے کی وجہ سے۔ چھوٹی کہانیاں تقریباً تمام ہی زبردست تھیں۔ خاص طور پر انجانے، عہد گرفتہ اور سایہ۔ جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر محی الدین نواب کی کہانی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ چٹکی ملکہ چٹکی میں بھی دوستوں کے تبصرے خوب صورت ہوتے ہیں۔ ان کی آپس کی نوک جھونک کافی مزہ دیتی ہے۔ امید ہے تمام دوست مجھے بھی خوش آمدید کہیں گے۔ (یقیناً)۔"

رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی سے لکھتے ہیں "جولائی کا جاسوسی شدید گرمی میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی مانند ملا۔ سرورق پر جاسوس آڑے ترچھے دیکھنے کو ملتے تھے لیکن اس دفعہ جاسوس کی جوڑی بھی بہتر رہی۔ عابد پان (سوری) عابد جان کرسی صدارت پر لینڈ کر گئے سو دلی مبارک باد وزارت کا قلمدان نوری اے نے سنبھالا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ذکر ہو جائے کس کا؟ جی ہاں للکار۔ محبوب قلم کار کی محبوب داستان اچانک پلٹا کھا گئی اور حیرتوں کا جھٹکا لگا گئی۔ تابش تو پہنچ گیا انڈیا۔ دیکھیے کولیوں کا بوسٹ عمران کا کیا کرتا ہے۔ ویسے پوری امید ہے کہ ہیرو بھائی بچ جائے گا۔ جاسوسی کے اولین صفحات کو سوچوں سے پرویا جناب محی الدین نواب صاحب نے اور ہم سب کو کھا دیا عراق میں۔ تاریخ گواہ ہے کہ داؤد اسرار جیسے بدبخت غمر کے بعیدی کے لیے کانٹا ڈھاتے۔ تنویر ریاض کا آخری رقص، جن جن کو ٹھکرا کے رائے زندگی ہی ہار گیا۔ مریم کے خان کی کاوش انجانے بہت پسند آئی۔ اس طرح کی کہانیاں میری پسندیدہ ہیں۔ ثمر عباس کی گاؤ جنوں ایک قاتل کی سفاک سرگرمیوں کا شاخسانہ بھی بہتر رہی۔ اوہ! تو یہ ہے سرینا راض کی عہد گرفتہ۔ ڈیوی اپنی بیوی سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لیتا تو بیری کے قتل سے بھی بچ جاتا اور اپنے تاریک انجام سے بھی۔ بہرحال کہانی کافی عمدہ تھی۔ گرداب میں اے ای صاحب پھنستی لگنے کے بعد چھوٹ گئے۔ اسرار عت، درد ماتویت اور حسن جمال کی داستان، سید احتشام کی شکر جاسوسی کو چار چاند لگا گئی یہاں کمال کے کردار ملے گئیں۔ سایہ، اصغر حسین کیا نفسیاتی انسان تھا کہ آدمی تیز سی بات پہ بیویاں قتل کر دیں۔ بالآخر خبیث خود بھی واصل جہنم ہو گیا۔ لو جی فاطمہ حسام جاسوسی کا پیلا رنگ شب ظلمات کے ہمراہ تھیں۔ کہانی سرورق کے رنگ سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ پرویز شیطان کو سر کے بجائے آقا کہتا۔ بہرحال کہانی بچہ کہانی تھی۔ کاشف زبیر کا دوسرا رنگ غلط انتخاب کافی بہتر رہی۔ کشر میں بہتر رہیں۔"

افضال مرزا اینڈ صبا مرزا کی ملی جلی کوشش چکوال سے "اس دفعہ جاسوسی کے انتظار میں کافی بے چینی تھی۔ کیونکہ ہم نے اپنا تبصرہ جو بھیجا ہوا تھا۔ سرورق کی ماہ جبینہ سے فرصت پا کر فہرست کا جائزہ لیا جہاں پر ہمارے فیورٹ رائٹر محی الدین نواب جو کہ ایک سال بعد جاسوسی کی جادوگری میں تشریف لائے، بسم اللہ ہم نے انہی سے کی۔ حالات ہائے بر ہم پڑھتے ہوئے ایسے لگا جیسے پہلے بھی پڑھی جا چکی ہے لیکن بعد میں خیال آیا کہ کچھ جملے بار بار دہرانے سے ایسے ہی لگتا ہے۔ فاطمہ حسام، کاشف زبیر کو سلام کرنے پہنچی۔ شب ظلمات کے بارے میں میری یہی رائے ہے کہ انسان خود شیطان کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ سلسلے وار کہانیوں کے بارے میں دل صحیح طرح فیصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ پہلے کون سی کہانی پڑھنی ہے کیونکہ پچھلے ماہ دونوں کہانیوں کا اینڈ سنسنی خیز ہوا۔ دماغ کے کھنے پر ترس کیا جو کہ ہماری پیاری اسما قادری نے جیتا۔ کشور اور آفتاب کے ساتھ اب کیا ہوگا، کیا اس بار بھی کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بات ہوگی؟ طاہر انکل! آپ ایک دم اتنا بڑا انقلاب لے آئے ہیں۔ آپ عمران کو کسی بھی طرح کہانی میں واپس لائیں ہمیں نہیں پتا؟ صبا کہہ رہی ہے ہمیں پتا ہے کہ انڈین بارڈر پاکستان کے ساتھ زیادہ لگتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمارے رائٹر صاحبان اپنے ہیرو کو انڈین بارڈر پار کرواتے ہیں۔ افغانستان کا چکر بھی کبھی کبھی لگ جاتا ہے۔ لیکن چین اور ایران کا بارڈر ابھی کسی ہیرو نے پار نہیں کیا۔ سایہ میں اصغر حسین کی نفسیات سمجھ میں نہیں آئی۔ مریم کے خان کی کہانی نے ہم پر کوئی خاص تاثرات نہیں چھوڑے۔ شکر میں ایملی نے دو قتل بڑی بہادری سے کر دیے۔ اب اجازت لینے کا وقت آ گیا ہے، انشاء اللہ اگلے ماہ رمضان میں ملیں گے بشرط زندگی۔"

ساہیوال سے اعجاز احمد کی تعریف "ماہ جولائی کا بے مثل شمارہ 8 تاریخ کو ملا۔ جون کی کڑکتی دھوپ میں جھلسا دینے والی گرمی اور پھر آتش ہجر و فراق میں سلگتا وجود بس شمارہ پڑھ ہی سکا تھا لیکن اب کے بار تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ سب سے پہلے ابتدائی صفحات پر انکل نواب کو دیکھ کر خوشی سے دل بے قابو ہو گیا۔ حالات ہائے بر ہم عراق کے حالات پر لکھی گئی زبردست اسٹوری تھی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ للکار پڑھی۔ مغل صاحب کی بے مثال ہستی تو میری سوچوں کے افق پر مانند مہتاب روشن ہے۔ تابش کے حالات زیست ایک ڈرامائی انداز اختیار کر گئے ہیں۔ ایک چوٹ سے ذہنی توازن بگڑا، دوسری سے ٹھیک ہوا لیکن ہمارے دل پر عمران والی چوٹ کاری ثابت ہوئی۔ مغل جی کوئی معجزہ دکھا دیں۔ عمران سے اتنی جلدی دوری من کو نہیں بھاتی۔ گرداب سے اے ای صاحب نکل گئے جبکہ ماہ بانو نکلنے والی ہے۔ کشور اور آفتاب کے جانے کی شنی تھی جبکہ اصل گرداب میں چودھری پھنسنا شروع ہوئے ہیں۔ پہلے رنگ شب ظلمات میں پرویز کا کردار کراہت آمیز تھا۔ بے شک ایسے ہی لوگ وقت کے خدا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی گمراہ لوگ شیطان کے پیروکار ہیں۔ جا شب تیرہ و تاریک جنگ میں جیت اللہ والوں کی ہوتی ہے۔ دوسرا رنگ غلط انتخاب تھا۔ درشہوار، شبیر اور رفعت کا انتخاب واقعی غلط تھا۔ بے شک نیکی اور بدی دو الگ راہیں ہیں۔ یہ ہماری اپنی سوچ ہے کون سی راہ چنیں۔ بدی کی راہ یقیناً غلط انتخاب ہے۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی انجانے میں یہ سبق ملا ہے کہ مشکل حالات میں بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ ثمر عباس کی گاؤ جنوں میں قدم رکھا جہاں رون بریک نے ایک جنونی قاتل کے جرم سے پردہ چاک کیا۔ عہد گرفتہ میں ڈیوی ایک دھوکے باز شوہر تھا جو بالآخر اپنے انجام کو پہنچا۔ سید احتشام کی اسٹوری شکر ایک الجھی ہوئی کہانی تھی جہاں پر سب نے ایک دوسرے کو دھوکا دیا۔ آخری رقص اور سایہ بھی لاجواب کہانیاں تھیں۔"

ان قارئین کے نام جن کے مکتوبات شامل محفل نہیں ہو سکے۔

— کولہوا دوڑان، وچیاں کھڑی شریف۔ عبدالودود چھاچھی، اٹک۔ افتخار احمد، کھلا پور۔ محمد رضوان علی یوسف، لاہور۔ ماہتاب گل رانا، راجن پور۔ فہیم تبسم، شورکوٹ۔ انجم فاروق، لاہور۔ چودھری سسٹرز، رحیم یار خان۔ ساگر کلو کر اینڈ امتیاز قادری، چشمہ بیراج۔ عبدالرؤف زرگر، مظفر گڑھ۔ پرنس تنویر احمد، دادو۔ نوری اے قرام مسلم، ٹاؤن بہاولپور۔

✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦✦

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضائع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

www.pkdigest.com

حالات ہائے برہم

محی الدین نواب

عزائم انسان کے ہوں یا کسی بڑی عالمی طاقت یا کسی بڑی ریاست کے...... ان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنا مفاد ہوتا ہے...... چاہے اپنے دیرینہ خواب اور تعیشات کی تکمیل کے لیے انہیں کیسا ہی طریقہ کار کیوں نہ اختیار کرنا پڑے...... ایسی ہی عالمی طاقتوں کا کھیل جو اپنی طاقت و مفادات کو قائم و دائم رکھنے کے لیے حالات میں بگاڑ پیدا کرکے انسانیت کو خس و خاشاک کی طرح روندتے جارہے تھے۔ عالمی حالات کے تناظر میں رونما ہونے والی سیاسی...... فکری اور نظریاتی تبدیلیوں کی غماز......

ناانصافیوں...... ناہموار زندگی کی مشکلات...... عشق جمال اور امن کے جذبوں کی عکاس

وہ لڑکا جو اس کے قدموں تلے آنے والا تھا، ایسے نکل گیا تھا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

داؤد اسرار اس بات پر تلملا رہا تھا کہ وہ چھوکرا پچھلے چوبیس گھنٹوں سے فرار ہونے کا جھانسا دے کر اس کے محل میں چھپ کر اسے الّو بنا رہا تھا۔

اور وہ اس لیے بھی بھڑک گیا تھا کہ اس کی آواز بیٹی کے فون سے سنائی دی تھی۔ وہ بے اختیار پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا کہ اسے مار ڈالے گا۔ اس کی بوٹی بوٹی کتوں کو کھلا دے گا۔

اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ جہاں تھا، وہیں سے گولی چلا کر وسیم کو مار ڈالتا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ وہ یک لخت چپ ہوگیا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ اپنے دفتری کمرے میں کھڑا ہے اور دوسرے عہدے دار اس کا منہ تک رہے ہیں۔ ایک نے پوچھا۔ "سر! کیا آپ نے فون نمبر سے معلوم کرلیا ہے کہ وہ کہاں ہے؟"

داؤد نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ دوسرے عہدے دار نے پوچھا۔ "سر! یہ کس کا فون نمبر ہے؟"

یہ سوال ایک جوتے کی طرح اس کے منہ پر لگا۔ وہ کسی سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس کی اپنی بیٹی کا فون نمبر ہے۔

اس سے بڑی ذلت اور توہین کیا ہوسکتی تھی کہ جس مجرم کو وہ گالیاں دے رہا تھا، وہ اس کی بیٹی کے پاس پایا جانے والا تھا۔ سننے والے تو یہی کہتے کہ جب فون اس کے پاس ہے تو بیٹی بھی اس کے پہلو میں ہوگی۔

وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس سے بڑی گالی اور کیا ہوسکتی تھی؟ وہ گالی اور غصے کو برداشت کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ وہ کہاں ہے، یہ معلوم ہوچکا ہے۔ مجھے بہت محتاط رہ کر وہاں جانا ہوگا... ورنہ وہ وہاں سے بھی بھاگ جائے گا۔"

ایک نے پوچھا۔ "کیا پولیس فورس تیار کی جائے؟"

وہ پاؤں پٹخ کر اپنی کرسی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ "نہیں... تشہیر اور ہنگامہ ضروری نہیں ہے۔ اسے گرفتار کرنے کے لیے میرے باڈی گارڈز ہی کافی ہیں۔ آپ لوگ جائیں۔ میں تنہائی چاہتا ہوں۔"

وہ سب وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ اس نے فون اٹینڈ کرنے والی جاسوس عورت سے کہا۔ "تم بھی جاؤ۔ میری اجازت کے بغیر کسی کو بھی اندر نہ آنے دینا۔"

اس نے باہر جاتے ہوئے دروازے کو بند کردیا۔ داؤد نے اپنے موبائل فون کے ذریعے اپنے محل کے ایک خسرے باڈی گارڈ کو مخاطب کیا۔ وہ آواز سنتے ہی مستعدی سے بولا۔ "جی جناب عالی...!"

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کہاں ہو تم؟"

"خادم محل کے بیرونی دروازے پر ہے۔"

"کیا تم اندر کی خبر رکھتے ہو؟"

"جی جناب عالی! میرے ساتھ تین خواجہ سرا ہیں۔ ہم صبح سے شام کا اندھیرا ہونے تک محل کے اندر جاتے آتے رہتے ہیں اور ایک ایک بات کا دھیان رکھتے ہیں۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ فرار ہونے والا لڑکا محل کے اندر نہیں ہے؟"

"نہیں ہے... جناب عالی! ہم نے محل کا ایک ایک گوشہ دیکھا ہے۔ بڑے بڑے وارڈ روب کے پیچھے اور اسٹور روم کے

کباڑ میں بھی اسے ڈھونڈا ہے۔ وہ یہاں سے بھاگ گیا ہے۔“
وہ غصہ پیتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ ”وہ فرار نہیں ہوا ہے، وہیں موجود ہے۔ میں نے یہاں سے اس کی موجودگی کو پالیا ہے۔“

اس کا آقا ایک ناقابلِ یقین بات کہہ رہا تھا لیکن وہ چپ تھا۔ اس کی بات کو جھوٹ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”تم سب میرے وفادار ہو۔ تم لوگوں نے اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں کوتاہی نہیں کی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ وہاں موجود ہے اور کسی طرح تمہاری نظروں میں نہیں آرہا ہے۔“

”جنابِ عالی! آپ نے جس طرح اسے پالیا ہے اسی طرح ہماری راہنمائی کریں۔ ہم ابھی اس کی گردن دبوچ لیں گے۔“

وہ بولا۔ ”وہاں اس کی موجودگی کا سراغ مل چکا ہے لیکن وہ کہاں چھپا ہوا ہے... یہ محل کے اندر جاکر معلوم کرنا ہوگا۔“

”میں ابھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر جاتا ہوں۔“

”نہیں۔ تم لوگ باہر رہو۔ اندر کسی کے کانوں میں ہلکی سی بھنک بھی نہ پڑے کہ ہم اچانک نئے سرے سے تلاشی شروع کرنے والے ہیں۔ میں ابھی آرہا ہوں۔ تم میرے ساتھ اندر جاؤ گے۔“

”جی جنابِ عالی!“ ”ہم یہاں مستعد رہیں گے۔“

داؤد نے اس خسر ے گارڈ کے بعد سیکیورٹی افسر سے رابطہ کیا۔ اسے بھی بتایا کہ وسیم محل کے اندر چھپا ہوا ہے پھر کہا۔ ”خفیہ کیمروں کے ذریعے محل کے اندر نظر رکھو۔ وہ وہاں سے نکل کر باہر آسکتا ہے۔ اسے گولی نہ مارنا صرف زخمی کرنا۔ میں اسے کچلنا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں۔“

پھر اس نے کہا۔ ”میری بیوی... اور بیٹی کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں وہاں پہنچنے والا ہوں۔ انہیں ابھی اس معاملے سے بے خبر رکھو۔“

اس نے تمام سیکیورٹی گارڈز کو اور اپنے خاص خسر ے گارڈز کو چوکنا کردیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ بیٹی نے وسیم سے کوئی تعلق رکھا ہوگا۔ صرف اس کا فون نمبر اسے الجھا رہا تھا اور شبہ پیدا کررہا تھا۔

سارہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یاقوت بن کر وسیم سے رابطہ کرنے والی اس کے پاپا کے شعبے سے تعلق رکھتی ہوگی اور اس جاسوس کے ذریعے اس کا موبائل نمبر باپ تک پہنچ گیا ہوگا۔

سارہ کو سوچنا سمجھنا چاہیے تھا کہ وسیم کے ساتھ فراڈ کرنے والی عورت کوئی دشمن ہوسکتی ہے۔ دشمنوں کی آلۂ کار ہوسکتی ہے۔ یوں اس کا فون نمبر دشمنوں تک پہنچ گیا ہوگا۔ لیکن وہ مختلف پہلوؤں سے سوچ نہ سکی کیونکہ سہاگ کا پہلا دن گزار رہی تھی۔ پہلی بار ایسی مسرتیں حاصل ہورہی تھیں جو اسے پَر کے بغیر پرواز کرارہی تھیں۔ وہ اپنے بیڈروم کے باہر کی تمام دنیا بھلا چکی تھی۔

محل میں کام کرنے والے دس ملازمین حسبِ معمول صبح آئے تھے اور شام کو چلے گئے تھے۔ خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ وسیم کی آغوش میں لپٹی ہوئی تھی۔ دونوں بہت ہی دھیمی سرگوشی میں بڑے پیار سے کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔

پھر وہ فوراً ہی الگ ہوکر اٹھ بیٹھے۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وسیم اسٹور روم میں جانے کے لیے بیڈ سے اتر گیا۔ پھر رک گیا۔ دوسری بار دستک کی آواز کے ساتھ بیگم داؤد کی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

سارہ نے دروازے کے قریب آکر پوچھا۔ ”کیا ملازم جاچکے ہیں؟“

”ہاں۔ اب کوئی نہیں ہے۔“

”کیا خواجہ سرا بھی جاچکے ہیں؟“

”ہاں۔ صرف ایک ہے۔ ایک گھنٹا پہلے بیرونی دروازے کے باہر کھڑا فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔“

”مام! وہ ادھر آسکتا ہے۔“

”نہیں آئے گا۔ میں نے تم دونوں کے لیے اسپیشل ڈشیں تیار کرائی ہیں۔ دروازہ کھولو۔ میں ٹرالی اندر کروں گی۔“

اس نے اتنا ہی دروازہ کھولا کہ ٹرالی اندر آجائے۔ بیگم داؤد نے وسیم کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے آئی پھر اسی طرح باہر چلی گئی۔ سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کردیا۔ ٹرالی سے لذیذ پکوان کی اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ کرسیاں لے کر ٹرالی کے اطراف بیٹھ گئے۔

سارہ نے کھانے کے دوران کہا۔ ”مام نے ہماری شادی کی خوشی میں بہترین کھانا تیار کرایا ہے۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”بڑی دیر سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ کبھی کبھی میری بھی دائیں یا بائیں آنکھ پھڑکتی ہے۔“

”میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جب بھی میری بائیں آنکھ پھڑکتی ہے کوئی مصیبت ضرور آتی ہے۔“

”خواہ مخواہ ڈرانے والی باتیں نہ کرو۔ کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔ یہ دقیانوسی باتیں ہیں کہ آنکھ پھڑکنے سے کچھ

اچھا یا برا ہوتا ہے۔“

انہوں نے ٹی وی اونچی آواز میں آن رکھا تھا تاکہ ان کی آواز دبی رہے، باہر نہ جائے۔ سارہ نے کہا۔ ”میں نے مام کی زبان سے سنا تھا، پرانے چھپے ہوئے گناہ گاروں کو چھپ کر گناہ کرنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ دراصل کسی کو چوری چھپے حاصل کرو تو وہ بڑی پُراسرار بڑی پرکشش لگتی ہے۔ آئندہ بھی اسی طرح اسے حاصل کرنے کو جی چاہتا ہے۔“

وسیم نے کہا۔ ”ہم گناہ گار نہیں ہیں۔ اس کے باوجود چھپ کر مل رہے ہیں۔ تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟“

”بہت اچھا لگ رہا ہے۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔ بڑے سسپنس کے ساتھ رومانس ہورہا ہے۔“

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے چونک گئے، گھبرا گئے... جیسے کوئی آگیا ہو۔

کوئی نہیں آیا تھا۔ فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔ سارہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ سسپنس اور رومانس مزہ دے رہے تھے اور کلیجا بھی دھڑکا رہے تھے۔

اس نے فون کا بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ ”ہیلو...“

دوسری طرف سے ماں کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”سارہ! تمہارے پاپا اچانک آگئے ہیں۔ میں نے بالکونی سے دیکھا ہے۔ وہ اپنی کار ڈرائیو کرتے ہوئے بڑے گیٹ سے اندر آئے ہیں۔ سنبھل جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔“

اب اسے معلوم ہوا کہ ہوش کیسے اڑتے ہیں؟ اس نے بوکھلا کر وسیم کو دیکھا۔ اگر دھیمی آواز میں چیخ سکتے ہیں تو وہ چیخ کر بولی۔ ”وہ آگئے ہیں... پاپا آگئے ہیں۔ بھاگو... مم... میرا مطلب ہے... وہاں جاکر چھپ جاؤ۔“

وہ دونوں دوڑتے ہوئے باتھ روم میں آئے۔ وسیم دروازہ کھول کر اسٹور روم میں جانے لگا تو وہ بولی۔ ”چپ رہنا۔ کوئی آہٹ بھی نہ ہو۔ جب تک میں یہ نہ بولوں کہ میں تمہاری شریکِ حیات ہوں، تب تک دروازہ نہ کھولنا۔“

وہ وہاں بند ہوگیا۔ وہ دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔ بیڈ پر ادھر اُدھر دیکھا۔ کہیں وسیم کی موجودگی کا کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔ شبے میں مبتلا کرنے والی شکنیں بستر پر نہیں تھیں۔ محبوب کے سر سے ٹوٹا ہوا ایک بال بھی نہیں تھا۔ دل یقین سے کہہ رہا تھا کہ باپ چوری نہیں پکڑے گا۔

اس نے ٹرالی کے پاس آکر وسیم کے جھوٹے برتن کو ٹشو پیپر سے صاف کیا پھر دروازے کے لاک کو اندر سے ہٹا دیا۔ چھ خواجہ سرا اور دس سیکیورٹی گارڈز داؤد کے ساتھ اندر آگئے

پیانو

ایک شادی شدہ جوڑا ہنی مون کے لیے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کے لیے ائرپورٹ پر پہنچا تو دلہن نے اپنے شوہر سے کہا۔ ”کاش ہم اپنا پیانو بھی ساتھ لے آتے۔“

”پیانو؟“ شوہر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھلا پیانو ساتھ لانے کی کیا تک ہے؟“

”جہاز کے ٹکٹ پیانو پر رکھے ہوئے تھے۔“ دلہن نے جواب دیا۔

تھے اور بڑی تیزی سے محل کے ہر حصے کو میں کھنگال رہے تھے۔

داؤد غصہ برداشت نہیں کرپارہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا سیدھا بیٹی کے کمرے کے سامنے آیا۔ پھر اس نے دروازے کو ایک لات ماری۔ وہ ایک جھٹکے سے پوری طرح کھل گیا۔ سارہ سہم کر سانس لینا بھول گئی۔ باپ کے اس انداز نے سمجھا دیا تھا کہ وہ دشمن بن کر آیا ہے۔

وہ اندر آتے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر گرجتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا فون کہاں ہے؟ مجھے دو۔“

فون کے مطالبے نے اسے مزید سمجھا دیا کہ بات بگڑ چکی ہے۔ بھید کھلنے والا ہے۔ وہ بوکھلا کر فون کو ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگی۔ وہ پھر گرجنے لگا۔ ”کہاں ہے فون؟ کم آن گیو اٹ ٹو می۔ ہری اپ۔“

فون کھانے کی ٹرالی پر رکھا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ادھر گئی پھر اسے اٹھا کر لے آئی۔ داؤد نے اسے جھپٹنے کے انداز میں لیا پھر کہا۔ ”وہ کتا اسی فون سے بول رہا تھا۔ کہاں ہے وہ؟“

بیگم داؤد بھی وہاں آگئی تھی۔ دروازے پر رک کر باپ بیٹی کی باتیں سن رہی تھی۔ سارہ ذرا حوصلے سے بولی۔ ”پاپا! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آتے ہی بیٹی کو غصہ دکھا رہے ہیں۔ کوئی کتا میرے فون سے کیسے بولے گا؟“

”میں اُس کتے کی بات کررہا ہوں جو وسیمہ بن کر یہاں آیا تھا۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے، یہیں اسی محل میں ہے اور تمہارا فون استعمال کررہا ہے۔“

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا اس نے میرے اس فون سے آپ سے بات کی ہے؟“

”ہاں۔ وہ ہماری ایک جاسوس کو اپنی سسٹر سمجھ کر بول رہا تھا۔“

سارہ نے کہا۔ ”او گاڈ! وہ میرے فون کی سم استعمال کررہا ہے۔ میں نے کل آپ کے جانے کے بعد سم بدل دی

www.pkdigest.com

تھی۔ پرانی ہم کو پانچ ہزار دینار کے ساتھ تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ سوچا تھا کسی وقت اسے دراز میں رکھ دوں گی۔"

پھر اس نے ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر کہا۔ "رات کو سونے سے پہلے تکیہ ہٹایا تو یہاں ہم اور نقد رقم نہیں تھی۔ میں نے یہ بات ماں کو بتائی تھی۔"

بیگم نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔ "میں نے سوچا، سارہ کہیں رکھ کر بھول گئی ہے۔ ہم نے الماری کی، ٹی وی ٹرالی کی اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں میں دیکھا تھا۔ نہ وہ ہم ملی اور نہ دینار۔"

سارہ نے کہا۔ "یہی بات سمجھ میں آئی کہ وہ فرار ہونے والا ہم سمیت رقم لے گیا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "ہم نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے کال کی تھی لیکن فون انگیج جا رہا تھا۔ پھر سوچا کہ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ آپ آئیں گے تو یہ بات بتا دیں گے۔"

تین خواجہ سرا اندر آ گئے تھے۔ وہ بیڈ کے نیچے، الماری کے پیچھے دیکھنے کے بعد اسٹور روم اور باتھ روم میں گئے۔ وہ پہلے بھی وہاں جا چکے تھے۔ اسٹور روم کے بڑے بڑے بھاری سامان نے پھر یہی سمجھایا کہ کوئی پہلوان بھی اکیلا انہیں ہٹا کر ان کے پیچھے نہیں جا سکتا اور باتھ روم سے کھلنے والا دروازہ ہمیشہ اندر سے بند رہتا ہے۔

داؤد نے جھنجلا کر ان خسروں سے کہا۔ "نکلو یہاں سے... میرے ساتھ آؤ۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کس راستے سے فرار ہوا ہے۔"

وہ ان کے ساتھ محل سے باہر آ گیا۔ سیکیورٹی افسر اور دوسرے گارڈز بھی ساتھ ہو گئے تھے۔ ہر سمت احاطے میں بلب روشن تھے۔ دور تک دیکھنے کے لیے سرچ لائٹس بھی تھیں۔ سیکیورٹی افسر داؤد کو بتا رہا تھا کہ گارڈز دو دو کی ٹولی بنا کر احاطے کی دیواروں کے ساتھ چلتے رہتے ہیں اور دوسری طرف سے دوسرے گارڈز آتے ہوئے انہیں کراس کرتے رہتے ہیں۔

پھر یہ کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے چھوٹی وی اسکرینز پر محل کے اندر اور باہر کا منظر دیکھا جاتا ہے۔

ان کے لیے حیرانی کی بات یہ تھی کہ وسیم دن کی روشنی میں فرار ہوا تھا۔ احاطے کی دیواروں کے ساتھ کئی گھنے درخت تھے۔ یہی رائے قائم کی گئی تھی کہ وہ گارڈز سے نظریں بچا کر کسی درخت کے ذریعے اونچی دیواروں کے پار گیا ہوگا۔

سارہ نے ہم کے چوری ہونے کی بات جس انداز میں بتائی تھی، وہ بن گئی تھی۔ داؤد کا یہ شبہ دور ہو گیا کہ بیٹی نے اسے چھپا کر رکھا ہے۔ اب وہ اس کی خواب گاہ کی طرف آنے والا نہیں تھا۔ بیگم داؤد کے اسٹور روم، باتھ روم اور بیڈ روم میں بھی اسے تلاش کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ نظر نہیں آ رہا تھا، ایک کانٹے کی طرح دماغ سے نکل گیا تھا مگر پھانس کی طرح کھٹک رہا تھا۔

وہ مطمئن ہونے کے باوجود غیر شعوری طور پر الجھا ہوا تھا۔ کیا کرتا....؟ کانٹا آسانی سے نکل جاتا ہے، پھانس نکلنے کا نام نہیں لیتی۔

وہ حرم سرا کے عیش کدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس رات وہاں صرف شراب تھی، پی کر بہکنے کا سامان نہیں تھا۔ پھانس نکالنے والی نہ کوئی تھی، نہ کوئی تھا۔ وہ ڈنر سے پہلے وائن پیتا تھا۔ اس نے ایک گلاس بنا کر ابو ولاد سے فون پر کہا۔ "میں خالی بیٹھا ہوں۔ کوئی اچھی چیز بھیجو۔"

اس نے کہا۔ "سر! میرے اڈے پر گولیاں چل رہی ہیں۔ میں وہاں سے بہت دور ہوں۔ ابھی تو کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد کچھ کر سکا تو کال کروں گا۔"

اس نے لعنت بھیج کر فون بند کر دیا۔ وہ باہر کی مصروفیات سے فراغت کے بعد محل میں آ کر راتیں رنگین کرنے کا عادی تھا، تب ہی اس کی تھکن دور ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وسیم پکڑا جائے گا تو اسے باندھ کر اس کی مرمت بھی کرے گا اور خرمستیاں بھی کرتا رہے گا۔ ہر رات اس سے انتقام لیتے رہے گا۔ جب بیزار ہو جائے گا تو اسے گولی مار کر کہیں پھنکوا دے گا۔

مگر حسرت ہی رہ گئی۔ وہ ہاتھ کیا آتا، نظر تک نہیں آیا۔ رت جگا منانے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ بیگم داؤد رات کا کھانا ٹرالی میں لے کر آئی اور کہا۔ "آج تو اس عیش کدے میں کوئی نہیں ہے۔ کیا میں آپ کے ساتھ بیٹھ کر کھا سکتی ہوں؟"

"ہاں... بیٹھو۔ آج میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔ سارہ کو بھی بلا لو۔"

"آپ بیٹی کو کبھی حرم سرا میں آنے نہیں دیتے، اسے نہ بلائیں۔ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے۔ وہ کھانے کے بعد سو گئی ہے۔"

وہ پینے کے دوران تھوڑا بہت کھاتا رہتا تھا۔ پیٹ میں خوراک سے زیادہ شراب جاتی..... تھی۔ اس نے نشہ تیز کرنے کے لیے بیگم سے کہا۔ "بلیک لیبل کی کوئی بوتل کھولو اور پیگ بناؤ۔"

بیگم نے حکم کی تعمیل کی۔ بہت عرصے بعد اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہوئے ساقی کا فرض ادا کرنے لگی۔ اس کے اندر ہمکنے والے جذبات کہہ رہے تھے کہ شاید مجازی خدا آج مہربان ہوگا۔

وہ پی رہا تھا اور برائے نام کھا رہا تھا۔ بیگم نے پوچھا۔ "آج آپ کی رات کیسے گزرے گی؟"

داؤد نے تیسرا پیگ ختم کر کے اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ "اور دو... میں اتنا پیوں گا کہ کسی کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ میں مدہوش ہو جاؤں گا۔ نہ کوئی ہوگی، نہ نظر آئے گی۔ رات گزر جائے گی۔"

وہ ایک حساس عورت تھی۔ اپنی توہین برداشت کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا میں آپ کو بھی نظر نہیں آؤں گی؟"

اس نے ہنستے ہوئے چوتھے پیگ کو منہ سے لگایا۔ پھر دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "جس طرح بڑھاپے کے لیے سرمایہ بچا کر رکھا جاتا ہے، اسی طرح تمہیں سنبھال کر رکھا ہے۔ تم بڑھاپے میں کام آؤ گی۔"

اس نے جام خالی کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے تھوڑی تھوڑی سی چھلک رہی ہو۔ یہ شراب کا کرشمہ ہو سکتا ہے۔ چلو اور پلاؤ۔"

پانچواں گلاس بھر گیا پھر خالی ہو گیا۔ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ "یہ شراب بھی کیا جادو دکھاتی ہے؟ سوکھے تنکے کو چمکا دیتی ہے۔ ارے میری جان! تم تو چمک رہی ہو۔"

بیگم پوری چمک دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے خالی گلاس کو بھر دیا۔ وہ اسے ایسے چھو رہا تھا جیسے پہلی بار دریافت کر رہا ہو۔ اس نے قریب ہو کر گلاس پیش کیا۔ بے چاری اٹھارہ برسوں کے بعد جذبات سے کانپ رہی تھی۔ اس نے گلاس لیا پھر دو گھونٹ پینے کے بعد اسے پکڑنے لگا۔ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔ "ارے! تم تو قیامت ہو۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ سالی بیگم آ کر بیٹھی ہے۔ لعنت ہے... کہاں تم اور کہاں وہ...؟"

وہ نشے میں بہک رہا تھا۔ شریک حیات پر لعنت بھیج رہا تھا۔ عورت اپنی توہین برداشت نہیں کرتی لیکن وہ اس امید پر برداشت کر رہی تھی کہ برسوں کی آگ بجھائے گا۔ گالی دے کر ہی سہی، وہ اس کی تنہائی کو آباد کرے گا۔

اور ایسا ہو رہا تھا۔ اسے کھویا ہوا سہاگ مل رہا تھا۔ اگرچہ وہ نشے میں کسی اور سے بہل رہا تھا لیکن وہ پورے ہوش و حواس میں اپنے شوہر کو پا رہی تھی۔

کوئی کتنا ہی بدنصیب کیوں نہ ہو، کبھی نہ کبھی اس کے دن پھرتے ہیں۔ بیگم داؤد کی رات پھر آئی تھی۔ وہ سوچ رہی

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المسلم دار الحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

تھی' کیا کرے؟ اسے کیسے دیوانہ کردے کہ یہ رات بار بار آتی رہے؟

پھر وہ اچانک ہی گڑبڑا گئی اور پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ... یہ کیا کر رہے ہیں؟''

نشے کے باعث زبان میں لکنت آگئی تھی۔ وہ بولا۔ ''وہی کر رہا ہوں جو میرا دل چاہتا ہے۔''

''میں لعنت بھیجتی ہوں ایسے شوق پر۔''

تڑاخ کی آواز کے ساتھ منہ پر طمانچہ پڑا۔ ''سالی! چپ کر...''

''نہیں۔ میں چپ نہیں رہوں گی۔ یہ خلافِ فطرت ہے۔ یہ ازدواجی محبت نہیں ہے۔ وحشت ہے... حیوانیت ہے۔''

وہ اسے مار رہا تھا۔ اسے زیر کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''خدا سے ڈرو۔ اٹھارہ برسوں کے بعد آئے ہو۔ میں انسان ہوں۔ میرے جذبات کو سمجھو۔ مجھے وسیمہ نہ سمجھو۔''

پھر ایک الٹا ہاتھ منہ پر پڑا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ''وہ کتا تھا۔ بھاگ گیا۔ تو وسیم ہے... تو نے بہت دوڑایا ہے۔ تجھے تو میں نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ دروازہ وہ کل بند کرکے جاتا تو کبھی بھاگ نہ پاتا۔ اب کہاں جائے گا... بول؟''

وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''مجھے بھاگنا ہوتا تو برسوں پہلے طلاق لے لیتی۔ لیکن کیا کروں؟ یہاں جیسے گزر رہی ہے' ویسے گزار رہی ہوں۔''

وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''جو بھی نیا وسیم آتا ہے' اسی طرح دوڑاتا ہے۔ بڑا مزہ آتا ہے۔''

وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے سنبھل گیا۔ بیگم نے ایک گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اور پیتے رہیں۔ مدہوش ہو جائیں۔ سو جائیں... یہی بہتر ہے۔ مجھے اپنی بدنصیبی پر رونے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں تو روتی ہی رہوں گی۔''

اس نے گلاس پر ایک ہاتھ مارا۔ وہ دور جا کر دیوار سے ٹکرایا پھر اس کے کئی ٹکڑے دور تک بکھر گئے۔

ایسے ہی وقت بجلی چلی گئی۔ سوئچ بورڈ سے لگی ہوئی چارجر لائٹ آن ہو گئی۔ داؤد نے آگے بڑھ کر اسے دبوچتے ہوئے کہا۔ ''سالے! میری بیٹی کے فون سے بولتا ہے۔ میں تو تیری بولتی بند...''

بیگم داؤد نے ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا۔ ایسے وقت اس کا ہاتھ داؤد کے منہ پر پڑا تو وہ بھنا گیا۔ ''کتے! تو نے مجھے طمانچہ مارا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

اس نے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا۔ شراب چڑھ گئی تھی۔ کھوپڑی الٹا رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں وہ نہیں ہوں۔ آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ اسے ہٹائیں۔ گولی چل جائے گی۔''

''نہیں چلے گی۔ جو کہتا ہوں وہ کر...''

وہ دروازے کی طرف بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر بولا۔ ''میں سیکیورٹی گارڈز کی طرح اندھا نہیں ہوں۔ تجھے بھاگنے نہیں دوں گا۔''

بیگم نے آگے بڑھ کر اسے دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا کر فرش پر گر پڑا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وسیم اس کے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ ابھی نشے میں حیوان بن رہا ہے' صبح انسان بن جائے گا۔

وہ دروازے کی طرف بھاگنے لگی۔ وہ فرش پر سے اٹھتے اٹھتے پھر ڈگمگا گیا۔ اس نے دوسری بار گرتے ہی ریوالور والا ہاتھ اٹھایا پھر چیخ کر کہا۔ ''پکڑو... یہ پھر بھاگ رہا ہے۔ اسے جانے نہ دو۔''

رات کے سناٹے میں دھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ گولی چلی۔ بیگم داؤد دروازہ کھول چکی تھی۔ اسی وقت اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ منہ کھل گیا' دیدے پھیل گئے۔ پھر وہ دروازے سے لگ کر بیٹھے بیٹھے فرش پر چاروں شانے چت ہو گئی۔

وہ اُدھر پڑی تھی' یہ اِدھر پڑا تھا۔ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے شیر مارا ہو۔ نشہ اس قدر حاوی تھا کہ فرش پر سے اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ پھر اس کے فون سے کالنگ ٹون چیخنے لگی۔ ''کون ہے؟''

وہ اپنے لباس کو ٹٹولنے لگا۔ پھر فون کو پا کر بولا۔ ''سالا! یہ چیخ رہا ہے۔''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے پرسنل خسرے گارڈ کی آواز سنائی دی۔ ''سر! ہم نے فائر کی آواز سنی ہے۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟''

وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ''وہ کتا بھاگ رہا تھا۔ میں نے اسے ٹھائیں کر دیا ہے۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ۔''

خسرے گارڈ نے فون بند کر دیا۔ اس کے پاس مقفل دروازے کی ایک چابی رہتی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر کئی سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ اندر آیا۔ وہ سب حرم سرا میں آئے۔ پھر بیگم کی خون آلود لاش دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

سیکیورٹی افسر اور کئی گارڈز داؤد کے پاس آئے۔ وہ فرش پر سے اٹھ رہا تھا۔ دو گارڈز نے اسے سہارا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اس کتے کی لاش کو کہیں دور لے جا کر پھینک دو۔''

سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ''سر! آپ نے اپنی وائف کا مرڈر کیا ہے۔''

''آں...؟''

اس نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے دیکھا۔ آنکھیں میچ کر کھولیں۔ سر جھٹک کر دیکھا۔ حیران ہو کر کہا۔ ''یہ تو میری بیوی ہے... وہ کہاں ہے؟''

ایک خسرو گارڈ فریج کھول کر لیمن جوس نکال کر لایا۔ اسے پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! اسے پی لیں۔ ہوش میں آئیں۔ معاملہ سنگین ہے۔ ہمیں بتائیں' کیا کرنا ہے؟''

وہ لیمن جوس کا بھرا ہوا گلاس منہ سے لگا کر پینے لگا۔ کچھ سمجھ آرہی تھی کہ معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے۔ یہ یاد آرہا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے بیگم سے ہاتھا پائی ہو رہی تھی۔

اس نے گلاس خالی کرکے آنکھیں بند کرلیں۔ حاضر دماغ رہنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے دوسرا گلاس پیش کیا گیا۔ وہ اسے بھی پینے لگا۔ سیکیورٹی افسر اور تمام گارڈز اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔

اس نے دوسرا گلاس خالی کرنے کے بعد کہا۔ ''اس مرڈر کی ہسٹری بناؤ۔ دہشت گردوں نے حملہ کیا تھا۔ وہ محل میں گھس آئے تھے۔ ایسے وقت بجلی گئی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں میری وائف ماری گئی۔ سارہ کو بھی یہی معلوم ہونا چاہیے۔''

سارہ بند کمرے میں وسیم کے ساتھ تھی۔ انہوں نے فائر کی آواز سنی تھی۔ ایک ذرا سی الجھن ہوئی کہ محل کے اندر گولی کیوں چلی ہے؟ کس نے چلائی ہے؟

رات کے سناٹے میں محل کے فرش پر بھاری بھرکم جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ وہ بولی۔ ''وسیم! اٹھو... اسٹور روم میں جاؤ۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ شاید پاپا ادھر آئیں گے۔''

وہ چھپنے کے لیے اسٹور روم میں چلا گیا۔ سارہ اپنی مام سے معلوم کرسکتی تھی کہ محل میں کیا ہو رہا ہے؟ اس نے بیگم داؤد کا فون نمبر پنچ کیا۔ رابطہ ہونے پر دوسری طرف سے بیل کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ فون بیگم داؤد کے بیڈ روم میں تھا۔ وہاں کوئی اسے اٹینڈ کرنے والا نہیں تھا۔

سارہ نے فون بند کر دیا۔ اسی وقت مسلسل فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ بیگم کی مرڈر ہسٹری کے مطابق دہشت گرد محل میں گھس آئے تھے۔ وہاں کی دیواروں' دروازوں' کھڑکیوں اور الماریوں پر گولیوں کے نشانات ثابت کرنے والے تھے کہ محل میں حملہ ہوا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر فائرنگ ہو رہی تھی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقت گزر گیا۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ایک خسرے گارڈ نے پوچھا۔ ''آپ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں۔ خیریت سے ہوں۔ یہ گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟''

''دہشت گرد محل میں گھس آئے تھے۔ ہم نے انہیں مار بھگایا ہے۔ لیکن...''

اس نے پوچھا۔ ''لیکن کیا...؟''

''آپ دیکھ رہی ہیں' ہر طرف اندھیرا ہے۔ آپ کی مام فائرنگ کی زد میں آگئیں۔''

سارہ نے تڑپ کر پوچھا۔ ''کہاں ہیں میری مام...؟''

خسرے گارڈ نے اناللہ... پڑھا۔ وہ چیختی ہوئی دروازہ کھولتی ہوئی باہر آئی۔ گارڈ نے اسے چارجر لائٹ کی روشنی میں وہاں پہنچادیا۔ اس نے ماں کی خون آلود لاش دیکھی پھر فرش پر گر کر اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

☆☆☆

یاقوت نے کبھی اُدھر سے گزرتے ہوئے راہباؤں کے اس مسکن کو دیکھا تھا۔ پہلی بار وہ قریب آئی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر اس کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔

وہ کانونٹ چھوٹے سے پہاڑی ٹیلے کی اونچائی پر تھا۔ شہری آبادی سے دور' دنیا سے الگ تھلگ لگتا تھا۔ وہ ایک راہبہ میریا کے ساتھ چلتی ہوئی دائیں بائیں سر گھماتے ہوئے اس اجنبی پُراسرار ماحول کو دیکھ رہی تھی۔ پناہ لینے کے لیے ایک نئی دنیا میں آگئی تھی۔

ایک صدی سے کچھ پہلے مشرقِ وسطیٰ میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے وہ وسیع و عریض چار دیواری تعمیر کی گئی تھی۔ وہاں دینی قواعد و ضوابط پر بڑی سختی سے عمل کرایا جاتا تھا۔ طریقۂ عبادت کے مطابق روحانی مشقوں کے علاوہ سخت احاطہ بندی تھی۔ کوئی نن اس عمارت کے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی اور کوئی مرد باہر سے جھانک بھی نہیں سکتا تھا۔

وہاں مراقبہ' نفس کشی' یوگا اور خاموشی لازمی تھی۔ راہباؤں کو آپس میں بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی اہم معاملے میں وہ مدر سے رجوع کرتی تھیں۔ مدر کے علاوہ ایک فادر اور ایک راہب تھا جو زندگی کی ضروریات کا تمام سامان کانونٹ میں لاتا تھا۔

وہ جس راہبہ کے ساتھ آئی تھی' اس کا نام کبھی جمائمہ تھا۔ اب وہ میریا ہو گئی تھی۔ مذہب بدل گیا تھا۔ یاقوت کی بھی دین دنیا اور نام بدلنے والا تھا۔

www.pkdigest.com

ایک آفس میں مدر مارتھا دو راہباؤں کو وہاں کے کسی معاملے میں ہدایات دے رہی تھی۔ میریا نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا۔ ''مدر! یہ وہی لڑکی ہے۔''

ریڈ کراس سوسائٹی کے ایک ایجنٹ نے مدر کو یاقوت کے متعلق پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ حالات کی ستائی ہوئی لڑکی ہے۔ دل سے عیسائیت قبول کر کے وہاں کے قوانین اور اصولوں کے مطابق زندگی گزارے گی۔

مدر نے یاقوت پر ایک نظر ڈالی پھر اس کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ زیادہ نہیں بولتی تھی۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ اس نے پیچھے آ کر جو کام کیا' وہ بالکل ہی یاقوت کی توقع کے خلاف تھا۔

اس نے ''کھچاک'' کی آواز کے ساتھ ہی قینچی کے چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی ریشمی زلفیں کٹنے اور چھوٹی ہونے لگیں۔ کلیجے سے ''ہائے'' نکلی۔ اُسے یاد آیا' اس کے محبوب حارث نے ریشمی گھنی زلفوں میں ڈوب کر پہلی بار اس کی گردن کا بوسہ لیا تھا۔

اب اسے یاد آ رہا تھا کہ نن بننے والی عورتوں کے سر پر بال نہیں رہتے یا پھر ناخن برابر رہتے ہیں۔ وہاں کانونٹ میں آئینہ نہیں تھا۔ ورنہ وہ دیکھتی کہ کالے بادلوں کے چھٹنے کے بعد چاند سا مکھڑا کیسا اُبلے ہوئے انڈے جیسا لگے گا؟

اسے وہاں کا مخصوص لباس پہننے کے لیے دیا گیا۔ وہ لباس چرچ میں موجود باقی تمام چیزوں کی طرح صدیوں کی روایات کے مطابق تھا۔ ایک ڈھیلا ڈھالا سوتی لبادہ' چوڑی آستینیں جن میں انگلیوں اور ہتھیلیوں کو چھپا کر رکھنا پڑتا تھا۔

مدر نے ہدایات دیں۔ ''تمہیں اپنا سر جھکا کر چلنا ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کو لباس کے اندر رکھو۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاؤ۔ آہستہ چلو۔ کبھی کسی سسٹر سے نظریں نہ ملاؤ۔ نہ کسی سے بولو نہ کسی کی سنو۔ تمہارے کان صرف خدا کے الفاظ سننے کے لیے ہیں۔''

اس نے سر جھکا کر کہا۔ ''جی معزز مدر!''

''جو یہاں آتی ہیں' وہ دوسروں کے ساتھ رہنے نہیں آتیں۔ خدا کی تلاش میں آتی ہیں اور اس کو پانے کے لیے ...... تنہائی بہت ضروری ہے۔''

''جی معزز مدر!''

''تمہیں ہمیشہ آنکھوں کی خاموشی کا پابند رہنا ہوگا۔ دوسروں کی آنکھوں میں جھانکنے سے تمہارے دماغ میں بیکار تصورات جنم لیں گے جو تمہاری توجہ کو منتشر کریں گے۔''

''جی معزز مدر!''

''جو سب سے پہلا سبق تم یہاں سیکھو گی' وہ ماضی کے ہر تصور کو دماغ سے نکال پھینکنا ہے۔ خود کو اپنی چاہت اور اپنی محبت سے باز رکھنے کے لیے اپنا احتساب کرو اور توبہ کرتی رہو۔ تمہیں اپنے احساسات اور جذبات سے جنگ لڑنی ہوگی۔''

''جی ہولی مدر!''

''ہر نن خاموش اور تنہا رہتی ہے۔ ایسے جیسے وہ جنت میں پہنچ چکی ہو۔ اس شفاف اور نایاب خاموشی میں جس کی وہ بھوکی ہوتی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ لامتناہی خاموشی کو سن سکے اور خدا کو پالے۔''

وہ بظاہر اس کی ہدایات کو تسلیم کر رہی تھی اور دل ہی دل میں بیزار ہو رہی تھی۔ اسے بیزاری کے باوجود وہاں کی ایک کال کوٹھری جیسے کمرے میں رہنا تھا۔ اس کمرے میں سونے کے لیے تخت اور بیٹھنے کے لیے سیدھی پشت کی ایک کرسی تھی۔ ایک چھوٹا سا ٹب' مگ اور صابن ایک کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ وہاں کسی نن کو کسی دوسری نن کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ قید خانہ اس لحاظ سے اہم اور اطمینان بخش تھا کہ وہاں عورتیں محفوظ تھیں۔ پورے عراق میں قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ وہاں کوئی انہیں چھونے کے لیے بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وحشیوں کی بستی میں آبرو کا سرمایہ محفوظ تھا۔

1979ء میں جب صدام حسین صدر کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آیا تو سیاسی حالات ابتر ہونے لگے۔ اس پہلو پر کسی نے توجہ نہیں دی کہ اس دور سے کانونٹ میں نن بننے والی عورتوں کا اضافہ ہوتا آ رہا ہے۔ ایسی عورتوں کا اضافہ جو پہلے مسلمان تھیں۔

اس تلخ حقیقت کا پس منظر یہ ہے کہ اس دور میں ہر سو صدام حسین کے مخالفین تھے۔ شمال میں کرد قوم اپنے جائز حقوق کے مطالبات کر رہی تھی جنہیں تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا۔ جنوبی علاقوں میں اس کی مخالفت کرنے والے شیعہ غالب اکثریت میں تھے۔

ایسے وقت اس نے اسلامی جمہوریہ ایران سے جنگ چھیڑ کر بہت بڑی سیاسی غلطی کی۔ 1980ء میں جنگ شروع کی گئی اور 1982ء میں عرضِ ایران سے شکست کھا کر واپس آنا پڑا۔

پھر اس نے 1990ء میں کویت پر حملہ کر کے دوسری بڑی سیاسی غلطی کی۔ اسے ایک سال کے اندر ہی فتح کے باوجود شکست تسلیم کرنی پڑی۔ اس دوران وہ اقتصادی اور

عسکری طور پر کمزور ہوتا گیا۔ عوامی سطح پر بیروزگاری' غربت اور محتاجی بڑھتی گئی۔ ریڈ کراس ٹیم کے ایجنٹ مسلمان تعلیم یافتہ، آفت زدہ عورتوں کو روٹی' کپڑے اور نئی زندگی کے عوض عیسائیت کی طرف مائل کرنے لگے۔

2003ء میں امریکا' برطانیہ اور یورپ کے دیگر اتحادیوں نے عراق پر حملہ کیا تو ملک میں اقتصادی بدحالی اور بیروزگاری کے باعث قتل و غارت گری' ڈکیتی' اغوا' ٹارگٹ کلنگ اور خودکش حملوں میں اضافہ ہو گیا... جیسے قیامت آ گئی ہو' آخری وقت ہو اور یہ قیامت پورے عراق کو نابود کر کے ہی جائے گی۔

عراق میں جو طوائف الملوکی رہی، اس کے نتیجے میں جرائم کی تعداد بڑھی۔ لڑکےلڑکوں کی خرید و فروخت اور بے حیائی کے کام جاری رہے۔ ان حالات میں بھوک سے' موت سے اور گناہوں سے بچنے والوں کے لیے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ عیسائیت کی چھاؤں میں چلے آئیں۔

جہاں یاقوت پہنچی' وہاں ایسی ہی مسلمان عراقی عورتیں تھیں جو اب مسلمان نہیں رہی تھیں۔ جیسا کہ وہ دیکھ رہی تھی' وہ دین سے بھٹکی تھیں لیکن ان سب کی شرم و حیا سلامت تھی۔

کانونٹ میں وہ پہلی رات تھی۔ وہ نیم تاریکی میں لکڑی کے تخت پر بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی۔ حارث بھی ایسی ہی کال کوٹھری میں ہوگا۔ اسے سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ وہ وہاں زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہوگا اور میں یہاں نئی زندگی کا ہاتھ تھامنے آئی ہوں۔

'ہم پیار کرنے والوں کا یہ نصیب کیسا ہے؟ ہم زیادہ کچھ نہیں چاہتے۔ پیار کرنے کے لیے صرف کھلی فضا اور آزادی کی آرزو ہے۔ اتنی سی آرزو پوری نہیں ہوتی۔

'ہمارے مجاہدین کہہ رہے تھے۔ حارث، دی لائن آف اللہ بریگیڈ کا ایک فولادی ستون ہے۔ اسے مرنے نہیں دیں گے۔ دشمنوں کو سزائے موت پر عمل نہیں کرنے دیں گے۔ اسے زنداں سے نکال لانے کے لیے جان کی بازی لگا دیں گے۔'

وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی۔ ''یا خدا! مجاہدین کے عزائم پورے کر دے۔ وہ زندہ سلامت آئے گا تو میں خوشی سے مر جاؤں گی۔ بے شک... میں مر جاؤں میرے معبود... اسے زندہ رہنے دے۔''

وہ سوچ رہی تھی اور کروٹیں بدل رہی تھی۔ پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کیا۔ ایک ہلکی سی کھٹ کی آواز سنائی دی.... رات کو دس بجے کے بعد لائٹ آن رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ پورے کانونٹ میں گہری تاریکی چھا جاتی تھی۔ تمام کوٹھریاں اور دفتری کمرے کی لائٹیں بجھ جاتی تھیں۔

وہ گہری تاریکی میں تھی۔ اس نے سرہانے ہاتھ بڑھا کر ایک سوئچ کے بٹن کو دبایا۔ زیرو پاور کی دھیمی سی روشنی ہوگئی۔ اس نے اُدھر دیکھا۔ اس دروازے پر ایک ہتھیلی بھر کی چھوٹی سی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس کے چھوٹے سے پٹ کو کھول کر دیکھا جاتا تھا کہ کون آیا ہے؟

زیرو پاور کی پُراسرار روشنی دروازے کے نچلے حصے سے باہر گئی ہوگی۔ آنے والے کو معلوم ہوگیا کہ کال کوٹھری والی جاگ رہی ہے۔ باہر سے پھر ایک کھٹ کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں کے اصول کتنے سخت ہیں۔ ایک نن کو دوسری نن سے بات کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ کوئی کسی کے دروازے پر نہیں آتی تھی پھر اتنی رات کو کون آیا تھا؟

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے پاس آئی۔ پھر اس نے اپنی انگلی سے دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد جواباً ویسی ہی دستک سنائی دی۔ یہ یقین ہوا کہ باہر کوئی ہے۔

وہاں کسی سے ملنے اور بات کرنے پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انہوں نے دل سے عیسائی مذہب قبول نہیں کیا ہے۔ خدا اور ابنِ مریم سے منسوب ہونے والے اگر کسی اور سے نسبت رکھیں' اس سے چوری چھپے ملیں تو انہیں سزائیں دینے کے بعد کانونٹ سے باہر پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دروازہ کھولنے کی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی... مگر دیکھنا چاہتی تھی کہ کون آیا ہے اور کیوں آیا ہے؟ یہ معلوم نہ کرتی تو تجسس کے مارے نیند نہ آتی۔ صبح تک جاگتی رہتی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر گہری تاریکی تھی۔ کسی کو دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے سانسوں بھری سرگوشی میں پوچھا۔ ''کون...؟''

فوراً ہی جواب نہ ملا۔ آنے والی ہستی پُراسرار بن رہی تھی۔ وہ اس کے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ اس نے کھڑکی کو بند کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک بھاری بھرکم مردانہ سرگوشی سنائی دی۔ کسی نے اس کا نام لیا۔ ''یاقوت...!''

وہ ایک دم سے گھبرا گئی۔ وہاں کوئی اسے یاقوت کے نام سے نہیں جانتا تھا اور باہر اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ مزید حیرانی اور پریشانی کی بات یہ تھی کہ راہباؤں کی اس چار

www.pkdigest.com

دیواری میں کوئی مرد بول رہا تھا۔

وہ پھر بولا۔ ”ہائے... مفرور لیڈی ڈاکٹر...!“

یہ بات تو جیسے دھماکا تھی۔ وہ نام تو جانتا ہی تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آرمی اسپتال سے فرار ہونے والی لیڈی ڈاکٹر ہے اور یہ بھی جانتا ہوگا کہ اتحادی فوجی اس کے خون کے پیاسے ہیں۔

وہ دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر تیزی سے سوچنے لگی کہ ایسے وقت کیا کرے؟

پھر ایک سرگوشی لہراتی ہوئی آئی۔ ”دروازہ کھولو۔“

اس نے کھڑکی کے باہر تاریکی میں گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“

”نہ تم نام سے جانو گی نہ صورت سے پہچانو گی۔ دروازہ کھولو گی، دوستی ہوگی تو دوستانے سے پہچانو گی۔“

”تم مجھے کیسے جانتے ہو؟“

”میرا دھندا یہی ہے۔ شکاری بو سونگھ کر اس کی پوری ہسٹری معلوم کر لیتا ہوں۔“

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”شکاری کو اندر تو آنے دو۔“

”مجھے دروازہ کھول کر یہاں کے اصول نہیں توڑنے۔“

وہ بھاری بھرکم سرگوشی میں بولا۔ ”کھڑکی کھلتے ہی اصول ٹوٹ گئے۔ دروازہ نہیں کھولو گی تو ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاؤ گی۔ کل صبح تمہاری اصل ہسٹری مدر اور فادر کی میز پر ہوگی۔“

اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ کچھ سوچا پھر پوچھا۔ ”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”تمہارے پاس دینے کے لیے حسن کی دولت ہے۔ اس سے زیادہ نہیں چاہوں گا۔“

یاقوت نے کہا۔ ”اس کانونٹ میں چار مرد ہیں۔ ایک فادر ہیں، ایک کلرجی مین، ایک چرچ وارڈن اور ایک منتظم۔ تم ان میں سے کوئی ہو۔“

”اندازہ نہ کرو۔ دروازہ کھولو۔ مجھے دیکھو اور خود کو دکھاؤ۔“

”پلیز! میں بے حیا بازاری نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو ایک نن کی خشک اور سپاٹ زندگی گزارنے یہاں نہ آتی۔ کسی امیر کبیر کی داشتہ بن کر اس کے حرم میں چھپ کر رہتی۔“

”اپنی پارسائی نہ جتاؤ۔ اگر یہ چاہتی ہو کہ تمہارا بھید نہ کھلے تو دروازہ کھول دو۔“

وہ دروازے سے ذرا دور ہو کر بولی۔ ”تم اچانک آکر شاک پہنچا رہے ہو۔ میں اتنی جلدی تمہاری بات نہیں مانوں گی۔ مجھے سوچنا ہے... کیا یہاں زندگی گزارنے اور دشمنوں سے بچنے کے لیے عزت کو داؤ پر لگانا ہوگا؟“

”تمہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی۔“

”منوانا چاہتے ہو تو کل تک سوچنے اور تمہارے حق میں فیصلہ کرنے کی مہلت دو۔“

”تم مجھے کل تک ٹالنا چاہتی ہو؟“

”یہ خوب سمجھتے ہو کہ میں یہاں سے بھاگنے والی نہیں ہوں۔ تم سے پیچھا چھڑا کر باہر جا کر مرنا نہیں چاہوں گی۔“

وہ سوچنے کے انداز میں بولا۔ ”ہوں... اتنا تو یقین ہے، یہاں سے تم نہیں جا سکو گی۔ کل انکار نہیں کر سکو گی۔ ٹھیک ہے، میں بڑا صابر بندہ ہوں۔ کل آؤں گا۔“

یاقوت نے فوراً ہی ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کو بند کر دیا۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھڑی رہ کر اس کی آہٹ سننا چاہتی تھی لیکن باہر خاموشی رہی۔ وہ کسی طرح کی آہٹ پیدا کیے بغیر گم ہو گیا تھا۔

وہ تخت کے سرے پر آکر بیٹھ گئی۔ اس صاف ستھری پناہ گاہ میں ایک نیا شرمناک مسئلہ، ایک نیا شیطان پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ آف کیا۔ زیرو پاور کی کمزور سی روشنی بجھ گئی۔ گہرا اندھیرا چھا گیا۔

اندھیرا اس کا پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

داؤد محل کی فضا ماتمی تھی۔ کچھ رشتے دار آئے تھے۔ کچھ سرکاری افسران اور ماتحت ملازمین بھی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے حاضر ہو گئے تھے۔ بیگم داؤد کی تدفین ہو چکی تھی۔ شام تک تقریباً سب ہی رخصت ہو گئے۔ دو چار رشتے داروں نے سارہ کی تنہائی دیکھ کر وہاں رہنا چاہا لیکن اس نے کہہ دیا۔ ”میں تنہا رہ کر صرف مام کو یاد کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہ کسی کے ساتھ وقت گزار سکوں گی نہ باتیں کر سکوں گی۔“

داؤد بھی راتوں کو پی کر بدمست ہو جاتا تھا۔ اسے کسی کی موجودگی گوارا نہیں تھی۔ اس نے بھی ان رشتے داروں کو رخصت کر دیا۔ یوں سارہ کو تنہائی میں وسیم کی قربت ملی تو اس کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ نہ ہوتا تو باپ کے سینے سے لگ کر روتی لیکن ماں کی لاش کے پاس اس نے باپ کو نشے کی حالت میں دیکھا تھا۔ اسے صدمہ پہنچا تھا۔ ماں کی میت تدفین کے لیے تیار تھی، تب بھی اس نے باپ کو وہاں نہیں دیکھا۔ زیادہ پینے کے باعث طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کیا تھا۔

سارہ کے لیے یہ اور بھی دکھ کی بات تھی کہ باپ نے اس کی ماں کو آخری آرام گاہ تک نہیں پہنچایا تھا۔ ساری زندگی اپنی شریکِ حیات کو چھوڑ کر خرمستیاں کرتا رہا تھا۔ اسے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آخری وقت قبر میں پھنکوا دیا تھا، خود نہیں گیا تھا۔

وہ وسیم کی آغوش میں چھپ کر روتی رہی۔ ماں سے جتنی قربت رہی، اتنی باپ سے نہیں ہو سکتی تھی۔ نصیب میں وسیم لکھا تھا۔ اس کی قربت مل رہی تھی۔ وہ آنسو پونچھ رہا تھا۔

دوسرے دن چچا کی فیملی لندن سے آئی۔ چچا اور چچی نے سارہ کو گلے لگا کر رسمی طور پر آنسو بہائے۔ اسے پیار کیا پھر ان کا جوان بیٹا جواد اسے گلے لگا کر رونے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔

وہ بولا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ اپنے باپ کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”میں صرف بزرگوں سے ملتی ہوں۔ ہمارے درمیان ذرا فاصلہ رہنا چاہیے۔“

”تم لندن میں تو کھلے دل سے ملتی تھیں۔“

”تب ہم بچے تھے۔“

اس کی چچی نے کہا۔ ”ہم دقیانوسی خیالات رکھنے والے پس ماندہ لوگ نہیں ہیں۔ یہ محرم سے لگنے اور نامحرم سے دور رہنے والی باتیں نہ کرو۔“

چچا نے کہا۔ ”پھر یہ کہ تم تو ہماری ہونے والی بہو ہو۔ بھائی جان نے اس رشتے کے لیے زبان دی ہے۔“

اس نے داؤد سے پوچھا۔ ”کیوں بھائی جان! اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں... مگر یہ وقت ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ تم تعزیت کے لیے آئے ہو۔“

اس نے بیٹی کو اور جواد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”رشتہ ہوگا لیکن شادی سے پہلے میں ان کے درمیان بے تکلفی پسند نہیں کروں گا۔“

چچی نے خوش ہو کر کہا۔ ”آپ نے ہاں کہہ دی، ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکائیں گے۔“

وہ باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آ گئے۔ جواد اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تعزیت کے بہانے اسے پالینا چاہتا تھا لیکن حسرت ہی رہ گئی۔ اسے چھو بھی نہ سکا۔ اور سارہ کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ اسے اپنے قریب پھٹکنے بھی نہیں دے گی۔ اسے وسیم کی فکر تھی۔ وہ بھوکا ہوگا۔ انتظار کر رہا ہوگا۔ وہ ڈائننگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”سوری! میرے کھانے کا وقت بدل گیا ہے۔ میں آدھی رات کے بعد کسی وقت اپنے روم میں ہی کھانا کھاتی ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔“

جواد نے کہا۔ ”ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ہم ایک دن کے لیے آئے ہیں۔ کل چلے جائیں گے۔ کچھ باتیں تو کرو۔“

داؤد نے کہا۔ ”سارہ! بیٹھ جاؤ۔ ابھی سونے کا وقت نہیں ہوا ہے۔“

وہ بیٹھ گئی اور بولی۔ ”میں کل رات سے جاگ رہی ہوں۔ ایسا لگ رہا جیسے مام میرے سرہانے بیٹھی ہیں۔ آج بھی انہیں محسوس کروں گی، ان سے باتیں کروں گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جماہی لی۔ نیند کا بہانہ بھی کیا۔ چچی نے کہا۔ ”بیٹی! تم جاؤ۔ میں تمہارے جذبات سمجھ رہی ہوں۔ نیند آئے تو سو جانا۔ نہ آئے تو مام سے باتیں کرتی رہنا۔ جب میری ماں کا انتقال ہوا تھا تو میں بھی تنہائی میں ان سے بولتی رہتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ سن رہی ہیں۔“

سارہ وہاں سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ پھر ایک بڑی سی ٹرے میں کھانا لے کر دوسرے دروازے سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ دو افراد کا کھانا لے جاتے وقت کسی کی نظروں میں نہیں آئی۔

داؤد اپنے بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر پینے کے لیے بیٹھ گیا۔ جواد نے ماں سے کہا۔ ”مجھے ہونے والے سسر کے ساتھ پینا نہیں چاہیے۔ میں کہاں جاؤں؟“

”تمہارے لیے جو بیڈروم ہے، وہاں بیٹھ کر شغل کرو۔ میں کمپنی دوں گی۔“

”اوہ ممی! سارہ سامنے ہوگی تو پینے کا مزہ آئے گا۔“

”اس کے مزاج کو سمجھو۔ وہ ماں کا صدمہ اٹھا رہی ہے۔ فی الحال اسے بھول جاؤ۔“

ماں بیٹے ایک بیڈروم میں آ گئے۔ ماں نے وسکی کے دو پیگ بنا کر ایک بیٹے کو پیش کیا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اسے دودھ پلاتی تھی۔ اب بھی کمپنی دینے کے لیے شراب پلایا کرتی تھی۔ ماں باپ اور بیٹا سب ہی مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

جواد نے پینے کے دوران کہا۔ ”آپ میری پسند کی ہر چیز بازار سے خرید کر لے آتی ہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا، میں نے کوئی فرمائش کی ہو اور آپ نے پوری نہ کی ہو۔“

”تم میری جان ہو۔ جان بھی مانگو گے تو تم پر نچھاور

کردوں گی۔"

"ابھی تو میں سارہ کو مانگتا ہوں۔"

ماں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔ "ابھی میں نے تم سے کیا کہا ہے؟ وہ ہماری طرح ابھی لائف انجوائے کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔"

"جانتا ہوں، سمجھتا ہوں۔ ماں کا صدمہ اٹھا رہی ہے مگر مما! میرے اندر ایک کھلبلی سی ہے۔ اگر اسے چھو لیتا تو ایسی بے چینی نہ ہوتی۔"

وہ بیٹے کی ضرورت اور بے چینی کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "اسے دماغ سے نکالو۔ یہاں اپنی ضد منواؤ گے تو جانتے ہو، تمہارے انکل داؤد کیسے خوں خوار بھیڑیے ہیں۔ رشتے کا لحاظ نہیں کریں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ اُن سے ڈرتا بھی ہوں۔ انہیں ناراض کرنے والی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔"

"پھر کیا کرو گے؟"

"بس اس سے دو باتیں کروں گا، اسے چھو لوں گا تو تسلی ہو جائے گی۔"

"نہیں ہوگی۔ پہلے چھونے کو جی چاہتا ہے پھر پکڑنے کو... ایسے وقت خواہشیں چابک مارتی رہتی ہیں اور بندہ بے لگام ہوتا چلا جاتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ مجھ پر بھروسا کریں۔"

اس نے دوسرا پیگ حلق سے اتارا۔ ماں نے کہا۔ "بس اور نہ پیو۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں مما! بس وہاں جاؤں گا، اسے مناؤں گا کہ مجھ سے دو باتیں کرلے۔ پھر اسے راضی کروں گا تو وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے گی۔"

اس نے تیسرا پیگ بنایا۔ وہ بولی۔ "میں منع کر رہی ہوں نا اور نہ پیو۔"

"او مما! پلیز... موڈ میں آنے دیں۔ ذرا سُر میں آنے سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ اندر کی بات آسانی سے باہر آجاتی ہے۔"

وہ تیسرا پیگ پینے کے بعد اٹھ گیا۔ پھر تن کر بولا۔ "دیکھو مما! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ڈگمگا بھی نہیں رہا۔"

وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا وہاں سے جانے لگا۔ ماں کو دکھانے لگا کہ نشے میں نہیں ہے۔ یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا کہ نشے میں نہیں ہے تو سنبھل کر کیوں چل رہا ہے؟

خواب گاہ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ بیڈ پر تھی لیکن وسیم کے ساتھ جذباتی ازدواجی لمحات نہیں گزار رہی تھی۔ اس کی آغوش میں رو کر ماں کے بارے میں کبھی کبھی کچھ کہہ رہی تھی۔

وہ اس وقت کہہ رہی تھی۔ "میری مام جیسی کوئی نہیں ہوگی۔ انہوں نے میری خاطر سہاگن رہ کر بیوہ جیسی زندگی گزار دی۔ وہ مجھے کبھی بے سہارا چھوڑ نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے موت سے پہلے تمہیں میرا سہارا بنا دیا ہے۔"

وسیم نے اس کے کان میں کہا۔ "میں تمہاری مام کو سلام کرتا ہوں۔"

اس نے خوش ہو کر اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ ایک دستاویزی فلم چل رہی تھی۔ کمنٹری کرنے والے کی آواز باہر تک جا رہی تھی۔ ان دونوں کی آواز تقریباً معدوم ہوگئی تھی۔

وہ ذرا ڈگمگاتا ہوا، ذرا سنبھلتا ہوا دروازے کے پاس آکر رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہوگی یا ماں کے غم میں رو رہی ہوگی لیکن اندر سے ٹی وی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کوئی بول رہا تھا۔ الفاظ واضح نہیں تھے۔ اتنا تو معلوم ہوگیا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

وہ جاگ رہی ہے تو ٹی وی اسکرین پر کیا دیکھ رہی ہے؟ کیا سن رہی ہے؟ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ ٹی وی سے تو کوئی بول ہی رہا تھا مگر اس آواز کے پیچھے دھیمی سی سارہ کی آواز سنائی دی۔ وہ کچھ کہہ کر چپ ہوگئی تھی۔ پھر ایک مختصر سی مردانہ آواز ابھر کر گم ہوگئی۔

جواد منہ کھول کر حیرانی سے سوچنے لگا۔ 'کیا وہ بول رہی ہے؟'

ہاں۔ اس کی گنگناہٹ جیسی آواز سنائی دی تھی۔ پھر ایک اور آواز ابھری۔

اس نے سر کھجاتے ہوئے سوچا۔ 'وہ مردانہ آواز تو... ٹی وی سے آرہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایسا لگا تھا جیسے کوئی اور بھی بول رہا تھا مگر اب نہیں بول رہا ہے۔'

اس نے اپنے سر پہ چپت مار کر سوچا۔ 'کیا میں نشے میں ہوں؟'

پھر سر ہلا کر دل ہی دل میں اعتراف کیا۔ 'ہاں۔ مجھے چڑھ گئی ہے۔ مجھ پر تو سارہ کو چڑھنا تھا۔ یہ کم بخت شراب چڑھ رہی ہے۔ مجھے سنبھلنا چاہیے۔'

وہ پھر دروازے سے لگ گیا۔ کمنٹری کرنے والے کی آواز کے علاوہ بیک گراؤنڈ میوزک کا بھی شور تھا۔ ایسے شور میں سارہ کی گن گن کرتی ہوئی آواز ابھری۔ پتا نہیں، وہ کیا بول رہی تھی؟

اس نے سوچا۔ 'کیا اپنی ماں کی روح سے بول رہی ہے؟ اسے خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے؟ اگر دیکھ رہی ہے تو ٹی وی کون دیکھ رہا ہے؟ کیوں اسے خوامخواہ آن رکھا ہے؟'

پھر وہ چونک گیا۔ بیک گراؤنڈ میوزک کے شور میں جیسے کسی نے سرگوشی کی تھی۔ صرف دو چار الفاظ کہے تھے پھر چپ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد کمنٹری کرنے والے کی آواز ابھرنے لگی تھی۔

وہ ذرا پیچھے ہٹ کر دروازے کو گھورنے لگا۔ نشے کی حالت میں گھور کر دیکھا جائے تو ایک کے دو دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ایک دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ اسے دو دروازے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ 'لعنت ہے۔ کیا میں تین پیگ میں لڑھک گیا ہوں؟ ہرگز نہیں... میرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔'

اس نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے سارہ! اِٹ اِز می... جواد۔"

وہ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ سارہ نے ریموٹ سے ٹی وی کو آف کرتے ہوئے پوچھا۔ "اتنی رات کو کیوں آئے ہو؟ پلیز! مجھے ڈسٹرب نہ کرو۔"

"ابھی تو کوئی رات بھی نہیں ہے۔ یوں کہہ رہی ہو کہ اتنی رات ہوگئی ہے؟ پھر یہ کہ تم جاگ رہی ہو۔ ٹی وی دیکھ رہی ہو۔"

وہ انکار نہیں کرسکتی تھی کہ ٹی وی سے دل بہلا رہی ہے۔ وہ بول رہا تھا۔ "ہم ایک رات کے مہمان ہیں۔ کل صبح کی فلائٹ سے چلے جائیں گے۔ پلیز! مجھ سے دو باتیں کرلو۔"

اس نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ باتھ روم میں چلا جائے۔ اس نے اشارے سے کہا۔ "میں بیڈ کے نیچے چھپ جاؤں گا۔"

وہ دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'میں اس سے دو باتیں کروں گی۔ پھر ٹال دوں گی۔ بے چارہ وسیم بار بار اسٹور روم میں جا کر بند ہو جاتا ہے۔ بیزار ہوگیا ہے۔'

اس نے اشارے سے کہا۔ "ٹھیک ہے بیڈ کے نیچے چلے جاؤ۔"

وہ فوراً ہی قالین پر لیٹ کر کروٹ بدلتا ہوا بیڈ کے نیچے جا کر گم ہوگیا۔ سارہ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی توازن قائم نہ رکھ سکا، سنبھلتے سنبھلتے اوندھے منہ گر پڑا۔ گرتے ہی سر فرش سے ٹکرایا تو جیسے چکرا کر رہ گیا۔

اس کا رخ بیڈ کے نچلے حصے کی طرف تھا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں کسی مرد کا سایہ سا دکھائی دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے، دماغ کو قابو میں رکھنے کے لیے آنکھیں بند کیں۔

سارہ نے پوچھا۔ "کیا تم نے بہت پی لی ہے؟"

"نن... نہیں۔ میں نشے میں نہیں ہوں، بالکل ہوش میں ہوں۔"

اس نے آنکھیں کھولیں، بیڈ کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب سر چکرایا تھا، آنکھوں کے سامنے لمحاتی تاریکی چھا گئی تھی، تب اسے بیڈ کے نیچے کسی کا سایہ دکھائی دیا تھا۔ اب کچھ نہیں تھا۔ دماغ صاف ہوگیا تھا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ 'اب میں پورے ہوش میں ہوں۔ یہاں کی ہر چیز کو واضح طور پر دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کسی کا سایہ وایہ نہیں ہے۔'

سارہ نے پوچھا۔ "کیا صبح تک یہیں پڑے رہو گے یا اٹھنے کی زحمت بھی کرو گے؟"

وہ دونوں ہاتھ ٹکا کر اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں خوش خبری سنانے آیا تھا۔ اگرچہ ابھی یہ خوش خبری نہیں سنانا چاہیے۔ تمہاری مام کے لیے جتنا بھی صدمہ ہو، جتنے بھی آنسو بہائے جائیں، کم ہیں۔ میرا دل تمہاری مام کے لیے رو رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں، تم اندر سے کس قدر روتے ہوئے کوئی خوش خبری سنانے آئے ہو۔ چلو... جلدی سے سنا دو۔ پھر مجھے سونا ہے۔"

وہ بولا۔ "ہم دونوں بچپن کے ساتھی ہیں۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں بڑی ہی رومانٹک بات کہنے والا ہوں۔"

"تم میرے چچا زاد بھائی ہو۔ چھوٹی بہن سمجھ کر ہاتھ پکڑ سکتے ہو۔"

"شادی سے پہلے چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد بھائی بہن ہی ہوتے ہیں۔ مام کے چالیسویں کے بعد ہمارا رشتہ بدل جائے گا۔"

وہ انجان بن کر خوش ہو کر بولی۔ "رشتہ بدل جائے گا؟ کیا ہم سگے بھائی بہن بن جائیں گے؟"

"او نو سارہ! ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔"

''اونو جواد! میری شادی اب کسی سے نہیں ہو سکتی۔ میں سہاگن ہوں۔''

وہ تعجب سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''جو تم سن رہے ہو۔ ایک جن مجھ پر عاشق ہو گیا تھا۔ تنہائی میں آ کر مجھے چھیڑتا تھا۔ بڑا مزہ آتا تھا۔ میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔''

''یہ... یہ کیا کہہ رہی ہو؟ انکل تو مجھے داماد بنانے والے ہیں۔''

''ابھی انہیں معلوم نہیں ہے۔ میں نے بتایا نہیں ہے۔ وہ یقین نہیں کریں گے کہ ایک جن ان کا داماد بن چکا ہے۔''

''مجھے بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔ کہاں ہے وہ جن؟ میں اسے دیکھوں گا۔''

''یہیں... تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔''

اس نے مارے خوف کے اچھل کر پیچھے دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ وہ جھینپ کر بولا۔ ''کیوں مذاق کر رہی ہو...؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اب یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مگر جنات کسی کو نظر نہیں آتے اس لیے تم اسے دیکھ نہیں پا رہے ہو۔''

''پھر تم کیسے دیکھ رہی ہو؟''

''میں شریک حیات ہوں۔ یہ میرا مجازی خدا ہے۔ صرف میں ہی اسے دیکھ سکتی ہوں۔''

وہ چاروں طرف گھوم کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نہیں مانتا۔ پلیز! اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔''

''میرا خاوند صرف بھائی کو میرا ہاتھ پکڑنے دے گا۔''

وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''میں نہیں مانتا کہ یہاں کوئی ہے۔ بس ایک بار اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ میں تمہیں پالینا چاہتا ہوں۔''

اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''قریب نہ آؤ۔ فاصلہ رکھو۔''

''اب میں دور نہیں رہوں گا۔ تمہارے اندر اگر جن گھسا ہوا ہے تو اسے مار بھگاؤں گا۔ میری آغوش میں آؤ۔ میں اپنے رقیب سے نمٹ لوں گا۔''

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ اس سے کتراتے ہوئے بولی۔ ''ہوش میں آؤ اور یہاں سے جاؤ۔ ورنہ میں پاپا کو آواز دوں گی۔''

''وہ تو پی کر ٹن ہو گئے ہوں گے۔ تمہاری آواز نہیں سنیں گے۔ جوانی کی صدائیں مجھے سناؤ۔''

وہ جھپٹنے کے انداز میں آگے بڑھا لیکن اسے چھو نہ سکا۔ اوندھے منہ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ سارہ نے تنبیہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔ ''آخری بار سمجھاتی ہوں۔ یہاں سے نہیں جاؤ گے تو...''

وہ بات پوری نہ کر سکی۔ جواد نے اچھل کر اسے دبوچ لیا۔ وہ نشے کے باعث توازن قائم نہ رکھ سکا۔ سارہ کو جکڑتے ہوئے فرش پر گر پڑا۔ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ جھنجلا گئی تھی۔ اس نے خود کو چھڑاتے ہوئے اسے ایک لات ماری۔ وہاں سے اٹھنا چاہتی تھی، اس سے پہلے ہی وہ اس پر آ گرا۔

وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا مگر اسے پکڑنے اور جکڑنے کے بعد ہوس بڑھ گئی تھی۔ بدن کی زرخیزی پاگل کر رہی تھی۔ وہ فرش پر پڑی تھی۔ اس کا بوجھ اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت جواد کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔

وسیم برداشت نہ کر سکا۔ وہ رقیب اس کی سارہ کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ اس نے پیتل کا گل دان اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا..... کوئی مرد یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کی عورت کو لوٹ کا مال سمجھا جائے۔ وہ بھی غصے اور جھنجلاہٹ میں بھول گیا کہ خود کو ظاہر کر رہا ہے۔ سارہ نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ اگرچہ اس کی مردانگی اچھی لگی تھی لیکن یہ مردانگی اب مہنگی پڑنے والی تھی۔

سر پر زوردار ضرب لگائی گئی تھی۔ جواد کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ اسے اچھی طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اس نے سر گھما کر حملہ کرنے والے کو دیکھنا چاہا۔ دائیں بائیں اور پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وسیم چھپنے کے لیے جا چکا تھا۔

سارہ نے فوراً ہی فرش پر پڑے ہوئے گل دان کو اٹھا لیا۔ جواد کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ وہ اپنی گردن پر لہو کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک طرف ڈھلکنے سے پہلے دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر اسی طرح بیٹھا رہ گیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سارہ اس گل دان کو ہاتھ میں اٹھا کر کہہ رہی تھی۔ ''اگر تم یہاں سے نہ گئے تو اس بار سر توڑ دوں گی۔''

جواد نے جھومتے ہوئے اسے دیکھا۔ کمرے کی نیم تاریکی میں کچھ اچھی طرح نظر نہیں آ رہا تھا لیکن گل دان آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سارہ آگے ہے تو چوٹ سر کے پیچھے کیسے لگی؟

تکلیف ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ اپنے پیروں پر

PAKISTAN DISTANCE LEARNING INSTITUTE HOME STUDY PROGRAMMES

PDLI

پاکستان انسٹی ٹیوٹ برائے فاصلاتی تعلیم

البارئ روڈ پیپلز کالونی ڈی گراؤنڈز نزد ریڈیو اسٹیشن فیصل آباد

چھ ماہ کے شارٹ ٹرم کورسز

گھر بیٹھے بذریعہ خط و کتابت گورنمنٹ سے منظور شدہ کورسز (عمر اور تعلیم کی کوئی قید نہیں)

انگلش لینگویج | بیوٹی پارلر اینڈ بیوٹیشن | ڈرافٹس مین سول | فوٹوگرافی | فرسٹ ایڈ میڈیکل | جرنلزم | الیکٹریشن | لائبریرین | ریڈیو ٹی وی ٹیکنیشن | نیوز رپورٹنگ

پبلک ریلیشن آفیسر | ڈرافٹس مین مکینیکل | سکول ٹیچنگ | لیڈی ٹیلرنگ | یوگا | موبائل ریپئرنگ | ڈرائنگ ماسٹر | انٹیریئر ڈیزائننگ اینڈ فائن آرٹس | کوکنگ اینڈ بیکنگ

بوتیک اینڈ فیشن ڈیزائننگ | امپورٹ ایکسپورٹ | ریفریجریشن اینڈ ایئر کنڈیشننگ | کمپیوٹر کورس | کمپیوٹر ہارڈ ویئر | آٹو کیڈ الیکٹریکل | آٹو کیڈ سول | کارپینٹر

موٹر سائیکل ٹیکنیشن | حکمت طب نبوی | سول سروسز کوالٹی اینڈ | فزیوتھراپی | پلمبر | ہوم ڈاکٹر | مارکیٹنگ | چلڈرن کیئر | پولٹری فارمنگ | میجک کرنا سیکھیے

عربی بول چال سیکھیے | سائنس اور زراعت | ویلڈنگ | فنز | باغبانی (پھل اور سبزیاں) | ہائی جین اینڈ پبلک ہیلتھ | ٹیکسٹائل ڈیزائننگ | IELTS

کمپیوٹر پروگرامنگ | کمپیوٹر گرافکس | کورل ڈرا | ویب ڈیزائن | ڈرائنگ ماسٹر | ایکسل | تھری ڈی سٹوڈیو | ایم ایس آفس | ایئر ٹیکنیشن | جرنلسٹ بنیے | ڈریس میکنگ

سکول مینجمنٹ | جدید ریکروٹ سروس | ہمارے پھل | مکینکس آف سٹرکچر | انڈسٹریل الیکٹریشن | پولیس فیلڈ کرافٹ | فیملی ہیلتھ | ڈنگر ڈاکٹری

پٹرول انجن | ڈیزل انجن | پلاسٹک سازی | جیومیٹریکل اینڈ ٹیکنیکل ڈرائنگ | الیکٹریکل انجینئرنگ | ثانوی تعلیم | سٹیل فکسر | ٹیلی کمیونیکیشن

پھلوں اور سبزیوں کی مصنوعات تیار کرنا | اسلامک بینکاری | بیکری کی مصنوعات تیار کرنا | کھجور اور گڑ کی مصنوعات تیار کرنا | حکمت (طب یونانی)

ہومیو پیتھک | نرسنگ | ڈسپنسر | ویٹرنری اسسٹنٹ (جانوروں کا علاج) | الٹراساؤنڈ ٹیکنیشن | ایکسرے ٹیکنیشن | گائناکالوجی اسسٹنٹ

فزیوتھراپی اسسٹنٹ | آکوپنکچر | الیکٹرو ہومیو پیتھی | فزیکل ایجوکیشن | ڈنگر ڈاکٹری | لیبارٹری ٹیکنیشن | آپریشن تھیٹر ٹیکنیشن | ڈینٹل ٹیکنیشن

مدت کورس: چھ ماہ۔ مکمل کورس فیس 1850/- روپے۔ نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر: 0305-7987627

تین ماہ کے شارٹ ٹرم کورسز

گھر بیٹھے بذریعہ خط و کتابت گورنمنٹ سے منظور شدہ کورسز (عمر اور تعلیم کی کوئی قید نہیں)

سپیشل چائلڈ اور تربیت | ہیپناٹزم | میوزک | دست شناسی / پامسٹری | گفتگو اور تقریر کا فن | ان پیج اردو کمپیوٹر کورس | مقناطیس سے علاج

کرانے | امتحان میں کامیابی | نفسیات | بروج اور شخصیت علم نجوم کی روشنی | میک اپ کے ذریعے خوبصورتی | ٹیلی پیتھی | شخصیت کی پرکھ | خوشبو سازی

بیوٹی پارلر ٹیکنیکل ٹریننگ | شہرت سازی | لذت جہاں کوکنگ | انگلش ٹائپنگ | اردو ٹائپنگ | انٹرنیٹ | صحت اور غذا | مائیکرو سوفٹ ونڈوز | سونا پالش کریں

نفسیات و اطفال رہنمائے امراض | یوگا | مچھلی فارم بنانا | جرمن لینگویج | کورین لینگویج | تعلیم بذریعہ کھیل | امیگریشن قوانین | انشورنس میکنگ | ویلڈنگ

پنجاب کی دستکاری | پاور پوائنٹ ڈیزائن | ٹائپنگ کا تیز | مائیکرو میڈیا پلیئر | سیاست اور حیثیت | ترکش اردو بول چال | گٹار بجانا | صابن سازی

مدت کورس: چھ ماہ۔ مکمل کورس فیس 950/- روپے۔ نام پتہ اور کورس کا نام SMS کرنے کیلئے موبائل نمبر: 0305-7983709

کورس ڈاکیہ گھر پر بذریعہ وی پی پارسل ڈیلیور کرے گا اور فیس وصول کرے گا

کھڑے رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا دروازے کی طرف جانے لگا۔ اس کی ماں بیٹے کے لیے پریشان تھی۔ دل میں یہ بات تھی کہ وہ نشے کی حالت میں کوئی گڑبڑ نہ کر بیٹھے۔

وہ خیریت معلوم کرنے کے لیے اُدھر آئی۔ اسی وقت سارہ نے دروازہ کھولا تاکہ جواد رینگتا ہوا وہاں سے چلا جائے۔ ماں نے بیٹے کے خون آلود سر کو دیکھا پھر اسے رینگتے ہوئے دیکھا تو چھاتی پیٹتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ ”کیا ہوگیا میرے بچے کو...؟ ہائے اللہ! میں مر جاؤں گی۔“

اس نے سارہ کے ہاتھ میں پیتل کا گل دان دیکھا۔ وہ بولی۔ ”آپ کا بیٹا میری عزت پر حملہ کر رہا تھا۔ میں نے اسے سزا دی ہے۔ باقی سزا ابا دیں گے۔“

جواد نے ماں کی گود میں سر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ ممتا نے تڑپ کر کہا۔ ”میرے بیٹے نے کچھ نہیں کیا ہے۔ میں دیکھتی آرہی ہوں، تم اس سے کترا رہی ہو.... یہ تو یہاں دو باتیں کرنے آیا تھا اور تم نے اس کے ساتھ دشمنوں جیسا سلوک کیا ہے۔“

سارہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں دونوں بھائی پی رہے تھے۔ اس نے پیتل کا گل دان انہیں دکھاتے ہوئے کہا۔ ”انکل! میں نے اس گل دان سے جواد کا سر توڑ دیا ہے۔ وہ نشے میں میری عزت پر حملہ کرنے آیا تھا۔“

دونوں بھائی اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ داؤد نے پوچھا۔ ”کیا جواد نے ایسی گری ہوئی حرکت کی ہے؟“

”جی ہاں۔ آپ خود چل کر میرے کمرے کے سامنے دیکھ لیں۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے ادھر آئے۔ ماں بیٹے کو سہارا دے کر اپنے کمرے کی طرف لے جارہی تھی۔ پھر باپ نے بھی اسے سہارا دیا۔ داؤد نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر جواد کو نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھا۔ پھر بھائی سے کہا۔ ”شکر کرو، یہ تمہارا بیٹا اور افسوس کہ میرا بھتیجا ہے۔ ورنہ ابھی اسے گولی مار دیتا۔“

وہ بولا۔ ”بھائی جان! یہ نادان ہے۔ ہمارا ہی خون ہے۔ آپ غصہ تھوک دیں۔ ہم بزرگ ہیں۔ اسے سزا دیں گے، یہ آپ کے قدموں میں سر رکھے گا۔ جب تک آپ معاف نہیں کریں گے، سر نہیں اٹھائے گا۔“

داؤد نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ پھر ایک گارڈ سے رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ ”فرسٹ ایڈ بکس لے آؤ۔“

محل کے اندر صرف خسرے گارڈ ہی آتے تھے۔ ایک خسرو ابتدائی طبی امداد کا سامان لے آیا۔ جواد بیڈ پر اوندھا پڑا تھا.... اس کے سر سے لہو پونچھا۔ مرہم پٹی کی پھر وہاں سے چلا گیا۔

سارہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد باتھ روم میں آکر اسٹور روم کے دروازے پر دستک دی۔ ”میں ہوں سارہ...“

وسیم دروازہ کھول کر باہر آیا تو وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ”تم نے اچھا کیا مگر غلطی بھی کی۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتا تو پھر چھپنے کا موقع نہیں دیتا۔“

”مجھے اور موقع نہیں ملا۔ ورنہ اسے جان سے مار ڈالتا۔ وہ میری جان کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔“

وہ خوش ہو کر اس پر قربان ہونے لگی۔ اسے بتانے لگی کہ اپنے پاپا اور جواد کے ماں باپ کے سامنے کیسی باتیں بنائی ہیں... خطرہ ٹل گیا ہے۔ کوئی اس کی موجودگی پر شبہ نہیں کرے گا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہم بیڈ روم میں چلیں؟“

”ہاں چلو... مگر میں پہلے دیکھ کر آتی ہوں کہ وہاں کیا ہورہا ہے۔“

وہ پھر چھپنے کے لیے چلا گیا۔ سارہ بیڈ روم سے باہر آکر دبے قدموں جواد کے کمرے کی طرف جانے لگی۔

وہ اپنے بیڈ پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ سر پر پٹی بندھی تھی۔ زود اثر دواؤں کے باعث تکلیف کچھ کم ہوئی تھی۔ اب وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھا۔ سوچ رہا تھا، اس کے ساتھ کچھ عجیب سے حالات پیش آئے ہیں۔

اسے ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ جب وہ سارہ کو دبوچتے ہوئے زمین پر گرا تھا، تب وہ سامنے تھی۔ پھر سر کے پچھلے حصے پر کس نے ضرب لگائی؟

وہ خالی ہاتھ تھی۔ ایسے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ جب تاریکی چھٹ گئی اور وہ نظر آنے لگی تو اس کے ہاتھوں میں گل دان دکھائی دیا تھا۔

اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ سامنے سے حملہ کرے اور سر کے پیچھے چوٹ آئے... جبکہ سر کے اگلے حصے کو گل دان کی زد میں آنا چاہیے تھا؟

یہ ایسی باتیں تھیں جو اسے الجھا رہی تھیں۔ پھر یاد آیا کہ کمرے میں ٹی وی آن تھا۔ کمنٹری کرنے والا بول رہا تھا۔ اس کے ساتھ سارہ کی دھیمی سی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ آخر وہ کس سے بول رہی تھی؟

یہ بھی یاد آیا کہ کمنٹری کرنے والے کے علاوہ ایک اور مردانہ سرگوشی بھی ابھری تھی۔ کیا وہ سارہ سے بول رہا تھا؟ سارہ اس سے بول رہی تھی؟

وہ سوچ رہا تھا۔ داؤد اپنے بھائی اور بھاوج کے ساتھ وہاں بیٹھا اسے باتیں سنا رہا تھا۔ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ ”ذلیل...! کمینے! تو میرے بھائی کا بیٹا ہے، ہمارا خون ہے اور ہمارے ہی گھر میں ڈاکا ڈالنے گیا تھا؟“

ایسے ہی وقت معمول کے مطابق بجلی چلی گئی۔ چارجر لائٹ آن ہوگئی۔ باپ نے بیٹے سے کہا۔ ”بھائی جان تمہیں داماد بنانے والے ہیں اور تم نے ہمارا سر جھکا دیا۔“

”میں اسے داماد بناؤں گا۔ اسے بہت چاہتا ہوں مگر پہلے اس کی پٹائی کروں گا۔ ذرا یہ اچھا تو ہوجائے۔“

ماں نے خوش ہو کر کہا۔ ”بھائی جان! یہ آپ کا بیٹا ہے۔ ہماری طرف سے بھی اس کی پٹائی کریں۔“

ایسے ہی وقت جواد اُچھل کر بیٹھ گیا۔ سب ہی اسے تعجب سے دیکھنے لگے۔ اسے یاد آیا تھا کہ جب اوندھے منہ فرش پر گرا تھا تو بیڈ کے نیچے ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔

یہ یاد آتے ہی کڑی سے کڑی مل گئی کہ اسی سائے نے پیچھے سے سر پر ضرب لگائی ہوگی اور اسی کی آواز کمنٹری کرنے والے کے ساتھ اور بیک گراؤنڈ میوزک کے شور میں دبی دبی سی سنائی دی تھی۔

باپ نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ تم تکلیف سے بے حال تھے، ایک دم سے اچھل کر کیسے بیٹھ گئے؟“

وہ داؤد کو دیکھ کر بولا۔ ”انکل! میں پورے ہوش و حواس میں ہوں اور پورے یقین سے کہتا ہوں، سارہ نے میرے سر پر گل دان نہیں مارا تھا۔ کسی نے پیچھے سے مجھ پر حملہ کیا تھا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ سارہ کے کمرے میں کون پیچھے سے آکر حملہ کرے گا؟“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں، کوئی بیڈ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کے بعد دیکھ نہ سکا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ پلیز! مجھ پر بھروسا کریں۔ ایک بار میری باتیں توجہ سے سن لیں۔“

وہ پوری تفصیل کے ساتھ بولنے لگا۔ وہ تینوں توجہ سے سن رہے تھے اور اس سے سوالات کر رہے تھے۔

”کیا ٹی وی اونچی آواز میں آن تھا اور اس دوران سارہ بول رہی تھی؟“

”کیا تمہیں پورا یقین ہے، تم نے کمنٹری کرنے کے علاوہ ایک اور مردانہ آواز سنی تھی؟“

”کیا فرش پر گرنے کے بعد واقعی تم نے کسی شخص کی جھلک دیکھی تھی؟“

”کیا سارہ تمہارے آگے تھی اور حملہ پیچھے سے کیا گیا تھا؟“

”ہاں...“ ہر سوال کے جواب میں وہ پورے یقین سے ہاں کہہ رہا تھا۔ اس کے باپ نے کہا۔ ”بھائی جان! یہ میرا ہی نہیں، آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اس کی بات کا یقین کریں۔ وہاں چل کر دیکھنے میں کیا حرج ہے؟“

پچھلی رات اس پورے محل میں دوسری بار وسیم کو تلاش کیا گیا تھا اور وہ نظر نہیں آیا تھا۔ داؤد پھر بیٹی کے کمرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بات ایک بار پھر نشتر کی طرح چبھنے لگی کہ اس نے بیٹی کے فون سے دشمن چھوکرے کی آواز سنی تھی۔

اب یہ سوچ رہا تھا کہ بیٹی جھوٹ بول سکتی ہے۔ اس کے فون کی سم چرائی نہیں گئی ہے۔ چور کہلانے والے کو اس نے کہیں چھپا دیا ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ سب ہی اس کے ساتھ اٹھ گئے۔ یہ بہت چونکا دینے والا انکشاف ہوسکتا تھا۔ وہ وہاں سے سارہ کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ ماں دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ بیٹے کا بیان سچ ثابت ہوجائے۔ اس کے بیٹے کا سر پھاڑ دیا گیا تھا۔ وہ سارہ کو بددعائیں دے رہی تھی۔

وہ چاروں دروازے کے پاس آکر رک گئے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اندر سے بند ہوگا لیکن وہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اندر سے چارجر لائٹ کی روشنی باہر آرہی تھی۔

داؤد غصے میں تھا کہ اس بار وسیم کو ضرور پکڑ لے گا۔ وہ اسی کمرے میں ہوگا لیکن کھلا ہوا دروازہ کہہ رہا تھا، چور وہاں چھپ نہیں سکتا۔ وہ دروازہ کھلے دل اور کھلی نیت کی طرح تھا۔

داؤد نے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ بیٹی مصلے پر بیٹھی زیرِ لب تسبیح پڑھ رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جواد نے کمرے میں آتے ہی بیڈ کے نیچے جھک کر دیکھا۔ ماں نے باتھ روم کی طرف دیکھا۔ پھر اُدھر جانے لگی۔ جواد کا باپ اسٹور روم کا دروازہ کھول کر دیکھنے لگا۔

ان سب کے ہاتھوں میں چھوٹے سائز کی چارجر لائٹس تھیں۔ سارہ نے پوچھا۔ ”پاپا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ پہلے دو بار تمام گارڈز نے آکر تلاشی لی۔ اب آپ... بھائی اور بھتیجے کے ذریعے تلاشی لے کر میری توہین کر رہے ہیں۔ کیا میں بدچلن ہوں؟“

www.pkdigest.com

داؤد نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”خاموش رہو۔ جواد نے یہاں کسی کو دیکھا ہے۔ میرے اندر بھی پھانس اٹکی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے اس نے رقم نہ چرائی ہو اور تم نے اسے چھپا کر رکھا ہو۔“

وہ بولی۔ ”واہ پاپا! آپ نے کھل کر کہہ دیا کہ بیٹی بے حیا ہے... بدچلن ہے۔“

”اگر یہ غلط ہوا تو باپ تم سے معافی مانگ لے گا۔“

بھائی نے اسٹور روم سے باہر آکر کہا۔ ”بھائی جان! یہاں کافی وزنی سامان رکھا ہوا ہے۔ کیا اس کے پیچھے دیکھا گیا ہے؟“

داؤد نے کہا۔ ”ایک اکیلا شخص وہ وزنی سامان ہٹا کر چھپنے کے لیے پیچھے نہیں جاسکتا۔“

بھاوج نے آکر کہا۔ ”باتھ روم میں ایک دروازہ ہے جو اِدھر کھلتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ اُدھر سے سامان کے پیچھے جاکر اندر سے دروازہ بند کرلیتا ہو۔“

داؤد اسٹور روم میں آکر اوپر سے نیچے تک سامان کو دیکھنے لگا۔ اس دروازے کے متعلق کہا جاتا تھا کہ ہمیشہ سے ہی اندر سے بند رہتا ہے اور واقعی وہ باتھ روم کی طرف سے نہیں کھلتا تھا۔

یہ ایک بات ذہن میں نہیں آئی کہ بیگم اور بیٹی نے غلط بیانی کی ہوگی۔ وہ پورے محل کے دروازے کھڑکیوں کا حساب نہیں رکھتا تھا۔ اس نے ماں بیٹی کی بات مان لی تھی۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ لڑکا باتھ روم سے اسٹور روم میں جاکر دروازے کو اندر سے بند کرلیتا ہوگا۔

اس نے بھائی سے کہا۔ ”میں گارڈز کو بلا کر یہ سامان نہیں ہٹاؤں گا۔ اگر واقعی وہ اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے تو میں شرم سے مرجاؤں گا۔“

بھائی نے کہا۔ ”آپ باہر سے کسی کو نہ بلائیں۔ میں جواد کے ساتھ یہ سامان ہٹا سکتا ہوں۔“

وہ باپ بیٹا مزدور بن گئے۔ بڑی محنت سے سامان ہٹانے لگے۔ داؤد بھی اُن کا ساتھ دے رہا تھا۔

سارہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ سسکتے ہوئے کہنے لگی۔ ”پاپا! یہاں کوئی نہیں ہے۔ سامان نہ ہٹائیں۔ میں شرم سے مری جارہی ہوں۔“

اس کے آنسو سمجھا رہے تھے کہ دال میں کالا ہے اور وہ کالا سامنے آنے والا ہے۔ اس سے پہلے ہی وہ شرم سے مری جارہی ہے۔

تین تنے کتنے مرد لگے ہوئے تھے۔ پہاڑ کو سرکا رہے تھے۔ آخر وہ سرک ہی گیا۔ جیسے میدان صاف ہوگیا۔ کھلے میدان میں کوئی چھپ نہیں سکتا اور کوئی وہاں چھپا ہوا نہیں تھا۔ عورت کے متعلق کہا جاتا ہے وہ یار کو چھپانا چاہے تو آنکھ کے کاجل میں چھپالیتی ہے۔ مرد کی ساری ذہانت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

باتھ روم کی طرف سے کھلنے والا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس کی نچلی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اگر وہ چھپا ہوتا اور وہاں سے نکل کر جاتا تو اندر سے کنڈی لگی نہ رہتی۔ دروازہ باتھ روم کی طرف کھلا ہوتا... لیکن وہ تو بند تھا۔ ثابت ہوگیا کہ بیٹی کے کمرے میں کبھی کوئی نہیں تھا۔

حقیقتاً وہ نچلی کنڈی ایسی تھی کہ باہر آکر دروازے کو زور سے بند کرو تو وہ جھٹکا کھا کر نیچے آکر اٹک جاتی تھی۔ یوں وہ باہر سے بند ہوجاتا تھا اور وسیم نے وہاں سے جاتے ہوئے اسی تدبیر سے اسے بند کیا تھا۔

سارہ اسے چارجر لائٹ کی روشنی میں دبے قدموں چلتے ہوئے ماں کے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ وہاں وہ اسٹور روم میں رکھی ہوئی الماری کے پیچھے چھپ سکتا تھا۔ اس نے ماں کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کردیا۔ ایک آدھ گھنٹے بعد حالات معمول پر آتے تو وہ وسیم کو اپنے کمرے میں لے آتی۔

تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ جواد کے منہ پر تھپڑ پڑا۔ داؤد اس کی پٹائی کرتے ہوئے بولا۔ ”اس نے میری معصوم بچی کی انسلٹ کی ہے۔ میں اسے یہاں رہنے نہیں دوں گا۔“

اس نے بھائی اور بھاوج سے کہا۔ ”تم سب یہاں سے نکلو۔ انیکسی میں صبح تک رہو۔ پھر مجھے صورت دکھائے بغیر یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“

وہ تینوں سر جھکا کر وہاں سے جانے لگے۔ داؤد نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں نے بھی تم پر شبہ کیا۔ میں باپ ہوں۔ سونے کا نوالہ کھلاتا ہوں شیر کی نظر سے دیکھتا ہوں... پھر بھی سوری کہتا ہوں۔“

وہ بھی وہاں سے چلا گیا۔ اس نے اطمینان کی لمبی سانس لی پھر دوڑتی ہوئی مصلے پر آئی اور سجدے میں گر پڑی۔ حالات ایسے سازگار ہوئے تھے کہ آئندہ اس کا باپ بھی اس کے کمرے میں آنے والا نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر وہی منظر تھا۔

رات جانے والی تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ ایسے وقت ایک پولیس وین اس وسیع و عریض عمارت کے سامنے آکر رک گئی۔ امریکی اس عمارت کو ڈیتھ ہاؤس کہتے تھے اور عراقی

اپنی زبان میں اسے دارالاجل بولتے تھے۔ سانسیں لیتی ہوئی زندگیاں وہاں پہنچ کر ختم ہوجاتی تھیں۔

اس پولیس وین کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا گیا۔ قاضی ابرار ہاشمی باہر آیا۔ وہ جیل خانے کی مسجد کا پیش امام تھا۔ اکثر دارالاجل میں آکر سزائے موت پانے والے قیدیوں کو آخری نماز پڑھاتا تھا۔ انہیں کلام پاک کی آیات سناتا تھا۔ پھر سپاہی ان قیدیوں کو پھانسی کے تختے پر یا گیس چیمبر میں لے جاتے تھے۔

اذان ہورہی تھی۔ ابھی رات کا اندھیرا باقی تھا۔ قاضی ابرار ہاشمی نے نئے پولیس افسر کو دیکھا۔ وہ نئے اسٹاف کے ساتھ آیا تھا۔ پرانے افسر اور اس کے ماتحت سپاہیوں کی ڈیوٹی بدل گئی تھی۔ وہ نئے افسر کے ساتھ اس عمارت میں داخل ہوگیا۔

وہاں ایک کمرے میں معمول کے مطابق قاضی صاحب کے شناختی کاغذات چیک کیے گئے پھر انہیں آگے جانے کی اجازت دی گئی۔ ان کے آگے پیچھے چلنے والے جیلر اور سپاہیوں نے آگے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھولا۔ وہ اس دروازے سے گزر کر آگے بڑھے تو پچھلا دروازہ بند ہوگیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر دوسرا دروازہ کھل گیا۔

وہ دوسرے دروازے سے گزر کر ایک راہداری میں آئے جس کے اطراف تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں۔ ہر کوٹھری میں ایک قیدی تھا۔ وہ سب ہی اپنی موت کی مقررہ تاریخ تک جی رہے تھے۔

قاضی ابرار ہاشمی پولیس افسر اور سپاہیوں کے ساتھ چلتا ہوا ایک کوٹھری کے سامنے آکر رک گیا۔ صبح کی اذان ہوچکی تھی۔ ایک قیدی حارث الجمائلی نیچی چھت والی تنگ کوٹھری میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ایسے وقت قاضی ابرار ہاشمی نے سلاخوں سے باہر نماز ادا کی۔ پولیس افسر اور سپاہی چپ چاپ ایک دیوار سے لگے کھڑے رہے۔

نماز کے بعد اسسٹنٹ جیلر نے آکر آہنی سلاخوں والے دروازے کو کھولا۔ قاضی نے اندر آکر کہا۔ ”السلام علیکم...“

حارث نے جواب نہیں دیا۔ وہ چبھتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ قاضی نے پولیس افسر اور جیلر سے کہا۔ ”اسے نشانے پر رکھو۔ یہ خطرناک ہے۔“

انہوں نے حارث کی طرف گنز سیدھی کیں۔ قاضی ابرار ہاشمی نے مطمئن ہوکر دونوں ہاتھ باندھے۔ پھر کلام پاک کی آیت پڑھنے کے لیے منہ کھولا۔ ایسے ہی وقت پولیس افسر نے اپنے ریوالور کی نال اس کے منہ ٹھونس دی۔

یہ بالکل ہی خلافِ توقع تھا۔ اس کے دیدے خوف اور حیرانی سے پھیل گئے۔ منہ کھلا ہوا تھا مگر وہ کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔

حارث نے کہا۔ ”تم مسلمان ہو مگر منافق ہو۔ دکھاوے کے لیے نمازیں پڑھتے اور پڑھاتے ہو... لیکن امریکی اتحادیوں کے آگے جھکتے ہو۔ تمہارے بچے کینیڈا میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ موت کی سزا مجھے نہیں تمہیں ملنی چاہیے۔“

پھر اس نے پولیس افسر سے کہا۔ ”قصہ ختم کرو۔“

اس نے کہا۔ ”ذرا انتظار کرو۔ سگنل ملنے والا ہے۔“

جیلر نے کہا۔ ”میں جاکر دیکھتا ہوں۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ ایسے وقت تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔“

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا، ایسے ہی وقت سگنل مل گیا۔ اس عمارت کے صدر دروازے پر زبردست بم دھماکا ہوا۔ وہاں کے درودیوار لرزنے لگے۔ پولیس افسر نے قاضی صاحب کو گولی ماردی۔

جیلر نے کہا۔ ”نکلو یہاں سے... مجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔ جتنی جلدی ہوسکے نکل جاؤ، گورے آقاؤں کو مطمئن کرنے کے لیے مجھے اپنی کارکردگی دکھانی ہے۔“

وہ سب وہاں سے دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ دور و نزدیک مسلسل فائرنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جیلر ان سے الگ ہوکر دوسری سمت چلا گیا تھا۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس عمارت کے صدر دروازے کو بم دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا۔ مجاہدین اندر گھس آئے تھے۔ اِن کاؤنٹر فائرنگ ہورہی تھی۔ وہ حارث جیسے فولادی مجاہد کو وہاں سے نکالنے کے لیے جان کی بازی لگا رہے تھے۔

حارث کو ایک گن دی گئی تھی۔ وہ بڑی مہارت سے چھپتا چھپاتا، چھلانگیں لگاتا اور کبھی فرش پر لڑھکتا ہوا فائر کرتا ہوا سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارتا جارہا تھا۔

صدر دروازے کی دیواریں دور تک منہدم ہوگئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر اس کے لیے وین کھڑی تھی۔ مجاہدین اسے سگنل دے رہے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا آکر وین میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا۔ وہ آگے بڑھ کر تیز رفتاری سے ایک سمت بڑھنے لگی۔

اس زبردست دھماکے کے باعث جیل کا ایک حصہ کھنڈر بن گیا تھا۔ آہنی دروازے اور دیواریں گر گئی تھیں۔ دوسرے کئی قیدی بھی فرار ہوگئے تھے۔ آئندہ ان کی سزائے

www.pkdigest.com

موت پر عمل ہونے والا تھا۔ اب انہیں نئی زندگی مل رہی تھی۔

نارتھ سینٹرل جیل میں امریکی اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا۔ وہاں ان کی گرفت مضبوط تھی۔ ایسی جگہ مجاہدین بڑی بے باکی سے ڈستھ ہاؤس کی اہم عمارت کو کھنڈر بنا کر حارث الجمالکی کو نکال لے گئے تھے۔

اس علاقے کی پولیس اور فوج کو ہائی الرٹ کر دیا گیا۔ تمام راستوں کی ناکا بندی ہونے لگی۔ ایک انتہائی سفاک درندے ایس پی جبار الفائدی کو فوراً ہی فون پر حکم دیا گیا اور کہا گیا۔ ”جس حال میں بھی ہو اسی حلیے اور لباس میں دوڑو۔ حارث الجمالکی سلیمانیہ کی حدود میں ہوگا۔ اسے دور جانے سے پہلے ہی دبوچ لو۔ وہ زندہ ہاتھ نہ آئے تو مردہ بنا کر ہمارے سامنے لاؤ۔“

جبار الفائدی اسم بامسمیٰ تھا۔ جبر کی انتہا کر دیتا تھا۔ جو مجاہدین اس کی گرفت میں آجاتے، انہیں بڑی سخت اذیتیں دے کر مار ڈالتا تھا۔ چند ماہ پہلے حارث الجمالکی سے مقابلہ ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے پسینا چھوٹ گیا تھا۔

حارث اتحادیوں کے ایک فوجی قافلے پر کامیاب حملہ کرنے کے بعد فرار ہو رہا تھا۔ جبار نے اپنے فائٹروں کے ساتھ اسے گھیر لیا تھا۔ اس ان کاؤنٹر میں مجاہدین بھی تھے۔ کئی گھنٹوں تک فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا تھا۔ دونوں طرف کے لوگ مرتے رہے۔

مجاہدین کے طریقہ کار کے مطابق ہر حملے کے بعد فرار ہونا لازمی تھا۔ وہ موقع پا کر ایک ایک کر کے اپنی پناہ گاہ کی طرف بھاگنے لگے۔ حارث تنہا رہ گیا۔

جبار سے ٹھن گئی تھی۔ اس کے سپاہی بھی مارے گئے تھے۔ وہ خود زخمی ہوا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ حارث بھی زخمی ہے۔ یہ اس کے لیے اچھا موقع تھا۔ وہ اسے گولیوں سے چھلنی کر کے جانا چاہتا تھا۔

ان کے درمیان فیصلہ کن فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ دو میں سے کسی ایک کو مرنا تھا۔ میدانِ جنگ میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی ایک موت کے گھاٹ اترتا ہے، دوسرا فاتح بن کر جاتا ہے۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ دونوں کی ایک ایک گولی نے دونوں کے قدم اکھاڑ دیے۔ جبار کو پہلی گولی جس ٹانگ میں لگی تھی، دوسری گولی بھی وہیں آکر پیوست ہوئی تھی۔ دونوں گولیاں اس کے اندر انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ گرنے کے بعد اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

حارث کا پہلا زخم معمولی تھا۔ دوسری گولی بازو میں آکر پیوست ہوئی تھی۔ وہ گن چلانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ زخمی سپاہیوں نے آکر اسے گرفتار کرلیا تھا۔ پولیس اسپتال میں اس کے بازو سے گولی نکالی گئی۔ اس کا علاج کرایا گیا۔ پھر اسے ابوغریب جیل... بھیج دیا گیا۔

جبار نے لنگڑاتے ہوئے جیل میں آکر حارث کو نفرت اور غصے سے دیکھا پھر گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ”تو نے مجھے ایک پیر سے اپاہج بنا دیا ہے۔ اگر تو اتحادی فوجیوں کو مطلوب نہ ہوتا تو اس جیل میں تجھے تڑپا تڑپا کر مار ڈالتا۔“

حارث نے کہا۔ ”اگر میں سلاخوں کے پیچھے نہ ہوتا تو تجھے ایک ایک گالی کے جواب میں سو سو زخم لگاتا۔ زندہ رکھ کر مارتا رہتا۔ کوئی بات نہیں۔ کبھی یہاں سے نکلوں گا تو تجھ سے نمٹ لوں گا۔“

وہ اس کی طرف تھوکتے ہوئے حقارت سے بولا۔ ”تیرا باپ بھی اور تیرے مجاہدین بھی تجھے... یہاں سے نہیں نکال سکیں گے۔ اتحادی تجھے سزائے موت دیں گے۔“

اور یہی ہوا۔ اسے سزائے موت دینے کے لیے سلیمانیہ کے ڈستھ ہاؤس میں پہنچایا گیا تھا جہاں سے اب وہ فرار ہو چکا تھا۔ اس نے جبار کو چیلنج کیا تھا کہ کبھی جیل سے نکلے گا تو ایک ایک گالی کے جواب میں سو سو زخم لگائے گا۔

اور جبار یہ قسم کھا چکا تھا کہ اسے فرار ہونے کے بعد کہیں چھپنے نہیں دے گا۔ دوڑا دوڑا کر کتے کی موت مارے گا۔

داؤد اسرار اور جبار الفائدی جیسے وطن فروشوں کے کاندھوں پر اتحادی فوج کی بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے ذریعے مجاہدین کو کچل ڈالنا چاہتے تھے۔

یہ سامراجی قوتیں بھول رہی تھیں کہ عراق کی زمین پر صدیوں سے ایسے معرکے برپا ہوتے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں سے لے کر کربلا تک کی تاریخ سے انہیں بہت کچھ سیکھنا چاہیے تھا کہ ظالم اور جابر کو کبھی عزت اور فتح نصیب نہیں ہوتی۔

چار ہزار سال پہلے اسی ملک عراق میں نمرود نے آگ بھڑکائی تھی اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اسے گلزار بنا دیا تھا۔

تین سو تیرہ صحابہ کرامؓ نے حضرت محمدؐ کی قیادت میں یہی سبق کفار کو سکھایا تھا۔ آج بھی سامراجی اور جارح قوتوں کو یہ سبق مل رہا تھا۔ عراق پر حملہ کرنے کے بعد پانچ برسوں میں امریکا تین کھرب ڈالرز اور برطانیہ دس ارب پاؤنڈز جنگ میں جھونک چکے ہیں۔ ہزاروں امریکی اور برطانوی فوجی ہلاک اور اپاہج ہو چکے ہیں۔

امریکی تھنک ٹینک کا بیان ہے کہ عراق کی جنگ ویت

نام کی جنگ سے تین گنا زیادہ بھاری پڑ رہی ہے۔

ایسی ضدی جارحیت کا ایک دردناک پہلو یہ ہے کہ عراق سے واپس جانے والے فوجی مسلسل تھکن اور جی متلانے کی شکایت میں مبتلا رہتے ہیں۔ کیمیاوی اور جراثیمی ہتھیار استعمال کرنے..... کے باعث جینیٹک وائرس ان فوجیوں کی بیویوں میں منتقل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ہونے والے بچوں میں پیدائشی نقائص لازمی ہو جاتے ہیں اور ان کی بیویاں نسوانی پیچیدہ امراض میں مبتلا رہتی ہیں۔ امریکا اور برطانیہ میں ایسی بیماریوں کو ”سینڈرم آف گلف“ یعنی خلیج کی بیماری کہا جاتا ہے۔

کٹھ پتلی حکمران اور افسران اپنی ہی عراقی عورتوں مردوں بچوں اور بزرگوں پر دشمنوں کی طرح ظلم کر رہے تھے۔ ان کی نظروں میں صرف وطن کی ہی نہیں، دینِ اسلام کی بھی اہمیت نہیں رہی تھی۔ جبار الفائدی بھی نام کا مسلمان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بصرہ کی عظیم الشان لائبریری میں چند نایاب اور قدیم مخطوطات ہیں۔ سات سو سال پہلے حضرت محمدؐ کی حیاتِ طیبہ پر جو کتاب لکھی گئی تھی، وہ اس کتب خانے میں موجود ہے۔ جبار اس کتاب کو کسی دوسرے اسلامی ملک میں فروخت کر کے لاکھوں ڈالرز کما سکتا تھا۔

مارچ 2003ء کے بعد بصرہ میں ایسی بمباری ہوئی کہ وہ کتب خانہ کھنڈر بن گیا۔ قیمتی کتابیں اور قدیم نسخے تباہ ہوگئے۔ جبار وہاں دیر سے پہنچا۔ اس نے ملبے میں خزانہ تلاش کیا۔ اسے نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ پر کتاب نہیں ملی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کتب خانے کا انچارج ایک بوڑھا تھا۔ اس بوڑھے نے بمباری سے پہلے حیاتِ طیبہ سمیت قدیم نسخے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیے تھے۔ جبار کے لیے سرمایہ محفوظ تھا۔ وہ اسے حاصل کر سکتا تھا۔

وہ اس بوڑھے کے گھر پہنچا۔ وہاں اس کی میت رکھی ہوئی تھی۔ وہ بے چارہ بمباری کے دوران زخمی ہو گیا تھا۔ اسے اسپتال پہنچایا گیا تھا لیکن زخموں کی تاب نہ لا کر وہ اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔

جبار آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹیز کے طور پر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ لوگ آرمی اور پولیس والوں کے ظلم و ستم سے سہمے رہتے تھے۔ انہیں دیکھ کر بیٹھنے والے میت سے دور ہو گئے۔ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔

جبار نے اس کی بیوہ سے کہا۔ ”لائبریری کی کتابیں اس گھر میں لائی گئی ہیں، انہیں ہمارے حوالے کر دو۔“

خاتون نے کہا۔ ”کتابیں یہاں نہیں ہیں۔ کسی دوسری محفوظ جگہ پہنچائی گئی ہیں۔“

سپاہیوں نے گھر کے ایک ایک حصے کی تلاشی لی۔ انہیں ایک بھی قدیم نسخہ نہیں ملا۔ جبار نے پوچھا۔ ”وہ اہم نسخے اور کتابیں کہاں پہنچائی گئی ہیں؟“

وہ بولی۔ ”میں نہیں جانتی۔ میرا بیٹا پرویز جانتا ہے۔ بغداد میں کہیں فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ باپ کے جنازے کو کندھا دینے کے لیے یہاں آ نہیں پا رہا ہے۔“

جبار نے کہا۔ ”اس سے فون پر بات کراؤ۔“

خاتون نے اپنے فون کے ذریعے بیٹے سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”یہاں پولیس والے چھاپا مارنے آئے ہیں۔ لائبریری کے تمام اہم نسخے اور کتابیں طلب کر رہے ہیں۔ تلاشی لینے کے لیے ہمارے گھر کا تمام سامان الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ یہاں تمہارے باپ کا جنازہ رکھا ہوا ہے۔ کندھا دینے والے ان کے خوف سے...“

جبار نے اس سے فون چھین کر کان سے لگایا پھر کہا۔ ”ہیلو... میں جبار الفائدی آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی بول رہا ہوں۔ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بتاؤ... قدیم نسخے اور نبی کریمؐ کی کتاب حیاتِ طیبہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟“

پرویز اکبر نے کہا۔ ”یہ دینی سرمایہ ایمان والوں کے پاس محفوظ ہے۔ جب امریکی اتحادی فوجیں ہمارے ملک سے نکل جائیں گی، حالات سازگار ہوں گے تو حیاتِ طیبہ سمیت تمام قدیم نسخے لائبریری میں واپس لائے جائیں گے۔“

”بکواس مت کرو۔ ساری کتابیں ابھی یہاں لاؤ۔ ہم انہیں حفاظت سے رکھیں گے۔“

”تم سب امریکا کے غلام ہو۔ اپنے ہی ملک کو کیسے لوٹ رہے ہو، یہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں محفوظ ذخیرے سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔“

”میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔ ابھی پانچ منٹ کے اندر تمہاری ماں کو گولی مار دوں گا۔ اس کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً بولو... کتنے وقت میں میرے مطالبات پورے کرو گے؟“

”میری بوڑھی ماں پر ظلم نہ کرنا۔ لائبریری کا تمام سرمایہ مجاہدین کی تحویل میں ہے۔ میں وہاں سے ایک کتاب بھی نہیں لا سکوں گا۔“

جبار نے کہا۔ ”پانچ منٹ گزر گئے۔ اب ماں کی چیخ سنو۔“

پرویز نے فائر کی آواز کے ساتھ چیخ سنی۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر ماں کو آوازیں دینے لگا۔ جبار نے کہا۔ ”یہ

www.pkdigest.com

تمہاری آواز سے دور جا چکی ہے۔ اب یہاں سے ایک نہیں دو جنازے اٹھیں گے۔"

وہ غصے سے جبار کو گالیاں دینے لگا۔ اس نے کہا۔ "یہاں کمند ڈال دیتے تو آؤ گے ہی۔ تب گالیوں کا حساب کروں گا اور جب تک نہیں آؤ گے' تب تک میتیں یہیں پڑی رہیں گی۔ تمہارا کوئی محلے پڑوس والا ادھر آنے کی غلطی نہیں کرے گا۔"

پرویز اکبر مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے غصے میں گالیاں دے کر اسے جانی دشمن بنا لیا تھا۔ ویسے بھی وہ دشمن تھا اور کافروں سے بدتر تھا۔ اس نے کتاب حیات طیبہ سے لاکھوں ڈالرز کمانے کے لیے ایک بوڑھی بیوہ کو قتل کیا تھا۔ اس گھر میں ایک میت کا اضافہ کیا تھا۔ بیٹا آتا تو تیسری میت کا بھی اضافہ کر دیتا۔

عجیب بے بسی تھی۔ محلے والے دور دور سے پرویز اکبر کے مکان کو دیکھ رہے تھے۔ دروازے کے باہر جنازہ تیار تھا۔ دوسری لاش گھر کے اندر پڑی تھی۔ قانون کے محافظ ڈاکو بن کر آئے تھے۔ وہ سب ہی مسلح تھے۔ ان کے ہتھیار گویا قتل کرنے کا لائسنس تھے۔ کوئی انہیں قانونی گرفت میں نہیں لاسکتا تھا۔

دوپہر سے شام ہو گئی۔ پرویز اکبر نے مجاہدین کو اپنے حالات بتائے اور ان سے پوچھا۔ "میرے والدین کی تدفین کیسے ہو گی؟ جبار میتوں کے قریب کسی کو جانے نہیں دے رہا ہے۔ رات گزر جائے گی' پھر کل کا دن بھی گزر جائے گا۔ کیا وہ میتیں ویسے ہی رکھی رہیں گی؟"

مجاہدین جانتے تھے کہ جبار درندہ ہے۔ اس کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو وہ اس محلے میں بے گناہوں کی لاشیں گراتا رہے گا۔ انہوں نے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ پھر رات کی تاریکی میں اچانک اس محلے میں گھس آئے۔ جبار کی پولیس فورس پر ایسی گولیاں برسائیں کہ وہ تتر بتر ہو گئے۔

حملہ ان کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ جوابی فائرنگ کرتے ہوئے جانیں بچاتے ہوئے وہاں سے بھاگنے لگے۔ جبار کو بھی میدان چھوڑنا پڑا۔ مجاہدین ان دونوں میاں بیوی کی لاشیں اپنی گاڑیوں میں ڈال کر لے گئے۔

جبار القائدی اپنی طاقت اور ناجائز اختیارات سے کام لینے کے باوجود ناکام رہا تھا۔ لاکھوں ڈالرز کمانے کے لیے کتاب حیات طیبہ اس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ اس نے کئی ماہ بعد ایک موقع پر پرویز اکبر کو بھی گولی مار دی۔ یوں سات سو سال قبل لکھی ہوئی حیات طیبہ کی حفاظت کرتے ہوئے اس خاندان کے تمام افراد شہید ہو گئے۔

اب وہ حارث کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ گورے آقاؤں نے کہا تھا' وہ اسے سلیمانیہ شہر سے باہر نکلنے نہ دے۔ اس سے پہلے ہی زندہ یا مردہ پکڑ کر لے آئے۔ لیکن اپنی مسلح فورس تیار کرتے ہوئے جبار کا کچھ وقت ضائع ہو گیا تھا اور حارث اس شہر سے بہت دور نکل آیا تھا۔

اس کا دشمن ایک جبار ہی نہیں تھا' پورے عراق کی آرمی اور پولیس والوں تک اس کی تصویریں پہنچائی گئی تھیں۔ سب ہی اپنے اپنے علاقوں میں محتاط اور مستعد ہو گئے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ مجاہدین کی فورس اور بھرپور اسلحہ ہے۔

مجاہدین کے مختلف گروہوں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہاں روپوش رہتے ہیں؟ وہ اپنی پناہ گاہیں بدلتے رہتے تھے۔ کچھ ایسے علاقے تھے جہاں آرمی اور پولیس والے حملے کرنے کے بعد بھاری نقصان اٹھا کر واپس آئے تھے۔ پھر انہوں نے جھنجلا کر وہاں مسلسل بمباری کی تھی۔ انسانی آبادی کا نام و نشان مٹا دیا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ ان کی پناہ گاہوں تک پہنچ نہیں پائے تھے۔

جبار کو یقین تھا کہ حارث کو کہیں مستقل پناہ نہیں ملے گی۔ پورے عراق میں اسے تلاش کیا جا رہا تھا۔ وہ صبح سے شام تک اپنے وسیع ذرائع استعمال کرتا رہا۔ جہاں سے بھی اس کی سُن گُن ملتی' وہ وہاں پہنچ جاتا تھا۔ آخر اس کی پولیس موبائل ایک پہاڑی ٹیلے کے پاس آ کر رک گئی۔

ان سب نے گاڑی سے اتر کر دیکھا۔ ٹیلے کی بلندی پر وہ کانونٹ ایک مضبوط قلعے کی طرح دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جبار نے اپنے دست راست کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "زبیر! ہمارا شکار یہاں ہے۔"

زبیر نے کہا۔ "سر! اس کے احاطے میں کسی مرد کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ دوست ہو یا دشمن' کوئی ادھر نہیں جاتا۔"

"بے شک... سب ہی اس عبادت گاہ کا احترام کرتے ہیں۔ کوئی مرد وہاں نہیں جاتا لیکن ایک مجرم کے لیے یہ چھپنے کی بہترین جگہ ہے۔"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ حارث اور اس کے ساتھی یہاں اسلحہ کے زور پر پناہ حاصل کر سکتے ہیں۔"

"یہ کہو کہ پناہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہم یقیناً انہیں دبوچ لیں گے۔"

"کیا اندر جانے کے لیے فادر سے اجازت لینی ہو گی؟"

"ادھر ہم اپنی آمد کی خبر دیں گے' اجازت لیں گے... ادھر وہ ہوشیار ہو جائیں گے اور دوسرے راستوں سے فرار ہو جائیں گے۔"

"سمجھ گیا سر... ! ہم اس... وسیع چار دیواری میں چپ چاپ داخل ہوں گے۔"

"ہاں۔ پہلے اس کی بلند دیواروں کے چاروں طرف گھوم کر دیکھیں گے۔ فرار ہونے کے لیے کوئی بھی دوسرا دروازہ ہو گا تو اسے باہر سے بند کر دیں گے۔ پھر اندر جائیں گے۔"

یہ اطلاع دی گئی تھی کہ حارث تین مجاہدین کے ساتھ ہے جبکہ جبار کے ساتھ دس مسلح سپاہی تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی زیادہ تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ حارث کو زندہ بچ کر جانے نہیں دے گا۔

شام کے سائے رات کی تاریکی میں بدل رہے تھے۔ ایک آدھ گھنٹے میں چاند نکلنے والا تھا۔ وہ سب ایک دوسرے سے جدا ہو کر کانونٹ کے چاروں طرف پھیلنے لگے۔ انہیں جلدی نہیں تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے رات کے کسی حصے میں شب خون مارنے والے تھے۔

وہاں حارث تو نہیں تھا مگر اس کی محبوبہ تھی۔ اتحادیوں سے اور اپنے ہی ملک کی پولیس سے چھپنے کے لیے راہبہ بن گئی تھی۔ وہاں فوج اور پولیس تو کیا' کوئی اعلیٰ حاکم بھی احاطے کے اندر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ یاقوت کو اطمینان حاصل ہوا تھا کہ کانونٹ میں رہ کر دشمنوں کی گرفت میں نہیں آئے گی۔

لیکن اسی رات معلوم ہوا کہ آسمان سے گر کر کھجور میں آ کر اٹک گئی ہے۔ وہاں خلاف توقع ایک دشمن پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے مطالبہ کر رہا تھا کہ کوٹھری کا دروازہ کھولے اور خود کو اس کے حوالے کر دے۔

پتا نہیں وہ کون تھا؟ یہ جانتا تھا کہ وہ آرمی اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ اتحادیوں سے منہ چھپانے کے لیے وہاں چھپی ہوئی ہے۔ اگر اس کا مطالبہ پورا نہیں کرے گی تو دوسرے دن فادر اور مدر کے سامنے اس کا بھید کھل جائے گا۔ اسے کانونٹ سے نکال دیا جائے گا۔ پھر وہ دشمن اتحادیوں کی جھولی میں جا گرے گی۔

یاقوت نے بڑی مشکل سے ایک رات کے لیے اسے ٹالا تھا۔ یہ وعدہ کیا تھا کہ سوچے گی' سمجھے گی۔ اپنے حالات پر غور کرے گی۔ پھر دوسری رات خود کو اس کے حوالے کرے گی۔

اسے کیسا سوچنا سمجھنا تھا؟ وہ مہلت لے کر وہاں سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے اس امید پر مہلت حاصل کی تھی کہ شاید کسی طرح بچاؤ کا راستہ نکل آئے۔ ہو سکتا ہے' اس دشمن کو موت آ جائے' وہ بھید کھولنے سے پہلے ہی مر جائے اور وہ اس کے مرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

اس کانونٹ میں صرف چار مرد تھے۔ ایک فادر' ایک کلرجی مین' ایک کانونٹ کا منتظم اور ایک اور شخص تھا جو ضرورت کا تمام سامان باہر سے لایا کرتا تھا۔ ان میں سے تین عراقی عیسائی تھے۔ صرف فادر کا تعلق یورپ سے تھا۔ یاقوت کو شبہ تھا کہ ان تین مقامی باشندوں میں سے کوئی ایک اس کا دشمن ہے۔

اس نے دوسرے دن سوچ لیا کہ جب بھی ان تینوں سے سامنا ہو گا تو وہ انہیں تاڑنے کی کوشش کرے گی۔ معلوم کرے گی' آخر کون اس کے پیچھے پڑ گیا ہے؟

فادر سے دن میں کئی بار سامنا ہوتا تھا۔ عبادت کے وقت کلرجی مین ان کے روبرو رہتا تھا۔ اس کے بعد پھر کوئی مرد کسی راہبہ کے قریب سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ ایسی جگہ اس دشمن کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔ یاقوت وہاں میریا کے ذریعے داخل ہوئی تھی۔

اس نے بائبل پڑھتے وقت دھیمی آواز میں میریا سے کہا۔ "کل رات کوئی میرے دروازے پر آیا تھا۔ میں نے دروازہ نہیں کھولا مگر آج کھولنا پڑے گا۔ وہ مجھے مفرور لیڈی ڈاکٹر یاقوت کی حیثیت سے جانتا ہے۔"

میریا نے بائبل پڑھنے کے انداز میں ذرا آگے پیچھے ملتے ہوئے کہا۔ "اوہ گاڈ! پتا نہیں تم کس کی نظروں میں آ گئی ہو؟ میں تمہیں لائی ہوں۔ تمہارا بھید کھلے گا تو میری بھی شامت آ جائے گی۔"

یاقوت نے کہا۔ "اس شخص کو پہچان کر اس سے کوئی سمجھوتا کرو۔"

"میری اور اپنی بہتری چاہتی ہو تو اس کا مطالبہ پورا کرو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"راستہ ہے... میں جان دے دوں گی' اس کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

"تم مر جاؤ گی۔ پولیس تفتیش کے لیے آئے گی۔ تم پہچانی جاؤ گی۔ مجھ پر الزام آئے گا کہ میں تمہیں یہاں چھپانے کے لیے لائی تھی۔ تم تو مرو گی' مجھے بھی لے مرو گی۔"

وہ زیادہ باتیں نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ طے کیا کہ اس شخص

www.pkdigest.com

کو پہچان کر اس سے بات کی جائے گی۔ رات ہونے سے پہلے کسی طرح اسے ٹالنے کی کوشش کی جائے گی۔

وہاں چار مرد تھے۔ چاروں ہی پارسا دکھائی دیتے تھے۔ شرافت اور نیک نیتی کے باعث وہاں ان کی رہائش مستقل تھی۔ یاقوت اور میریا کسی پر انگلی نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ پھر یہ کہ ان سے کبھی کبھی کسی ضرورت کے تحت سامنا ہوتا تھا۔ ایسے وقت بھی مدر بولتی تھی۔ راہبائیں خاموش رہتی تھیں۔

کچھ نہ ہوسکا' دن ڈھل گیا۔ رات ہوگئی۔ تمام راہبائیں رات نو بجے کھانے کے بعد اپنی اپنی کوٹھری میں چلی گئیں۔ یاقوت نے اپنی کوٹھری میں آکر دروازے کو اندر سے بند کرلیا اور تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ رات دس بجے سے پہلے لائٹ بجھا دینے کا حکم تھا۔ اس نے لائٹ آف کر کے زیرو پاور.... ایک بلب روشن کردیا۔

ایسے وقت اس کے اندر گھبراہٹ اور بے چینی نہیں تھی۔ جب یہ فیصلہ ہوجائے کہ مرنا ہے اور ہر حال میں مرنا ہے تو پھر سزائے موت پانے والے کے اندر ایک ذرا ٹھہراؤ آجاتا ہے کہ مرنا تو ہے ہی تو پھر ڈرنا یا رونا کس لیے...؟

وہ آنے والا بہت بے چین تھا۔ تمام کوٹھریوں کی لائٹس آف ہوتے ہی چلا آیا۔ دروازے پر بہت ہلکی سی ”ٹھک“ کی آواز سنائی دی۔

اس نے ادھر دیکھا۔ دروازے پر بنی ہوئی بالشت بھر کی کھڑکی کا پٹ بند تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے لگی، تب دوسری بار وہی ٹھک کی آواز سنائی دی۔

وہ تخت سے اتر کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں آئی۔ پھر اس نے دروازے کو ایک انگلی سے بجایا۔ جواباً باہر سے پھر ویسی ہی دستک سنائی دی۔ یاقوت نے کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر تاریکی تھی۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اس کی دھیمی سی بھاری بھرکم سرگوشی سنائی دی۔ ”کھڑکی نہیں' دروازہ کھولو۔“

یاقوت نے کہا۔ ”مجھ پر رحم کرو۔ میں بے حیا بدکار نہیں ہوں۔ مجھے بے داغ رہنے دو۔“

”کسی بے داغ سے کھیلنے پر فخر حاصل ہوتا ہے کہ اس عورت کے پہلے فاتح ہم ہیں۔“

”کیا تمہیں ایک ذرا احساس نہیں ہوتا کہ ایک مجبور پر ظلم کررہے ہو؟“

”یہ باتیں اندر بھی ہوسکتی ہیں۔ دروازہ کھولو۔“

وہ بے بسی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی باہر جائے گی۔ پہلے میں لائٹ بجھاتی ہوں۔ بعد میں اسے آن کیا جائے گا۔“

اس نے سوئچ بورڈ کے پاس جاکر زیرو پاور کے بلب کو بجھا دیا۔ گہری تاریکی چھا گئی۔ گہری پُراسرار تاریکی میں خود کو اپنا وجود دکھائی نہیں دیتا۔ وہ دونوں عارضی طور پر اندھے ہوگئے تھے۔

پھر اندھے کو معلوم ہوا کہ دروازہ کھل گیا ہے۔ یاقوت کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ ”آجاؤ... سیدھے تین قدم آگے جاؤ۔ میں دروازہ بند کرنے کے بعد لائٹ آن کروں گی۔“

وہ اندر آکر تین قدم چلتے ہی تخت سے ٹکرا گیا۔ وہاں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ایسے وقت دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”سوئچ بورڈ کہاں ہے؟ لائٹ آن کرو۔“

اسے جواب نہیں ملا۔ کوٹھری میں گہری تاریکی اور خاموشی رہی۔ روشنی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو تم؟“

تب دروازے پر ہلکی سی ٹھک کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”دروازہ کیوں بجا رہی ہو؟ یہاں آؤ۔ لائٹ آن کرو۔“

پھر وہی ٹھک کی آواز ابھری۔ اس نے سوچا' کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ فوراً ہی تخت سے اتر کر اندھے کی طرح دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر ایک دیوار کے پاس آیا۔ ادھر اُدھر ہاتھ مارنے پر سوئچ بورڈ مل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں زیرو پاور کی روشنی جل اٹھی۔

مچھلی ہاتھ سے پھسل گئی تھی۔ کوٹھری اس کے وجود سے خالی تھی۔ اس نے تخت کے نیچے جھانک کر دیکھا پھر دروازے کے پاس آکر اسے کھولنا چاہا۔ وہ کھل نہ سکا۔ باہر سے بند ہوچکا تھا۔

آپ اپنے دام میں صیاد آگیا...

اس نے بالشت بھر کی کھڑکی کے پٹ کو کھولا۔ باہر تاریکی تھی' وہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی دھیمی سی سرگوشی سنائی دی۔ ”اب تم پنجرے میں ہو۔ باہر کیسے آؤ گے؟“

وہ غصے سے دانت پیس کر بولا۔ ”دروازہ کھولو... ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔“

”پہلے تنہا پچھتاتی' تنہا ماری جاتی' اب تمہیں اپنی صفائی میں بیان دینا ہوگا کہ میری کوٹھری میں کیسے پہنچ گئے؟“

”میں کہہ دوں گا کہ تمہیں مفرور ملزمہ کے طور پر جانتا تھا۔ تم نے مجھے بدنام کرنے کے لیے یہاں دھوکے سے بلا کر قید کردیا ہے۔“

”پوچھا جائے گا' جب میری اصلیت جانتے تھے تو مدر اور فادر کو رپورٹ کیوں نہیں دی؟ پولیس کو انفارم کیوں نہیں کیا؟ میری کوٹھری میں کیوں چلے آئے؟“

”بکواس مت کرو۔ میں خود کو کسی طرح بچالوں گا۔ تم ماری جاؤ گی۔“

”میری فکر نہ کرو۔ خود کو بچاؤ۔ چیخو چلاؤ۔ دروازہ کھولنے کے لیے فادر اور مدر کو آوازیں دو۔ میں جارہی ہوں۔“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں... تم نہیں جاسکتیں۔ رک جاؤ۔ مجھ سے سمجھوتا کرو۔“

”تم نے کیا سمجھوتا کیا تھا؟ کسی بے داغ عورت سے کھیل کر فخر حاصل کرتے ہو نا؟ فخر کرو... آؤ! میرے فاتح بنو۔“

”پلیز یاقوت! عقل سے کام لو۔ تمہاری نادانی سے ہم دونوں ڈوبیں گے۔ تمہاری ذہانت اور سمجھوتے سے دونوں کو امان ملے گی۔ میں یہاں تمہارا بھید نہیں کھولوں گا۔“

”میں نادان بچی نہیں ہوں۔ تمہاری کمینگی اور خباثت کو خوب سمجھ رہی ہوں۔ دروازہ کھلتے ہی تم پھر گیدڑ سے شیر بن جاؤ گے۔“

”اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ یہاں سے نکل پاؤ گی تو یہ ممکن نہیں ہے۔“

وہ بولی۔ ”میرے لیے باہر موت ہے۔ اس لیے مدر کے پاس جارہی ہوں۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تمہارا راز نہیں کھلے گا۔ ہم یہاں دوست بن کر رہیں گے۔ مدر کے پاس جاکر اپنا بھید نہ کھولو۔ میں تمہارا رازدار بن کر رہوں گا۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ اسے جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”میری باتیں سن رہی ہو؟ جواب دو...“

باہر خاموشی رہی۔ اس نے کہا۔ ”یاقوت...! اونو۔ تم یاقوت نہیں ہو۔ یہاں تمہارا نام مریم ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ تم یاقوت ہو۔ پلیز! دروازہ کھولو...“

باہر چاند نکل آیا تھا۔ کوٹھری کی طرف دھیمی دھیمی سی چاندنی جھلک رہی تھی۔ وہ بالشت بھر کھڑکی سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی جواب بھی نہیں مل رہا تھا۔ وہ جاچکی تھی۔ شکاری شکار ہوکر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

مدر مارتھا سونے سے پہلے کھڑکی کے پاس آئی تھی۔ وہاں سے احاطے کی اونچی دیواریں دور تک دکھائی دیتی تھیں۔ ایک سمت چرچ نظر آرہا تھا۔ دوسری طرف خانقاہ تھی۔ وہ فادر اور کلرجی مین کی رہائش گاہ بھی تھی۔ چاندنی میں دور تک دیکھا جاسکتا تھا۔ ایسے وقت مدر نے چونک کر دیکھا چند مسلح اجنبی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ اجنبی احاطے کی دیوار سے لگ کر دبے قدموں چلتے ہوئے چرچ کی طرف جارہے تھے۔ تین مسلح افراد نے خانقاہ کا رخ کیا تھا' وہ سائے کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور راہباؤں کی کوٹھریوں کی طرف جارہے تھے.... صورتِ حال کہہ رہی تھی کہ اس کانونٹ کا تقدس پامال ہونے والا ہے۔

وہاں صرف فادر اور مدر کے پاس موبائل فون رہتا تھا۔ مدر نے فوراً ہی فادر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے مسلح اجنبیوں کو دیکھ رہی ہوں۔ پتا نہیں یہ کون ہیں؟ ہمارے کانونٹ میں گھس آئے ہیں۔“

فادر نے کہا۔ ”آرمی یا پولیس والے ہوں گے۔ آج صبح سلیمانیہ کے ڈیتھ ہاؤس کو بم دھماکے سے کھنڈر بنا دیا گیا ہے۔ سزائے موت پانے والے کئی قیدی فرار ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ انہیں تلاش کرتے آئے ہوں گے۔“

”انہیں اجازت لے کر اندر آنا چاہیے تھا۔“

فادر نے کہا۔ ”معاملات زیادہ سنگین ہوں تو اجازت حاصل نہیں کی جاتی۔ اچانک چھاپے مارے جاتے ہیں۔ فکر نہ کرو میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔“

فون کا رابطہ ختم ہوگیا۔ دروازے پر دستک سنائی دی۔ مدر نے ادھر جاتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

یاقوت کی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں... مریم۔ پلیز! دروازہ کھولیں۔“

وہ سچ بولنے آئی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ جھوٹ کھلنے والا ہے۔ اس سے پہلے وہ اپنی روداد سنا کر مدر کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ مدر نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”گاڈ بلیس آن یو۔ تم اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں بہت گھبرا رہی ہوں۔ یہاں کئی مسلح اجنبی گھس آئے ہیں۔“

یہ ایسی بات تھی کہ یاقوت بھی گھبرانے لگی۔ اپنی بات کہنا بھول گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”مسلح افراد یہاں کیسے آگئے؟ کیا وہ آرمی اور پولیس والے ہیں؟“

”فادر یہی کہہ رہے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں' وہ باغی دہشت گرد ہوں گے تو کیا ہوگا؟“

اور یاقوت سوچ رہی تھی' وہاں گھس آنے والے آرمی اور پولیس کے آدمی ہوں گے تو کیا ہوگا؟ یہی ہوگا کہ اسے دیکھتے ہی پہچان لیں گے۔ جانور کی طرح اس کے گلے میں پھندا ڈال کر لے جائیں گے۔

www.pkdigest.com

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”مدر! وہ کوئی بھی ہوں... سب کے سب مرد ہیں۔ ہم راہباؤں کے ساتھ زیادتی کریں گے۔ یہاں کوئی ہماری عزت بچانے نہیں آئے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”ہاں۔ مجھے بھی یہی فکر ہے۔ میں اور فادر کانونٹ کے تقدس کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ میرے لیے کچھ کر سکتی ہیں؟ اگر اس الماری کے اندر جگہ ہے تو میں چھپ جاؤں گی۔“

بیڈ کے ایک بڑے سے ٹوکرے میں ڈھیر سارے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ مدر نے کہا۔ ”تم اس کے اندر چھپ سکتی ہو۔ کوئی شبہ نہیں کرے گا۔“

مدر نے ٹوکرے میں سے کپڑے باہر نکالے۔ یاقوت اس کے اندر جا کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ مدر نے تمام کپڑے اس پر ڈال دیے۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ باہر سے جبار القائدی نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دروازہ کھولو... ورنہ توڑ دیا جائے گا۔“

مدر نے کہا۔ ”ویٹ مائی سن! یسوع تمہیں سکون دے۔ میں دروازہ کھول رہی ہوں۔“

اس نے جیسے ہی دروازہ کھولا' باہر سے ایک لات پڑی۔ وہ دروازہ مدر کے منہ پر آ کر لگا۔ وہ تکلیف سے کراہتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔ جبار دو سپاہیوں کے ساتھ دندناتا ہوا اندر آیا پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

مدر کا سر گھوم رہا تھا۔ وہ بولنے کے قابل نہیں تھی۔ اشارے سے بولی۔ ”یہاں کوئی نہیں ہے۔“

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کمرے میں نہیں ہے لیکن اس عمارت میں کہیں ہے۔“

سپاہی بیڈ کے نیچے اور مختلف سامان کے پیچھے تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے الماری کھول کر دیکھی۔ ایک سپاہی نے کپڑوں سے بھرے ہوئے ٹوکرے کو لات ماری۔ وہ ٹوکرا ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ لات مارنے والے کو اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ بھاری ہے۔

مدر نے بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”مائی سن! تم کسے تلاش کر رہے ہو؟“

جبار ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ ”وہ کتا ہے۔ اس کا نام حارث ہے۔ اسے موت کی سزا ملنے والی تھی مگر وہ ڈیتھ ہاؤس سے فرار ہو گیا ہے۔“

یہ بات ایسی تھی کہ یاقوت ٹوکرے کے اندر بیٹھے بیٹھے خوشی سے لرز گئی۔ باہر ہوتی تو ناچنے لگتی۔ وہ پھر اس کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔ یہ بھول گئی کہ خود سلامتی کی محتاج ہے۔

ایسے ہی وقت تڑاتڑ فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ جبار نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے' میرے رائٹ ہینڈ زبیر نے دشمن کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ یقیناً حارث کے آدمیوں سے فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے۔“

اس کے فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں بولو زبیر! کیا وہ نظروں میں آ گیا ہے؟“

وہ بولا۔ ”نو سر! ہم اس کی نظروں میں تھے۔ اچانک ہی اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ ہمارے چار سپاہی مارے گئے ہیں۔ میں اس وقت چرچ میں چھپا ہوا ہوں۔ معلوم کر رہا ہوں' وہ عمارت کے کس حصے میں ہو گا؟“

جبار نے کہا۔ ”تم اُدھر سے اسے گھیرو۔ میں اِدھر سے آ رہا ہوں۔ اُسے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا۔“

وہ فون پر بولتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ مدر نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر ٹوکرے سے کپڑے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”وہ جا چکے ہیں۔ بہت ہی ظالم ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے' یہ لوگ ایک مدر کا بھی احترام نہیں کرتے۔ وردی پہن کر فرعون بن جاتے ہیں۔“

وہ ٹوکرے سے باہر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور حارث کے لیے پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ ’وہ تنہا ہو گا' پتا نہیں پولیس والے کتنی تعداد میں ہیں؟ کیا وہ یہاں سے نکل پائے گا؟

’وہ یہاں کیوں آیا ہے؟ کیا مجاہدین نے اسے بتایا ہے کہ میں یہاں رہتی ہوں؟

’یقیناً بتایا ہو گا اور وہ دیوانہ خطرات مول لے کر مجھ سے ملنے چلا آیا۔‘

وہ بڑے فخر سے سوچ رہی تھی۔ ’اسے معلوم ہونا چاہیے کہ میں یہاں مدر کے کمرے میں ہوں۔ وہ دشمنوں سے لڑتے ہوئے مجھے ڈھونڈ رہا ہو گا۔ یا اللہ! میں کیا کروں؟ اسے یہاں کیسے بلاؤں؟‘

اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے سوچا۔ ’کیا میں اسے ڈھونڈنے کے لیے جاؤں؟‘

پھر فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ آوازیں سمجھا رہی تھیں کہ مدر کے کمرے سے باہر جانا بہت بڑی حماقت ہو گی۔ باہر جبار کے فون پر کالنگ ٹون سنائی دی۔ پھر وہ فون پر کہنے لگا۔ ”ہاں زبیر! بولو۔“

وہ بڑے فخر سے بولا۔ ”سر! میں نے حارث کے ایک آدمی کو مار دیا ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ویل ڈن۔ یہ معلوم کرو کہ حارث کہاں ہے؟“

”میں جگہ بدل رہا ہوں۔ جلد ہی اسے نشانے پر لے آؤں گا۔“

اچانک ہی قریب سے گولیاں چلنے لگیں۔ وہ چھلانگ لگا کر ایک ستون کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے اس نے دور تک دیکھا تو دل ڈوبنے لگا۔ چاند کی روشنی میں اس کے تین سپاہیوں کی لاشیں زمین پر پڑی تھیں۔

ابھی زبیر نے خوش خبری سنائی تھی کہ حارث کا ایک ساتھی مارا گیا ہے اور چند منٹوں میں ہی اس کے تین سپاہی مارے گئے تھے۔ ان سے پہلے چار مر چکے تھے۔ اب وہ دس میں سے تین رہ گئے تھے۔

عقل کہہ رہی تھی کہ حارث کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ بڑی کامیابی سے چھپ کر حملے کر رہا تھا۔ اب تک کے نتائج سے یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ان سب کو جہنم میں پہنچا کر وہاں سے فرار ہو جائے گا۔

اب جبار کو مزید سپاہیوں اور ہتھیاروں کی ضرورت تھی۔ وہ ایک کال کرتا اور یہ اطلاع دیتا کہ حارث مجاہدین کے ساتھ کانونٹ میں چھپا ہوا ہے تو آرمی والے آ کر اس عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیتے۔

اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے تو معلوم ہوا' بیلنس ختم ہو چکا ہے۔ وہ کال وصول کر سکتا تھا' کر نہیں سکتا تھا۔ فی الوقت کسی کو مدد کے لیے طلب نہیں کر سکتا تھا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ زبیر اسے کال کرتا' تب اس کے ذریعے آرمی یا پولیس والوں کو مدد کے لیے بلایا جاتا۔ فی الحال بدترین حالات کا سامنا تھا۔

حارث عمارت کے اس حصے میں تھا جہاں راہباؤں کے لیے کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہاں تک چاند کی روشنی پہنچ نہیں رہی تھی۔ دور تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ تاریکی میں کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ محتاط انداز میں آس پاس دیکھتا ہوا دبے قدموں ایک سمت جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ٹھٹک گیا۔ ایک کوٹھری کے دروازے کے سامنے رک گیا۔

اس دروازے کی ننھی سی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اندر زیرو پاور کے بلب کی بجھی بجھی سی روشنی تھی۔ وہاں سے کسی مرد کی سرگوشی سنائی دی۔ ”جسٹ آ منٹ۔ پلیز! میری مدد کرو۔“

حارث نے خود کو چھپاتے ہوئے بالشت بھر کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا پھر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟ باہر کیوں نہیں آ رہے ہو؟“

”یہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ پلیز! اسے کھولو۔“

حارث نے جھک کر دیکھا۔ باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”کس نے تمہیں بند کیا ہے؟“

”میں تمہیں بتاؤں گا۔ پہلے باہر نکالو۔“

”پہلے بتاؤ۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تم دوست ہو یا دشمن؟ تمہیں میرے آدمیوں نے قید کیا ہے یا میرے دشمنوں نے؟“

”دشمن ہی مارتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ کسی دشمن نے مجھے قید کیا ہے۔“

حارث نے اتنا تو سمجھ لیا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ اصل بات بتائے بغیر باہر آنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا۔ ”ہم پولیس والے ہیں۔ یہاں باغیوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ سچ بولو' کیا تم باغیوں کے ساتھی ہو؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں... میں تو کلرجی مین ہوں۔ امریکی اتحادیوں کا تابع دار...“

حارث نے کہا۔ ”میں دیکھتا آ رہا ہوں' یہاں تمام کوٹھریوں میں راہبائیں رہتی ہیں۔ تم ایک نن کی کوٹھری میں کیسے قید ہو گئے؟“

اس نے کہا۔ ”میں ایک باغی دہشت گرد لڑکی کو پہچان گیا تھا۔ اس کے خلاف رپورٹ کرنے والا تھا۔ وہ مجھے دھوکے سے یہاں بند کر کے چلی گئی ہے۔ میں یہاں سے نکلتے ہی اسے گرفتار کراؤں گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”کون ہے وہ لڑکی؟ ابھی کہاں ہو گی؟“

”اس کا نام یاقوت ہے۔ وہ آرمی اسپتال کی لیڈی ڈاکٹر تھی۔ یہاں آ کر چھپی ہوئی تھی۔ ابھی فائرنگ ہو رہی ہے۔ پتا نہیں کہاں جا کر دبک گئی ہو گی؟“

حارث نے ایک گہری سانس لی۔ دل کی دھڑکنیں مچلنے لگیں۔ اسے ایک مجاہد نے فون کے ذریعے بتایا تھا کہ یاقوت نے دشمنوں سے چھپنے کے لیے کانونٹ میں پناہ لی ہے۔

اس کا خیال تھا کہ یاقوت کو فی الحال وہیں روپوش رہنا چاہیے۔ لیکن حارث نے اس پہاڑی ٹیلے کے قریب سے گزرتے وقت ایک جگہ پولیس وین دیکھی۔ اس گاڑی کے نمبر پڑھے۔ اسے بتایا گیا تھا کہ جبار القائدی اس نمبر کی موبائل میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

وہاں اس گاڑی کی موجودگی سے حارث نے سمجھ لیا کہ جبار اسے اور یاقوت کو تلاش کرنے کانونٹ کے اندر گیا ہے۔ تب ہی وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر ان سے مقابلہ کر رہا تھا۔

www.pkdigest.com

اب وہ جگہ اس کی یاقوت کے لیے محفوظ نہیں رہی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اب اس کی کوٹھری تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ نہیں تھی' وہاں اس کا رقیب تھا۔

اس نے کہا۔ "میں دروازہ کھولنے سے پہلے جاننا چاہتا ہوں کہ ایک لڑکی نے تمہارے جیسے ہٹے کٹے مرد کو یہاں کیسے بند کر دیا؟ تم چاہتے تو مدر اور فادر کو بلا لے آتے۔ اس کا بھید کھول دیتے لیکن تم تنہا اس کی کوٹھری میں کیوں آئے؟ صاف اور سیدھی بات بولو۔ تم بُرے ارادے سے آئے تھے؟"

"یہی سمجھ لو... دروازہ تو کھولو۔"

"میں سننا چاہتا ہوں' اس نے اپنی عزت کیسے بچائی؟ وہ باہر نکل گئی' تم اندر کیسے رہ گئے؟ پہلے بتاؤ پھر دروازہ کھلے گا۔"

اس نے مجبور ہو کر بتایا کہ یاقوت نے کیسی چال چلی تھی؟ کوٹھری میں اندھیرا کیا تھا۔ اسے اندر بلایا تھا۔ پھر تاریکی میں باہر نکل کر اسے وہاں قیدی بنا دیا تھا۔ حارث سن رہا تھا اور اپنی محبوبہ کی ذہانت پر فخر کر رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "ایک لڑکی نے الو بنا دیا۔ کیا تمہیں شرم آ رہی ہے؟"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "اس نے دھوکا دیا۔ میں سمجھ نہیں پایا۔ اب یہاں سے جاتے ہی اس کتیا کی اصلیت ظاہر کروں گا تو..."

اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ وہ گھبرا کر ذرا پیچھے گیا۔ حارث نے اس کا نشانہ لے کر کہا۔ "تو نے میری جان کو گالی دی ہے۔ اس منہ سے دی ہے۔"

اس نے منہ پر گولی ماری۔ وہ اچھل کر فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اس نے دوسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ گولیاں چلنے کی آواز گونجی تھی۔ دشمن ادھر آ سکتے تھے۔ وہ فوراً ہی اندھیرے میں چھپتا ہوا وہاں سے دور چلا آیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں چرچ' خانقاہ' راہباؤں کی رہائش گاہیں اور لائبریری وغیرہ کہاں ہیں؟ وہ اندازے سے بھٹک رہا تھا۔ کسی طرح جبار تک پہنچ کر اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وہ ایک جگہ تاریکی میں رک گیا۔ ایک دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا دکھائی دیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ یقیناً وہ زخمی تھا۔ آگے چل نہیں سکتا تھا۔ وہیں حارث کے قریب ایک چبوترے پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

ذرا سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے فون نکال کر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر جبار کی آواز سنائی دی۔ "زبیر! تم کہاں ہو؟ میں بڑی دیر سے تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ میرے فون میں بیلنس نہیں ہے۔ تم فوراً ہیڈ کوارٹر سے رابطہ کرو۔ انہیں بتاؤ کہ ہماری پوزیشن بہت کمزور ہے۔ حارث یہاں سے نکل بھاگے گا۔ فوراً کالونٹ کو گھیر لیا جائے۔"

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "ہاں۔ ہماری پوزیشن بہت کمزور ہو گئی ہے۔ صرف ہم دو رہ گئے ہیں اور میں زخمی ہو گیا ہوں۔ ایک گولی میری پسلی توڑ کر نکل گئی ہے۔ مجھے فوری طبی امداد کی ضرورت ہے۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ فون کرو۔ ہماری پولیس فورس کے ساتھ تمہارے لیے ایمبولینس بھی آ جائے گی۔"

"آل رائٹ۔ میں ابھی ہیڈ کوارٹر سے امداد طلب کرتا ہوں۔"

اس نے جبار سے رابطہ ختم کیا۔ اس کے بعد ہیڈ کوارٹر کے نمبر پنچ کرنا چاہتا تھا' اس سے پہلے ہی حارث نے ریوالور کی نال اس کی گردن سے لگا دی اور بڑی سفاکی سے کہا۔ "کال نہ کرو۔ ورنہ موت تمہیں کال کرے گی۔"

اس نے سہم کر فون بند کر دیا پھر کہا۔ "تم نے کسی کو زندہ نہیں چھوڑا ہے۔ مجھے بھی نہیں چھوڑو گے۔ پھر بھی پوچھتا ہوں' کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے؟"

حارث نے کہا۔ "پتا نہیں تم کتنے بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہو... اب مرنے سے ڈر رہے ہو؟"

"میں ڈرتا نہیں ہوں۔ موت تو کسی بھی وقت' کسی بھی بہانے سے آ سکتی ہے۔ پھر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ یہاں اچانک آ جائے گی۔"

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے فوری طبی امداد نہ ملی تو مر جاؤں گا یا ابھی تم مار ڈالو گے۔ لیکن گھر جانے تک زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہم انسان ہیں مگر حیوان سے بدتر ہیں۔ ہمارے جیسے ظالموں کے گھروں میں بھی پیار و محبت کے رشتے ہیں۔ میری امی کی سالگرہ ہے۔ کل صبح وہ پورے سو برس کی ہو جائیں گی۔"

وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولا۔ "مجھے دودھ پلانے والی سو برسوں سے زندہ ہے اور میں پچیس برس کی عمر میں فنا ہونے والا ہوں۔"

حارث نے کہا۔ "اس لیے کہ تم ماں کے دودھ کو اور انسانی لہو کو پانی کرتے آ رہے ہو۔"

"میں نے جو کیا' اس پر ندامت کا اظہار نہیں کروں گا۔ اگر یہ میرا آخری وقت ہے تو راہ راست پر آنے کی مہلت چاہوں گا۔"

"ہوں... کیا چاہتے ہو؟"

"امی کی گود میں سر رکھنا چاہتا ہوں۔ کل وہ سو برس کی ہو جائیں گی۔"

"شیطان کو مارو' تمہاری یہ خواہش پوری ہو جائے گی۔ مجھے جبار تک پہنچاؤ۔ میں تمہیں ماں تک پہنچاؤں گا۔"

"میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ مجھے فون کرنے دو۔ میں جبار سے بات کرتا ہوں۔"

حارث نے اجازت دے دی۔ اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے اس کی آواز سنائی دی۔ "ہاں زبیر! بولو... کیا ہیڈ کوارٹر سے مدد آ رہی ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہاں۔ وہ آنے والے ہیں۔ اب ہمیں ایک جگہ ہونا چاہیے۔ آپ ابھی کہاں ہیں؟"

"میں خانقاہ میں ہوں۔ یہاں دشمن آ سکتے ہیں اس لیے مدر کے کمرے کی طرف جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ادھر آ رہا ہوں۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ حارث فون سے کان لگا کر سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "تم میرے آدمیوں کی نگرانی میں رہو گے۔ اپنا فون مجھے دو۔ ہم یہاں سے جاتے وقت یہ تمہیں واپس کر دیں گے۔ پھر تم ہیڈ کوارٹر فون کر کے امداد طلب کرو گے۔"

زبیر نے کہا۔ "وہ لوگ یہاں آ کر پوچھیں گے کہ صرف میں کیسے زندہ رہ گیا؟"

"وہ ایسا احمقانہ سوال نہیں کریں گے۔ تم نے گولی کھائی ہے۔ تم زخمی ہو' وہ تمہیں اسپتال پہنچائیں گے۔ وہاں سے تم اپنی ماں کے پاس جا سکو گے۔"

حارث نے اپنے فون کے ذریعے دو ساتھیوں کو بلایا۔ زبیر کو ان کے حوالے کیا۔ انہیں سمجھایا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ احاطے کے مین گیٹ پر انتظار کریں۔ وہ جلد ہی ادھر آئے گا۔

اسے یاقوت تک پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ آخری دشمن کو ختم کیے بغیر اسے آزادی اور بے باکی سے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا خانقاہ کی طرف آیا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ مدر کی رہائش گاہ کہاں ہے؟

وہ ایک تاریک راہداری سے گزرتے وقت رک گیا۔ اس کی چھٹی حس نے کہا' وہ اس اندھیرے میں تنہا نہیں ہے۔

وہ ایک دروازے کے قریب دیوار سے لگ کر سُن گُن لینے لگا۔ گہری تاریکی' گہری خاموشی تھی۔ کوئی نہیں تھا۔ اس کا وہم ہو سکتا تھا لیکن وہ چوکنا رہنے کا عادی تھا۔ اپنی چھٹی حس کو اہمیت دیتا تھا۔ جہاں تھا' وہیں جم کر خاموش کھڑا رہا۔

ایسے وقت پھر اسے محسوس ہوا کہ آس پاس کوئی ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ کیسے دشمن کی موجودگی کا یقین کرے؟ اگر اس کی موجودگی معلوم نہیں ہوگی تو وہ آگے بڑھتے ہی' آہٹ پیدا کرتے ہی مارا جائے گا۔

تب عقل نے کام کیا۔ اس نے زبیر کا فون جیب سے نکال کر اسے کال کی۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد ہی اس دروازے کے پیچھے سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ حارث نے ریوالور سنبھالتے ہوئے ادھر دیکھا۔ دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ جبار کے فون کی ننھی سی اسکرین روشن تھی۔ وہ اسے کان سے لگا کر کہہ رہا تھا۔ "ہاں زبیر! بولو۔"

حارث نے اس روشن اسکرین سے اندازہ کیا پھر اسے نشانے پر لیتے ہوئے کہا۔ "میں بول رہا ہوں۔ گولی کی زبان سے..."

اس نے یہ کہتے ہی گولی چلا دی۔ وہ اچھل کر فرش پر گرا۔ سنسناتی ہوئی گولی دل کے قریب پیوست ہو گئی تھی۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ یہ ایسا اچانک حملہ تھا کہ وہ اپنا ہتھیار استعمال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ حارث دروازے کو پوری طرح کھولتا ہوا اندر آ گیا۔ چاندنی کے مدھم سے اجالے میں وہ فرش پر سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔

حارث نے اس کا نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنی زندگی میں بڑے شیطانی کھیل کھیلے ہیں۔ ایک بوڑھے نے حضرت محمدﷺ کی حیات طیبہ پر لکھی ہوئی کتاب کو ایک محفوظ مقام پر پہنچایا تھا لیکن تم نے اس کے ذریعے ڈالرز کمانے کے لیے اس بوڑھے کے خاندان کے تمام افراد کو شہید کر دیا۔ میں ان شہیدوں کو سلام کرتے ہوئے تمہیں جہنم رسید کر رہا ہوں۔"

اس نے کئی گولیاں چلائیں۔ سب کی سب اس کے ناپاک وجود میں اتار دیں۔ وہ تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

یاقوت اور مدر بری طرح سہم گئی تھیں۔ اس بار بالکل قریب سے گولیاں چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ مدر نے کہا۔ "خدا ہم پر رحم کرے۔ ہمارے دروازے کے پاس فائرنگ ہو رہی ہے۔ وہ لوگ یہاں آ گئے ہیں۔"

یاقوت نے کہا۔ "میں لائٹ آف کرتی ہوں۔ یہاں اندھیرا رہے گا تو کوئی نہیں آئے گا۔"

www.pkdigest.com

مدر نے کہا۔ ”اندھیرے میں میری جان نکل جائے گی۔“

”کیا آپ چاہتی ہیں وہ یہاں آ جائیں؟“

”وہ یہاں آ کر جا چکے ہیں۔ اب نہیں آئیں گے۔“

وہ دونوں زیرِ لب دعائیں مانگنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک سنائی دی۔ یاقوت اچھل کر کھڑی ہو گئی اور دوڑتی ہوئی بڑے سے ٹوکرے کے پاس آ گئی۔ وہاں سے کپڑے ہٹا کر اندر بیٹھ گئی۔ مدر نے اس پر تمام کپڑے ڈال دیے۔ دوسری بار دستک کے ساتھ حارث کی آواز سنائی دی۔ ”پلیز! دروازہ کھولو۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

وہ آواز یاقوت کے دل تک پہنچی لیکن ذرا سا شبہ ہوا۔ ”کیا ابھی میں نے حارث کی آواز سنی ہے؟“

مدر نے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ کر بولا۔ ”معزز مدر! آپ یہاں کی تمام نن کو جانتی ہیں۔ کل یہاں ایک لڑکی نن بنتے...“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ یاقوت خوشی سے چیختی ہوئی ٹوکرے سے اٹھی۔ تمام کپڑے ادھر ادھر بکھر گئے۔ وہ بھول گئی کہ ٹوکرے کے اندر ہے۔ اس نے تیزی سے محبوب تک پہنچنے کے لیے ایک قدم بڑھایا تو وہیں اٹک گئی۔ توازن قائم نہ رکھ سکی۔ اوندھے منہ گرنے لگی۔ حارث نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ کھینچ کر بازوؤں میں بھینچ لیا۔ وہ خوشی سے باؤلی ہو رہی تھی۔ وہ بھی کم باؤلا نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیوانہ وار چومنے لگے۔

مدر نے منہ پھیر کر کہا۔ ”اونو... یہ گناہِ عظیم ہے۔ یہ نن بن چکی ہے۔ توبہ کرو۔“

توبہ اور کیسے کی جاتی ہے؟ لمبی جدائی سے توبہ...

انہوں نے اب تک ایک دوسرے کے بغیر جو عمر گزاری، اُس گزر بسر سے توبہ...

وہ اپنے حالات کے مطابق توبہ کر رہے تھے اور مدر اپنے اصولوں کے مطابق منہ پھیر کر توبہ کر رہی تھی۔

☆☆☆

جواد اپنی مما اور ڈیڈ کے ساتھ ذلیل ہو کر محل سے نکالا جا رہا تھا۔ داؤد نے حکم دیا تھا کہ وہ تینوں انیکسی میں جا کر رات گزاریں پھر دوسرے دن منہ دکھائے بغیر وہاں سے چلے جائیں۔

بیٹے نے غلطی کی تھی۔ وہ بے آبرو ہو کر وہاں سے جا سکتے تھے مگر جانا نہیں چاہتے تھے۔ سارہ جس کے گھر دلہن بن کر جاتی، جہیز میں لاکھوں کروڑوں ڈالرز کی جائداد لے جاتی اور وہ عراق میں پھیلی ہوئی دولت اور جائداد سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

وہ تینوں سر جھکائے بیرونی دروازے کے پاس آ کر رک گئے۔ دروازہ بند تھا۔ باہر ایک خسرو گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ وہ داؤد کا حکم سنے بغیر دروازہ کھول کر انہیں محل سے باہر نکلنے نہ دیتا۔

باپ نے بیٹے کو غصے سے دیکھ کر کہا۔ ”کیا تجھے عقل آ رہی ہے کہ تیری حماقت سے ہم ذلیل ہو رہے ہیں اور لاکھوں کروڑوں ڈالرز ہار کر جا رہے ہیں؟“

وہ منہ پھیر کر بولا۔ ”میں ابھی کچھ نہیں بولوں گا۔ بولوں گا تو آپ گالیاں دیں گے۔“

ماں نے بیٹے کو ہمدردی سے دیکھا۔ پھر اس کے باپ سے کہا۔ ”حماد! جو ہوا اس پر مٹی ڈالو۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں، بھائی جان کا غصہ ٹھنڈا ہوگا تو دوبارہ آ کر انہیں منالیں گے۔“

حماد نے کہا۔ ”بلقیس! میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ بات بہت بگڑ چکی ہے۔ میں بنا کر ہی یہاں سے جاؤں گا۔“

”وہ بہت غصے میں ہیں۔ تمہاری کوئی بات ان پر اثر نہیں کرے گی۔ ابھی کچھ نہ بولو تو اچھا ہے۔“

جواد نے کہا۔ ”یہ دروازہ کب کھلے گا؟ کیا ہم صبح تک یہاں کھڑے رہیں گے؟“

بلقیس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے بھائی جان گارڈ کو حکم دینا بھول گئے ہیں۔“

حماد نے کہا۔ ”میں جا کر دیکھتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں؟“

وہ وہاں سے چلتا ہوا سارہ کے کمرے کی طرف آیا۔ خیال تھا، داؤد بیٹی سے باتیں کر رہا ہوگا لیکن وہاں خاموشی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ وہ قریب آ کر دستک دے کر پوچھنا چاہتا تھا کہ بھائی جان کہاں ہیں؟

پھر اس نے سوچا، کیا دروازہ کھلوانا مناسب ہوگا؟ ابھی وہاں سے ذلیل کر کے نکالا گیا ہے۔ سارہ سے سامنا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ پلٹ کر جانا چاہتا تھا۔ پھر ایک دم سے رک گیا۔ اندر سے ایک مردانہ ہنسی سنائی دی۔ وہ ہنسی اس کے بھائی جان کی نہیں تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کو گھورنے لگا۔ ہنسی گم ہو گئی تھی۔ پھر دھیمی سی مترنم آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ ”کیوں ہنس رہے ہو؟“

وہ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ”ہم گھر والوں کو اُلّو بنا رہے ہیں اور وہ آسانی سے بن رہے ہیں۔ کیا اس بات پر ہنسی نہیں آئے گی؟“

وہ مٹھیاں بھینچ کر دروازے کو گھور کو یوں دیکھنے لگا جیسے چور پھندے میں آ گیا ہو اور وہ اسے دبوچنے ہی والا ہو۔

وہ دروازے پر ہاتھ مار کر اسے کھلوانا چاہتا تھا۔ پھر ایکدم سے رک گیا۔ ایک کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اچھا تو یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے...؟“

یہ آواز اندر سے آئی تھی۔ پھر بیک گراؤنڈ میوزک کا شور سنائی دیا۔ حماد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”او گاڈ! ٹی وی آن ہے۔ کوئی ڈراما چل رہا ہے۔ ابھی اپنے بیٹے کی طرح میں بھی سارہ پر شبہ کرنے والا تھا۔ تھینکس گاڈ! میں بہت بڑی غلطی کرنے سے بچ گیا۔ ورنہ پھر ایک بار ذلیل ہونا پڑتا۔“

وہ دروازے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ ’اگر میں کسی طرح سارہ کو منالوں تو بھائی جان بھی مان جائیں گے۔ ہمیں معاف کر دیں گے۔‘

اس نے دروازے پر دستک دی۔ سارہ نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

وہ بڑے پیار سے بولا۔ ”میری بیٹی! میں ہوں۔“

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ وہ سر جھکائے ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔ سارہ نے پوچھا۔ ”آپ اندر آنا چاہتے ہیں... پھر تلاشی لینا چاہتے ہیں؟“

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اپنے انکل کو شرمندہ نہ کرو۔ غلطی بیٹے نے کی شرمندگی ہمیں ہو رہی ہے۔“

”آپ نے بھی شبہ کیا تھا۔“

”میری مت ماری گئی تھی کہ بیٹے کی باتوں میں آ گیا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا، تمہارا بچپن میری گود میں گزرا ہے۔ تم جس کندھے پر بیٹھتی تھیں... وہ کندھا، وہ سر آج تمہارے سامنے جھک رہا ہے۔“

یہ کہتے ہی وہ اچانک جھکتا ہوا اس کے قدموں میں گر پڑا۔ سارہ فوراً ہی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

اس کا سر جیسے سجدے میں تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ بلک بلک کر کہہ رہا تھا۔ ”میری گود میں پرورش پانے والی بے حیا نہیں ہو سکتی۔ بے حیا بدمعاش میرا بیٹا ہے۔ میری بیٹی لاکھوں میں ایک ہے۔“

وہ تڑپ کر فرش پر جھک کر اس سے لپٹ گئی۔ ”انکل! اٹھ جائیں۔ مجھے گناہ گار نہ کریں۔ باپ کا سر بیٹی کے قدموں میں نہیں جھکتا۔ آپ میرے پاپا جیسے ہیں۔ پلیز! اٹھ جائیں۔“

حماد اٹھ گیا اور روتے ہوئے بھتیجی کو گلے سے لگا لیا۔ ایسے جذباتی لمحات میں وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھے معاف کرو گی تو خدا مجھے معاف کرے گا۔ بھائی جان بھی معاف کر دیں گے۔“

”میں پاپا سے کہوں گی، وہ ضرور معاف کر دیں گے۔ پھر یہ کہ آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے لیکن میں جواد کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”ہاں۔ کبھی معاف نہ کرنا۔ میں بھی اس سے بات نہیں کروں گا۔ اسے اس کی ماں کے ساتھ انیکسی میں جانا چاہیے لیکن مجھے یہاں سے نکالا جائے گا تو یہ بے عزتی برداشت نہیں ہوگی۔“

”کوئی آپ کو یہاں سے نہیں نکالے گا۔ چلیں... میں ابھی پاپا سے کہتی ہوں۔“

وہ دونوں فرش پر سے اٹھ گئے اور داؤد کے کمرے کی طرف جانے لگے۔ حماد نے قسم کھائی تھی کہ بگڑی ہوئی بات بنائے بغیر وہاں سے نہیں جائے گا اور وہ بڑی چالبازی سے بگڑی بنا رہا تھا۔

اگر نوٹوں کی گڈی اپنی غلطی سے گر پڑے تو اسے اٹھانے کے لیے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ وہ بھتیجی کے قدموں میں جھک کر کھوئی ہوئی دولت اور جائداد حاصل کرنے والا تھا۔

داؤد اپنے بیڈ روم میں بیٹھا پی رہا تھا۔ اس نے حماد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تم تینوں کو محل سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ تم ابھی تک یہیں ہو؟“

حماد نے سر جھکا کر بھائی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ سارہ نے کہا۔ ”پاپا! یہ میرے بزرگ ہیں۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ غلطی جواد نے کی ہے۔ آپ اُسے محل سے نکالیں۔“

داؤد نے سوچتی ہوئی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”بھائی جان! آپ مجھے جیسی بھی سزا دیں مگر اپنے قدموں میں رہنے دیں۔ بیٹے کی غلطی کی سزا اگر باپ کو ملتی ہے تو مجھے ضرور سزا دیں۔“

داؤد نے بیٹی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”پلیز پاپا! یہ بھی میرے باپ ہیں۔ پہلے کی طرح ان کی عزت کریں۔“

اس نے بیٹی کی بات مان لی۔ سر ہلا کر حماد سے کہا۔ ”اٹھو... یہاں اوپر بیٹھو۔“

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان! گارڈ کو دروازہ کھولنے کا حکم دیں۔ جواد اور بلقیس انیکسی میں

www.pkdigest.com

جائیں گے۔"

اس نے فون اٹھا کر رابطہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو بھول ہی گیا تھا کہ ان کے لیے دروازہ کھلوانا ہے۔"

اس نے فون پر ایک گارڈ سے کہا۔ "دروازہ کھولو۔ جواد اور اس کی ماں کو انیکسی میں پہنچاؤ۔ وہاں ان کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔"

اس نے ضروری احکامات صادر کیے پھر فون بند کر دیا۔ حماد بوتل کھول کر دو گلاس بنا رہا تھا۔ سارہ کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ کوریڈور سے گزرتے ہوئے ماں کے کمرے کے پاس آ کر رک گئی۔ وسیم وہاں کے اسٹور روم میں چھپا ہوا تھا۔

اس نے سر گھما کر دور داؤد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں کا دروازہ بند تھا۔ دونوں بھائی پی رہے تھے۔ ادھر آنے والے نہیں تھے۔ وہ اندر آ کر دروازے کو لاک کر کے سیدھی اسٹور روم میں آئی۔ وسیم کسی کی آہٹ سن کر ایک الماری کے پیچھے چھپنے چلا گیا۔ اس نے آ کر خالی اسٹور روم دیکھا پھر کہا۔ "میں ہوں تمہاری سارہ... آ جاؤ۔"

اس نے باہر آ کر اسے دیکھا لیکن پیار والی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ چپ چاپ سر کو جھکا لیا۔ وہ قریب آ کر بولی۔ "کیا بات ہے؟ بہت اداس لگ رہے ہو؟"

"کیا اداس اور مایوس نہیں ہونا چاہیے؟ آخر میں کب تک چوروں کی طرح چھپتا رہوں گا؟ میرا تمہارا رشتہ چوری کا نہیں ہے۔"

وہ اس کی گردن میں باہیں ڈال کر دھڑکنوں سے لگ گئی۔ پھر بولی۔ "مجھے احساس ہے۔ تم بار بار کئی گھنٹوں تک اسٹور روم میں کھڑے رہتے ہو یا بیٹھے رہتے ہو۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس بار پاپا کو اچھی طرح یقین ہو گیا ہے۔ آئندہ کوئی ہمارے کمرے میں نہیں آئے گا۔ اب تم نہیں چھپو گے۔ آرام سے بیڈ روم میں رہا کرو گے۔"

"کیا ابھی تم مجھے لینے آئی ہو؟ ہم اپنے بیڈ روم میں جا رہے ہیں؟"

"ایک آدھ گھنٹا صبر کرو۔ جب بجلی جائے گی تو میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔"

رات کو بجلی کی روشنی میں خفیہ کیمروں کے ذریعے محل کے ہر حصے کو دیکھا جاتا تھا۔ صرف ماں باپ اور بیٹی کی خواب گاہوں میں اور حرم سرا میں کیمرے نہیں تھے۔

وسیم نے پھر پوچھا۔ "میں کب تک ایک مجرم کی طرح چھپا رہوں گا؟ عقل کہتی ہے کسی نہ کسی دن پکڑا جاؤں گا۔"

"خدا نہ کرے کہ کسی کی نظروں میں آؤ۔ تم دیکھ رہے ہو میں تمہیں کیسے چھپا کر رکھتی ہوں۔ تمہاری ہوا کسی کو لگنے نہیں دیتی۔"

"یعنی ہم اسی ایک بیڈ روم میں زندگی گزارتے رہیں گے؟ وہیں ہمارے بچے ہوں گے۔"

سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر کہا۔ "بچے... او مائی گاڈ! بچوں کی طرف دھیان ہی نہیں گیا... تمہارا پیار میرے اندر پرورش پائے گا۔ میں اسے جنم دوں گی۔ ہائے... میں تو اسے پیار کرتے نہیں تھکوں گی۔"

وسیم اس کی مسرتوں کو دیکھ رہا تھا۔ پہلے بچے کی اہمیت کو اب وہ بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں بالکل ہی بھول گئی تھی کہ تم پیار کا اتنا بڑا خزانہ دے سکتے ہو۔ ہائے اللہ! جب وہ میرے وجود کے اندر آئے گا تو میں خوب فخر محسوس کروں گی۔"

وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ یکبارگی دماغ کو جھٹکا لگا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا' اس کا باپ اور تمام گارڈز دیکھ رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ یہ پیٹ کیسے نکل آیا؟

وہ فوراً ہی وسیم سے الگ ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اگر ایسا ہوا تو پیٹ کیسے چھپاؤں گی؟"

"چوری کبھی نہ کبھی پکڑی جاتی ہے۔ تم اپنی ہیرا پھیری سے مجھے چھپاتی رہو، کوئی ہمیں نہیں پکڑے گا لیکن قدرت کی گرفت سے کیسے بچو گی؟"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ "مام نے کہا تھا کہ اگر عورت زرخیز ہو اور اپنے مرد کے ساتھ سوتی رہے تو ایک یا دو ماہ بعد ہی پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔"

وہ اس کا بازو تھام کر بولی۔ "آج ہماری تیسری رات ہے۔ اتنی جلدی تو کچھ نہیں ہوگا نا؟"

"میں کیا بولوں؟ ایسے معاملات میں کچھ نہیں جانتا۔ ویسے موٹی عقل سے بھی سوچو تو ہم ایک ہی کمرے میں، ایک ہی بیڈ پر رہیں گے۔ تمہاری مام کے کہنے کے مطابق ایک دو ماہ بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے اور کچھ نہیں بھی ہو سکتا۔"

"یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا اور کچھ کرنا ہوگا۔"

"کچھ کرنے کا ایک ہی راستہ ہے' یہاں سے نکل بھاگو۔"

"بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ پورے ملک میں پاپا

کے جاسوسوں سے چھپ نہیں سکیں گے۔"

وہ بولا۔ "کسی طرح مسٹر سے رابطہ ہو جائے تو وہ ہماری سلامتی کے لیے جان کی بازی لگا دیں گی۔"

"تم نے ایک بار رابطہ کیا تھا اور زبردست دھوکا کھا گئے تھے۔"

"ہاں۔ وہ تمہارے پاپا کی جاسوس تھی۔ میرا دل کہتا ہے مسٹر مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔"

"دل کے کہنے سے ہمارا بھلا نہیں ہوگا۔ دماغ سے سوچو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کچھ نہ کر سکے تو ایک دوسرے سے فاصلہ رکھیں گے۔ نہیں رکھیں گے تو بچہ لازمی ہوگا۔"

"تم سوچو۔ میں جا رہی ہوں۔ بجلی جائے گی تو یہاں آ کر تمہیں لے جاؤں گی۔"

وہ اسے اسٹور روم میں چھوڑ کر کمرے میں آئی۔ بے چارے کے نصیب میں لکھا تھا کہ اسٹور روم میں فاضل سامان کی طرح پڑا رہے اور خیرات کے طور پر ملنے والے ازدواجی لمحات گزارتا رہے۔

سارہ نے ماں کی الماری کھول کر حالیہ تصویروں کی البم نکالی۔ پہلے صفحے پر ماں کی تصویر دیکھ کر دل سے آہ نکلی۔ بے چاری بے موت ماری گئی تھی۔ قاتل باپ تھا لیکن کسی گرفت میں آنے والا نہیں تھا۔

بیٹی کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر آئی تو ٹھٹک گئی۔ باپ اور چچا بھی کمرے سے باہر آئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بوتل تھی' دوسرے کے ہاتھوں میں گلاس۔ وہ کھلے آسمان کے نیچے پینے کے لیے ٹیرس پر جا رہے تھے۔

داؤد نے پوچھا۔ "تم ماں کے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟"

اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ البم کھول کر ماں کی ایک تصویر دکھائی پھر آنسو پونچھنے لگی۔ باپ نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں بھی تمہاری ماں کو مس کر رہا ہوں۔ صدمہ برداشت کرو اور کرنا ہی ہوگا۔ ہم کسی کے لیے ساری عمر آنسو نہیں بہاتے۔ صبر کرو۔"

وہ اس کے شانے کو تھپک کر بھائی کے ساتھ آگے بڑھ گیا اور کوریڈور کے ایک موڑ پر گم ہو گیا۔ سارہ نے آگے بڑھ کر دیکھا' وہ دونوں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

اس نے سیڑھیوں کے قریب آ کر دیکھا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ چھت پر پہنچ گئے تھے۔ ایسے ہی وقت گہری تاریکی چھا گئی۔ بجلی چلی گئی تھی۔

اس نے سوچا' ماں کے کمرے میں چارجر لائٹ ہے۔ وہ اس کی روشنی میں وسیم کو اپنے کمرے میں لے آئے گی۔ بجلی کبھی منٹوں میں آ جاتی تھی' کبھی ایک آدھ گھنٹے بعد آتی تھی۔

وہ اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وہاں سے چارجر لائٹ لے کر اسٹور روم کا دروازہ کھول کر بولی۔ "میں ہوں سارہ۔ جلدی آؤ۔ راستہ صاف ہے۔"

وہ سامان کے پیچھے سے نکل آیا۔ اس کے ساتھ تیزی سے چلتا ہوا' ایک کوریڈور سے گزرتا ہوا اپنے بیڈ روم کے دروازے پر آ گیا۔ اسے کھول کر جیسے ہی اندر پہنچا تو خوف سے اچھل پڑا۔ سارہ بھی ڈر گئی۔ فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیختی ہوئی بلا آ گئی ہو۔

سارہ نے دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ "ہیلو... کون؟"

دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ "شاید تم مجھے آواز سے پہچان سکو۔ میں تمہیں تاریکی سے نکالنا چاہتا ہوں۔ تمہاری مام دہشت گردوں کی فائرنگ سے ہلاک نہیں ہوئی تھی۔ اس رات محل میں دہشت گرد نہیں آئے تھے۔"

سارہ نے کہا۔ "آئے تھے۔ میں نے محل کے اندر مسلسل فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔"

"تم نے آوازیں سنی تھیں، آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا۔ وہاں ڈراما کیا گیا تھا۔ تمہاری مام کے قاتل کو چھپانے کے لیے تمام گارڈز نے فائرنگ کر کے الماری اور دیواروں پر گولیوں کے نشان بنائے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق دہشت گردوں نے ایسا کیا تھا۔ وہ کبھی سچ نہیں بولیں گے کہ ان کے آقا نے بیگم صاحبہ کو گولی ماری تھی۔"

سارہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ بے یقینی سے بولی۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ پاپا نے میری مام کو قتل کیا ہے؟"

"بے شک... تم میری بات کا یقین کرو۔"

"کیسے یقین کروں؟ وہ کیوں خوامخواہ ان کی جان لیں گے؟"

"میں نہیں جانتا۔ تم جاننے کی کوشش کرو۔ میری بات کا یقین نہ آئے تو ایک مہربانی کرو۔ اپنے پاپا سے کبھی یہ نہ کہنا کہ کسی نے ان کے خلاف تم سے سچ کہا ہے۔"

"میں ان سے کہوں گی تو کیا وہ تمہیں پہچان لیں گے؟"

"ہاں۔ وہ مجھ پر شبہ کریں گے۔"

"میں بھی تمہیں پہچان رہی ہوں۔ تم خوابگاہ سرا گارڈ ہو۔ تمہاری ڈیوٹی بیرونی دروازے پر ہوتی ہے۔ اندر آنے اور دروازہ کھولنے کے لیے ایک چابی تمہارے پاس رہتی ہے۔"

www.pkdigest.com

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”جی ہاں۔ میرا نام شاکر ہے۔ اگر تم میرے خلاف اپنے پاپا سے بولو گی تو میری موت لازمی ہوگی۔ سوچو اتنی بڑی دنیا میں تم تنہا رہ گئی ہو۔ تمہارے سر پر باپ کے نام کی جو چھت ہے وہ بہت کمزور ہے۔ کسی دن تم پر بھی گرے گی۔“

اس نے پوچھا۔ ”تمہیں مجھ سے ہمدردی کیوں ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ اب تو سچ بولتے بولتے مرنا ہے۔ میرا جو بھی انجام ہو، ایک سچ تمہارے باپ کے بارے میں کہہ دیا۔ دوسرا سچ یہ ہے کہ میں دل و جان سے تمہیں چاہتا ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ تم کیوں اچھی لگتی ہو؟ میرا دل تمہارے لیے تڑپتا رہتا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا تم خواجہ سرا نہیں ہو؟“

فون پر ایک گہری سانس یوں سنائی دی جیسے اس خسرے شاکر کے سینے سے آہ نکلی ہو۔ وسیم سارہ کے فون سے کان لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

شاکر نے کہا۔ ”ہاں۔ میں مرد ہوں مگر نہیں ہوں۔ جب دس برس کا تھا تب ایک بہت ہی دولت مند شخص نے جبراً آپریشن کے ذریعے مجھے خسرہ بنا دیا تھا۔ مجھ سے زیادتی کرتا رہا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے۔ بڑی سچائی سے کہتا ہوں تمہارے باپ سے بھی نفرت ہے۔ وہ بھی کم سن لڑکوں کا مستقبل برباد کرتا رہتا ہے۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ”کل یہاں دوبارہ ایک بہت ہی کم سن لڑکا لایا جائے گا۔ یہ کیسی بے شرمی اور درندگی ہے؟ تمہارا باپ بہت طاقت ور ہے۔ میں اسے حیوانیت سے روک نہیں سکوں گا۔ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکوں گا۔“

وہ ایک آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”کئی بار سوچا ملازمت چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن تم نے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ روز تمہیں دیکھتا ہوں اور بہلتا ہوں۔ یہاں سے جا کر تمہارے دیدار سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔“

وہ بول رہا تھا۔ سارہ اور وسیم نے سر گھما کر ایک دوسرے کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر سارہ نے فون پر کہا۔ ”پیار میں ایک دوسرے کو پالینا ضروری ہوتا ہے۔ تم کیا سوچ کر مجھ سے عشق کر رہے ہو؟“

”مجھے جبراً ایسا بنا دیا گیا ہے۔ ورنہ قدرتی طور پر آج بھی مرد ہوں لیکن خود غرض نہیں ہوں۔ تمہیں یک طرفہ پالینے کی غلطی نہیں کروں گا۔ پچھلے چار برسوں سے یہاں ملازمت کر رہا ہوں۔ دور ہی دور سے تمہاری پرستش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا۔“

وہ بولی۔ ”یہ سن کر مام کی موت کا صدمہ اور بڑھ گیا ہے کہ پاپا نے انہیں اٹھارہ برسوں سے سہاگن بنائے رکھنے کے بعد گولی ماری ہے۔ میں انہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

”تمہارے معاف کرنے نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ تو کبھی خدا سے بھی معافی نہیں مانگتے۔“

سارہ نے سر گھما کر وسیم کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ”میں یہاں سے دور کھلی فضاؤں میں سانسیں لینا چاہتی ہوں۔ ایک نئی زندگی گزارنا چاہتی ہوں مگر اس ملک میں جہاں جاؤں گی وہاں پاپا کی حکمرانی ہوگی۔ میں اپنے محبوب کے ساتھ اپنی مرضی سے کہیں رہ نہیں سکوں گی۔“

اس نے پوچھا۔ ”تمہارا محبوب...؟ کیا تم کسی کو چاہتی ہو؟“

”ہاں۔ تمہیں یہ سن کر مایوسی ہوگی۔ وہ میرے دل میں رہتا ہے۔ اس وقت بھی میرے پاس ہے میرے دل میں دھڑک رہا ہے۔“

وہ بولا۔ ”میں مایوس نہیں ہوا، خوش ہوں۔ تم جسے بھی چاہو گی میں اس کا رقیب نہیں ہوں گا۔ ابھی کہہ چکا ہوں تمہیں پالینے کی یک طرفہ غلطی نہیں کروں گا۔ تمہیں کسی مکمل مرد کے ساتھ زندگی گزارنی ہوگی۔ ہم قدرتی تقاضوں سے انکار نہیں کریں گے۔ تم کسی نہ کسی سے شادی کرو گی۔ بیوی بنو گی ماں بنو گی ایک بھرپور زندگی گزارو گی۔ لیکن میں تمہارے قریب رہ کر دور ہی دور سے تمہاری پرستش کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں اس محل سے نکل کر اپنے محبوب کے ساتھ کہیں زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ کیا سچ کہہ رہے ہو کہ حسد اور رقابت میں مبتلا نہیں رہو گے؟“

”کبھی نہیں۔ میں قدرتی تقاضے پورے کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہاری ازدواجی زندگی کی خوشیاں دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔ لیکن تمہارا محبوب کون ہے؟ تم اس محل سے باہر کیسے جاؤ گی؟ کیا اپنے باپ کی مرضی اور مزاج کے خلاف اس کے ساتھ کہیں رہ سکو گی؟“

”یہی تو مشکل ہے۔ وہ ہم دونوں کو گولی مار دیں گے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ میری خوشیاں چاہتے ہو تو کوئی راستہ دکھاؤ۔ میرے لیے کچھ کرو۔“

”بہت مشکل ہے لیکن میں سوچتا ہوں۔ تمہاری خوشیوں کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔ کیا ایک آدھ گھنٹے بعد فون کر سکتا ہوں؟“

”ہاں۔ کچھ سوچو، کچھ کرو۔ پاپا اور انکل ٹیرس پر ہیں۔ جب وہ نیچے آکر سو جائیں گے تب میں خود تمہیں کال کروں گی۔“

اس نے بٹن دبا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ پلٹ کر وسیم کے سینے سے لگ گئی اور اس سے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟ میں بعد میں اس گارڈ سے کیا بات کروں گی؟“

”ابھی تو ہمیں یہ سوچنا سمجھنا ہے کہ وہ ہمارے کسی کام آئے گا یا نہیں؟ وہ تمہارا دیوانہ ہے۔ میں تمہارے کسی عاشق دیوانے کو برداشت نہیں کروں گا۔“

”پلیز! رقابت سے نہ سوچو۔ وہ میرے پاس آکر بھی بے ضرر رہے گا۔ تم اس کی مجبوری سمجھتے ہو اس لیے اپنے مطلب کی بات سوچو۔ ہم اسے دوست بنا سکیں گے تو وہ تمہیں اس محل سے بخیریت نکال سکے گا۔ میرے اور تمہارے لیے کہیں چھپ کر رہنے کی جگہ بنا سکے گا۔“

”کیا یہاں سے جا کر بھی ہم چھپتے رہیں گے؟“

”ہو سکتا ہے ہمیں اس ملک سے باہر جا کر کہیں پناہ مل جائے۔ وہاں ہمیں چھپ کر نہیں رہنا پڑے گا۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سارہ نے کہا۔ ”اس پہلو سے سوچو اسے رازدار بنا کر ہم اس قید خانے سے نکل سکیں گے یا نہیں؟“

”یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم میری خاطر اس محل کو قید خانہ کہہ رہی ہو۔ یہاں کا عیش و آرام دولت اور جاہ و جلال چھوڑ دینا چاہتی ہو۔“

”میں جب سے پیدا ہوئی ہوں مام کے ساتھ یہاں قیدی بن کر رہتی آئی ہوں۔ پاپا نے اسے گناہوں کا محل بنا دیا ہے۔ کل ایک کم سن لڑکا یہاں آنے والا ہے۔ سوچتی ہوں تو شرم سے مرنے لگتی ہوں۔“

”مجھے تو غصہ آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے تمہارے پاپا کو ہی ختم کر دوں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری...“

”پلیز! ایسا نہ کہو۔ پاپا نے ظلم کی انتہا کی ہے۔ میری مام کو ہلاک کیا ہے۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔ پھر بھی انہیں زندہ رہنا چاہیے۔ وہ جیسے بھی ہیں ایک سہارا تو ہے کہ میرے باپ ہیں۔ پھٹا ہوا آنچل ہیں مگر حیا کے طور پر سر ڈھانپ رہے ہیں۔ وہ مجھے غیروں کی دشمنی سے اور اپنوں کے مکر و فریب سے بچائے رکھتے ہیں۔“

وہ ایک ذرا توقف سے بولی۔ ”ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کل یہاں ایک کم سن چھوکرا آئے گا اور میرے پاپا بہت ہی بدکار ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم یہاں کب تک چھپ کر رہو گے؟ ایک اور مسئلے پر بھی دھیان کیا ہے کہ میں ماں بن سکتی ہوں۔ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا ہم ایک چھت کے نیچے ایک دوسرے سے دور رہ سکیں گے؟“

”کبھی نہیں رہ سکیں گے۔“

”تو ہمیں آزادی سے ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے یہاں سے نکلنا ہی ہوگا۔“

”میں تو دل سے یہی چاہتا ہوں مگر یہاں سے نکل کر ہم کہاں جائیں گے؟ میرا اور سسٹر کا مکان دشمنوں کی نظروں میں رہتا ہوگا۔ میں ادھر کا رخ نہیں کر سکوں گا۔ ہم جہاں بھی جائیں گے وہاں تمہارے باپ کی حکمرانی ہوگی۔“

”بس ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے... ہم سرحد پار کر کے کسی بھی پڑوسی ملک میں آزادی سے رہ سکیں گے۔“

وسیم نے کہا۔ ”پھر تو یہاں سے نکلنے کے لیے وہ خسرہ گارڈ شاکر ہی ہمارے کام آسکے گا۔“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں اسے رقیب مت سمجھو۔ کیا میں ایسی نادان ہوں کہ ایک ملازم کو منہ لگاؤں گی؟ اسے میرا دیوانہ بن کر رہنے دو۔ اس کی دیوانگی ہماری نجات کا ذریعہ بنے گی۔“

وہ بیڈ پر آگئے تھے۔ دھیمی سرگوشی میں بول رہے تھے۔ سارہ نے کہا۔ ”ہمیں سرگوشی کے لیے اسی طرح لگ کر رہنا ہوگا جبکہ ہمیں فاصلہ رکھنا چاہیے۔ بچے والی بات نے مجھے سہما دیا ہے۔“

”ہاں۔ ہمارے عجیب حالات ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے قریب ہو کر اپنے آپ سے دشمنی کریں گے۔“

سارہ نے پوچھا۔ ”کیا ہم ایک ہی بستر پر رہ کر دریا کے دو کنارے بن سکیں گے؟“

وہ بولا۔ ”مشکل ہے۔ ہم بہک جائیں گے۔“

”ہمیں سنبھلنا ہوگا۔ ورنہ قدرتی طور پر بھید کھلے گا تو کہیں بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔ ہم دونوں بے موت مارے جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں اسٹور روم میں جا کر سو جاؤں گا۔“

”تم وہاں فرش پر کاٹھ کباڑ میں رہو گے تو کیا مجھے نیند آئے گی؟ ہرگز نہیں۔ تم اسی بیڈ پر رہو گے۔ میں باہر سے دروازہ بند کر کے مام کے کمرے میں رات گزاروں گی۔ پھر صبح آجاؤں گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”نہیں گڑبڑ ہو جائے گی۔ تمہاری غیر موجودگی میں کوئی ادھر آسکتا ہے۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔ پاپا پوری طرح مطمئن ہو گئے ہیں۔ کوئی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ پھر یہ کہ دروازہ باہر سے مقفل رہے گا۔ تم میری آواز سنے بغیر اسے نہیں کھولو گے۔ اطمینان رکھو اب کسی کو کسی طرح کا شبہ نہیں ہوگا۔“

رات کا ایک بجا تھا۔ وہ دونوں بھائی ٹیرس پر بیٹھے پی رہے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ دور تک چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ حماد نے کہا۔ ''بھائی جان! یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ آج نہیں تو کل جواد کو معاف کر دیں گے۔ آپ اسے بہت چاہتے ہیں۔ اسی کو داماد بنائیں گے۔''

داؤد نے ناگواری سے کہا۔ ''ابھی اُس کا نام نہ لو۔ دوسری باتیں کرو۔''

''سوری... اب اس کی کوئی بات نہیں کروں گا۔ آپ کی باتیں کرتا ہوں۔ یہ بتائیں، بھابھی تو اللہ کو پیاری ہو گئیں، کیا دوسری لائیں گے؟''

وہ انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بیوی نام کی چیز پالنے کی حماقت کیوں کی جائے؟ جبکہ ہر رات ایک نئی عورت ایک نئے روپ میں نئی اداؤں کے ساتھ مل جاتی ہے۔''

اس نے گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔ پھر بڑے فخر سے کہا۔ ''میری کوئی رات خالی نہیں جاتی۔ آج تم لوگوں کی وجہ سے بلکہ ہونے والے داماد کا خیال کرتے ہوئے میں نے حرم سرا کو ویران رکھا ہے۔ کل اسے اور بلقیس کو یہاں سے لے جاؤ۔''

''ضرور لے جاؤں گا۔ کیا چالیسویں کے بعد آؤں؟''

وہ دوسرا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔ بیگم نہیں رہی۔ پورے محل میں ایک جوان بیٹی تنہا رہ گئی ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ میں چاہوں گا، بارات لاؤ اور اسے لے جاؤ۔''

اسی وقت لائٹ آ گئی۔ حماد نے کہا۔ ''آپ کی زبان مبارک ہے۔ بیٹی کو دلہن بنانے کی بات کرتے ہی روشنی ہو گئی۔''

وہ غٹاغٹ پی رہا تھا۔ پھر اس نے گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ ''بس اب سونا چاہیے۔ میں گارڈ سے کہتا ہوں، وہ دروازہ کھول دے گا۔ تم انیکسی میں چلے جاؤ۔''

وہ دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ داؤد نے بہت پی لی تھی۔ حماد اسے سہارا دے کر نیچے لے آیا۔ اس نے اپنے بیڈ روم کے دروازے پر آ کر فون کے ذریعے گارڈ سے کہا۔ ''شاکر! دروازہ کھولو۔ میرا بھائی انیکسی میں جائے گا۔''

''آل رائٹ سر! میں دروازہ کھول رہا ہوں۔''

داؤد نے کمرے میں جا کر بھائی کو لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں شب بخیر کہا۔ پھر دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ سارہ رات گزارنے کے لیے ماں کے کمرے میں جانا چاہتی تھی۔ اس نے بیرونی دروازے کو کھلتے ہوئے دیکھا تو رک گئی۔ شاکر اسے دیکھ کر ایک تابع دار کی طرح الرٹ ہو گیا۔

اب اس کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ وہ محض ایک تابع دار محافظ نہیں ہے، ایک عاشق بھی ہے۔ اس پر ہزار جان سے قربان ہو رہا ہے۔

سارہ نے پہلی بار اسے توجہ سے دیکھا۔ وہ دراز قد، صحت مند کبرو جوان تھا۔ چہرے پر مردانگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اسی قدر رور پر وہ... کھوکھلا بھی تھا۔

حماد نے آ کر پوچھا۔ ''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''مام کے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے... جاؤ بیٹی! آرام کرو۔''

وہ بولتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔ شاکر نے سارہ کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ یہ جانتا تھا کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے وہ دونوں دیکھے جا رہے ہیں۔ اس نے فوراً ہی دروازے کو باہر سے بند کر لیا۔

سارہ ماں کے کمرے میں آ گئی۔ اس کا خالی بستر اور وہاں کا تمام سامان دیکھ کر شاکر کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا، یہاں کے تمام گارڈز کبھی سچ نہیں بولیں گے کہ ان کے آقا نے بیگم صاحبہ کو گولی ماری تھی۔

بیٹی کے دل سے درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ ''آہ مام! میں آپ کے لیے کیا کروں؟ کس سے انصاف مانگوں؟ یہاں تو منصف ہی قاتل ہے، میرا باپ ہے۔ میں انتقام نہیں لے سکوں گی۔ آپ کا فیصلہ خدا پر چھوڑتی ہوں۔ خدا کرے پاپا کو عبرت ناک سبق حاصل ہو۔''

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے بڑے دکھ سے ماں کے متعلق سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پھر لائٹ چلی گئی۔ وہ ماں کے کمرے سے جو چارجر لائٹ لے گئی تھی، اسے پھر واپس لے آئی تھی۔ اس نے روشنی میں وقت دیکھا، دو بج گئے تھے۔

اسے سو جانا چاہیے تھا لیکن مسائل جگا رہے تھے۔ اس کے اور وسیم کے درمیان شاکر آ گیا تھا۔ اسے کباب میں ہڈی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ وہ ان کے بہت کام آ سکتا تھا۔ وسیم کو بخیریت اس محل سے باہر پہنچا سکتا تھا۔ اسے آزادی ملتی، تحفظ حاصل ہوتا اور کہیں نہ کہیں پناہ مل جاتی۔

وہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وسیم کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ محل چھوڑے گی تو باہر کہاں بھٹکتی رہے گی؟ مال و زر کی کمی نہیں تھی۔ اس کی الماری میں لاکھوں ڈالرز کے علاوہ زیورات اور کچھ جواہرات بھی تھے۔ لیکن یہ سب کچھ لے کر وہ کہاں جائے گی؟ آگے راستہ تاریک تھا۔ کوئی منزل نہیں تھی۔

اس کا اور وسیم کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اب تیسرا آ گیا تھا۔ شاید وہ سلامتی کا کوئی راستہ دکھا سکتا تھا۔ ایسے وقت یہ اہم سوال پیدا ہوا کہ کیا وسیم کے سلسلے میں شاکر کو رازدار بنانا ہو گا؟

آزادی سے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے کسی بھی مددگار پر بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ شاکر پر اعتماد کیے بغیر وسیم کو بخیریت محل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک سوچتی رہی پھر اس نے فون کے ذریعے اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ''شکریہ... تم وعدے کے مطابق فون کر رہی ہو۔ میں بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنے پیار کی، اپنی دیوانگی کی باتیں نہ کرو۔ میرے لیے کچھ کرو۔''

''تمہارے لیے تو جان بھی دے دوں گا۔ بولو کیا کروں؟''

''میں اس محل سے نکل کر اپنے محبوب کے ساتھ ایک گھریلو ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔''

''کیا تمہارا وہ محبوب کسی خفیہ پناہ گاہ میں تمہاری حفاظت کر سکے گا؟''

''وہ بھی بے گھر ہے، دور اور بے یارو مددگار ہے۔''

''تم اس ملک میں کہیں بھی چھپ کر رہو گے تو کسی دن پکڑے جاؤ گے۔''

''کیا تم ہمیں سرحد پار کرا سکو گے؟ ہم اُردن، شام یا ترکی کہیں بھی چلے جائیں گے۔''

''میں ایک معمولی سیکیورٹی گارڈ ہوں۔ سرحدی چوکیوں تک میری پہنچ نہیں ہے۔ پھر بھی تمہارے کام آنے کے لیے کوئی تدبیر ضرور کروں گا۔''

''کیا تم مجھے یا کسی کو بھی اس محل کے باہر پہنچا سکتے ہو؟''

''ہاں۔ یہ میرے لیے آسان ہے... لیکن تم یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گی؟ اگر مجھ سے راضی ہو جاؤ تو کل ہی کوئی خفیہ پناہ گاہ تلاش کروں گا۔ کل رات اسی وقت تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے وسیم کے متعلق کیسے بتائے اور صرف بتانا ہی نہیں تھا، شاکر کو اعتماد میں بھی لینا تھا... اور یہ سب کچھ فون کے ذریعے نہیں ہو سکتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن بہت ساری باتیں ہیں۔ فون پر نہیں ہو سکیں گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا میں آ جاؤں؟ لائٹ گئی ہوئی ہے۔ کوئی بھی گارڈ ہمیں اسکرین پر نہیں دیکھ سکے گا۔''

''پھر اچانک لائٹ آئے گی تو ہم دیکھ لیے جائیں گے۔''

''میں اندر آ کر دروازے کے پاس ہی رہوں گا۔ لائٹ آئے گی تو ٹی وی اور کیمروں کو آن ہونے میں جتنا وقت لگے گا اتنی دیر میں باہر جا کر دروازہ بند کر دوں گا۔ صرف تم تنہا دکھائی دو گی۔ کوئی تم پر شبہ نہیں کرے گا۔ پوچھ گچھ نہیں ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ میں دروازے کے پاس آ رہی ہوں۔''

وہ انتظار کرنے لگا۔ فون آن تھا۔ تھوڑی دیر بعد آواز سنائی دی۔ ''میں آ گئی ہوں۔''

وہ فون بند کر کے دروازے کو آہستگی سے کھول کر اندر آ گیا۔ وہاں گہری تاریکی نہیں تھی۔ باہر چاندنی کی روشنی تھی جس کے سبب وہ دونوں سائے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

ان لمحات میں سارہ کو شاکر کی اہمیت کا احساس ہوا۔ یہ خیال آیا کہ اس کا دیوانہ وسیم کی طرح ایک نوجوان لڑکا نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک قد آور پہاڑ جیسا مرد ہے۔ وہ پہلی بار تنہائی میں ایک چٹان جیسے مرد کے قریب آئی تھی۔

وہ دھیمی دھیمی سرگوشی میں بولا۔ ''تم مجھ سے وہ باتیں کہنے آئی ہو جو فون پر نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ایسی کیا بات ہے، جلدی بولو! لائٹ کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔''

''کیا تم میرے محبوب کو رقیب سمجھو گے؟ کیا اس سے دشمنی کرو گے؟''

''کبھی نہیں۔ تم جس کے ساتھ رہو گی، میں تمہیں خوش دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔''

''کیا میں تم پر بھروسا کروں کہ میرے رازدار بن کر رہو گے؟ میرا ایک اہم راز ہے۔ اسے کسی کے سامنے زبان پر نہیں لاؤ گے؟''

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں۔ تمہارا راز ہمیشہ میرے سینے میں محفوظ رہے گا، کبھی میری زبان پر نہیں آئے گا۔''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''وہ وسیم جو وسیمہ بن کر یہاں آیا تھا... وہی میرا محبوب، میرا مجازی خدا ہے۔''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ نکاح پڑھائے بغیر وہ تمہارا مجازی خدا کیسے بن سکتا ہے؟''

''ہم نے مام کی موجودگی میں خدا کو گواہ بنا کر ایک دوسرے کو قبول کیا ہے۔''

وہ مزید حیرانی سے بولا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وسیم یہاں اسی محل میں موجود ہے؟''

''ہاں۔ وہ فرار نہیں ہوا ہے۔ میں اسے چھپا کر رکھتی ہوں۔''

www.pkdigest.com

”یا خدا! ہم نے محل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آیا؟“

”یہ بتانے کا وقت نہیں ہے کہ اسے کیسے چھپاتی آرہی ہوں؟ تم بولو! کیا ہم دونوں کو یہاں سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا سکتے ہو؟“

”میں کل رات ہی ایسا کرسکتا ہوں لیکن جہاں بھی پہنچاؤں گا' وہاں بھی تم کو چھپانا پڑے گا۔ ہمیں اس مسئلے پر اچھی طرح سوچنا سمجھنا ہوگا۔ کیا وسیم تمہارے کمرے میں ہے؟“

”ہاں۔ فی الحال خطرہ ٹل گیا ہے۔ کوئی اسے تلاش نہیں کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ میں اسے کب تک چھپا کر رکھ سکوں گی؟ یہاں سے نکل کر اس کے ساتھ آزادی سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔“

”تمہاری یہ خواہش پوری ہوگی لیکن ذرا صبر کرنا اور سوچنا سمجھنا ہوگا۔“

شاکر نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”پلیز! مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔“

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں' تم نے مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ تمہیں دن رات دیکھنے کے لیے یہاں ملازمت کررہا ہوں۔ آئندہ تمہارے بہت کام آنے والا ہوں۔ کیا میرے کام کا صلہ پیار سے نہیں دوگی؟“

”میرا یہ وجود صرف وسیم کے لیے ہے۔“

”میں وسیم سے کبھی تمہیں چھیننا نہیں چاہوں گا مگر اپنے حصے کا پیار چاہتا ہوں۔ پہلے تو محض ایک عاشق تھا' اب تمہارا راز دار بھی ہوں۔“

اس نے سارہ کے گداز بازوؤں کو جکڑ لیا پھر پوچھا۔ ”کیا تم نہیں چاہتیں کہ یہ راز میرے اندر سے باہر نہ نکلے؟“ یہ کہہ کر اس نے اسے بازوؤں کے حصار میں لیا' سینے سے لگایا۔ پھر اس کے چہرے پر جھک گیا۔ اسے لیتا ہوا فرش پر آگیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوششیں کرتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑو مجھے... دور سے بات کرو۔ میں راز داری کے لیے مہنگا سودا نہیں کروں گی۔ تم سے منت کرتی ہوں' التجا کرتی ہوں' ایک اچھے انسان کی طرح میرے کام آؤ۔“

وہ اپنی ایک بہت بڑی کمزوری کے ساتھ اس کے ہاتھ آئی تھی۔ اب چھڑ چھڑاتی رہتی' منتیں کرتی رہتی مگر ہارتی بھی رہتی۔ مجبور تھی۔ اس کے خلاف کسی سے کچھ بول نہیں سکتی تھی۔

وہ بھوکا شیر تھا۔ اسے جھنجوڑ رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”تمہاری شادی خانہ آبادی تمہیں مبارک ہو۔ مجھے اپنا حصہ وصول کرنا ہے اور یہ میرا وعدہ ہے کہ وسیم کے ساتھ یہاں سے جانے دوں گا۔ جہاں جاؤ گی' وہاں تمہاری سلامتی کے لیے بہت کچھ کرتا رہوں گا۔“

وہ قسمیں کھا رہا تھا کہ اس کا راز دار رہے گا۔ وہ اس کی ذات سے فائدہ اٹھاتی رہے گی۔ فی الوقت تو وہ فائدہ اٹھا رہا تھا۔ سارہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پر بھروسا کرکے بری طرح پھنسے گی۔ اس کے آگے مجبور اور بے بس ہو جائے گی۔

حالات کبھی اچانک یوں بدلتے ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ سارہ نے حیرانی سے دیکھا۔ حالات یک لخت بدل گئے۔ وہ جیسے جھنجلا کر قالین پر ہاتھ مارتا ہوا اس سے الگ ہوگیا۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا؟ وہ سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ تکلیف سے کراہتے ہوئے سجدے کے انداز میں جھک رہا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر لباس درست کرتی ہوئی اس سے دور ہوگئی۔

اس کی بھاری بھاری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سایہ جو سجدے کی حالت میں کراہ رہا تھا' اب چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا دروازے کی طرف گیا تھا۔ پھر اسے کھول کر باہر جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ بھول گئی تھی۔ اس لیے سمجھ نہ سکی کہ پچھاڑنے والا شیر اچانک ہی منہ چھپا کر کیوں چلا گیا ہے؟

وہ باہر آکر اوندھے منہ گر گیا اور بلک بلک کر رونے لگا۔ المیہ یہ تھا کہ وہ ساری زندگی ٹھیک ایسے ہی وقت روتا رہے گا جب... وہ چار ہاتھ جبکہ لب بام رہے گا۔

☆☆☆

وہ عیدالضحٰی کی صبح تھی۔ ساری دنیا کے مسلمان نماز عید ادا کرنے کے بعد جانوروں کی قربانیاں دینے والے تھے۔ اس سے پہلے صدام حسین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ عوام کی جانب سے اس کی موت پر کوئی قابل ذکر ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ایک آمر کی موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ کوئی اسے شہید نہیں کہتا۔

امریکا اور اس کے اتحادیوں کے خلاف نفرتیں معمول کے مطابق تھیں۔ مختلف شہروں خصوصاً بغداد میں اسٹریٹ فائٹنگ اور بم دھماکے ہورہے تھے۔ حارث نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس علاقے میں گھس کر حملہ کیا تھا جہاں ابوولاد کا صدر دفتر اور فحاشی کا اڈا تھا۔ اس ان کاؤنٹر کے نتیجے میں ابوولاد مارا گیا۔ اس کے کئی آدمی زخمی ہوئے اور باقی فرار ہوگئے۔ حارث نے کم سن لڑکوں کو وہاں کے قید خانے سے رہائی دلائی۔ اس کے آفس میں نوعمر لڑکوں کا جو تحریری اور تصویری ریکارڈ تھا' انہیں دیکھا اور پڑھا۔ ایسے وقت وسیم کی تصویریں اس کے سامنے آگئیں۔

اس نے بڑے دکھ سے ان تصویروں کو دیکھا۔ اسے وسیم سے وسیمہ بنا دیا گیا تھا۔ یاقوت اس کے لیے پریشان تھی۔ کانونٹ سے نکلنے کے بعد کہہ رہی تھی۔ ”کسی طرح اسے تلاش کرو۔ وہ زندہ ہے۔ کہیں مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔“

حارث نے دل ہی دل میں کہا۔ ”بے چاری یاقوت سوچ بھی نہیں سکے گی کہ وسیم انتہائی شرمناک مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔“

اس نے ایک زخمی کارندے کو وسیم کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ لڑکا کہاں ہے؟“

وہ بولا۔ ”اسے تو بہت بڑے آدمی کے پاس پہنچایا گیا ہے۔ یہ داؤد اسرار کے محل میں ہے۔“

”کب سے وہاں ہے؟“

”ابھی چار دن ہوئے ہیں۔ تم فون کرکے معلوم کرسکتے ہو۔“

وہاں ٹیلی فون ڈائریکٹری میں داؤد اسرار کے گھر اور دفاتر کے فون نمبرز تھے۔ اس نے تمام نمبر اپنے فون میں محفوظ کیے پھر اس سے رابطہ کیا۔ دفتر سے کہا گیا کہ وہ گھر میں ہے۔

اس نے گھر کے نمبر پر رابطہ کیا مگر کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ داؤد نے رات کو خوب پی لی تھی۔ اس وقت نیند میں مست تھا۔ اس کے ذاتی موبائل فون کی کالنگ ٹون بھی چیخنے رہنے کے بعد چپ ہوگئی تھی۔

حارث نے سوچا بعد میں پھر ان نمبرز پر رابطہ کرے گا۔ اپنے ہی عراقی بھائی' بہنوں اور ماؤں پر مظالم ڈھانے والے حکمرانوں میں داؤد اسرار سرفہرست تھا۔ کئی گروپوں کے مجاہدین اس کی تاک میں رہتے تھے۔ ایک آدھ بار اس پر حملے بھی کیے گئے لیکن وہ انتہائی سخت سیکیورٹی کے باعث محفوظ رہا۔ اب وسیم کے معاملے میں وہ اور زیادہ توجہ کا مرکز بننے والا تھا۔ حارث نے طے کرلیا کہ جلد ہی اس پر ایک منظم حملہ کرے گا۔

اس نے اپنی موجودہ پناہ گاہ میں آکر یاقوت سے کہا۔ ”وسیم کا سراغ مل گیا ہے۔ میں ابھی فون کے ذریعے تصدیق کروں گا کہ وہ داؤد کے محل میں ہے یا نہیں؟“

یاقوت نے خوش ہوکر کہا۔ ”تم بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہو۔ فوراً فون کرو اور تصدیق کرو۔“

وہ اس کے شانے کو تھپک کر بولا۔ ”ابھی کرتا ہوں۔ ذرا صبر کرو اور اس کے متعلق ایک تلخ حقیقت سنو۔“

اس نے جیب سے وسیم کی دو تصویریں نکال کر دکھائیں۔ اس نے تصویریں دیکھ کر بڑی حیرانی اور پریشانی سے وسیمہ کے روپ میں اسے دیکھا۔ حارث نے کہا۔ ”وسیم شرمناک دھندا کرنے والوں کے شکنجے میں آگیا ہے۔“

یاقوت کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”اس معصوم لڑکے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اسے کسی طرح ان کے شکنجے سے نکالو۔“

”میں نے ابوولاد کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اس کے کئی آدمیوں کو بھی جہنم رسید کیا ہے۔ باقی فرار ہوگئے ہیں۔ اب وہاں دھندا جاری رکھنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔“

اس نے موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ ”دو گھنٹے پہلے فون کیا تھا' کسی نے اٹینڈ نہیں کیا۔ اب تو داؤد کو ضرور بولنا چاہیے۔“

اس نے فون کو کان سے لگایا اور یاقوت کو اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ وہ چپ چاپ فون کی طرف دیکھنے لگی۔

دوسری طرف داؤد اور حماد ناشتے کی میز پر تھے۔ سارہ ان کے لیے چائے کی ٹرے لاکر رکھ رہی تھی۔ اسی وقت داؤد نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہیلو... کون ہے؟“

حارث نے پوچھا۔ ”وسیم کہاں ہے؟“

اس نے ناگواری سے کہا۔ ”رانگ نمبر... یہاں کوئی وسیم نہیں رہتا۔“

سارہ نے چونک کر فون کو دیکھا۔ اُدھر سے حارث نے کہا۔ ”میں اُس وسیم کا پوچھ رہا ہوں جسے وسیمہ بنا کر تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔“

داؤد نے ناگواری سے ریسیور رکھ دیا۔ حماد نے کہا۔ ”بھائی جان! ایروں غیروں کے فون اٹینڈ کرنا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ یہاں ایک لیڈی سیکریٹری رکھ لیں۔“

سارہ نے کہا۔ ”انکل! آپ ایک سیکریٹری کے بہانے کسی عورت کو لانے کا مشورہ نہ دیں۔ آپ کی فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔“

وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں۔ بلقیس اور جواد انتظار کررہے ہیں۔ مجھے جانا چاہیے۔“

داؤد اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ بھائی کو گلے لگا کر رخصت کرنے لگا۔ سارہ کا دل ٹیلی فون کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ وہاں سے کسی نے وسیم کا نام لیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' یقیناً اس کا شناسا تھا۔ اسے تلاش کرتے ہوئے داؤد محل کے ٹیلی فون تک پہنچ چکا تھا۔

وہ دعا مانگنے لگی کہ وہ دوبارہ کال کرے۔ اپنا نام اور اپنی پہچان بتائے۔ حماد وہاں سے جاچکا تھا۔ اس بار داؤد کا موبائل فون بولنے لگا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔

حارث نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم بارود کے ڈھیر پر

www.pkdigest.com

بیٹھے ہو۔ فون بند کرو گے تو ایک گھنٹے کے اندر ایک میزائل تمہارے محل میں آ گرے گا۔"

داؤد نے غرانے کے انداز میں کہا۔ "ہم جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ ہمیں دھمکی نہ دو۔ کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟"

"بہت معمولی سا مطالبہ ہے۔ وسیم کو ہمارے حوالے کر دو۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "تم جس وسیم کی بات کر رہے ہو، وہ آج سے چار دن پہلے آیا تھا لیکن اسی دن یہاں سے فرار ہو گیا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ بے شک تم اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہو مگر محل میں تمہارے بیوی بچے ہیں۔ ان کی سلامتی کی فکر کرو اور سچ بولو۔"

اس نے سوچتے ہوئے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ "یہاں میری ایک بیٹی ہے۔ میں اس کی سلامتی چاہتا ہوں۔ تم بہت بڑے احمق ہو۔ اگر یہ کہتے ہو کہ میں نے وسیم کو یہاں قیدی بنا کر رکھا ہے تو کیا سوچ کر میزائل داغنے کی بات کر رہے ہو؟ عقل سے سوچو! ہمارے ساتھ وہ لڑکا بھی مارا جائے گا۔"

حارث نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے وسیم وہاں موجود ہے؟"

"یہی سمجھو گے تو میرے محل کو ٹارگٹ بنانے کی حماقت نہیں کرو گے۔ یاد رکھو... میں اسے کہیں قید رکھوں گا اور بیٹی کو لے کر ایک چور راستے سے نکل جاؤں گا۔ تم ہماری نگرانی کرنے والے جتنے بھی ہو، ہمیں دیکھ نہیں پاؤ گے۔"

"کیا تمہارے لیے یہ بہتر نہ ہوگا کہ ایک لڑکے کی خاطر ہم سے دشمنی نہ کرو۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

"میں کس زبان میں سمجھاؤں، وہ یہاں نہیں ہے۔ ہوتا تو ابھی اسے محل سے باہر بھگا دیتا۔ وہ بہت چالباز ہے۔ مجھے اور میرے مسلح گارڈز کو دھوکا دے کر نہ جانے کیسے فرار ہو گیا ہے؟ بہتر یہی ہے کہ تم اسے میرا قیدی سمجھو اور یہاں حملہ کرنے کی حماقت نہ کرو۔"

اس نے فون بند کر دیا پھر ناگواری سے چائے کی پیالی کو ہونٹوں سے لگا کر ایک گھونٹ لیا مگر تھو اور جھنجلا گیا۔ "لعنت ہے... اس مردود کی بکواس میں چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ وہاں گرم چائے لے آؤ۔"

وہ میز پر بکھرے ہوئے اخبارات اٹھا کر بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا، سارہ نے فوراً ہی سیل فون کی اسکرین پر حالیہ کال کرنے والے کے نمبر پڑھے۔ پھر انہیں اپنے فون میں سیو کرنے کے بعد کیتلی سے ایک پیالی میں گرم چائے انڈیلنے لگی۔

ادھر یاقوت نے کہا۔ "ہم کیسے یقین کر لیں کہ وسیم اس محل میں نہیں ہے... وہاں سے فرار ہو گیا ہے؟"

حارث نے کہا۔ "یہی میں سوچ رہا ہوں۔ وسیم سمجھدار ہے مگر چالاک نہیں ہے۔ وہ مسلح گارڈز کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار نہیں ہو سکے گا۔"

"میرا دل اس کے لیے تڑپ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ، تم کیا کرو گے؟"

"فی الحال صبر کروں گا۔ تم بھی کرو۔ ہم داؤد محل کا اچھی طرح جائزہ لیں گے۔ پھر اسے وہاں سے نکال لانے کی ٹھوس پلاننگ کریں گے۔"

وہ مایوس ہو کر سر جھکا کر سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہی کالنگ ٹون سنائی دی۔ حارث نے نمبر پڑھ کر کہا۔ "کوئی نیا نمبر ہے۔ پتا نہیں کون کال کر رہا ہے؟"

اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ "ہیلو... فرمائیے؟"

سارہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ابھی آپ نے ہی فون کیا تھا اور وسیم کا مطالبہ کیا تھا؟"

"ہاں۔ تم کون ہو؟ کیا ہمیں وسیم کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو؟"

"بتا سکتی ہوں۔ پہلے بتائیں، آپ کون ہیں؟"

"میں نے ابووال داؤد اور اس کے آدمیوں کو جہنم میں پہنچایا ہے۔ جبراً استعمال کیے جانے والے لڑکوں کو شرمناک دھندے سے نجات دلا رہا ہوں۔ وسیم کو بھی اس کے گھر پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"وسیم اپنے گھر جائے گا تو پھر پکڑا جائے گا۔ اگر آپ اس کے کام آنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک سسٹر کو تلاش کریں۔ وہ آرمی اسپتال میں لیڈی ڈاکٹر ہے۔"

"اور اس کا نام یاقوت ہے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں۔ یہی نام ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں، وہ کہاں ہوں گی؟"

"وہ یہیں ہے، لو اس سے بات کرو۔"

پھر سارہ نے ایک نسوانی آواز سنی۔ "ہیلو... میں یاقوت بول رہی ہوں۔"

سارہ نے بے یقینی سے کہا۔ "خوب! میں نے ابھی یاقوت کے متعلق دریافت کیا اور تم ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ظاہر ہو گئیں۔"

"کیا تم یقین نہیں کر رہی ہو؟"

"کیسے کروں؟ پہلے ایک بار ایک جاسوس نے یاقوت بن کر دھوکا دینا چاہا تھا مگر وسیم بہت چالاک ہے۔ اس نے اپنی سسٹر کے بارے میں ایسے سوالات کیے کہ اس جاسوس کا

جھوٹ پکڑا گیا۔"

"وسیم کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔ وہ میری آواز سنتے ہی مجھے پہچان لے گا۔ اپنی سسٹر کے بارے میں جو پوچھے گا، اس کا جواب دوں گی۔ یقین کرو، میں ہی اس کی سسٹر ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ انتظار کرو۔ ذرا دیر لگے گی مگر وہ دوسرے فون سے بولے گا۔"

سارہ اپنی مرحومہ ماں کے کمرے میں تھی۔ وہاں سے نکل کر اپنے کمرے کے دروازے پر آ گئی۔ وہاں اس نے ہلکی سی دستک دی پھر دھیمی آواز میں کہا۔ "میں ہوں سارہ۔ دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھل گیا۔ وسیم نے پوچھا۔ "خیریت ہے؟"

"ہاں۔ ایک خوش خبری ہے۔ اگر وہ عورت فراڈ نہ ہوئی تو تم ابھی اپنی سسٹر سے بات کرو گے۔"

وہ حیرت اور مسرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ فون کی سم بدل رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "اس سم کے ذریعے تم نے ایک فراڈ یاقوت سے باتیں کی تھیں۔ اس بار بھی اچھی طرح پرکھنے کے بعد اسے سسٹر تسلیم کرنا۔"

اس نے نمبر پنچ کرنے کے بعد اسے وسیم کی طرف بڑھایا۔ دوسری طرف کال جا رہی تھی پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو وسیم! کیا تم نے کال کی ہے؟ میں تمہاری سسٹر بول رہی ہوں۔"

وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بڑے جذبے سے بولتا ہوا باتھ روم میں آ گیا۔ "سسٹر! میری جان سسٹر! میں تمہاری آواز لاکھوں میں پہچان لیتا ہوں۔ تم ہی میری سسٹر ہو۔"

سارہ نے فون پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "فوراً تسلیم نہ کرو۔ اس سے سوالات کرو۔"

اس نے ہاتھ ہٹا دیا۔ ادھر سے یاقوت کہہ رہی تھی۔ "وسیم! تم کہاں ہو؟ کس حال میں ہو؟ کیا داؤد نے تمہیں کہیں قیدی بنا کر رکھا ہے؟"

"نہیں۔ میں آزاد ہوں۔ اپنے بارے میں بہت کچھ بتاؤں گا۔ پہلے مجھے اچھی طرح یقین کرنے دو۔ یہ بتاؤ کہ ہم ایک دوسرے سے بچھڑتے وقت آخری بار کہاں تھے؟ اور کس طرح ایک مکان سے فرار ہوئے تھے؟"

یاقوت نے تفصیل سے بتایا کہ اس رات اس کے گھر میں ڈکیتی اور قتل کی واردات ہوئی تھی۔ وہ اور وسیم احاطے کی دیوار پھاند کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔

وسیم نے سارہ سے کہا۔ "یہ میری اور اپنی ایک ایک بات بیان کر رہی ہیں۔ میں دیکھے بغیر پورے یقین سے کہتا ہوں، یہی میری سسٹر ہیں۔"

یاقوت نے پوچھا۔ "تمہیں ملانے والی لڑکی کون ہے؟"

"داؤد اسرار کی بیٹی ہے۔ باپ سمجھ رہا ہے، میں یہاں سے فرار ہو گیا ہوں جبکہ اس محل سے فرار ہونا ناممکن ہے۔ اس کی بیٹی سارہ نے مجھے چھپا کر رکھا ہے۔ کیا آپ ہم دونوں کو یہاں سے نکال کر لے جا سکتی ہیں؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا سارہ بھی تمہارے ساتھ آئے گی؟"

"ہاں۔ یہ میرے ساتھ رہے گی۔ یہ میری شریک حیات ہے۔"

"کیا...؟" یاقوت نے حیرت سے چیخ کر پوچھا۔ "ایک بار پھر کہو... ابھی تم نے کیا کہا ہے؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ سارہ کی مام وکیل تھیں۔ خدا ہمارا گواہ تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے نکاح قبول کیا ہے۔"

یاقوت نے خوشی سے حارث کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "سن رہے ہو؟ تم اس کی وسیمہ والی تصویر لائے تھے مگر وہ مرد ہے۔ اس نے داؤد اسرار کی بیٹی کو دلہن بنایا ہے۔"

حارث نے کہا۔ "تعجب ہے۔ داؤد جیسے ظالم، جابر اور مغرور شخص نے اسے داماد کیسے بنا لیا؟"

"داؤد اس رشتے سے بے خبر ہے۔ بیٹی نے وسیم کو باپ سے چھپا کر رکھا ہے۔ وہ اس محل سے باہر آنا چاہتے ہیں۔"

"آ کر کہاں جائیں گے؟ تم ہمارے حالات دیکھ رہی ہو۔ ہم کسی ایک پناہ گاہ میں مستقل نہیں رہ پاتے۔ چھپتے رہنے کے لیے جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ بیٹی محل سے نکلے گی تو باپ اسے تلاش کرنے کے لیے پورے عراق میں معصوم اور بے گناہ لوگوں کا خون بہاتا رہے گا۔"

یاقوت نے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ وہ اپنے ملک میں سلامتی سے رہ نہیں پائیں گے۔ کیا سرحد پار کسی دوسرے ملک میں جا سکیں گے؟"

"سرحدیں خطرناک ہو گئی ہیں۔ القاعدہ کے جنگجو چوری چھپے بارڈر کراس کرتے رہتے ہیں۔ وہاں اکثر گولیاں چلتی رہتی ہیں۔"

یاقوت نے فون پر کہا۔ "وسیم! تم سن رہے ہو، حارث کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ فی الحال ہمارے لیے باہر کہیں جائے پناہ نہیں ہے۔"

حارث نے کہا۔ "ہم تمہارے لیے فکرمند تھے۔ اب یہ اطمینان ہے کہ جہاں بھی ہو، محفوظ ہو۔ اپنے دشمن کی بیٹی کے ساتھ مردانہ وار زندگی گزار رہے ہو۔ دانشمندی یہ ہوگی کہ فی الحال وہیں چھپ کر رہو۔ حالات سازگار ہوں گے،

www.pkdigest.com

تب وہاں سے نکلنا مناسب ہوگا۔"
پھر یاقوت کی آواز سنائی دی۔ "حارث درست کہہ رہے ہیں۔ ہم تمہارے لیے مستقل محفوظ پناہ گاہ تلاش کریں گے۔ ابھی سارہ کے ساتھ وہاں سلامتی سے رہو۔"
سارہ نے فون لے کر کہا۔ "آپ کا مشورہ ہماری بہتری کے لیے ہے۔ ہم حالات کے بہتر ہونے کا انتظار کریں گے۔ ابھی فون بند کر رہی ہوں۔ ہم زیادہ دیر یہاں چھپ کر باتیں نہیں کر سکتے۔ میں فون کی سم بدل رہی ہوں۔ رات کو کسی وقت وسیم سے باتیں ہو سکیں گی۔"
وسیم نے فون کی طرف جھک کر خدا حافظ کہا۔ پھر سارہ نے فون آف کر دیا۔ وہ دونوں باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آ گئے۔ وسیم بہت خوش تھا۔ اس نے تقریباً دو ہفتے بعد اپنی مسٹر کی آواز سنی تھی۔ یہ حوصلہ پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ بالکل تنہا نہیں ہے۔ محل کی چار دیواری میں سارہ تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ اب محل کے باہر بھی مضبوط سہارا مل رہا تھا۔ یہ امید تھی کہ یاقوت اور حارث اس کے اور سارہ کے لیے کوئی محفوظ پناہ گاہ ضرور تلاش کر لیں گے۔
سارہ مایوس تھی۔ وہ کمزور سہارا قبول کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یاقوت اور حارث خود کہیں محفوظ نہیں تھے۔ جگہ بدلتے رہتے تھے۔ پھر بھلا ان کے لیے کیا کر سکتے تھے؟ وہ شاکر کے بارے میں سوچنے لگی۔ پچھلی رات وہ اپنی اوقات سے باہر ہو گیا تھا۔ تاریکی اور تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ تب یہ عقل آئی تھی کہ اس نے ایک گارڈ کو راز دار بنا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔
شاکر نے اسی غلطی سے فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اس کی دست درازی پر وہ اعتراض نہیں کرے گی۔ اگر کرے گی تو وہ بھید کھول دے گا۔ جہاں وسیم چھپا رہتا ہے، وہاں داؤد کو پہنچا دے گا۔
اسے کہتے ہیں، اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا۔ اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط شکنجہ خود ہی تیار کیا تھا۔ اب وہ شاکر کی گرفت سے نکل نہیں سکتی تھی۔
اس نے وسیم سے یہ بات چھپائی تھی کہ شاکر حد سے بڑھ چکا ہے اور آئندہ بھی جب چاہے گا، اس سے کھیلنے آ جائے گا۔ اب وہ کیا کرے؟ کیسے اس دلدل سے نکلے؟
یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وسیم کو یہ بات معلوم ہوگی تو وہ برداشت نہیں کرے گا۔ شاکر کو مارنے یا مرنے پر اتر آئے گا۔ وہ خود سوچ رہی تھی کہ مر جائے گی لیکن آئندہ اس کے ہاتھوں بلیک میل نہیں ہوگی۔

وہ وسیم کی بہتری چاہتی تھی۔ اسے محل سے باہر یاقوت کے پاس پہنچانا چاہتی تھی اور شاکر ہی اسے تمام گارڈز کی نظروں سے بچا کر وہاں سے نکال سکتا تھا۔
وہ جانتی تھی کہ شاکر پھر اس سے کسی وقت فون پر بولے گا۔ پھر تنہائی میں ملنے کی خواہش کرے گا۔ تب وہ شرط رکھے گی کہ پہلے وہ وسیم کو محل سے بخیریت نکال کر یاقوت اور حارث کے پاس پہنچائے، اس کے بعد وہ تنہائی میں اس سے ملے گی۔ اور تنہائی میں اس کے ساتھ وہ آخری ملاقات ہوگی۔

☆☆☆

شاکر نے پر مارے تھے۔ اونچی اڑان چاہتا تھا مگر زمین پر آ گرا تھا۔
مرد، اور عورت کے سامنے آ کر گر جائے... یہ توہین برداشت نہیں ہوتی۔ شرمندگی منہ چھپا کر رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔
جب اسے آپریشن کے ذریعے ناکارہ بنایا گیا تھا، تب سے وہ سوچتا تھا... کیا اس کی زندگی میں کوئی محبت کرنے والی نہیں آئے گی؟
یہ تو صاف سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ وہ کبھی کسی کے ساتھ نہ ازدواجی زندگی گزار سکے گا، نہ کبھی باپ بن سکے گا۔
اس نے چاہا تھا کہ کسی دوشیزہ پر دل آ جائے پھر عشق و محبت کے مرحلے سے گزرے گا۔ مگر عجیب بات تھی کہ کوئی آنکھوں میں سمائی تھی نہ دل میں اتری تھی۔
جب اسے سیکیورٹی گارڈ کے طور پر داؤد محل میں رکھا گیا، تب اس نے سارہ کو دیکھا تھا۔ وہ آنکھوں میں سمائی تھی۔ دل میں بھی اتر آئی تھی لیکن یہ چاند کو چھونے والی بات تھی۔ وہ آسمان تھی، یہ زمین تھا۔ پھر یہ کہ پرواز سے پہلے ہی اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔
وہ روزانہ اسے دیکھتا تھا، محسوس کرتا تھا کہ ایک مرد ہے، عاشق ہے۔ تقدیر مہربان ہو جائے تو اسے معشوق بنا سکتا ہے۔
چار برسوں کے بعد تقدیر مہربان ہوئی تھی۔ پہلی بار اس سے فون پر باتیں کرنے کے بعد بڑے جذبے سے سوچتا رہا کہ اسے اتنی محبتیں دے گا کہ وہ اپنے محبوب کو بھول کر صرف اور صرف اسی کے نام ہو جائے گی۔
سوچنا اور بات ہے، سمجھنا اور بات ہے۔ پچھلی رات وہ مجبور ہو کر اس کی گرفت میں آ گئی تھی۔ اگر وہ اسے جیت لیتا تو مرد میدان ہو جاتا۔ ان لمحات میں شدت سے شرمندگی بھی ہوئی اور یہ پچھتاوا بھی ہوا کہ جسے جان سے زیادہ چاہتا ہے، اس کا دل دکھایا ہے۔ اس پر جبر کیا ہے۔ اسے کنارے لگانا تھا، بیچ بھنور میں چھوڑ آیا ہے۔

وہ منہ چھپا کر روتا رہا۔ مرد نہیں روتے۔ اسی بات کا رونا تھا کہ ہاتھی کا دانت تھا۔ دکھانے کے لیے تھا، کھانے کے لیے نہیں تھا۔
صبح اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ وہ کوارٹر میں سونے کے لیے آیا۔ نیند نہیں آ سکتی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا رہا، بڑی سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ 'مجھے مر جانا چاہیے۔ میں کس حیثیت سے جی رہا ہوں؟ نہ اِدھر کا ہوں نہ اُدھر کا... جسے دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں، اسے ایک رات کی بھی مسرتیں نہیں دے سکتا۔ تھو ہے مجھ پر..... مجھے مر جانا چاہیے۔'
اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ 'خدا بہتر جانتا ہے۔ میں سارہ کو سچے دل سے چاہتا ہوں۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسے زندگی کی اہم مسرتیں نہیں دے سکوں گا۔ مگر کچھ تو دے سکتا ہوں۔'
'وہ اپنے شوہر کے ساتھ محل سے نکل کر سلامتی سے ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہے جبکہ یہ ناممکن ہے۔'
'عشق تو وہی سچا اور مستحکم ہوتا ہے جو ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ کوئی اسے تحفظ فراہم نہیں کر سکے گا۔ صرف میں کر سکتا ہوں۔ خدا مجھے حوصلہ دے۔ میں اس کی سلامتی اور بے خوف و خطر ازدواجی زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کر سکتا ہوں۔'
وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کاغذ قلم لے کر لکھنے لگا۔ ان لمحات میں اس کے اندر جذبات بھرے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جذبے سے سوچتا رہا اور لکھتا رہا۔ پھر اس نے کاغذ کو تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ ایسا اطمینان حاصل ہوا جیسے بے لوث محبت کا تمام قرض ادا کر چکا ہو۔
وہ آرام سے ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ سکون مل گیا تھا اس لیے جلد ہی گہری نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔
شام ڈھل گئی۔ سائے گہرے ہو گئے اور رات کی تاریکی میں بدل گئے۔ پچھلی چار راتوں سے وہاں بڑے خاموش ہنگامے ہوتے رہے تھے۔ اس رات بھی کچھ ہونے والا تھا۔
داؤد نے بیٹی سے کہا۔ "تم کھانے کے بعد اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں اسٹڈی روم میں رہوں گا۔"
وہ سمجھ گئی۔ باپ اپنی بیٹی کے سامنے حرم سرا کو اسٹڈی روم کہا کرتا تھا۔ وہ بولتا ہوا اسی طرف جا رہا تھا۔ سارہ رات کا کھانا ٹرالی میں لے کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ آٹھ بج چکے تھے۔ داؤد بوتل کھول کر گلاس بھر رہا تھا اور اس بات پر جھنجلا رہا تھا کہ وہ رات بھی خالی جائے گی۔ جس کم سن لڑکے کو آنا تھا، وہ نہیں آئے گا۔ اسے فون پر اطلاع مل چکی تھی کہ ابو دلاور مارا گیا ہے۔ قاشی کا اڈا تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ کسی بھی دلال سے رابطہ ممکن نہیں ہے۔

شاکر اپنے وقت کے مطابق ڈیوٹی پر آ گیا تھا۔ وہ بیرونی دروازے کو کھول کر اندر آیا۔ اسے مقفل کیا۔ پھر دبے قدموں چلتا ہوا حرم سرا میں آ گیا۔ داؤد کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ "تم اجازت لیے بغیر اندر کیوں آئے ہو؟"
وہ بولا۔ "آج بھی آپ کی رات خالی جائے گی، اس لیے آپ کا پہلو گرم کرنے آیا ہوں۔"
وہ گلاس کو میز پر پٹختے ہوئے بولا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ مرنا چاہتے ہو؟"
"میں تو اسی دن مر گیا تھا جب مجھ سے میری مردانگی چھین لی گئی تھی اور تب سے میں عیاش رئیسوں سے نفرت کرتا آ رہا ہوں۔"
داؤد نے میز پر رکھے ہوئے فون کو اٹھایا۔ شاکر نے اپنی گن سیدھی کی۔ اس کا نشانہ لیا پھر کہا۔ "فون واپس رکھ دو۔ پھر دوبارہ ہاتھ نہ لگانا۔"
وہ فون کو میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "تم اچانک نمک حرامی کیوں کر رہے ہو؟"
"کوئی بات اچانک نہیں ہوتی۔ اس بات کے پیچھے کتنے ہی عوامل کام کرتے رہتے ہیں۔ یہاں جب بھی کسی لڑکے کو لایا جاتا ہے تو میرے اندر سانپ پھنکارنے لگتا ہے۔ زخم تازہ ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسی ہی زیادتیاں کی گئی تھیں۔ میں تمہارے جیسے درندے کو مار ڈالنا چاہتا تھا لیکن..."
وہ ذرا چپ ہوا تو داؤد نے کہا۔ "تمہارے اس لیکن کے پیچھے مجھے ہلاک نہ کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے تو بولو؟"
"ہاں۔ بہت بڑی، بہت اہم وجہ ہے۔ تمہاری بیٹی نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔"
وہ غصے سے دہاڑتا ہوا اٹھا۔ "ذلیل... کمینے! میری بیٹی کا نام زبان پر..."
بات پوری ہونے سے پہلے ہی گن کا دستہ منہ پر پڑا۔ وہ پیچھے صوفے پر گر پڑا۔ پیشانی پر ضرب لگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے قمقمے جلنے بجھنے لگے تھے۔ سر چکرا رہا تھا۔ پیشانی پر بہتے ہوئے لہو کی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ذرا دیر بعد سنبھل کر آنکھیں کھولیں۔
شاکر نے بھرا ہوا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔ "پیشانی پر گومڑ نکل رہا ہے۔ پیو۔ تکلیف کم ہو جائے گی۔"
اس نے غصے اور بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کے ہاتھ سے لے کر پینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بوتل اٹھا کر منہ سے لگالی۔
شاکر نے میز پر گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "رسی جل

www.pkdigest.com

جائے گی اہل نہیں جائیں گے۔ تو اپنی رات کالی کرنے کے لیے وسیم کو یہاں لایا تھا۔ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ یہاں سے فرار نہیں ہوا ہے۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ تم سب نے اسے پورے محل میں تلاش کیا ہے۔"

اس نے پھر بوتل کو منہ سے لگایا۔ شاکر نے کہا۔ "اور میں تلاش کرنے والا ابھی کہہ رہا ہوں، وہ اس وقت تیری بیٹی کے بستر پر موجود ہے۔"

اسے ایک زوردار جھٹکا لگا۔ منہ سے بوتل نکل گئی وہ ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گئی۔ ایسا زبردست جھٹکا لگا تھا کہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے کھانستے دہرا ہو رہا تھا۔

وہ کمزور نہیں تھا لیکن اس رات تنہا حرم سرا میں آیا تھا اور خسرے گارڈ کی گن کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ جب کھانسی تھمنے لگی تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "سارہ کے کمرے میں چلو۔ اگر وہ کتا وہاں ہو گا تو..."

وہ آگے نہ بول سکا۔ منہ پر گھونسا پڑا۔ وہ اٹھ رہا تھا پھر بیٹھ گیا۔ شاکر نے کہا۔ "میری سارہ حیا والی ہے۔ کوئی گناہ نہیں کر رہی۔ اس نے وسیم سے نکاح قبول کیا ہے۔ تجھ سے نجات ملتے ہی باقاعدہ نکاح پڑھوائے گی۔"

یہ کہتے ہی اس نے پھر گن کے دستے سے اس کے منہ پر، گردن پر اور سر پر پے در پے ضربیں لگائیں۔ وہ بے دم سا ہو کر قالین پر چاروں شانے چت ہو گیا۔ شاکر نے گن کی نال اس کے سینے پر رکھ کر کہا۔ "تو کبھی سارہ کو اس کی مرضی سے ازدواجی زندگی گزارنے نہ دیتا۔ وہ بے چاری پریشان ہو رہی تھی کہ جہاں جائے گی، اپنے وسیم کے ساتھ ماری جائے گی۔ اب ایسا نہیں ہو گا۔ تو یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا کہ بازی کیسے پلٹ گئی ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر دبایا۔ رات کے سناٹے میں فائر کی آواز دور تک گونجی ہو گی۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا سارہ کے دروازے پر آیا۔ پھر دستک دیتے ہوئے بولا۔ "میں شاکر ہوں۔ دروازہ کھولو۔"

دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ سارہ نے کہا۔ "میں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے چلائی تھی۔"

اس نے جیب سے تہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "دروازہ بند کرو اور اسے وسیم کے ساتھ پڑھو۔ میں تمہیں آخری بار حسرت سے دیکھ رہا ہوں اور دعا دے رہا ہوں کہ خدا تمہیں وسیم کے ساتھ شاد و آباد رکھے۔"

باہر سے دروازہ پیٹنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر دوڑتا ہوا ادھر آیا۔ سیکیورٹی افسر کہہ رہا تھا۔ "شاکر! تم اندر ہو۔ کیا تم نے گولی چلائی ہے؟ عالی جناب فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ تم کہاں ہو؟ دروازہ کھولو۔"

اس نے دروازہ کھول کر کہا۔ "وہ حرم سرا میں ہیں۔"

سیکیورٹی افسر اور گارڈز دوڑتے ہوئے ادھر گئے۔ شاکر باہر جانے لگا۔ ایک منٹ کے اندر ہی سیکیورٹی افسر چیختا ہوا آیا۔ "شاکر کو گرفتار کرو۔ اس نے عالی جناب کو گولی ماری ہے۔"

کئی گارڈز نے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "شاکر! اپنی گن پھینک دو۔"

وہ ان سے دور جا رہا تھا۔ رک گیا۔ پلٹ کر محل کو یوں دیکھنے لگا جیسے سارہ کو حسرت سے دیکھ رہا ہو۔ پھر اس نے گن کا رخ گارڈز کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "آہ سارہ! تجھے سارا تو کیا آدھا بھی نہ پا سکا۔"

اس نے ایک گولی چلائی۔ جواب میں کئی گولیوں نے شور مچاتے ہوئے اسے چھلنی کر ڈالا۔

سارہ اور وسیم بند کمرے میں دیوانے عاشق کی تحریر پڑھ رہے تھے۔

اس نے لکھا تھا۔ "میری زندگی! تمہارے بغیر زندگی بھی کوئی زندگی ہے؟ تمہیں کہیں تم نہیں ملو تو مجھ کو کچھ بھی نہیں ہے۔ بس موت کا سناٹا...

"میں تمہاری آزاد ازدواجی زندگی کے لیے راستہ ہموار کر چکا ہوں۔ میری چند ہدایات پر فوراً عمل کرو۔

"آج کے بعد تم اس محل کی اور اپنے باپ کی تمام دولت و جائداد کی مالک بن جاؤ گی۔

"سب سے پہلے گارڈز تبدیل کرو۔ جو موجود ہیں، انہیں یہاں سے نکالو۔ نئے گارڈز آئیں گے تو وسیم کو تمہارا شوہر تسلیم کریں گے۔ تم یہاں کی خودمختار مالک بن چکی ہو گی۔ تمہارے آگے کوئی زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی رشتے دار یہاں قدم نہیں رکھے گا۔

"تم بالغ ہو۔ تمہاری شادی کو قانوناً بھی تسلیم کیا جائے گا۔

"اب تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ حالات نے اچانک کیسے پلٹا کھایا ہے...؟

"میں نے تمہارے بدکار باپ کو جہنم میں پہنچا دیا ہے۔"

سارہ کے ہاتھ سے کاغذ چھوٹ کر گر پڑا۔ اسی وقت باہر سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کا شور سنائی دیا۔ وہ دیوانہ چھلنی ہو رہا تھا۔

www.pkdigest.com

موقع شناس

محمد عفان آزاد

بڑا آدمی بننے کے لیے سیڑھی پر تو چڑھنا ہی پڑتا ہے۔ زندگی میں ترقی کی سیڑھی پر چڑھنے کا ایک موقع ہر شخص کو ملتا ہے۔ اسے بھی بڑا بننے کے لیے زندگی کے پہلے موقع کی تلاش تھی اور پھر وہ لمحہ آ ہی گیا۔

ایک موقع شناس کا امتحان جو زندگی میں دوسری بار موقع ملنے پر یقین نہیں رکھتا تھا

میڈ اگرچہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا لیکن نہ جانے لوگ اسے کیوں پاگل کہتے تھے۔ جب وہ اسے میڈ کہتے تو ان کا مفہوم اس کا نام نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے پاگل کہتے تھے۔ میڈ جانتا تھا کہ لوگ اسے کیا کہہ رہے ہیں لیکن وہ کبھی ان سے متفق نہیں ہوا۔ اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ لوگ اسے کیوں پاگل کہتے ہیں۔ کیا اس وجہ سے کہ وہ بارن کے ساتھ رہتا تھا اور وہ بارن کو پسند بھی کرتا تھا۔ اگر لوگ اس وجہ سے اسے پاگل کہتے تھے تو میڈ کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بارن جیسے شخص کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ دوسرے بارن کے لیے جو جذبہ رکھتے تھے، وہ صرف خوف اور نفرت تھے۔ کوئی اس کے لیے پسندیدگی کا جذبہ نہیں رکھتا تھا... سوائے میڈ کے۔

بارن واقعی قابلِ نفرت تھا... ایک تھرڈ کلاس بدمعاش جس سے ہر برائی اور جرم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ دنیا میں اگر اسے کسی چیز سے پیار تھا تو وہ اس کی اپنی ذات تھی۔ اس کے آگے وہ کسی کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتا تھا اور اپنے معمولی سے فائدے کے لیے وہ کسی کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک لاکھ ڈالرز کے لیے کسی کو قتل کر سکتا تھا اور ایک ڈالر کے لیے بھی۔ وہ ہر قیمت پر اپنا مطلب حاصل کرنے کے نظریے پر یقین رکھتا تھا۔

بارن تقریباً چالیس سال کا تھا اور صورت سے ہی گھٹیا اور بدمعاش نظر آتا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، صفائی سے محروم زرد دانت اور بلانوشی کی وجہ سے ہمہ وقت سرخ رہنے والی آنکھیں دیکھ کر کوئی بھی شخص اسے صرف بدمعاش ہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ بارہ سال کا تھا جب اس کی ماں اسے لاوارث چھوڑ کر کہیں غائب ہوگئی۔ اصل میں بارن نے اتنی سی عمر میں اسے اتنا تنگ کر دیا تھا کہ اس نے بھاگ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ اسے بارن کی کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ بارن کو کسی سے خطرہ نہیں البتہ دوسرے لوگوں کو بارن سے خطرہ ہوسکتا ہے۔ اس کی ماں کا اس کے بارے میں خیال درست ثابت ہوا۔

اپنی عمر سے بڑے نظر آنے والے بارن نے شروع سے اپنے ہم عمر بدمعاشوں میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔ وہ مار پیٹ میں تیز تھا اور ایسے وقت اس کے ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے چلتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ بہت ہوشیار بھی تھا۔ کسی سے بھی الجھنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتا۔ اگر وہ محسوس کرتا کہ حریف طاقت ور ہے اور وہ اس پر حاوی نہیں ہوسکے گا تو وہ فرار ہونے میں دیر نہیں لگاتا۔ اگر حریف برابر کا ہوتا تو وہ اسے کوئی بڑا نقصان پہنچائے بغیر شکست دینے کی کوشش کرتا تاکہ بعد میں وہ اس سے الجھنے سے گریز کرے۔ کوئی بڑا نقصان کرنے کی صورت میں وہ بارن کا دشمن بھی بن سکتا تھا اور وہ دشمن پالنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے دشمن کو پہلی فرصت میں اوپر بھیج دو، اس سے پہلے کہ وہ یہ کام کر گزرے۔ جو حریف بارن سے کمزور پڑتا تھا، اس کے لیے وہ سخت بے رحم بن جاتا۔ ایسے حریف پر وہ دل کھول کر اپنے ارمان پورے کرتا۔ اسے تشدد میں مزہ آتا تھا اور وہ کمزور حریف کو سوائے قتل کرنے کے ہر ممکن اذیت دینے کی کوشش کرتا۔

سولہ سال کی عمر میں وہ منشیات بیچنے لگا۔ ساتھ ہی اپنے علاقے میں موجود کال گرلز کے لیے دلال کا کام بھی کرنے لگا۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کسی کال گرل کے ساتھ رات گزار لیا کرتا لیکن اس نے کبھی ہیروئن یا کوکین استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ یہ موت کی طرف جانے والا شارٹ کٹ ہے اور وہ ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ صرف دوسروں میں موت بانٹنے کا قائل تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے پہلا قتل کیا۔ ایک حریف منشیات فروش لڑکے کو ایک ویران گلی میں گھیر کر اس نے بے دردی سے بیس بال کے بلّے سے اسے مارا۔ بارن کا ارادہ تو اس کی ہڈیاں توڑنے کا تھا لیکن ایک بار جب وہ اس کے بازو پر وار کر رہا تھا تو اس نے غلطی سے سر آگے کر دیا اور مہلک ضرب نے اسے فوری طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ زمین پر گر کر ساکت ہوگیا۔ بارن نے دو تین ضربیں اور لگائیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ حرکت نہیں کر رہا۔ اس نے لڑکے کی نبض دیکھی تو اسے ساکت پا کر متوحش ہوگیا۔ لڑکا مر چکا تھا۔ بارن کو اپنی فکر لگ گئی۔ اس کی خوش قسمتی کہ اس کے جرم کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔ اس نے بیس بال کے بلّے سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔ بعد میں پولیس نے لڑکے کے قتل کو نامعلوم شخص کی کارروائی قرار دے کر داخلِ دفتر کر دیا۔ پولیس جانتی تھی کہ لڑکا منشیات فروش تھا اور ایسے افراد کے قتل کو پولیس والے مدد قرار دیتے تھے۔

اس پہلے اتفاقی قتل کے بعد بارن محتاط ہوگیا۔ بیس سال کی عمر میں اسے منشیات فروشی کا کام چھوڑنا پڑا کیونکہ وہ پولیس کی نظر میں آچکا تھا۔ اس لیے نہ تو ہول سیلر اسے منشیات دیتے تھے اور نہ گاہک اس سے منشیات لیتے تھے۔ اس کا کام کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔ اس دوران میں وہ دو بار چند مہینے کے لیے جیل بھی جا چکا تھا۔ جیل میں اس نے پیشہ ور چوروں سے ان کے گر سیکھے اور جب اس کا منشیات فروخت کرنے کا دھندا ختم ہوا تو اس نے چوری شروع کر دی۔ وہ متوسط علاقوں میں خالی گھروں پر ہاتھ صاف کیا کرتا۔ عام طور سے اس کو ایک گھر سے اتنا مل جاتا کہ ایک آدھ مہینا آرام سے گزر جاتا۔ کبھی زیادہ مل جاتا تو وہ عیاشی بھی کر لیا کرتا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا۔

تیس سال کی عمر میں اس نے دوسرا قتل کیا۔ اس بار اس نے جان بوجھ کر اور ارادتاً قتل کیا۔ اس کا دشمن جونی بھی چور تھا اور اس نے ایک موقع پر عین اس وقت جب بارن ایک گھر میں گھس کر چوری میں مصروف تھا، پولیس کو کال کر دی۔ اس روز بارن بڑی مشکل سے بچا۔ وہ حیران تھا کہ پولیس کیسے آگئی کیونکہ اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا تھا جو کسی کو متوجہ کرتا اور پولیس الرٹ ہو جاتی۔ بعد میں یہ بات اسے میڈ نے بتائی۔ وہ اس وقت صرف دس سال کا تھا اور اس گلی میں آوارہ پھرتا تھا جس میں بارن کی رہائش تھی۔ اس نے اتفاق سے جونی کی گفتگو سن لی تھی۔ وہ کسی کو موبائل سے کال کر رہا تھا اور اسے بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح پولیس کو فون کر کے بارن کو مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی قسمت تھی جو وہ بچ گیا۔

میڈ بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے بارن میں کیا بات اچھی لگی تھی لیکن جب اس نے بارن کے بارے میں جونی کی بات سنی تو اسے غصہ آگیا اور اس نے جا کر بارن کو یہ بات بتا دی۔ بارن بھی ایک دس سال کے بچے پر اعتماد نہیں کرتا لیکن ایک تو جونی واقعی اس کا حریف تھا اور دوسرے میڈ نے اسے کچھ ایسی باتیں بھی بتائیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ اس کے باوجود بارن نے میڈ کی گردن پکڑ کر اسے دھمکی دی کہ اگر اس کی بات غلط نکلی تو وہ اسے قتل کر دے گا۔ میڈ سہم گیا۔

”میں اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہوں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے خود جونی کو فون پر بات کرتے سنا ہے۔“

”اپنی ماں کی قسم تو میں بھی کھاتا ہوں لیکن ہمیشہ جھوٹی قسم کھاتا ہوں۔“ بارن نے کہا اور جونی سے نمٹنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ جلد اسے ایک خیال سوجھ گیا اور اس نے ایک دن جونی کو خوش اخلاقی سے برانڈی کی بوتل میں شرکت کی دعوت دی۔ وہ حیران تو ہوا لیکن شراب دیکھ کر اس کی عقل گھاس چرنے چلی گئی۔ شراب اس کی بھی بڑی کمزوری تھی۔ بارن نے چالاکی سے خود کم پی اور اسے زیادہ پلائی۔ اس کے بعد اسے لے کر وہ ذرا گھوم کر آتے ہیں۔ اس جگہ سے کچھ دور گوداموں کے درمیان سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ رات ہوتے ہی وہاں سناٹا چھا جاتا تھا اور پھر کوئی اس طرف سے نہیں گزرتا تھا کیونکہ اس وقت وہاں جرائم پیشہ افراد کا راج ہوتا۔

بارن جونی کو وہیں لے گیا اور اس نے اسے ریلوے لائن پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ رسّی وہ ساتھ لایا تھا۔ نشے کی وجہ سے جونی مزاحمت نہیں کر سکا۔ بس پوچھتا رہا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ جب ٹرین کی وسل سنائی دی تو بارن نے اس سے سوال کیا۔ ”پولیس کو میرے بارے میں اطلاع تم نے دی تھی؟“

جونی چونکا اور پہلی بار اسے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو بارن نے اسے دھکا دے کر پھر پٹری پر گرا دیا۔ ”میرے سوال کا جواب دو۔“

”خدا کے لیے... ٹرین آنے والی ہے۔“ وہ دہشت زدہ ہو کر بولا۔ ”مجھے یہاں سے ہٹاؤ۔“

”مجھے معلوم ہے اور اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں پٹری سے اٹھنے نہیں دوں گا۔“

جونی نے اٹھنے کی کوشش کی تو بارن نے پھر اسے دھکا دے دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور وہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ ٹرین نزدیک آگئی تھی اور اس کے انجن کی سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ جونی رونے اور گڑگڑانے لگا لیکن بارن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ”مجھے جواب چاہیے۔ میرے بارے میں پولیس کو اطلاع تم نے دی تھی؟“

جونی نے دیکھ لیا کہ بارن بالکل سنجیدہ ہے اور ٹرین بھی پاس آگئی تھی... اور اگر اس نے تسلیم نہیں کیا تو کچھ دیر میں ٹرین اس کے جسم کے پرخچے اڑاتی ہوئی گزر جائے گی۔ مجبوراً اس نے تسلیم کر لیا کہ اس نے پولیس کو فون کر کے بارن کے بارے میں اطلاع دی تھی کہ وہ ایک گھر میں چوری کی نیت سے گھسا ہے۔ ”تم نے پولیس کو کیوں اطلاع دی؟“

”اس گھر کو میں نے تاڑا تھا لیکن مجھ سے پہلے تم وہاں گھس گئے اس لیے میں نے پولیس کو اطلاع کر دی۔“

”تم جانتے ہو، جرائم پیشہ ایک دوسرے کے بارے میں پولیس کو نہیں بتاتے، چاہے ان میں دشمنی کیوں نہ ہو۔ تم نے اس اصول کو توڑا ہے اس لیے تم مستحق ہو کہ تمہیں سزائے موت دی جائے۔“

بذریعہ ڈاک
خواتین و حضرات گھر بیٹھے داخلہ لیں
انگلش لینگویج کورس
ریفریجریشن ایئر کنڈیشننگ
اسکول ٹیچنگ میتھڈ
صحافت
فوٹوگرافی
کمپیوٹر
اسلام آباد اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر 1237
جی پی او اسلام آباد

"نہیں۔" جونی نے ٹرین کو قریب آتے دیکھ کر گھگیا کر کہا۔ "خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو... مجھے معاف کر دو۔"

لیکن بارن اس پر ترس کھانے کے لیے اسے یہاں نہیں لایا تھا۔ وہ تو اس کی موت کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے پاس سے ذرا دور جھاڑیوں میں چلا گیا تاکہ کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ جونی ریلوے لائن پر اچھل رہا تھا اور ٹرین کی آمد سے پہلے اس سے ہٹ جانا چاہتا تھا لیکن اسے مہلت نہیں ملی۔ ٹرین قریب آگئی تھی اور پھر وہ اسے روندتی ہوئی گزر گئی۔

اس واقعے کے بعد ہی میڈ، بارن کے قریب آیا۔

اس سال سرما بہت شدید تھا اور ایک رات جب بارن نشے میں دُھت واپس آرہا تھا تو اس نے میڈ کو شدید سردی میں اپنی گلی میں اخبارات تلے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ناکافی کپڑے پہن رکھے تھے اور اخبارات کی مدد سے خود کو سردی سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بارن نے رک کر اسے دیکھا۔ بارن اگرچہ کسی پر ترس کھانے والا شخص نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے اس وقت میڈ پر ترس آگیا۔ وہ سردی سے تھرتھر کانپ رہا تھا اور اس کے منہ سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ بارن نے کہا۔ "اٹھو... میرے ساتھ آؤ۔"

"کہاں جناب؟" میڈ کانپتے ہوئے بولا۔

"میرے کمرے میں آجاؤ۔"

میڈ ایک لاوارث لڑکا تھا۔ اس کی ماں بے راہ رو اور خود غرض عورت تھی۔ میڈ کے باپ کا خود اسے بھی نہیں معلوم تھا اور وہ بیک وقت کئی مردوں سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی چکر میں وہ ماری گئی۔ پولیس نے اس کے قتل کے الزام میں کئی افراد کو گرفتار کر لیا لیکن کسی پر الزام ثابت نہیں ہوا۔ اس وقت میڈ صرف سات سال کا تھا، تب سے وہ گلیوں اور فٹ پاتھوں پر پل رہا تھا۔ وہ کھانا مانگ کر یا کچرے دان سے چن کر کھاتا تھا اور اسی طرح مانگ تانگ کر کپڑے پہنتا۔ ماں کے مرنے کے بعد اس نے کبھی چھت تلے رات نہیں گزاری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بارن نے اسے اپنے کمرے میں آنے کی دعوت دی تو اسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

بارن کا کمرا اسی غلیظ گلی میں تھا جہاں میڈ رات گزارتا تھا۔ کمرا بھی کم غلیظ نہیں تھا لیکن بہر حال کھلی فضا کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔ بارن نے اسے ایک کونے میں پڑے پھٹے قالین پر لیٹنے کو کہا اور خود اپنے بستر پر گر کر خراٹے لینے لگا۔ یہ گھسا ہوا قالین میڈ کے لیے کسی نرم بچھونے سے کم نہیں تھا۔ بہت دنوں یا سالوں بعد وہ سکون کی نیند سویا۔ شاید اس رات کی مہربانی نے میڈ کو بارن کا گرویدہ بنا دیا۔ اس کے بعد دنیا بارن کے بارے میں جو کہتی، میڈ اسے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا۔ اس کے لیے بارن ہی سب کچھ تھا۔ وہ بارن کا کچھ ایسا گرویدہ ہوا کہ اس کا کہا میڈ کے لیے حرفِ آخر ہوتا۔

صبح بارن اٹھا تو میڈ سو رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ناشتے کے لیے ایک ڈالر رکھ کر چلا گیا۔ میڈ اٹھا تو اپنے پاس ڈالر پا کر سمجھ گیا اور یہ بھی جان گیا کہ بارن نے اسے مستقل یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس نے ڈالر سنبھال کر رکھ لیا اور سب سے پہلے اس کمرے کی صفائی کی۔ اگرچہ میڈ کو صفائی ستھرائی سے سروکار نہیں تھا اور وہ خود بہت گندا ہو رہا تھا لیکن وہ شکر گزاری کے جذبے کے اظہار کے لیے کمرے کی صفائی کر رہا تھا۔ البتہ اس نے یہ احتیاط کی کہ بارن کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اگرچہ وہاں کسی اہم یا قیمتی چیز کے پائے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا، ورنہ بارن اپنا کمرا یوں بے پروائی سے کھلا چھوڑ کر نہ جاتا۔ پھر بھی میڈ کی کوشش تھی کہ اس کی کسی حرکت سے بارن ناراض نہ ہو اور اسے اس پناہ گاہ سے بے دخل نہ کر دے۔

کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا باتھ روم بھی تھا اور اس میں گرم پانی آرہا تھا۔ میڈ عرصے بعد نہایا۔ آخری بار وہ ستمبر میں ہونے والی بارش میں نہایا تھا اس کے بعد بارش کا پانی بہت یخ ہو گیا تھا اور اس میں نہانے کا مطلب نمونیے سے مرنا بھی ہو سکتا تھا۔ میڈ نے ایک ڈالر سے ڈٹ کر ناشتا کیا اور جب شام کو بارن آیا تو وہ کمرے کے باہر موجود تھا۔ وہ اس کے لیے شاپر میں کھانا لایا تھا۔ اپنا کمرا صاف دیکھ کر بارن کو حیرت ہوئی۔

"یہ تم نے کیا ہے؟"

"جی جناب... آپ نے مجھے رات سردی میں ٹھٹھرنے سے بچایا۔" میڈ نے کہا۔

"اوہ... وہ تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بہر حال، تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔ دن میں بھی رہ سکتے ہو۔"

"شکریہ جناب!" میڈ خوش ہو گیا۔

بارن نے اسے دوسرے کپڑے بھی لا دیے۔ یہ بھی پرانے اور گھسے پٹے تھے اور بارن شاید کسی سیکنڈ ہینڈ کپڑوں کی دکان سے لایا تھا لیکن بہر حال یہ صاف ستھرے تھے اور انہیں پہن کر میڈ نے پہلی بار خود کو انسان محسوس کیا۔ اس کے بعد میڈ مستقل بارن کے ساتھ رہنے لگا اور بارن کے ساتھ رہنے اور

کھانے پینے کے عوض اس کے کام کرنے لگا۔ یہ سب چھوٹے موٹے کام تھے۔ میڈ کے خیال میں بارن کو اس کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اسے بارن کی ضرورت تھی۔ اس لیے اس کے دل میں کبھی بارن کے لیے جذبۂ شکر گزاری کم نہیں ہوا۔

میڈ کو احساس نہیں ہوتا تھا لیکن جب وہ باہر جاتا تو گلی میں رہنے والے دوسرے افراد اور خاص طور سے لاوارث لڑکے اسے مذاق اڑانے والے انداز میں دیکھتے تھے۔ وہ اس کا تمسخر اڑاتے اور اس سے معنی خیز باتیں پوچھتے۔ میڈ اتنا چالاک نہیں تھا اور نہ اس کی عمر اتنی تھی کہ ان کے اشاروں اور باتوں کو سمجھتا۔ اصل میں اس کا مذاق اڑانے والے اس سے جلتے تھے کیونکہ وہ میڈ پر جس بات کا الزام لگا کر اس کا مذاق اڑاتے، خود اسی گند میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میڈ گلی سے اٹھ کر ایک کمرے میں رہنے لگا تھا اور وہ خود گلی میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دن ایک لڑکے نے میڈ کو روک کر اس سے واضح الفاظ میں پوچھ لیا کہ وہ بارن کے ساتھ کس حیثیت سے رہ رہا ہے۔ میڈ گلیوں میں اور گندے لوگوں کے درمیان پلا بڑھا تھا۔ اپنی سادگی کے باوجود وہ بہت ساری باتوں کو سمجھتا بھی تھا۔ اس لیے یہ بات سن کر اسے شاک سا لگا۔ اس نے پُرزور احتجاج کیا۔ "یہ سب بکواس ہے۔ بارن بہت شریف آدمی ہے۔"

"شریف آدمی۔" وہ لڑکا ہنسا۔ "بے وقوف کسی اور کو بنانا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس نے آج تک مجھے غلط نظر سے نہیں دیکھا۔"

لیکن لڑکے نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ وہ مستقل یہی کہتا رہا کہ میڈ کے بارن سے غیر اخلاقی تعلقات ہیں۔ میڈ بہت ٹھنڈے دماغ کا لڑکا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ کوئی اس کے ساتھ زیادتی بھی کرتا تو وہ خاموشی سے برداشت کر لیا کرتا مگر اس وقت طیش میں آکر میڈ نے اس کے منہ پر مکا مار دیا۔ لڑکا عمر اور جسامت میں میڈ سے خاصا بڑا تھا۔ اس نے جوابی کارروائی کی اور میڈ کو دھنک کر رکھ دیا۔ ابھی وہ میڈ کی مرمت کر رہا تھا کہ بارن آگیا۔ بارن نے گردن سے پکڑ کر لڑکے کو الگ کیا۔ اسے دیکھ کر لڑکے کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ میڈ کو مار رہا تھا اور دوسرے اس نے بارن کے بارے میں بھی بکواس کی تھی۔ میڈ نے زمین سے اٹھ کر بارن کو اس کے الزام کے بارے میں بتایا تو بارن نے خوں خوار نظروں سے اسے دیکھا۔ بارن لڑکے کو کھینچ کر اپنے کمرے میں لے گیا اور وہاں اس کی طبیعت سے مرمت کی۔ جب اس نے لڑکے کو باہر دھکا دیا تو اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد گلی کے لڑکے اور دوسرے لوگ محتاط ہو گئے تھے۔ میڈ نے سکون کا سانس لیا۔ پھر بارن نے یہ علاقہ چھوڑ دیا اور وہ سینٹرل نیویارک کے ایک علاقے میں آگیا۔ یہاں زیادہ تر سیاہ فام اور اسپینش نسل کے لوگ آباد تھے۔ اسپینش خود کو سفید فام نہیں سمجھتے۔ وہ خود کو رنگ دار نسل میں شمار کرتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ بستے تھے اس لیے ان کے درمیان بارن خوش رہتا۔ اب اس نے ایک نیا دھندا شروع کر دیا۔ وہ بندرگاہ کے گوداموں سے درآمد برآمد ہونے والا سامان چوری کرتا کیونکہ اس چوری کا پتا منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد چلتا تھا اور اس وقت تک بارن سامان ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔ گوداموں میں اس سامان کی خاص حفاظت بھی نہیں کی جاتی تھی۔ سامان میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس میں کپڑے بھی ہوتے تھے اور الیکٹرانکس کا اور دوسرا سامان بھی۔

میڈ کو نہیں معلوم تھا کہ بارن کیا کرتا ہے۔ بس اسے یہ معلوم تھا کہ بارن جو کرتا ہے، وہ کسی نہ کسی طرح جرم کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک دن بارن نے اس سے کہا۔ "اب تم بڑے ہو رہے ہو... کسی لڑکی کے بارے میں سوچا ہے؟"

میڈ کو اچھا کھانے پینے کو ملا تو اس نے بارہ سال کی عمر میں قد کاٹھ نکال لیا لیکن ابھی اس نے لڑکیوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس نے شرما کر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں جناب!"

بارن ہنسا۔ "کوئی بات نہیں... کچھ دن بعد سوچنے لگو گے۔ کچھ کمانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں کما سکتا ہوں؟" میڈ نے بے یقینی سے کہا۔ "لیکن مجھے تو کچھ نہیں آتا جناب۔"

"کام میں تمہیں سکھاؤں گا اور پھر ہم جو کمائیں گے، اس میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔"

"میں تیار ہوں جناب۔" میڈ نے مستعدی سے کہا۔ "میں تو خود کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن آپ سے کہتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔"

اگلی بار بارن میڈ کو بھی ساتھ لے گیا۔ بندرگاہ کے ساتھ گوداموں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا اور یہ سارے ہی گودام بہت بڑے رقبے پر بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے

www.pkdigest.com

اکثر کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ وہ لوگ صرف تالا لگا کر مطمئن تھے۔ کچھ جگہوں پر گارڈز تھے اس لیے بارن ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کرتا۔ اس نے اپنی خستہ حال گاڑی ایک ایسے گودام کی عقبی گلی میں روکی جس میں کوئی گارڈ نہیں تھا۔ اس نے میڈ سے گاڑی میں رکنے کو کہا اور خود گاڑی کی چھت پر چڑھ کر دیوار پھلانگی اور اندر چلا گیا۔ میڈ اس کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ ایک چھوٹے سے دروازے سے باہر آیا اور اس نے میڈ کو ساتھ آنے کو کہا۔ میڈ اس کے ساتھ اندر آیا تو بارن نے کئی کارٹن میں سامان نکال کر رکھا ہوا تھا۔ میڈ اس کے ساتھ یہ سامان لا لا کر گاڑی میں رکھنے لگا۔ یہ کارٹن خاصے بھاری تھے اور تعداد بھی زیادہ تھی۔ ان کی منتقلی میں بیس منٹ لگ گئے۔ بارن آرام سے کام کر رہا تھا لیکن میڈ کو ڈر تھا کہ کوئی آنہ جائے۔ بارن نے اس کا خوف محسوس کر لیا۔ اس نے کہا۔

''آرام سے کام کرو، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔''

سارے کارٹن گاڑی میں بڑی مشکل سے آئے تھے۔ اس کے فوراً بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میڈ کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے گھر کا رخ کریں گے لیکن بارن اس کے بجائے بندرگاہ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی آبادی تک آیا اور اس نے ایک شخص کو یہ سارے کارٹن فروخت کر دیے۔ یہ شخص کباڑیا تھا۔ رقم کے معاملے پر بارن کا اس شخص سے تھوڑا جھگڑا ہوا۔ میڈ ڈر گیا کہ بارن یہاں ہنگامہ نہ کر دے۔ لیکن جلد تنازع طے ہو گیا اور اس شخص نے بارن کی مانگی ہوئی رقم اس کے حوالے کر دی۔ میڈ یہ تو نہیں دیکھ سکا کہ بارن کو کتنی رقم ملی تھی لیکن اس نے میڈ کو بیس ڈالرز کا ایک نوٹ دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس سے پہلے اسے کبھی اتنی رقم ایک ساتھ نہیں ملی تھی۔ اس نے بارن سے پوچھا۔

''جناب! ان کارٹنوں میں کیا تھا؟''

''پلاسٹک کی رسی اور بوریاں تھیں۔ چور مارکیٹ میں ان کی اچھی قیمت مل جاتی ہے۔''

اس روز میڈ نے پہلی بار کھل کر شراب پی۔ اس سے پہلے بھی وہ چکھتا رہا تھا لیکن اس نے نشے کے حد تک نہیں پی تھی۔ بارن بہت خوش ہوا۔ اس نے میڈ کی پیٹھ تھپک کر کہا۔ ''برخوردار! اب تم نے ٹھیک لائن پکڑی ہے۔ ہماری زندگی کیا ہے... شراب، کھانا اور عورت۔ بس عورت کا خانہ خالی ہے لیکن کچھ دن میں تم اس میں بھی چالو ہو جاؤ گے۔'' بارن نے اسے آنکھ ماری تو میڈ ہنس دیا۔

پہلی واردات کے بعد میڈ، بارن کے ساتھ مستقل کام کرنے لگا۔ بارن ہر واردات کے بعد اسے سو پچاس ڈالرز پکڑا دیا کرتا۔ میڈ کو نہیں معلوم تھا کہ بارن کتنا کماتا ہے لیکن اس کے لیے یہ سو پچاس ڈالرز بھی بہت تھے۔ ہفتے میں ایک بار وہ کام پر نکلتے۔ بارن موقع پہلے ہی تاڑ لیا کرتا اور باقاعدہ منصوبہ بنا کر جاتا۔ وہ کسی معاملے میں اندھا ہاتھ ڈالنے کا قائل نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ شروع میں دو بار سزا کاٹنے کے بعد پھر کبھی جیل نہیں گیا تھا۔

جب بارن کے پاس رقم آجاتی تو وہ دو تین دن کھل کر عیاشی کرتا۔ شراب خانے جاتا اور پھر کسی کال گرل کے ساتھ نکل جاتا۔ وہ کبھی کسی عورت کو اپنے گھر میں لے کر نہیں آیا تھا اور نہ ہی گھر لا کر شراب پیتا تھا۔ اس کی کیا وجہ تھی، اس نے کبھی میڈ کو بتایا نہیں اور نہ ہی میڈ نے اس سے کبھی اس بارے میں پوچھا۔ میڈ کو ٹی وی پر باسکٹ بال اور بیس بال دیکھنے کا شوق ہوا تو بارن نے اسے کہیں سے ایک سیکنڈ ہینڈ ٹی وی لا دیا۔ اب میڈ فارغ اوقات میں اپنا یہ شوق پورا کرتا۔ اس نے بارن کی لڑکیوں کے معاملے میں چالو ہونے والی پیش گوئی ابھی تک پوری نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اسے لڑکیوں سے شرم آتی تھی۔

اب تک ان کا کام ٹھیک چل رہا تھا اور سوائے ایک دو موقعوں کے انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ایک بار جب وہ چوری کر رہے تھے تو غیر متوقع طور پر گودام میں کچھ لوگ آگئے اور ان کو عجلت میں فرار ہونا پڑا۔ اسی طرح کئی بار چوری کے بعد واپس آتے ہوئے ان کا پولیس سے سامنا ہوا مگر پولیس نے انہیں روکا نہیں۔ میڈ جب پولیس کو دیکھتا تو اس کی حالت خراب ہو جاتی۔ بارن اس موقع پر پُرسکون رہتا۔ ایک بار اس نے میڈ سے کہا۔ ''پریشان ہونے سے کیا فائدہ... زیادہ سے زیادہ پولیس گرفتار کر لے گی۔''

''مجھے جیل جانے سے ڈر لگتا ہے۔''

''احمق... جرم کرتے ہو اور جیل جانے سے ڈرتے ہو؟ آدمی جیل جا کر تو سیکھتا ہے۔''

میڈ، بارن کی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتا تھا لیکن اسے جیل جانے والی بات سے اختلاف تھا۔ وقت گزرتا رہا اور میڈ بھرپور جوان ہو گیا۔ بارن اب جوانی کی حد سے نکل کر ادھیڑ عمری میں آگیا تھا لیکن اس کے کس بل میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ہاتھ پاؤں کی لڑائی میں وہ اچھے اچھے لڑاکوں کو بھی پیٹ کر رکھ دیتا۔ اس نے میڈ کو بھی لڑائی سکھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس چیز سے گھبراتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ذاتی

www.pkdigest.com

دفاع کے لیے بارن کا محتاج تھا۔

البتہ دوسرے امور میں بارن نے اسے طاق کر دیا تھا۔ اسے چوری کے تمام رموز آگئے تھے اور اب وہ چاہتا تو خود بھی کام کر سکتا تھا لیکن اس نے کبھی بارن کو چھوڑنے کا سوچا ہی نہیں۔ اب ریکی کا کام میڈ کرتا اور پھر دونوں مل کر چوری کرتے تھے۔ سالوں سے ایک ہی جگہ کام کرنے کی وجہ سے ان کو گوداموں کا یہ علاقہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح ازبر ہو گیا تھا۔ پھر بارن نے مقامی گارڈز سے ایسی لائن بنالی تھی کہ اسے ان سے معلوم ہوتا رہتا کہ کس گودام میں کون سا مال آیا ہے۔ شراب کی ایک بوتل کے عوض اسے بیش قیمت معلومات مل جاتی تھیں۔

اب بارن زیادہ کے چکر میں رہتا تھا۔ وہ ہفتے میں دو وارداتیں کرنے لگا۔ میڈ نہیں جانتا تھا کہ اسے رقم کی پہلے سے زیادہ ضرورت کیوں رہنے لگی ہے کیونکہ اس کے اخراجات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ کچھ کمی ہی ہوئی تھی۔ اس نے عورتوں پر رقم لٹانا کم کر دیا تھا اور اب مہینے میں ایک دو بار ہی کسی کے ساتھ جاتا۔ میڈ نے محسوس تو کر لیا تھا لیکن عادت کے مطابق بارن سے کبھی پوچھا نہیں۔

ایک رات بارن باہر سے آیا تو اس نے ٹی وی دیکھتے میڈ کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”آج ایک اچھی خبر ملی ہے۔“

”کیسی خبر جناب؟“ میڈ نے ٹی وی سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

”بندرگاہ پر گیمز سیمولیشن کی ایک بڑی کھیپ آئی ہے اور فی الحال اسے بندرگاہ سے لے جانے کا بندوبست نہیں ہو سکا ہے۔ کل یہ کھیپ ایک گودام میں رکھ دی جائے گی۔“

”یہ تو الیکٹرانکس کی چیز ہے تو اس کی لازمی حفاظت ہو گی۔“ میڈ نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں، گارڈز تو لازمی ہوں گے لیکن ان سے بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ سمجھو کہ لاکھوں ڈالرز کا مال ہے۔“

میڈ اچھل پڑا۔ ”سچ میں لاکھوں ڈالرز کا مال ہے؟“

بارن نے فخر سے سر ہلایا۔ ”اگر یہ سامان ہاتھ آگیا تو سمجھو ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”لیکن ہم اسے بیچیں گے کیسے؟“

”میری نظر میں ایک آدمی ہے جو یہ سامان لے سکتا ہے۔ اس کی ساکھ بھی اچھی ہے۔ وہ چوری کے مال کی آدھی قیمت دیتا ہے۔“

بارن نے اس آدمی کا نام نہیں بتایا اور میڈ نے پوچھا بھی نہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا قائل تھا۔

اس کے خیال میں بارن جو سوچتا اور کرتا، وہی ٹھیک ہوتا تھا۔ اگلے روز بارن بندرگاہ میں اس سامان کے سلسلے میں پھرتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ دو بڑے کنٹینرز اترے تھے اور ان میں صرف گیمز سیمولیشن تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کھیپ کی مالیت لاکھوں نہیں کروڑوں ڈالرز میں تھی۔ بارن خوش ہو گیا۔ اگر اس میں سے کچھ سامان ہی ہاتھ آجاتا تو اس کے مزے ہو جاتے اور پھر اسے آئے دن چھوٹی موٹی چوریوں کے لیے خطرہ مول لینا نہیں پڑتا۔ اگرچہ وہ ان کنٹینرز سے سارا سامان نہیں لے جا سکتا تھا... بلکہ شاید دسواں حصہ بھی نہیں لے جا سکتا تھا لیکن اس بار اس نے لمبا ہاتھ مارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ایک کنٹینر کا دسواں حصہ بھی بہت تھا۔

بارن نے سامان کے لیے کہیں سے ایک چھوٹا ٹرک حاصل کیا جس کا پچھلا حصہ بند ڈبے پر مشتمل تھا اور اس میں کوئی سامان چھپا کر آسانی سے لے جایا جا سکتا تھا۔ ٹرک میڈ چلاتا۔ اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ بارن نے آنے والی رات ہی کام کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ کب کنٹینرز گودام سے روانہ کر دیے جائیں۔ ان کی خوش قسمتی کہ اس رات شدید بارش جاری تھی۔ وہ ٹرک میں اس گودام تک آئے۔ بارن نے ٹرک گودام سے کچھ دور رکوا دیا۔ وہ عقبی گلی کی طرف چلا گیا۔ میڈ ٹرک کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کوئی نصف گھنٹے بعد گودام کا دروازہ کھلا اور بارن نے باہر نکل کر اشارہ کیا۔

میڈ ٹرک اسٹارٹ کر کے گودام میں لے آیا۔ اندر دونوں کنٹینرز موجود تھے۔ یہ کنٹینرز سیل تھے لیکن بارن سارے انتظامات کر کے آیا تھا۔ اس کے پاس پورٹیبل ویلڈنگ ٹارچ تھی اور اس کے شعلے نے دس منٹ میں کنٹینر کے دروازے کی تینوں سلاخیں کاٹ دیں اور اس کا دروازہ کھل گیا۔ اندر تہ در تہ درمیانے سائز کی پلائی کے بنے کارٹن رکھے تھے۔ یہ واٹر پروف تھے۔ بارن اور میڈ نے نہایت پھرتی سے کارٹن اٹھا کر ٹرک میں رکھنا شروع کر دیے۔ میڈ کو وہاں کوئی گارڈ نظر نہیں آیا۔ بارن کا اطمینان بتا رہا تھا کہ وہاں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ انہوں نے ٹرک کا عقبی حصہ کارٹنوں سے بھر لیا۔ یہ بھی لاکھوں کا مال تھا۔ انہیں آدھا گھنٹا لگا۔ اس کے فوراً بعد وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ بارش نے ان کا حشر نشر کر دیا تھا اور پانی بھی ٹھنڈا تھا لیکن انہوں نے جو حاصل کیا تھا، اس کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

”گارڈز کہاں تھے؟“ میڈ نے ٹرک چلاتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اپنے کمرے میں بندھے پڑے ہیں۔ ان کو قابو کرنے میں تو اتنا وقت لگا۔“ بارن نے چلا کر کہا۔ بارش کا شور اندر تک آرہا تھا۔ آسمان سے پانی کی چادر برس رہی تھی۔ اس وجہ سے میڈ ٹرک بھی آہستہ رفتار سے چلا رہا تھا۔ بارن اس کی راہنمائی کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد اس شخص کے گودام پر تھے جو چوری کا مال خریدتا تھا۔ بارن اور میڈ ٹرک روک کر نیچے اتر آئے۔ بارن اس شخص کے پاس گیا۔

”ماسٹر! میں سامان لے آیا ہوں۔“

میڈ اس شخص کو جانتا تھا۔ وہ نیویارک میں ماسٹر کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا جو بہت کم لوگ جانتے تھے۔ اس کی وجہ شہرت چوری کا مال خریدنا تھی۔ ماسٹر نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے ٹرک سے کارٹن نکالنا شروع کر دیے۔ ماسٹر نے ایک کارٹن خود کھولا۔ اس نے اندر سے گیم مشین نکالی۔

”اے ون چیز ہے۔“ بارن نے کہا۔

”ہاں لیکن اے ون چیز کی مانگ آج کل کم ہے۔ دو نمبر زیادہ چل رہے ہیں۔“ ماسٹر نے جواب دیا۔

جس دوران میں ماسٹر کے آدمی ایک ایک کارٹن کھول کر چیک کر رہے تھے، بارن اور ماسٹر ایک کونے میں چلے گئے اور قیمت طے کرنے لگے۔ اس میں خاصا وقت لگا کیونکہ دونوں اپنا مفاد حاصل کرنے کے چکر میں تھے۔ بالآخر ایک قیمت طے ہو گئی اور ماسٹر نے ایک چھوٹا سا چرمی بیگ بارن کو دیا۔ اس نے بیگ کھول کر رقم دیکھی اور مطمئن ہو کر اسے بند کر دیا۔ ٹرک خالی ہو گیا تھا اور ماسٹر کے آدمیوں نے تمام کارٹن کھول کر گیم مشینیں چیک کر لی تھیں۔ بارن اور میڈ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اپنے فلیٹ پہنچ کر بارن نے میڈ سے کہا۔

”ٹرک چارلی کو دے آؤ۔“

”چارلی ورکشاپ والے کو؟“ میڈ نے پوچھا۔

”ہاں، اسے دے آؤ... ابھی۔“ بارن کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔ میڈ فرماں برداری سے روانہ ہو گیا۔ حالانکہ بارش کے زور میں کوئی کمی نہیں آئی تھی اور میڈ یہ کام صبح بھی کر سکتا تھا لیکن بارن کے سامنے اسے بحث کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ ٹرک واپس کر کے آیا تو بارن بستر پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ اس نے رقم والا چرمی بیگ کہیں چھپا دیا تھا۔ میڈ کو ورکشاپ بند ملی تھی اس لیے وہ ٹرک باہر کھڑا کر کے اور چابی اسی میں چھوڑ کر آگیا تھا۔ وہ بھی تھکا ہوا تھا اس لیے لیٹتے ہی سو گیا۔

صبح اٹھ کر اس نے ناشتے کی تیاری شروع کر دی۔ بارن کی آنکھ کھل گئی تھی اور وہ بستر پر لیٹا شراب کی بوتل سے گھونٹ لے رہا تھا۔ میڈ نے ناشتا تیار ہونے کی اطلاع دی تو وہ بستر سے نکل آیا۔ ناشتے سے پہلے اس نے کپڑے بدلے اور ایک چھوٹے سے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور دوسری چیزیں ڈال لیں۔ رقم والا چرمی بیگ بھی اسی میں ڈال لیا۔ میڈ سب دیکھ رہا تھا۔ جب بارن کھانے کی میز پر آکر بیٹھا تو میڈ نے پوچھا۔ ”کیا تم کہیں جا رہے ہو؟“

”ہاں، میں جا رہا ہوں۔“ بارن نے ناشتا شروع کرتے ہوئے کہا۔

”کہاں؟“

”یہ تو نہیں پتا لیکن اب میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔“ بارن نے بے نیازی سے شانے اچکا کر کہا۔

میڈ ششدر رہ گیا۔ کئی منٹ تک اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ پھر اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”کیا تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟ مم... میرا کیا ہو گا؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ بارن نے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تمہارا ساری عمر کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا ہے۔“

میڈ بھی یہ بات جانتا تھا لیکن اس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ وہ بارن کے بغیر بھی رہے گا۔ بارن نے ناشتا ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”آدمی کو زندگی میں ایک موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی لائف سنوار سکے اور مجھے یہ موقع مل گیا ہے۔ میں جرم کرتے کرتے تھک گیا ہوں۔ اب میرے پاس دولت ہے اور میں یہاں سے کہیں دور جا کر سکون کی زندگی گزاروں گا۔“

”میں کیا کروں گا؟“ میڈ نے ملتجی لہجے میں کہا۔ ”تم جانتے ہو، میں تمہارے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں نے کہا نا، ہر آدمی کو ایک بار موقع ملتا ہے۔ تمہیں بھی ملے گا۔ تم اپنے موقع کا انتظار کرو... اور ہاں، جلدی سے کافی بنا دو مجھے جانا ہے۔“

”پلیز بارن! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا... تم مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“

”نہیں برخوردار! میں تمہیں نہیں لے جا سکتا۔ میں اپنا ماضی چھوڑ کر جا رہا ہوں اور تمہیں لے جانے کا مطلب ہے کہ میں ماضی کو ساتھ رکھوں۔“ بارن نے صاف انکار کر دیا۔ میڈ کچھ دیر اس کے آگے روتا گڑگڑاتا رہا پھر مایوس ہو کر کافی تیار کرنے لگا۔ کافی تیار کر کے میڈ نے اس کے سامنے رکھ دی

www.pkdigest.com

اور حسرت سے اسے دیکھنے لگا۔ بارن نے کافی کا لمبا گھونٹ لیا اور بولا۔

''مجھے بھی یوں تمہیں چھوڑ کر جاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب تم اس قابل ہو چکے ہو کہ خود سے زندگی گزار سکو۔ میں نے تمہیں بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ امید ہے کہ تمہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔''

اگلے روز میڈ فلیٹ سے نکلا تو ان کے سامنے فلیٹ میں رہنے والی لڑکی نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''کیا بات ہے، کل صبح تم اور بارن زور زور سے بول رہے تھے؟''

''ہاں۔'' میڈ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''بارن مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میں اسے روک رہا تھا لیکن اس نے میری ایک بات نہیں سنی۔''

لڑکی نے حیرت سے میڈ کو دیکھا۔ ''بارن تمہیں چھوڑ گیا؟ ناقابلِ یقین بات ہے۔''

''لیکن یہ حقیقت ہے۔ اسے کہیں سے بڑی رقم مل گئی تھی اور اب وہ کسی اجنبی جگہ جا کر سکون سے رہنا چاہتا تھا جہاں اس کا ماضی اس کے سامنے نہ آئے۔ وہ جرم کی دنیا سے اکتا گیا تھا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ وہ جرم کی دنیا سے اکتا سکتا ہے۔ وہ تو جرم کی دنیا کا آدمی ہے۔''

''مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا جب اس نے مجھ سے جانے کو کہا... لیکن اس نے اپنا سامان سوٹ کیس میں رکھا اور چلا گیا۔ تب سے میں پی پی کر اپنا غم ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

لڑکی نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ ''اب تم اس کے بغیر کیسے رہو گے؟''

''یہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔''

شام تک پورے علاقے میں اور تمام جاننے والوں میں یہ بات پھیل چکی تھی اور میڈ جہاں سے گزرتا، لوگ اسے روک روک کر پوچھتے اور بے چارے کو اپنی کہانی سنانی پڑتی۔ شام تک اس نے بارن کے جانے کی کہانی کوئی پچاس بار سنائی تھی۔ لوگ شاید یقین نہ کرتے لیکن بارن جاتے ہوئے اپنی کار بھی ساتھ لے گیا تھا۔ بارن اس کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ جب لوگوں کو یقین آگیا تو وہ میڈ سے افسوس کرنے لگے۔ بعض نے اسے مبارک باد بھی دی کہ ایک بُرے انسان سے اس کی جان چھوٹ گئی جو کسی جونک کی طرح اس کا خون چوس رہا تھا اور اس سے برابر کا کام لے کر اسے مزدور جتنا معاوضہ بھی نہیں دے رہا تھا۔ شام تک میڈ کو ہر طرح کی باتیں سننا پڑیں۔ وہ شراب کی بوتل خرید کر واپس آیا تو وہی..... لڑکی اس کی منتظر تھی اور اس نے میڈ کو پیش کش کی کہ کم سے کم آج رات وہ اس کی تنہائی بانٹنے کے لیے تیار ہے۔ میڈ لڑکیوں کے معاملے میں اب بھی شرمیلا تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں کرسٹی! ابھی میرا موڈ نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی۔'' کرسٹی نے فراخ دلی سے کہا۔

میڈ حیران تھا۔ کل تک کوئی اس سے بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا اور آج سب اس پر مہربان تھے۔ کیا بارن ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ اپنی شخصیت بنا سکے گا؟ وہ فلیٹ میں آیا اور اس نے بوتل ایک طرف رکھ دی۔ بارن کے بغیر فلیٹ عجیب سا لگ رہا تھا لیکن اب اسے بارن کے بغیر ہی زندگی گزارنی تھی۔

بارن اس کا استاد تھا۔ اس نے میڈ سے جو کہا تھا اس نے اسے اپنی گرہ میں باندھ لیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے بارن کی آخری بات بھی مانی تھی کہ انسان کو زندگی میں اوپر جانے کا ایک موقع ضرور ملتا ہے اور اسے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے... کیونکہ ایک چانس پکا ہے، دوسرا نہیں۔ میڈ نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔ اس نے بارن کی کافی کے پانی میں نیند کی کئی گولیاں ملا دیں۔ پانی میں گولیاں گھل گئیں اور بارن کو کافی کی تلخی میں اس کا احساس نہیں ہوا۔ کافی ختم کرتے ہی اسے نیند آنے لگی اور اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال سمجھتا، نیند اس پر حاوی ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کا کام میڈ کے لیے بہت آسان تھا۔ اس نے عقبی سیڑھیوں سے بارن کو نیچے پہنچایا اور گلی میں کھڑی اس کی کار میں ڈال کر گاڑیوں کے ایک جنک یارڈ پہنچا دیا... جہاں اس نے بارن کو اچھی طرح باندھ کر اور اس کا منہ بند کر کے اسے ڈکی میں ڈال دیا اور کار ایسی جگہ کھڑی کر دی جہاں سے کسی کے گزرنے کا امکان نہ ہو۔

بارن کے پاس چار لاکھ ڈالرز سے زیادہ کی رقم تھی جو اس نے اس سودے میں کمائی تھی اور پہلے بھی جمع کرتا رہا تھا۔ میڈ کے لیے یہ رقم ایک چانس تھی اور یہ چانس اسے پھر نہیں ملتا، اس لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔ اب اس کا ارادہ یہاں سے نکل جانے کا تھا۔ ممکن ہے، بارن بچ جاتا اور واپس آجاتا لیکن اس وقت تک میڈ یہاں سے کہیں دور جا چکا ہوتا۔

تلاش

کاشف زبیر

سرپٹ دوڑتے وقت کے گھوڑے پر سوار دولت کے متلاشی کو کبھی کبھی ایسے حالات کا شکار ہونا پڑتا ہے کہ مقصد تو تکمیل پا جاتا ہے ...... لیکن اس کی لپیٹ میں بہت سے محبت گزیدہ اور فرض شناس افراد زندگی کی جنگ ہار جاتے ہیں

محبت انتقام اور فرض کے درمیان حائل رکاوٹوں کا منتشر ماجرا

وہ تعداد میں زیادہ تھے اور وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے اسے جکڑا اور اسے کھینچ کر اس کے بچوں کے کمرے میں لے آئے۔ چھ سال کی کیٹ اور چار سال کا وین اپنے بستر پر سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ مارک کو جیسے علم ہو گیا کہ وہ کیا کرنے والے ہیں۔ اس نے چلا کر انہیں منع کرنا چاہا لیکن اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ بیڈروم کی طرف سے نینسی کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ لیکن اس کی آواز اتنی نہیں تھی کہ کسی کو متوجہ کر سکتی۔ شام سے اس کا گلا خراب تھا اور وہ بڑی مشکل سے بول پا رہی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

مارک مچلتے ہوئے ان سے خاموش التجا کررہا تھا لیکن وہ بہت سفاک اور انسانیت سے عاری لوگ تھے۔ مارک حیران تھا کہ وہ گھر میں گھسے کیسے؟ کیونکہ وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کیسے اندر آئے۔ جب انہوں نے اسے دبوچا تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس وقت تک وہ بے بس ہوچکا تھا۔ اسے پکڑنے والے پیشہ ور تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ تین نے اسے قابو کیا اور دو نے نیٹ کو۔ وہ پانچوں نقاب پوش تھے۔ وہ اسے بچوں کے بیڈروم میں لے آئے۔ مارک کو احساس تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ ان میں سے ایک نے مارک کی آنکھوں میں دیکھا۔

”تمہیں خبردار کیا تھا کہ ہمارے راستے میں مت آنا۔“

مارک اس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس کیس سے دست بردار ہوجائے گا اور یہ کہ اس کے بچوں کو کچھ نہ کیا جائے۔ نقاب پوش نے شاید اس کے دل کی بات محسوس کرلی تھی۔ اس نے بچوں کی طرف دیکھا اور مارک سے کہا۔ ”تمہارے بچے بہت پیارے ہیں لیکن افسوس... ان کو بہت بُرا باپ ملا جس نے انہیں اپنی ضد پر قربان کردیا۔“

یہ کہتے ہی نقاب پوش نے بہت تیزی سے اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں دونوں بچوں کو شوٹ کردیا۔ گولیاں ان کے سروں پر لگی تھیں اور وہ اپنی جگہ ہی گر گئے۔ پستول میں سائلنسر تھا، آواز نہیں آئی۔ لیکن مارک کو ایسا لگا جیسے بہت بڑے دھماکے ہوئے ہوں۔ اس کی ساری دنیا اس کے سامنے تباہ ہوگئی۔ اس نے تڑپ کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو نقاب پوش نے اس کے سر پر پستول مارا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔

مارک کی آنکھ کھلی تو کار کی کھڑکی سے سورج کی روشنی اس کے منہ پر آرہی تھی۔ صبح ہوچکی تھی۔ ایک لمحے کو تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے تو اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ کیٹ اور رون کی لاشوں کے پاس... لیکن پھر اسے یاد آیا کہ یہ تو دو سال پرانی بات تھی جب وہ اینٹی نارکوٹکس فورس میں تھا۔ اس کی ایک ساکھ تھی اور منشیات فروش اس کے نام سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ جو کیس لیتا، اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر رہتا تھا۔ مارک کا شمار فورس کے بہترین فیلڈ ایجنٹس میں ہوتا تھا اور اب تک کے کیریئر میں اسے کبھی ناکامی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

مارک کی حسین و دل کش بیوی نیٹ سابق ماڈل و اداکارہ تھی۔ اس نے شادی کے بعد شوبزنس چھوڑ دیا تھا اور خود کو ہاؤس وائف بنالیا تھا۔ شوبزنس چھوڑنا آسان کام نہیں تھا، خاص طور سے اس وقت جب نیٹ کے سامنے ترقی کے بے شمار مواقع تھے اور وہ ابھی صرف بائیس سال کی تھی لیکن اس نے محبت کی خاطر اپنے کیریئر کی قربانی دے دی۔ شادی کے ایک سال کے اندر وہ ماں بن گئی۔ کیٹ کی پیدائش کے دو سال بعد رون پیدا ہوا تھا۔

ایک فیڈرل ایجنٹ کی تنخواہ زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوتی۔ پھر مارک کا ایک مکان بھی تھا جو اس نے کرائے پر دے رکھا تھا۔ نیٹ کی خواہش پر اس نے بیورلے ہلز کے پاس یہ فلیٹ خریدا جو اسے خاصا مہنگا پڑا لیکن نیٹ کو خوش کرنے کے لیے اس نے اس کی قیمت ادا کردی تھی۔ اینٹی نارکوٹکس میں آنا مارک کا خواب تھا کیونکہ اسے منشیات فروشوں سے شدید نفرت تھی اور اس کی خواہش تھی کہ وہ چن چن کر منشیات فروشوں کو کیفرِ کردار تک پہنچادے۔ اسی جذبے کے تحت اس نے گریجویشن کے بعد فورس میں شمولیت اختیار کی۔ تربیت کے بعد وہ افسر بن گیا تھا۔

جب وہ عملی زندگی میں آیا تو اسے صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ منشیات کا عفریت امریکی معاشرے کو کس طرح اندر سے کھوکھلا کررہا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار بتاتے تھے کہ ملک میں باقاعدہ منشیات استعمال کرنے والوں کی تعداد بیس لاکھ سے زیادہ تھی۔

منشیات کا عفریت سب سے زیادہ نوجوان نسل کو نشانہ بنارہا تھا۔ نشہ کرنے والوں کی اکثریت اٹھارہ سال سے کم عمر تھی اور ان میں لڑکیوں کی تعداد چالیس فی صد تھی۔ ان اعداد و شمار نے مارک کو ہلا کر رکھ دیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ منشیات فروشوں کے خلاف پوری توانائی سے کام کرے گا۔ اس نے اپنے عزم پر عمل کرنا شروع کیا تو جلد وہ اپنے اعلیٰ حکام اور منشیات فروشوں دونوں کی نظر میں آگیا۔ چار سال کے مختصر عرصے میں وہ ترقی کرکے سینئر ایجنٹس میں شامل ہوگیا تھا۔ انہی دنوں اس کی نیٹ سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہالی ووڈ میں ایک کیس کے سلسلے میں تفتیش کررہا تھا۔ ایک ریکٹ شوبزنس سے وابستہ لوگوں کو منشیات فراہم کررہا تھا۔

جلد ان کی ملاقات پسند اور پھر محبت میں بدل گئی۔ شادی کے بعد مارک اب اپنے کام کو پہلے جیسا وقت نہیں دے پاتا تھا۔ پھر بھی اس کے کام کرنے کے جذبے اور توانائی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شادی کے تین سال بعد وہ ایک ایلیٹ گروپ کا سربراہ بن گیا جو خاص کیسز کی تفتیش کرتا اور اس کا کام بڑے مگرمچھوں پر ہاتھ ڈالنا تھا۔ مارک نے چند بڑے منشیات فروش پکڑے اور ان کو عدالت سے سزائیں

دلوائیں تو اس کی دھوم مچ گئی کیونکہ اس سے پہلے بڑے منشیات فروشوں نے عدالت کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

ان دنوں مارک، کون مارسیانو کے کیس پر کام کررہا تھا۔ یہ اسپینش نژاد شخص آج سے بیس سال پہلے امریکا آیا تھا۔ اس نے امریکی شہریت حاصل کی اور اس کے بعد وہ بتدریج ترقی کرتا ہوا لاس اینجلس کی معزز شخصیات میں شامل ہوگیا۔ اسے سرکاری اور فلمی تقریبات میں مدعو کیا جاتا۔ بظاہر کون ایک صنعت کار تھا اور اس نے سلی کون ویلی میں الیکٹرونکس سے متعلق کئی صنعتیں قائم کی تھیں لیکن اس کے بارے میں دبے الفاظ میں کہا جاتا تھا کہ اس کی دولت مندی کے پیچھے اصل میں منشیات کارفرما ہے۔

کون کیونکہ اب امریکی شہری تھا اس لیے صرف شک کی بنیاد پر ریاستی پراسیکیوٹر جنرل نے اس کے خلاف کارروائی سے انکار کردیا۔ امریکی شک کی بنیاد پر کارروائی صرف اپنی سرحد سے باہر کرتے ہیں۔ انہی دنوں جب ریاستی وکیل نے کارروائی سے انکار کیا، وفاقی ایجنٹوں نے ایک میکسیکن منشیات فروش کو گرفتار کرنے کی کوشش میں ہلاک کردیا۔ اس کے قبضے سے بعض بینک اکاؤنٹس کی تفصیلات برآمد ہوئیں۔ جب ان اکاؤنٹس کے بارے میں چھان بین کی گئی تو انکشاف ہوا کہ کون کے ایک بینک اکاؤنٹ سے ان اکاؤنٹس میں باقاعدہ رقوم کی منتقلی ہوئی تھی۔

اس انکشاف نے اینٹی نارکوٹکس کے حکام کو حرکت میں آنے پر مجبور کردیا اور انہوں نے کون مارسیانو کا نام اپنی فہرست میں شامل کرلیا۔ یہ کیس مارک کے گروپ کو دے دیا گیا۔ کیونکہ حکام کون پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ حکام چاہتے تھے کہ کون کے خلاف ٹھوس ثبوت ملے اور وہ نہ صرف اسے بلکہ اس کے گروہ کو بھی جیل کی سیر کراسکیں۔

مارک یہ کیس حاصل کرکے خوش تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ منشیات فروشوں میں بڑی مچھلیوں کے خلاف کارروائی کی جائے تاکہ ان سے نیچے کے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو۔ فورس میں آنے کے بعد اس نے محسوس کیا تھا کہ یہاں نچلے اور درمیانے درجے کے منشیات فروش تو پکڑے جاتے ہیں لیکن اصل مگرمچھوں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا۔

مارک نے اپنے آدمیوں کے ساتھ کام شروع کردیا۔ انہوں نے کون کے محل نما مکان کے آس پاس ایسی پوزیشنز بنالی تھیں جہاں سے وہ چوبیس گھنٹے اس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس کے ساتھ انہوں نے عدالت سے اس کی فون کالز ٹیپ کرنے کی اجازت بھی حاصل کرلی تھی۔ مارک کوشش کررہا تھا کہ

ایک سنسان سڑک پر ایک راہ گیر نے ایک صاحب کو روکا اور کہا۔ ”کیا آپ ایک روپے کا سکہ عنایت کریں گے؟“

وہ صاحب بولے۔ ”ضرور ضرور مگر آپ کو اس وقت اس کی کیا ضرورت پیش آگئی؟“

راہ گیر نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ میں اور میرا ساتھی یہ ایک روپے کا سکہ اچھال کر یہ فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم میں سے کون آپ کا موبائل لے گا اور کون آپ کا بٹوا لے گا۔“

کون کے خفیہ بینک اکاؤنٹس کا پتا چلائے کیونکہ اصل ثبوت یہ خفیہ بینک اکاؤنٹس ہی ہوتے۔

کیس پر کام کرنے کی وجہ سے مارک رات کو دیر سے گھر آرہا تھا۔ اس نے نیٹ کو بتادیا تھا کہ ان دنوں وہ ایک اہم کیس پر کام کررہا ہے۔ عام طور سے اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریوں کا ذکر وہ نیٹ سے بھی نہیں کرتا تھا۔ مارک کے خیال میں انسان کو جو بات راز میں رکھنی ہے تو اسے سب سے چھپائے۔ دن بھر مصروفیات کی وجہ سے اسے اپنے ایجنٹس کی رپورٹس پڑھنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا اور وہ ان رپورٹس کی فائلیں گھر لے آتا تھا۔ رات کو دیر تک وہ ان میں مگن رہتا۔

اس رات وہ گھر آنے کے لیے روانہ ہوا تو کچھ دور نکلتے ہی اسے اپنی گردن پر کسی لمس کا احساس ہوا اور ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”غلط حرکت مت کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔ گاڑی روک کر دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے رہو۔“

مارک نے ایسا ہی کیا۔ عقبی سیٹ پر بیٹھا شخص اب اٹھ چکا تھا۔ عقبی آئینے میں نقاب نظر آرہا تھا۔ مارک نے سکون سے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم کون مارسیانو کے کیس سے دست بردار ہوجاؤ۔“ نقاب پوش نے کہا۔

”اس کا فائدہ... اگر میں کیس سے دست بردار ہوجاتا ہوں تو یہ کیس کسی اور کو دے دیا جائے گا۔“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم کیس سے دست بردار ہوجاؤ تو تمہاری منہ مانگی رقم گھر پہنچا دی جائے گی۔“

”میں بکاؤ نہیں ہوں۔“

”اوکے! تمہاری مرضی... لیکن اس کیس سے دست بردار ہونے کے لیے تمہارے پاس صرف دو دن ہیں۔ تمہیں جیڈ کیرن کا کیس یاد ہے؟“

جیڈ کیرن ایک اینٹی نارکوٹکس ایجنٹ تھی اور درمیانے

درجے کے منشیات فروشوں کے خلاف سرگرم عمل تھی۔ ایک رات کچھ لوگوں نے اس کے گھر میں داخل ہو کے اسے اس کے شوہر اور بچوں سمیت بے دردی سے قتل کر دیا۔ ایک لمحے کو مارک دہل کر رہ گیا۔ اسے اپنے بچوں سے بہت پیار تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے نقاب پوش گاڑی سے اتر گیا اور اس نے مارک کی گاڑی کا ٹائر فائر کر کے برسٹ کر دیا اور فوراً ہی وہاں آنے والی سیاہ وین میں سوار ہو کر رخصت ہو گیا۔ جب تک مارک گاڑی سے اترتا، وین دور جا چکی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ واضح نہیں تھی۔

مارک نے اپنے افسران کو اس دھمکی کے بارے میں تحریری طور پر آگاہ کر دیا لیکن نقاب پوش نے اس کی گاڑی میں کوئی معمولی سا نشان بھی نہیں چھوڑا تھا۔ دو دن گزرنے کے بعد ایک فون بوتھ کے نمبر سے مارک کو کال آئی۔

"تمہارے پاس دو دن کی مہلت تھی، تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کیس سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔" مارک نے انکار کیا۔ "یہ عملی طور پر ممکن ہی نہیں ہے اور میں نے اپنے محکمے کو رپورٹ کر دی ہے۔ اگر مجھے یا میرے گھر والوں کو کوئی نقصان ہوا تو اس کی ذمے داری کون مارسیانو پر عائد کی جائے گی۔"

دوسری طرف سے ایک قہقہہ لگایا گیا۔ "اچھا کیا، اب انتظار کرو دوست۔ بہت جلد تم سے ملاقات ہوگی۔"

مارک کا خیال تھا کہ ان کی دھمکی میں اتنی سنجیدگی نہیں کیونکہ کون بھی سمجھتا تھا کہ ایک فیڈرل ایجنٹ کے خلاف کارروائی کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ پھر بھی وہ محتاط ہو گیا اور اس نے نیٹ اور بچوں کے گھر سے غیر ضروری طور پر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ کیٹ اسکول جاتی تھی۔ مارک نے اسے اسکول جانے سے بھی روک دیا۔ نیٹ حیران تھی۔ اس نے کہا۔

"ہمیں بھلا کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"آج کل میں جس کیس پر کام کر رہا ہوں، وہ شخص بہت خطرناک اور طاقت ور ہے۔ اس کے پاس ایسے بدمعاشوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو اس کے اشارے پر کسی کو کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں... اس لیے مجھے اور تمہیں محتاط رہنا ہوگا۔"

نیٹ کا منہ بن گیا۔ "کیا مصیبت ہے... کیا اب میں کہیں باہر بھی نہیں نکل سکتی؟"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر سب معمول پر آ جائے گا۔" مارک نے اسے سمجھایا۔ "تم چاہو تو کچھ دن کے لیے بچوں کو لے کر اپنی ماں کے گھر ہو آؤ۔"

نیٹ کی ماں سان فرانسسکو میں رہتی تھی اور وہ بھی شوبزنس سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی وجہ سے نیٹ میں بھی شوبزنس کا شوق پیدا ہوا تھا۔ مارک اور نیٹ کی ماں دونوں ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نیٹ نے انکار کر دیا۔

"نہیں، میں اور بچے وہاں جا کر بور ہوں گے۔"

مارک کو تعجب ہوا کیونکہ عام طور سے نیٹ اپنی ماں کے پاس بڑی خوشی سے جاتی تھی۔ بہر حال، اس نے زیادہ زور نہیں دیا۔ اس کے خیال میں ساتویں منزل پر اس کا اپارٹمنٹ محفوظ تھا۔ لیکن فون پر دی جانے والی دھمکی کے ایک ہفتے بعد ہی کون مارسیانو کے آدمی نہ جانے کیسے اپارٹمنٹ میں گھس آئے اور انہوں نے مارک کے سامنے اس کے بچوں کو شوٹ کر دیا۔ جاتے ہوئے وہ نیٹ کو ساتھ لے گئے تھے۔ مارک کو اسپتال میں ہوش آیا تھا۔

صدمے سے مارک کا دماغ خراب ہو گیا تھا اور ہوش میں آنے کے بعد وہ چیخنے چلانے اور کون مارسیانو کو بلند آواز سے گالیاں اور دھمکیاں دینے لگتا۔ اس کی دماغی حالت کے پیش نظر ڈاکٹرز نے اسے نیند کا انجکشن دیا ہوا تھا۔ تیسرے دن اسے صبح سے ہوش آیا تھا۔ اس کی ساس آ گئی تھی لیکن وہ اسے دیکھنے اسپتال نہیں آئی تھی۔ البتہ جب قبرستان میں تدفین کے موقع پر اس کا مارک سے سامنا ہوا تو اس نے قہرناک نظروں سے مارک کو دیکھا۔

"میری بیٹی اور بچوں کے قاتل۔"

"آپ کی صرف بیٹی غائب ہے۔" مارک نے تلخی سے کہا۔ "میں تو اپنے سارے رشتوں سے محروم ہو گیا ہوں۔"

نیٹ کی ماں رونے لگی۔ "سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے... نہ جانے میری بچی کس حال میں ہوگی؟"

مارک کو اس کا رونا دھونا بھی اداکاری لگ رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ تھیٹر کی اداکارہ تھی اور گزشتہ چالیس برس سے جاری سوپ اوپیراز میں کام کر رہی تھی۔ کیٹ اور ورن کو اپنے ہاتھ سے قبر میں اتارتے ہوئے مارک کا دل خون ہو گیا اور اس نے خود سے عہد کیا کہ جب تک کون مارسیانو کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کرے گا سکون سے نہیں بیٹھے گا۔ اس نے اس بارے میں کسی سے بات نہیں کی اور خود کو نارمل کر لیا۔ مارک کے افسران اسے اس کیس سے الگ کر دینا چاہتے تھے لیکن اس نے اصرار کر کے کیس اپنے پاس ہی رکھا۔

پولیس نے واردات کی تفتیش کی۔ اس کے مطابق قاتل داخلی دروازے کا لاک والا حصہ کسی آری سے کاٹ کر اندر داخل ہوئے تھے۔ خود مارک نے بھی دیکھا تھا لیکن اسے تعجب تھا کہ اس کی آنکھ کیوں نہیں کھلی۔ بے شک بیٹری سے چلنے والی برقی آری اتنا شور نہیں مچاتی لیکن کچھ نہ کچھ آواز تو پیدا ہوتی ہے اور وہ بہت ہلکی نیند سوتا تھا۔ قاتلوں نے گھر میں کسی چیز کو نہیں چھیڑا تھا اور جاتے ہوئے صرف نیٹ کو ساتھ لے گئے تھے۔ پولیس اسے بھی تلاش نہیں کر سکی تھی۔ نہ تو اس کی لاش ملی اور نہ ہی اس کے بارے میں کوئی خبر آئی تھی۔

واردات کا معاملہ مارک نے پولیس پر چھوڑ دیا اور خود تن دہی سے کون کے خلاف تحقیقات کرنے لگا۔ اصل میں وہ کون کے بعض آف شور بینک اکاؤنٹس تک پہنچ گیا تھا جہاں سے رقوم جنوبی امریکا میں منشیات فروشوں کو منتقل کی جا رہی تھی۔ ایک بار کون کا تعلق ان اکاؤنٹس سے ثابت ہو جاتا تو اسے گرفتار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ مارک کی دن رات کی محنت رنگ لائی اور کون کا ان اکاؤنٹس سے تعلق ثابت ہو گیا اور مارک کے ایلیٹ گروپ نے کون کے محل پر چڑھائی کی تیاری شروع کر دی۔

لیکن جس وقت وہ چھاپا مارنے کون کے گھر پہنچے، اس سے چند گھنٹے پہلے ہی وہ فرار ہو چکا تھا۔ اس کے ملازمین نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ کون نے شادی نہیں کی تھی اور اکیلا رہتا تھا اس لیے اس کا کوئی رشتے دار بھی ہاتھ نہیں آیا۔ مارک بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا ورنہ اس کا ارادہ تھا کہ سامنا ہوتے ہی کون کو شوٹ کر دے گا اور اس کے بعد بے شک اس کے ساتھ جو ہوتا رہے۔ مارک نے چھاپے کو بہت خفیہ رکھا تھا لیکن پھر بھی کون کو پتا چل گیا اور وہ گھر سے فرار ہو گیا۔ اس کے محل سے ان کو بے شمار ثبوت اور منشیات بھی ملی تھی۔ کون نے ایک خفیہ تہ خانے میں بہت ساری منشیات جمع کر رکھی تھی۔ وہ جاتے ہوئے سونے کی اینٹوں کی صورت میں جمع کی ہوئی دولت بھی نہیں لے جا سکا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کچھ دیر پہلے ہی چھاپے کی اطلاع ملی تھی اور وہ محل کے خفیہ راستے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ راستہ بھی مل گیا تھا جو ایک چھوٹے سے بنگلے میں جا کر نکلتا تھا۔ اس کے بعد کون کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔

مارک نے اپنے طور پر کوشش جاری رکھی لیکن کچھ عرصے بعد محکمے نے اس سے دوسرے کیسز کی طرف توجہ دینے کو کہا تو مارک نے انکار کر دیا۔ وہ صرف اسی کیس پر کام جاری رکھنا چاہتا تھا۔ جب حکام نے اس سے یہ کیس باضابطہ طور پر واپس لے لیا تو مارک نے احتجاجاً استعفا دے دیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے طور پر کون کو تلاش کرے گا۔ ریاست نے اس کی عدم موجودگی میں اس پر مقدمہ چلا کر اسے سزا سنا

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہ اگست 2010ء کا احوال

شہر محبت

جذبات کی آندھیوں میں خوابوں کی کرچیاں بکھر جائیں تو رقابتوں کے طوفان تمام رشتوں اور رستوں کے نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ آخری صفحات پر آپ کے محبوب مصنف **طاہر جاوید مغل** کی دلگداز تحریر

سعی رائگاں

ابتدائی صفحات پر **ہمایوں بلگرامی** کی عبرت اثر تحریر... محلاتی سازشوں اور سنسنی خیز حالات واقعات کا احوال

حضرت یونسؑ

خدا کی شان کہ جس نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پیغمبر کو زندہ وسلامت رکھا... منکرین کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا قصہ

واپسی

تحیر، تجسس اور عشق کے دلفریب لمحات پر مشتمل پل پل رنگ بدلتی طویل داستان... **محی الدین نواب** کے قلم کا جادو

کھرے سکے

ایک باپ کی غلط فہمی اور... اولاد کی بے پروائی کا ماجرا...

ملک صفدر حیات ایک نئے انداز میں

اور مستقل سلسلے: انا ڑی، محفل شعر وسخن، آپ کے خط

مزید: محی الدین نواب، ش صغیر ادیب، کاشف زبیر، مریم کے خان اور سلیم انور کے قلم کا جادو

www.pkdigest.com

دی تھی اور ملک میں اس کے تمام اثاثے ضبط کر لیے تھے۔ عدالت نے یہ اثاثے منشیات کے عادی افراد کی بحالی پر خرچ کرنے کا حکم دیا تھا۔ حیران کن طور پر کون کے امریکا بھر میں ایک ارب ڈالرز کے اثاثے موجود تھے جو حکومت نے ضبط کر لیے۔ عام طور سے جرائم پیشہ افراد اور خاص طور سے منشیات کے دھندے سے تعلق رکھنے والے اپنے بیشتر اثاثے بیرونِ ملک بینکوں میں رکھتے ہیں تاکہ کبھی بھاگنے کا موقع آئے تو ان کی جمع پونجی ملک میں نہ رہ جائے۔

مارک کو یقین نہیں تھا کہ کون امریکا سے نکل گیا ہے کیونکہ کسی اور ملک سے اس کے بارے میں اطلاع نہیں آئی تھی۔ وہ اسے تلاش کر کے اس سے اپنے بچوں کے قتل اور اپنی بیوی کی گمشدگی کا حساب لینا چاہتا تھا۔ اس نے کون کے گروہ کے پکڑے جانے والے چند افراد سے خود پوچھ گچھ کی تھی لیکن وہ نہ تو کون کے بارے میں جانتے تھے اور نہ ہی وہ اس کے بچوں کے قاتلوں سے واقف تھے۔ مارک کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان لوگوں کو ادھیڑ کر رکھ دے۔ اس نے ان پر ایک حد تک تشدد کیا لیکن اسے اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ملی تھی۔ پھر کیس اس سے لے لیا گیا اور اس نے استعفا دے دیا۔

آنے والے دو سالوں میں اس نے امریکا کا سارا جنوبی علاقہ چھان مارا۔ اینٹی نارکوٹکس میں کام کرنے کے دوران اس کے اچھے تعلقات بن گئے تھے اور وہ کون کی تلاش میں انہیں بھی استعمال کر رہا تھا۔ اس کے جاننے والے اسے اطلاعات دیتے رہتے اور جہاں کہیں کون کے پائے جانے کا شک ہوتا وہ فوراً مارک کو اطلاع کرتے۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد مارک نے کون کی تلاش کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ وہ مستقل سفر میں رہتا۔ جہاں موقع ملتا سو جاتا اور جو ملتا کھا لیتا۔ بعض اوقات اسے کئی کئی ہفتے نہانے اور کپڑے بدلنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

دو سال بعد برازیل میں مارک کے ایک واقف کار نے اسے اطلاع دی کہ برازیل کے انتہائی جنوبی حصے میں یوراگوئے کی سرحد کے پاس کون سے ملتا جلتا شخص دیکھا گیا ہے وہ کہیں باہر سے آ کر وہاں آباد ہوا ہے لیکن اس کے پاس برازیل کی شہریت اور پاسپورٹ ہے۔ اس کا نام جوزف کوریوگ ہے۔ اس نے پہاڑوں اور گھنے جنگلات کے درمیان ایک بہت بڑا قطعۂ اراضی خرید کر اس پر اپنی اسٹیٹ قائم کر لی ہے۔

اگرچہ اس سے پہلے بھی مارک کو مختلف ممالک میں کون کی موجودگی کی اطلاعات ملتی رہی تھیں اور وہ خود ان ممالک گیا تھا لیکن یہ اطلاعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ اسے لگا کہ یہ بھی ایسی ہی ایک اطلاع ثابت ہوگی۔ پھر برازیل ایک ایسا ملک ہے جہاں منشیات فروشوں کے لیے زندگی آسان نہیں ہے۔ خاص طور سے نئی حکومت ان کے خلاف بھرپور کارروائی کر رہی تھی اور منشیات فروشوں کو اپنی جان بچانے کے لیے برازیل سے فرار ہونا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

جاب چھوڑنے کے بعد اس کا ذریعۂ روزگار نہیں رہا تھا۔ سوائے اس کے مکان کے جس کا کرایہ آتا تھا۔ اس نے بیورلے ہلز والا اپارٹمنٹ فروخت کر دیا تھا اور اس سے ملنے والی رقم سے اپنے اخراجات پورے کر رہا تھا۔ کچھ واجبات اسے ملازمت سے استعفا دینے کے بعد ملے تھے۔ اسے مالی مسئلہ تو نہیں تھا لیکن وہ زیادہ ہاتھ کھول کر بھی خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کون کی تلاش میں اسے ابھی مزید کتنا سفر کرنا ہے اور اس میں کتنا وقت اور سرمایہ لگ جاتا۔ اس لیے وہ بہت ہاتھ کھینچ کر خرچ کرتا تھا۔

☆☆☆

مارک دو دن سے سفر میں تھا۔ بارہ گھنٹے کی طویل پرواز کے بعد وہ ریوڈی جنیرو پہنچا تو وہاں اس کا واقف کار اینٹی نارکوٹکس ایجنٹ سیورسکو اس کا منتظر تھا۔ چونکہ اس نے یہ کام نجی طور پر کیا تھا اور اس میں ادارہ شامل نہیں تھا اس لیے سیورسکو، مارک کی ایک حد سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مارک کو ائرپورٹ سے گھر جاتے ہوئے راستے میں بتایا۔

''ہمارے ایجنٹوں نے مجھے اس شخص جوزف کے بارے میں بتایا ہے۔ اگرچہ اس کا منشیات سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا لیکن یہ پراسرار شخص ہے اور ہم ایسے افراد پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔ اس نے یوراگوئے اور برازیل کی سرحد سے صرف دو کلومیٹر دور ایک دشوار پہاڑی علاقے میں کوئی ایک ہزار ایکڑز زمین خریدی ہے۔''

''یہ کتنی پرانی بات ہے؟''

''کوئی پانچ سال پرانی... لیکن خود وہ دو سال پہلے یہاں آیا۔''

''ٹائمنگ تو درست ہے۔''

''ہاں یہی بات اسے سب سے زیادہ مشکوک کرتی ہے۔ اطلاعات کے مطابق اسٹیٹ پر کئی بڑی تعمیرات کی گئی ہیں اور وہاں کم سے کم سو افراد رہتے ہیں۔''

''سیکیورٹی سسٹم بھی ہے؟''

''لازمی بات ہے۔ اس کے پاس مسلح گارڈز ہیں جن

کے پاس جدید ہتھیار ہیں۔''

''مقامی طور پر اس کا رویہ کیسا ہے؟''

''کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ یا اس کے آدمی کسی کو ہراساں کرنے یا نقصان پہنچانے میں ملوث نہیں ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔''

''اسٹیٹ کے اندر کی کیا معلومات ہیں؟''

''بہت کم۔'' سیورسکو نے کہا۔ ''تقریباً دس مربع کلومیٹر پر پھیلا یہ علاقہ قدرتی طور پر پہاڑوں اور جنگل سے گھرا ہوا ہے۔ پھر وہاں پر خاردار تاریں بھی لگی ہیں اور جا بہ جا گارڈز پہرا دیتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب پولیس کی اطلاعات ہیں اور میں مقامی پولیس کی اطلاعات پر زیادہ بھروسا نہیں کرتا۔''

''پولیس اس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔ پولیس کے پاس اس کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں ہے۔ ویسے ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ جوزف کوریوگ پولیس کو خوش رکھتا ہے۔''

مارک کو شاید پہلی بار کسی اطلاع میں امید کی کرن نظر آئی۔ سیورسکو نے اسے ایک دن اپنے ہاں ٹھہرایا۔ پھر اس نے مارک کے لیے ایک کار کا بندوبست کیا کیونکہ مارک نے طیارے سے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ چھوٹے ائرپورٹ پر اترنے والوں کی خبر فوراً ہی آس پاس پھیل جاتی ہے اس لیے بائی روڈ زیادہ بہتر اور محفوظ تھا۔ سیورسکو نے اسے خبردار کیا تھا کہ اس علاقے میں سڑکیں زیادہ اچھی نہیں ہیں لیکن مارک اپنے فیصلے پر قائم رہا۔

پہلے دن اس نے مستقل سفر کیا اور درمیان میں صرف کھانے پینے کے لیے رکا۔ رات اس نے ایک کسان کے گھر بسر کی۔ اگلی صبح وہ روانہ ہوا تو راستہ بہت خراب تھا۔ اگر اس کے پاس مضبوط بیوک کار نہ ہوتی تو وہ مشکل میں پڑ جاتا۔ سفر تو جاری رہا لیکن رفتار بہت سست ہو گئی۔ وہ رات کے قریب اس علاقے میں داخل ہوا۔ یہاں پہاڑوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے قصبے تھے جہاں کسان آباد تھے۔ قریب ترین ائرپورٹ یہاں سے چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ علاقے میں بجلی اور فون کی سہولت تھی لیکن موبائل فون کے سگنل کام نہیں کرتے تھے۔ اصل میں آبادی اتنی نہیں تھی کہ موبائل فون کمپنیاں اپنا نیٹ ورک یہاں تک وسیع کرتیں۔

مسلسل سفر سے مارک تھک گیا تھا اور اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ رات سے پہلے وہ کسی آبادی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ شام تک کئی آبادیاں گزر چکی تھیں اور جب رات سر پر آئی تو کوئی آبادی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے شام کو ایک جگہ رک کر کافی کے ساتھ کچھ سینڈوچز لے لیے تھے اس لیے اسے بھوک نہیں تھی لیکن وہ شدت سے آرام کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ شام کے بعد موسم تیزی سے ٹھنڈا ہوا تھا اور سردی بڑھ گئی تھی۔

جب مارک کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہوئی تو اس نے کار سڑک سے اتار کر روک دی اور عقبی نشست پر لیٹ گیا۔ کون کی تلاش میں اس نے بے شمار راتیں کار میں سو کر گزاری تھیں۔ شروع میں اسے کسی قدر مشکل ہوئی لیکن اب وہ عادی ہو گیا تھا۔

روشنی ہونے پر اس کی آنکھ کھلی تو مارک کا جسم ٹوٹ رہا تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ وہ بہ مشکل کار سے نکلا۔ کچھ دیر چہل قدمی کی تو چکر کم ہوئے لیکن وہ یوں ہانپنے لگا جیسے اس نے کوئی میراتھن کی ہو۔ اسے حیرت ہوئی کہ اسے کیا ہو رہا ہے، اس کی اتنی بری حالت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے شاید علاج کی ضرورت تھی اور علاج کسی آبادی میں ہی ہو سکتا تھا۔ اس ویرانے میں نہیں جہاں اتنی دیر سے سڑک سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزری تھی۔ مدد کے لیے اسے یہاں سے جانا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ ہمت کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس علاقے کی آب و ہوا خوش گوار تھی اور نظارے بھی بہت خوب صورت تھے لیکن فی الحال مارک کو کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد مارک کو سڑک سے ذرا دور پہاڑی پر ایک فارم ہاؤس نظر آیا۔ اسے راستے میں کئی چھوٹی موٹی آبادیاں نظر آئی تھیں لیکن اب اسے نہیں معلوم تھا کہ آگے کہاں آبادی ہے۔ آبادی تھی بھی یا نہیں اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ اس فارم ہاؤس میں رہنے والوں سے مدد کی درخواست کرے۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کی حالت ٹھیک ہونے تک اسے یہاں رکنے کی اجازت دے دیں گے۔

مارک نے کار اس طرف موڑ دی۔ پہاڑی پر جانے کے لیے کچا لیکن ہموار راستہ تھا، اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یہ تقریباً پانچ چھ ایکڑز پر پھیلا فارم ہاؤس تھا جہاں مکئی کی فصل ابھی پک رہی تھی۔ ساتھ میں سبزی اور کچھ پھل دار درخت بھی تھے۔ مکان چھوٹا سا لیکن اچھا بنا ہوا تھا۔ اس کے احاطے میں مرغیاں پھر رہی تھیں اور عقب میں ایک چھوٹا سا مویشی خانہ نظر آ رہا تھا۔ گویا یہ ایک مکمل فارم تھا۔ احاطے میں ایک چھوٹا ٹریکٹر بھی کھڑا تھا۔ کار کے انجن کی آواز سن کر اندر سے ایک نوجوان لڑکا نکل آیا۔ مارک نے کار احاطے کے پاس روک لی اور نیچے اتر آیا۔ نوجوان کا رنگ صاف تھا لیکن اسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں مقامی خون کی

www.pkdigest.com

طاوٹ ہے۔

"مجھے مائنگ کہتے ہیں۔" مارک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انگلش میں کہا۔

"کاربو گارساں۔" نوجوان نے اپنا تعارف کرایا۔ مارک کے ہاتھ کی گرمی اس نے محسوس کر لی تھی۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

مارک نے سر ہلایا۔ "میں باہر سے آیا ہوں اور اس علاقے میں اجنبی ہوں۔ سفر کر رہا تھا کہ رات کو طبیعت خراب ہو گئی۔ رات میں کار میں سویا تھا۔ کیا یہاں پاس کوئی آبادی ہے جہاں میں کسی ڈاکٹر کو دکھا سکوں اور کوئی ہوٹل مل جائے؟"

اس سے پہلے کہ نوجوان کوئی جواب دیتا، اندر سے ایک کسی قدر طویل قامت لڑکی نکل آئی۔ اس نے پھول دار فراک کے ساتھ سر پر کپڑا باندھ رکھا تھا۔ دیکھنے میں وہ کاربو کی بہن لگ رہی تھی۔ اس نے کاربو سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

"یہ میری بہن جیسمین ہے۔" کاربو نے تعارف کرایا۔ "جیس! یہ مائنگ ہے۔ اس علاقے میں سفر کر رہا ہے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے علاج اور آرام کی ضرورت ہے۔"

جیسمین نے آگے آ کر بے تکلفی سے مارک کا ہاتھ تھام لیا اور پھر تشویش سے بولی۔ "اوہو... تمہارا جسم تو گرم ہو رہا ہے۔" اس نے مارک کی آنکھ دیکھی اور پھر زبان دکھانے کو کہا۔ "مجھے لگ رہا ہے تمہیں میعادی بخار ہو گیا ہے۔"

مارک نے اس کی بات پر غور کیا۔ "تم ڈاکٹر ہو؟"

جیسمین نے سر ہلایا۔ "ہاں، یہ میرا آخری سال ہے۔ تم اندر آ جاؤ۔"

مارک ہچکچایا۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم مجھے کسی آبادی کا پتا بتا دو جہاں مجھے ڈاکٹر مل جائے؟"

"ڈاکٹر میں ہوں نا... اور جہاں تک آبادی کی بات ہے تو یہاں سے نصف گھنٹے کی ڈرائیو پر ایک قصبہ ہے لیکن تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو حیرت ہے تم اتنے تیز بخار کے ساتھ سفر کیسے کر رہے ہو؟ تمہیں علاج کی اشد ضرورت ہے اور آرام کی بھی۔"

"میں شکر گزار ہوں گا اور اس کی ادائیگی کر دوں گا۔"

"یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔" جیسمین نے کہا اور کاربو کی طرف دیکھا۔ "گاڑی ایک طرف کر کے اسے اندر لے آؤ۔"

مارک کار کی چابی کاربو کو نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے اس نے خود گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور کاربو کے ساتھ اندر آ گیا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں چھوٹا سا کچن تھا جس میں چار افراد کے لیے میز بھی تھی۔ کچن کے آگے لاؤنج تھا جو سادہ لیکن خوب صورت فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ جیسمین اپنا میڈیکل بکس لے آئی اور اس نے مارک کو کاؤچ پر لیٹنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اسٹیتھس اسکوپ سے اس کے دل کی دھڑکن اور سانس چیک کی پھر بلڈ پریشر چیک کیا۔ اس دوران میں تھرمامیٹر اس کے منہ میں لگا دیا۔ چیک اپ مکمل کر کے اس نے تھرمامیٹر دیکھا اور تشویش سے بولی۔

"بخار ایک سو تین ہے۔ اگر یہ بڑھ گیا تو تمہیں پٹیاں رکھنی پڑیں گی۔ یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا ہے؟"

"کل شام کو کافی اور سینڈوچز لیے تھے۔"

"یعنی تم خالی پیٹ ہو۔ ایک منٹ رک جاؤ۔" جیسمین نے کاربو کو آواز دی۔ وہ باہر سے آیا۔ "کاربو! اسے اوپر مہمان خانے میں لے جاؤ۔"

کاربو اسے مکان کی اوپری منزل میں ایک چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے کمرے میں لے آیا۔ یہاں ایک بیڈ اور ایک چھوٹا صوفہ سیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف دیوار گیر الماری اور چھوٹا سا شیشے کا خانہ تھا۔ کاربو نے اس سے کہا۔ "تم کہو تو کار سے تمہارا سامان نکال لاؤں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مارک نے کہا۔ اس کا جسم ایک بار پھر ٹوٹنے لگا۔ کاربو کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔ وہ کچھ دیر اس کیفیت سے لڑتا رہا اور اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بے ہوشی نے اس پر غلبہ پا لیا۔ پھر اس کی آنکھ کھلی تو جیسمین چمچ سے دودھ اس کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اس کے منہ کا ذائقہ ازحد کڑوا ہو رہا تھا۔ وہ دودھ پی کر پھر نیند جیسی کیفیت میں چلا گیا۔ جیسمین اسے دوائیں دے رہی تھی اور اس نے اسے انجکشن بھی لگائے تھے کیونکہ جب اسے ہوش آتا تو اسے اپنا بازو بعض جگہ سے دکھتا ہوا محسوس ہوتا۔

اسے نہیں معلوم کہ اس کیفیت میں کتنا وقت گزر گیا لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا کہ اس کی بیماری میں دونوں، بہن بھائی بڑی جانفشانی سے اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ وہ بہت مہذب اور اچھے اخلاق والے تھے۔ ورنہ آج کے دور میں کوئی کسی اجنبی کے لیے اتنا نہیں کرتا۔ ان کی کوششوں سے رفتہ رفتہ مارک کی حالت بہتر ہونے لگی اور پھر اسے ہوش آ گیا۔

صبح کا اجالا پردے کے پیچھے سے جھلک رہا تھا۔ مارک

بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا لیکن جسم توڑ دینے والے بخار اور زبان پر کڑوے پن کا احساس غائب ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کوشش کی اور بستر پر اٹھ بیٹھا۔ اس کوشش میں اس کا سر چکرانے لگا لیکن وہ لیٹا نہیں، خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر وہ ہمت کر کے کھڑا ہوا اور جیسے ہی اس نے ایک قدم آگے بڑھانے کی کوشش کی، اسے یوں لگا جیسے زمین آسمان گھوم گئے ہوں۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے ہاتھ پھیلائے لیکن آس پاس سہارے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اسی لمحے جیسمین اندر آئی اور اس نے ڈگمگاتے مارک کو دیکھا تو بے اختیار اس کی طرف لپکی اور گرنے سے پہلے اسے سنبھال لیا۔

بیماری سے مارک کا وزن کم ہو گیا تھا لیکن اتنا بھی نہیں... جیسمین نے بہ مشکل اسے بیڈ پر بٹھایا اور پھر لٹا دیا۔ "تمہیں یوں نہیں اٹھنا چاہیے تھا۔" وہ اس کے ہاتھ پیر سیدھے کرتے ہوئے بولی۔ "ابھی تم بہت کمزور ہو۔"

"میری طبیعت کیسی ہے؟"

"بخار اتر گیا ہے اور اب خطرہ نہیں ہے لیکن تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔"

مارک کو پیاس لگ رہی تھی، اس نے پانی مانگا۔ جیسمین نے اسے پانی کی جگہ گلوکوز دیا۔ "تمہیں توانائی کی بہت ضرورت ہے۔"

گلوکوز پی کر مارک نے توانائی محسوس کی۔ وہ بستر پر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے کپڑے تبدیل کر دیے گئے تھے اور یہ شاید کاربو کے کپڑے تھے۔ ہلکا سوتی ٹراؤزر تھا اور پوری آستین کی ٹی شرٹ۔ مارک کا خیال تھا کہ وہ شاید دو دن سے یہاں تھا۔ اس نے جیسمین سے کہا تو وہ ہنس دی۔

"دو دن... مائنگ! تم سات دن سے یہاں ہو۔"

مارک حیران رہ گیا۔ "سات دن...؟"

"ہاں، شروع کے تین دن تو تمہیں ہوش ہی نہیں تھا۔ تمہاری طبیعت بہت خراب تھی۔ میں ڈاکٹر بننے والی ہوں لیکن ایک بار تو میں بھی ڈر گئی تھی اور تمہیں اسپتال لے جانے کا سوچ رہی تھی لیکن اسی رات تم ہوش میں آ گئے۔ بخار نے تمہیں اچھا خاصا نچوڑ لیا ہے۔ اس لیے پوری طرح ہوش میں آنے میں اتنے دن لگ گئے۔"

تفصیل بتانے کے دوران میں جیسمین نے اس کا چیک اپ کیا۔ مارک نے پوچھا۔ "کیا میں کچھ کھا سکتا ہوں؟ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"ٹھوس چیز نہیں... ہلکی غذا مل سکتی ہے۔"

کچھ دیر میں جیسمین اس کے لیے سوپ لے آئی جس میں ابلا ہوا انڈا بھی تھا۔ سوپ کے بعد اس نے مارک کو جوس دیا۔ مارک پیٹ بھرنے کے بعد غنودگی میں چلا گیا۔ شام کو اٹھا اور کھا پی کر پھر سو گیا۔ اس سے اگلی صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے خود سے اٹھ کر کمرے میں چہل قدمی کی اور پھر باہر آ گیا۔ جیسمین کچن میں تھی۔ مارک بالکونی میں آ گیا۔ یہاں سے فارم اور آس پاس پہاڑوں کا منظر بہت دل کش لگ رہا تھا۔ کھلی خنک فضا اچھی لگ رہی تھی اور مارک سانس لے رہا تھا تو جیسے جسم میں تازگی بھر رہی تھی۔ اس وقت بے اختیار اس کے دل میں خیال آیا کہ کاش وہ ہمیشہ یہاں رہ سکے۔ یہاں سکون اور امن کا احساس تھا جو اب اس دنیا میں بہت کم جگہوں پر باقی رہ گیا ہے۔

"تم یہاں ہو اور میں تمہیں کمرے میں تلاش کر رہی تھی۔" عقب سے جیسمین کی آواز آئی۔

"ہاں، میں اب بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔ "میں لیٹے لیٹے تنگ آ گیا ہوں۔"

جیسمین اس کے برابر میں آ گئی۔ "ہاں، تم بہتر ہو رہے ہو لیکن پھر بھی تمہیں ایک دو دن احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ ابھی تمہاری کمزوری پوری طرح دور نہیں ہوئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں کل تک بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

جیسمین نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "کل تک... بالکل بھی نہیں۔ تمہیں اپنے معمول کی صحت حاصل کرنے میں کم سے کم دو ہفتے درکار ہیں۔"

"میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

"کیا تمہیں واپس جانا ہے؟"

مارک نے اس دل کش لڑکی کی طرف دیکھا جس کا دل بھی اتنا ہی خوب صورت تھا۔ "نہیں، مجھے ایک کام کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی میں واپس جا سکوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ناشتا تیار ہے۔ آج تم کچن میں آ جاؤ۔"

جیسمین نے اسے سہارا دے کر سیڑھیوں سے اتارا اور وہ کچن میں آ گئے۔ مارک جانتا تھا کہ اب اس سے سوالات کیے جائیں گے اس لیے اس نے پہلے ہی سوالات شروع کر دیے۔ "یہاں بس تم دونوں ہوتے ہو؟"

جیسمین انڈے توڑ کر فرائی پین میں ڈال رہی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں، بس ہم دو بہن بھائی ہیں۔ یہ ہماری آبائی زمین ہے اور ہم یہاں چھ نسلوں سے آباد ہیں۔ ویسے ہم دو نہیں ہیں، ہمارا ایک ملازم بھی ہے۔ وہ پاس ہی ایک کمرے میں رہتا ہے۔"

www.pkdigest.com

''تم اسپینش ہو؟''

''نہیں، ہمارے بزرگ فرانس سے آئے تھے اور میرے پردادا نے ایک مقامی عورت سے شادی کی تھی۔ اس کے بعد سے ہم بدل گئے۔''

''اسی لیے تم میں فرانسیسی نزاکت اور دل کشی ہے۔'' مارک نے کہا۔

جیسمین نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ کاربو کسی کام سے گیا تھا۔ وہ کچھ دیر میں واپس آگیا۔ جیسمین نے میز پر ناشتا لگایا اور وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مارک کے لیے دلیا، ابلے ہوئے انڈے اور دودھ تھا۔ ناشتے کے بعد جیسمین نے مقامی طرز کی چائے بنائی۔ اس کی خوشبو اور ذائقہ اچھا تھا۔ مارک نے کاربو سے کہا۔

''تم لوگوں کو اس ویرانے میں ڈر نہیں لگتا؟''

''نہیں یہ ہمارا علاقہ ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''یہاں کے لوگ اچھے اور شریف ہیں۔''

''کیا یہاں باہر سے لوگ آکر آباد نہیں ہوئے؟''

''ہاں، کچھ لوگ ہیں۔''

''ان کے بارے میں تم کیا کہہ سکتے ہو کہ وہ شریف ہیں یا نہیں؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جیسمین نے کہا۔ ''یہاں باہر سے ایک بُرا آدمی آکر بس گیا ہے۔ اس نے یہاں بہت بڑی زمین خریدی ہے اور اپنے بدمعاشوں کے ساتھ رہتا ہے۔''

''اچھا، وہ کہاں سے آیا ہے؟'' مارک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ہمیں نہیں معلوم اور نہ ہی ہم نے آج تک اسے دیکھا ہے لیکن اس کے آدمیوں کے اطوار بدمعاشوں والے ہیں۔''

''کیا وہ مقامی لوگوں کو تنگ کرتے ہیں؟''

''نہیں لیکن جب وہ اپنی اسٹیٹ سے باہر آتے ہیں تو ان کا انداز بدمعاشوں والا ہوتا ہے۔ وہ بلا وجہ لوگوں کو گھورتے ہیں اور گھلنے ملنے سے گریز کرتے ہیں۔''

''وہ مسلح ہوتے ہیں؟''

''ان کے پاس اسلحہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کی سرِعام نمائش نہیں کرتے۔''

کاربو جو مارک کو بولتے ہوئے سن رہا تھا، اس نے اچانک کہا۔ ''تم امریکی ہو نا؟''

''ہاں۔'' مارک نے اعتراف کیا۔

''یہاں سیاحت کے لیے آئے ہو؟''

''ہاں۔'' اس بار بھی اس نے مختصر جواب دیا اور بولا۔ ''لیکن مجھے اس علاقے کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔ ویسے یہاں کوئی آبادی ہے؟''

''ہاں، یہاں قریب ہی جابا کون ہے۔''

''جابا کون!'' مارک کا دل دھڑکا۔ ''یہ کس جگہ کا نام ہے؟''

''یہاں سے کچھ دور جنوب کی طرف ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، وہاں ہوٹلز ہیں اور دوسری سہولیات بھی ہیں۔ ایک طرح سے وہ اس علاقے کا مرکز ہے۔'' کاربو نے بتایا۔

مارک سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اتفاق ہے کہ اسے ایک ایسے علاقے میں کون کی موجودگی کا پتا چلا تھا جس کے مرکزی قصبے کے نام میں کون آتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کاربو جس شخص کا ذکر کر رہا تھا وہ جوزف کوریوگ ہے۔ اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ''یہ شخص کہیں اور سے آیا ہے تو اسے زمین کس نے فروخت کی ہے؟''

''مقامی حکومت نے۔'' جیسمین بولی۔ ''یہاں ساری زمین حکومت کی ملکیت ہے اور مقررہ قیمت ادا کرکے کوئی بھی جتنی زمین چاہے خرید سکتا ہے۔''

مارک کو تعجب ہوا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ حکومت حدِ ملکیت مقرر کر رہی ہے؟''

''ہاں، وہ امیزون کے لیے ہے۔ اس علاقے میں آبادی بہت کم ہے اس لیے حکومت نے لوگوں کو آبادی کی ترغیب دینے کے لیے زمین کی ملکیت کی حد مقرر نہیں کی ہے۔''

''پھر بھی لوگوں نے احتجاج نہیں کیا کیونکہ زمین پر سب سے زیادہ حق مقامی لوگوں کا ہوتا ہے اور یہ شخص... کیا نام ہے اس کا؟ باہر سے آیا ہے۔''

''جوزف کوریوگ۔'' کاربو نے بتایا۔

مارک کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ ان سے جوزف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن ایک تو وہ زیادہ تجسس ظاہر کرکے ان بہن بھائی کو چونکانا نہیں چاہتا تھا، دوسرے وہ اتنی سی دیر بیٹھ کر تھک گیا تھا۔ جیسمین نے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اس نے مارک کو کچھ دیر دھوپ میں بیٹھنے کو کہا۔ ''اس سے تمہارا جسم ٹیون اپ ہوگا۔''

مارک اس کی بات مان کر باہر آگیا۔ کاربو نے اس کے لیے ایک آرام کرسی لا دی تھی اور خود کھیت کی طرف چلا گیا۔ بھٹے پک رہے تھے اور ان دنوں پرندے فصل کا بہت نقصان کرتے ہیں اس لیے کسان چوکنا رہتے ہیں۔ مارک کو دھوپ میں مزہ آرہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرکے کرسی جھلانے

لگا۔ کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کے سامنے سایہ آگیا ہو۔ اس نے آنکھ کھولی تو جیسمین اس کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ ''ہیلو! میں نے سوچا اگر تم جاگ رہے ہو تو تم سے گپ شپ لگاؤں۔'' جیسمین نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' مارک بولا۔ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا کہ لڑکی اس میں دلچسپی لے رہی ہے اور اب اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔ وہ برآمدے سے دوسری کرسی اٹھا لائی۔ اس نے بیٹھتے ہی سوالات شروع کر دیے۔

''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں... میں ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔'' مارک نے سوچ کر کہا۔

''شادی شدہ ہو؟''

مارک نے اس سوال کا جواب سوچا تو اسے تعجب ہوا۔ تکنیکی طور پر وہ شادی شدہ تھا کیونکہ نیٹ غائب تھی اور مارک نے عدالت سے شادی منسوخ نہیں کرائی تھی اس لیے وہ شادی شدہ تھا لیکن اس نے اس کا بھی غلط جواب دیا۔ ''نہیں۔''

جیسمین کے چہرے پر اطمینان کا تاثر آگیا۔ اس نے اگلا سوال کیا۔ ''تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' مارک نے الٹا سوال کر دیا۔

''تم سیاح نہیں ہو اور کسی خاص مقصد سے یہاں آئے ہو۔''

مارک کو اس کے اندازے پر تعجب ہوا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''بس پتا چل گیا۔ تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

مارک کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے سچ بتا دیا۔ ''میں ایک شخص کی تلاش میں آیا ہوں۔ لیکن وہ کون ہے اور میں اسے کیوں تلاش کر رہا ہوں، یہ مت پوچھنا۔''

اس کے لہجے میں کھردراپن محسوس کرکے جیسمین چپ ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں نہیں پوچھوں گی۔''

''معاف کرنا، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا۔'' مارک نے اس کی اداسی محسوس کرکے جلدی سے کہا۔ ''بس یہ موضوع کچھ تکلیف دہ ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' جیسمین کھڑی ہو گئی۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لینا۔''

اس کے جانے کے بعد مارک اونگھنے لگا پھر اسے نیند آگئی۔ دو گھنٹے بعد جیسمین نے اسے جگا کر اندر جانے کو کہا۔ ''اتنی دیر دھوپ میں سونا بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

مارک کو خیال آیا۔ ''میرے کپڑے اور سامان کہاں ہے؟''

''اوپر کمرے میں رکھا ہے۔ میں نے تمہارے کپڑے دھو دیے تھے۔'' جیسمین نے کہا۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں، تم میرے لیے بہت زحمت اٹھا رہی ہو۔'' مارک نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، تم ہمارے مہمان ہو۔'' جیسمین نے جواب دیا اور اسے سہارا دے کر اوپر لے آئی۔ اس نے مارک کو اس کے کپڑے اور اس کا سامان دیا۔ اس میں اس کا پرس، کار کی چابیاں اور موبائل فون تھا۔ وہ اسے چیزیں دے کر جانے لگی تو دروازے پر رکی اور آہستہ سے کہا۔ ''معاف کرنا، میں نے غلطی سے تمہارا پرس کھول کر دیکھ لیا تھا۔''

جیسمین کہہ کر چلی گئی۔ مارک اس وقت نہیں سمجھا کہ جیسمین نے یہ بات کیوں کہی ہے... کیونکہ وہ ایسی لڑکی نہیں تھی جو کسی کی ذاتی چیزوں کو اس کی اجازت کے بنا چھیڑتی۔ لیکن جب اس نے پرس کھولا تو اس کی سمجھ میں آگیا۔ سامنے نیٹ اور بچوں کی مشترکہ تصویر تھی۔ جیسمین نے یہ تصویر دیکھ لی تھی اور معذرت کر رہی تھی۔ اس نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔ اس بات نے اسے کون کی یاد دلا دی تھی جس کی خاطر وہ یہاں تک آیا تھا اور اب وہ اس تک پہنچنے کے لیے بےتاب تھا۔

اگلے روز اس کی طبیعت اتنی بہتر ہو گئی کہ جیسمین نے اسے نہانے کی اجازت دے دی۔ نہانے کے بعد اس نے خود کو تقریباً فٹ محسوس کیا اس دن وہ کھیتوں میں گھومتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی جسمانی توانائی جلد از جلد بحال ہو جائے۔ اس روز اس نے ٹھوس غذا کھائی تھی اور جیسمین نے اس کے لیے بہت اچھے کھانے بنائے تھے۔ مارک کو تعجب تھا کہ وہ ڈاکٹر بننے والی تھی لیکن گھر کے تمام کاموں میں ماہر تھی اور خاص طور سے کھانا بہت اچھا بناتی تھی۔ کاربو نے کہا۔

''جب جیس چھٹیوں میں گھر آتی ہے تو میرے مزے ہو جاتے ہیں، ورنہ باقی سال اپنے ہی بنائے ہوئے کھانے زہر مار کرنے پڑتے ہیں... یا باہر سے جا کر کھا لیتا ہوں۔''

جیسمین ایک مہینے کی چھٹیوں پر آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کا آخری سال شروع ہو جاتا۔ فارم کاربو سنبھالتا تھا۔ اسے تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں تھی اس لیے ہائی اسکول کے بعد اس نے زراعت سے متعلق کچھ کورس کیے تھے۔ یہ پہاڑی...... ان کی ملکیت تھی لیکن فی الحال کاربو صرف ایک ملازم کے ساتھ اتنی بڑی زمین کاشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جتنی زمین کاشت کر رہا تھا اسی سے کما رہا تھا اور جیسمین کی تعلیم کے

اخراجات بھی اسی سے پورے ہو رہے تھے۔

اس رات انہوں نے مکان کے سامنے احاطے میں الاؤ جلایا اور اس کے گرد بیٹھ کر قہوے اور مونگ پھلی سے لطف اندوز ہونے لگے۔ کاربو نے اس روز زیادہ کام کیا تھا اس لیے وہ تھکن کی وجہ سے جلد سونے کے لیے چلا گیا۔ جیسمین نے مارک کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہم بھی اندر چلتے ہیں، تم تھک گئے ہو گے۔"

"نہیں... میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

جیسمین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اچانک کہا۔ "اس تصویر کے بارے میں؟"

مارک نے سر ہلایا۔ "ہاں... اگر تم سننا پسند کرو۔"

"میں سنوں گی۔"

مارک نے آہستہ آہستہ سب بتا دیا۔ جیسمین خاموشی سے سنتی رہی، اس نے درمیان میں کوئی سوال نہیں کیا۔ مارک نے اسے صرف یہ نہیں بتایا کہ یہاں وہ کون کی تلاش میں آیا ہے لیکن جیسمین کی ذہانت، یہ بات اس نے خود سمجھ لی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم کون کی تلاش میں یہاں آئے ہو؟"

مارک نے اقرار کیا۔ "ہاں، میں اسے ہی تلاش کرتا ہوا یہاں آیا ہوں اور مجھے شبہ ہے کہ جوزف کوریوگ ہی کون ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، اگر وہ کون ہی ہے تو اس نے چھپنے کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا ہے جس کے نام میں اس کا نام بھی آتا ہے۔"

"تم اسے کیوں تلاش کر رہے ہو؟"

"کیوں تلاش کر رہا ہوں؟" مارک نے تعجب سے جیسمین کو دیکھا۔ "میں اس سے اپنے بچوں اور بیوی کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

جیسمین اس کے بدل جانے والے لہجے سے سہم گئی۔

"تم اسے قتل کر دو گے؟"

"میں شاید دو سال پہلے اسے قتل کر دیتا لیکن اس کی خوش قسمتی کہ وہ چھاپے سے چند گھنٹے پہلے فرار ہو گیا۔" مارک نے گہری سانس لی۔

جیسمین خاموش ہو گئی پھر اس نے پوچھا۔ "تمہیں اپنی بیوی سے بہت محبت تھی؟"

"مجھے اس سے آج بھی محبت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

"تم نے پھر شادی کرنے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

"نہیں، جب تک میں کون کو تلاش نہیں کر لیتا، میں کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔"

"اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ جوزف ہی کون ہے تو تم کیا کرو گے؟"

"میں نے ابھی اس بارے میں سوچا نہیں ہے لیکن میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

جیسمین پریشان نظر آنے لگی۔ "جوزف بہت طاقت ور شخص ہے اور اس کے پاس مسلح غنڈوں کی ایک پوری فوج ہے۔"

"کون امریکا میں بھی کم طاقت ور نہیں تھا اور اس کا ثبوت میرے بچوں کا قتل اور میری بیوی کا اغوا ہے۔ اس وقت بھی میں نے اس کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔" مارک جذباتی ہو گیا۔ "اب میں اسے کیسے معاف کر سکتا ہوں۔"

"مجھے تمہارے بیوی بچوں کا افسوس ہے لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کون سے انتقام لینے کا ارادہ ترک کر دو؟"

مارک نے غور سے اسے دیکھا۔ "تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں کوئی نقصان پہنچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"

"میں نے اپنے نفع اور نقصان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"

جیسمین کھڑی ہو گئی۔ "لیکن ممکن ہے کسی اور کو تمہارے نفع نقصان کی پروا ہو۔ آؤ، اندر چلیں... سردی بڑھ رہی ہے۔"

جیسمین اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور مارک اس رات سوچتا رہا کہ اسے اس کے نفع نقصان کی پروا کیوں ہے؟ اگلے روز ناشتے کے بعد اس نے اپنا سامان کار سے نکالا اور اس کا معائنہ کیا۔ پیٹرول کم رہ گیا تھا۔ اس نے کاربو سے کسی قریبی پیٹرول پمپ کا پوچھا، اس نے بتایا۔ "جاباکون کی طرف جاؤ گے تو راستے میں گیس اسٹیشن ہے۔"

مارک ڈرائیونگ کے لحاظ سے خود کو فٹ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے جیسمین سے جانے کو کہا تو اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"تم جا رہے ہو؟"

"ہمیشہ کے لیے نہیں۔" مارک نے وضاحت کی۔ "مجھے کار میں پیٹرول ڈلوانا ہے۔ میں ایک آدھ گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔"

جیسمین کے سانس میں سانس آیا۔ "تب ٹھیک ہے۔"

"لیکن مجھے جانا تو ہے۔"

"ہاں لیکن اتنی جلدی نہیں... جب تک میں مطمئن نہیں

ہو جاتی کہ تم بالکل ٹھیک ہو، تم جا نہیں سکتے۔"

مارک کار میں روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ بعد وہ پیٹرول پمپ پر تھا۔ وہاں سوائے ایک ادھیڑ عمر شخص کے کوئی نہیں تھا۔ کار رکتے ہی وہ پمپ کی طرف آیا۔ مارک نے اسے چابی دی۔ "ٹینک فل کر دو۔"

آدمی چونکا۔ "امریکی ہو؟"

مارک نے اپنے لہجے کو کوسا جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ شناخت کر لیا جاتا تھا۔ اس نے بادل ناخواستہ اعتراف کیا۔ "ہاں... سیاح ہوں۔"

آدمی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا کیونکہ کار مقامی نمبر پلیٹ کی تھی اور اس پر رینٹل کا کوئی نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے پوچھ لیا۔ "یہ تمہاری کار ہے؟"

"نہیں، میرے ایک مقامی دوست کی ہے۔ وہ ریو ڈی... جنیرو میں رہتا ہے۔" مارک نے کہا اور اسی لمحے اس کی نظر دفتر کے ساتھ لگی کافی مشین کی طرف گئی۔ اسے کافی کی طلب ہو رہی تھی، وہ کار سے اتر کر مشین تک آیا۔ کاغذ کے کپ میں کافی نکال کر اس نے آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ ٹینک بھرنے میں مصروف تھا۔ مارک نے کہا۔ "یہاں سیاحوں کے لیے کوئی دلچسپ مقام ہے؟"

آدمی نے سر ہلایا۔ "کوئی تاریخی مقام تو نہیں ہے لیکن جاباکون کا قصبہ بہت خوب صورت ہے۔"

"شکریہ۔" مارک نے میٹر دیکھ کر ادائیگی کی۔ "یہ سڑک آگے کہاں جاتی ہے؟"

"سیدھے جاؤ گے تو قصبے تک پہنچ جاؤ گے اور اس سے ذرا پہلے دائیں طرف ایک راستہ اوپر جا رہا ہے۔ تم اس پر مت جانا ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"کیوں، یہ راستہ خطرناک ہے؟"

ادھیڑ آدمی مسکرایا۔ "نہیں، اس راستے پر ایک خطرناک آدمی کی اسٹیٹ ہے۔ وہاں بنا اجازت جانے والے مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔"

مارک نے شکریہ ادا کر کے پیٹرول کی ادائیگی کی اور روانہ ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں کے لوگ امریکا کے بارے میں اچھے جذبات نہیں رکھتے۔ اس کی بنیادی وجہ اس خطے کے لیے امریکی پالیسیاں تھیں جنہوں نے جنوبی امریکا کے کئی ممالک کو تباہ کر دیا تھا اور بہت ساری جگہوں پر ابھی بھی بدامنی اور خانہ جنگی جاری تھی۔ مارک نے اس راستے پر جانے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ بلاوجہ جوزف کو خبردار کرنے والی بات ہوتی۔ وہ واپس آ گیا۔

مارک نے نہا کر کپڑے بدلے اور برآمدے میں آ کر بیٹھ گیا۔ جیسمین جان گئی تھی کہ اسے قہوے کے بجائے کافی پسند ہے اس لیے وہ اس کے لیے کافی بنا لائی۔ مارک کو اس موسم میں کافی اچھی لگ رہی تھی۔ یہاں مارچ کے آغاز میں بھی موسم خاصا سرد تھا جبکہ جنوبی کرے میں یہ گرمیوں کا موسم ہوتا ہے۔ اس سے مارک نے اندازہ لگایا کہ سردیوں میں یہاں اچھی خاصی سردی پڑتی ہو گی۔ یہاں سے نیچے سڑک صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سڑک سے درمیانے سائز کے ٹرکوں کا ایک قافلہ گزر رہا تھا جس کے سامان پر ترپالیں پڑی تھیں۔ جیسمین کا منہ بن گیا۔ اس نے مارک سے کہا۔

"یہ ٹرک جوزف کی اسٹیٹ کے لیے سامان لے کر جا رہے ہیں۔"

"اتنی بڑی مقدار میں سامان؟" مارک چونکا۔

"ہاں، اس کی اسٹیٹ پر کم سے کم ڈھائی تین سو افراد رہتے ہیں۔ ان کے لیے ہر ہفتے اتنا سامان آتا ہے۔ اس نے بہت بڑی زمین خرید کر اس کے چاروں طرف خاردار تار لگا دی ہے۔ اس کی وجہ سے مقامی لوگوں کو راستے بند ہونے سے تکلیف ہوئی ہے اور خاص طور سے جو پیراگوئے کی سرحد کے پاس آباد ہیں، وہ بڑی مشکل سے اور طویل چکر کاٹ کر جاباکون تک آتے ہیں۔"

"جوزف کوریوگ کی اسٹیٹ کہاں ہے؟"

جیسمین نے سڑک کے پار سامنے دو اونچے پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ان پر ہے۔ دائیں طرف کے پہاڑ پر اس کی رہائش ہے لیکن بائیں طرف والے پہاڑ پر بھی تعمیرات کی گئی ہیں۔ ان کے درمیان سے پہلے راستہ گزرتا تھا لیکن اب اس پر پابندی لگا دی گئی ہے۔"

مذکورہ پہاڑ یہاں سے کوئی پانچ چھ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھے۔ اگر مارک پیدل جاتا تو آدھے پون گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر وہ سو گیا۔ شام کو اسے کاربو نے اٹھایا۔ "اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے مارک۔"

مارک اٹھ کر نیچے آیا اور کار کی ڈکی سے اپنا سوٹ کیس نکال کر اوپر لے آیا۔ جیسمین اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھی۔ وہ چھٹیوں کے بعد کلاسز کی ابھی سے تیاری کر رہی تھی۔ رات کے کھانے سے پہلے مارک نے کچھ تیاری کی۔ کھانے کے بعد وہ سونے کا کہہ کر جلد اٹھ گیا۔ جیسمین نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "آج تم سوئے تو ہو... پھر نیند آ رہی ہے؟"

"ہاں۔" مارک نے جماہی لے کر کہا۔

وہ اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے اپنے سوٹ

www.pkdigest.com

کیس سے ایک سیاہ چست ہائی نیک ٹی شرٹ اور اسی رنگ کا چست ٹراؤزر نکالا۔ یہ دونوں ہلکے میٹریل کے بنے ہوئے تھے۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کے ہلکے کریپ سول جوتے تھے اور سر پر پہننے کے لیے نقاب بھی تھا۔ کپڑے بدل کر اس نے سوٹ کیس کی خفیہ تہ سے ایک عدد اعشاریہ تین، آٹھ کا چھوٹا سا لیکن مہلک پستول اور اس کا سائلنسر نکالا۔ اپنا اسلحہ وہ ساتھ نہیں لا سکا تھا۔ اس کا بندوبست بھی سیور سکو نے کیا تھا۔ مارک نے فاضل میگزین اپنی بیلٹ میں لگا لیے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس پتلی رسی کا ایک لچھا اور اس کے ساتھ کے کچھ ہکس اور کلپس تھے۔ ایک پتلی سی ٹول کٹ اپنی ران پر باندھی اور کچھ اوزار کمر سے لٹکا لیے۔

تیار ہو کر اس نے ایک چھوٹی سی عینک نکالی۔ یہ رات میں دیکھنے کے کام آتی تھی۔ بارہ بجے وہ کمرے سے نکلا اور دبے قدموں گھر سے باہر جانے والا تھا کہ اسے کچن میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ تاریکی میں جیسمین فریج سے لگی کھڑی تھی۔ مارک نے گہری سانس لی۔ "تم سوئی نہیں؟"

"تم بھی تو نہیں سوئے۔" جیسمین اس کے پاس آگئی۔ "کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہیں معلوم ہے کہ میں جا رہا ہوں تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔" مارک نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"تم جوزف کی اسٹیٹ میں جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"پلیز!" جیسمین نے التجا کی۔

"مجھے جانا ہے۔" مارک دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل آیا۔

جیسمین اس کے سامنے آگئی۔ اس نے جان لیا کہ مارک نہیں رکے گا اس لیے اس بار اس نے رکنے کو نہیں کہا بلکہ اپنی باہیں مارک کے گلے میں حمائل کر دیں اور سرگوشی میں بولی۔ "میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

مارک ساکت رہا تو وہ پیچھے ہٹ گئی اور مارک نیچے اتر گیا۔ اس نے کار اسٹارٹ کی۔ برآمدے میں جیسمین کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اس سے نظریں چراتا وہ پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔ بائیں طرف والی پہاڑی تک وہ کار میں جاتا اور اس کے بعد پیدل آگے جاتا۔ چند منٹ میں وہ پہاڑی تک پہنچ گیا۔ اس نے کار سڑک سے اتار کر جھاڑیوں میں کھڑی کی اور اتر کر پہاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔

حسب توقع رات سرد تھی اور اسے ان ہلکے کپڑوں میں سردی لگ رہی تھی لیکن یہ قابلِ برداشت تھی۔ کچھ دیر بعد مسلسل حرکت میں رہنے سے سردی کا احساس بھی نہیں رہا بلکہ مارک کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں۔ وہ جوزف کورلیوگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہی کون تھا تو اس کی تلاش ختم ہونے والی تھی لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل صبح کا سورج ان دونوں میں سے کون دیکھے گا۔ سڑک عبور کر کے وہ ان پہاڑیوں کی طرف بڑھا جہاں جوزف کی اسٹیٹ تھی۔ اس نے سڑک کے بجائے پہاڑی راستہ اختیار کیا۔ رات میں دیکھنے والی عینک کی وجہ سے اسے خاص مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت محتاط تھا اور پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کون جیسے لوگ اپنی حفاظت کے لیے صرف مسلح گارڈز پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جاتے بلکہ وہ ہر ممکن طریقے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے اس پہاڑی پر جدید جاسوس برقی آلات کی موجودگی عین ممکن تھی۔

مارک بڑے درختوں اور ایسی جگہوں سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں جاسوس کیمرے یا اس قسم کے آلات چھپائے جا سکتے تھے۔ وہ زیادہ تر جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ جلد وہ خاردار تاروں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے تاروں کو چھیڑے بغیر ان کے ساتھ چلنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں سے ان تاروں کو چھیڑے بغیر اندر جا سکے۔ جلد اسے ایک چھوٹا سا قدرتی نالا مل گیا جس میں پانی نہیں تھا اور اس میں تقریباً ڈیڑھ فٹ کی جگہ تھی۔ وہ زمین پر لیٹ کر اس کے اندر سے گزر کر اسٹیٹ کی حد میں آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے پستول نکال لیا کیونکہ اس کا سامنا کسی وقت بھی مسلح گارڈز سے ہو سکتا تھا۔

وہ محتاط قدموں سے اس پہاڑی کی طرف چلنے لگا جس پر جوزف کی رہائش گاہ تھی۔ اس کی روشنیاں بھی کبھی نظر آتی تھیں اور دور سے بھی یہ خاصی بڑی عمارت لگ رہی تھی۔ لیکن جب مارک دونوں پہاڑیوں کے درمیان والی وادی تک پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کے عین وسط میں ایک پُرشور دریا بہہ رہا ہے اور اسے عبور کرنے والے پل پر مسلح گارڈز تیز روشنیوں کے ساتھ نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کی موجودگی میں پل سے دریا پار کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ مارک کو خیال نہیں آیا ورنہ وہ براہِ راست اس پہاڑی کی طرف آتا لیکن اب واپس جانے کا موقع نہیں تھا۔

مارک نے فیصلہ کیا اور دریا کی طرف اترنے لگا۔ نزدیک آنے پر اسے اندازہ ہوا کہ دریا بہت تند ہے یہ شاید موسمی نہیں بلکہ مستقل بہنے والا دریا تھا۔ مارک ایک جگہ پانی میں اتر گیا اور خود کو تیز بہاؤ پر سنبھالتے ہوئے دوسری طرف

جانے لگا۔ پانی سرد تھا لیکن اس کی توقع سے کم تھا۔ جہاں پتھر تھے، وہاں اسے کچھ مشکل ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے پانی سے بھیگ گئے تھے۔ وہ کچھ دیر رکا پھر پہاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں درختوں کے درمیان روشنی تھی کیونکہ جابجا لائٹس لگی تھیں۔ مارک کو پہاڑی کے اوپری حصے میں حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں گارڈز موجود تھے۔ گویا اس پہاڑی کی خاص حفاظت کی جا رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور ابھی اس کے پاس بہت وقت تھا اس لیے وہ بہت محتاط تھا۔ کسی بھی جگہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ جائزہ لیتا اور پھر آگے بڑھتا۔ اس مرحلے پر صبر و تحمل کی اشد ضرورت تھی، ذرا سی بے احتیاطی سے سارا کام خراب ہو سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پہاڑی کے اس حصے میں جا نکلا جسے درختوں سے صاف کر کے اور خاص انداز میں ہموار کر کے اس پر خوب صورت پھول اور پودے لگائے گئے تھے۔ پھر آرائشیں تھیں اور فوارے لگے ہوئے تھے۔ اوپری لان پر مجسمے اور اسٹیچوز نظر آ رہے تھے۔ عمارت کے سامنے والے حصے پر سیڑھیوں پر شیروں کی جوڑی کھڑی تھی۔ بڑی مہارت سے بنے ان شیروں پر پہلی نظر میں حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ مارک ان کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ جب وہ کون کے محل پر چھاپا مارنے کے لیے اندر گئے تھے تو مارک کو وہاں بھی داخلی دروازے سے پہلے شیروں کی ایسی جوڑی نظر آئی تھی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کون کے پاس پہنچ گیا ہے۔

اس نے ایک جھاڑی کی اوٹ سے عمارت کا جائزہ لیا۔ اس میں سوائے داخلی دروازے کے اور کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تمام کھڑکیاں شیشوں سے بند تھیں اور اوپری منزل کی کھڑکیاں بھی اسی طرح بند تھیں۔ مارک درختوں کی آڑ میں رہتے ہوئے گھوم کر عمارت کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ لان بہت بڑا تھا اور اس وجہ سے اسے بہت طویل چکر لگانا پڑا۔ وہ عقب میں پہنچ گیا اور یہاں اسے اوپر جانے کا ایک راستہ نظر آ گیا۔ عقبی سمت میں ایک ٹیرس تھا اور اس کے ساتھ ایک بڑا سا گلاس ڈور نظر آ رہا تھا۔ ٹیرس منقش ستونوں پر قائم تھا اور اس کے آس پاس پھول دار جھاڑیاں تھیں۔ یہاں پر بھی لان میں روشنی تھی لیکن یہ اتنی تیز نہیں تھی۔ مارک آرائشی پودوں اور مجسموں کی آڑ میں ٹیرس کی طرف بڑھا۔ اس کی نظر اوپر ٹیرس پر تھی۔

اچانک ہی ٹیرس کے ساتھ والی ایک کھڑکی کھلی اور اس میں سے کسی عورت نے باہر جھانکا۔ مارک نے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا، وہ عورت نیٹ تھی اور اس نے سفید سلکی گاؤن پہن رکھا تھا۔ ایک لمحے کو مارک کو شبہ بھی ہوا کہ وہ نیٹ نہیں کوئی اور عورت ہے جو حیرت انگیز حد تک نیٹ سے مشابہ ہے۔ لیکن اس نے سیدھے کھڑے ہو کر انگڑائی لی تو مارک کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔ وہ نیٹ ہی تھی۔ مارک اس کی ایک ایک جسمانی حرکت پہچانتا تھا۔ اتنی دور سے اس کے تاثرات نظر نہیں آ رہے تھے لیکن جانے کیوں مارک کو محسوس ہوا کہ وہ اداس ہے۔

اس کی اداسی سمجھ میں آنے والی تھی۔ وہ برسوں سے اس شخص کی قید میں تھی جو اس کے بچوں کا قاتل تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے اغوا کر کے یہاں لے آیا تھا اور اسے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اب مارک کو اس میں بھی شبہ نہیں رہا تھا کہ جوزف کورلیوگ ہی اصل میں کون ہے اور وہ امریکا سے فرار ہو کر یہاں فرضی نام اور شخصیت کے ساتھ عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے۔

مارک، نیٹ کو دیکھ کر اتنا بے خود ہوا کہ اردگرد سے بھی بیگانہ ہو گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ نیٹ، کون کے پاس ہی ہوگی۔ اس کا خیال تھا کہ کون نے نیٹ کو بھی قتل کر کے کسی نامعلوم قبر میں دفنا دیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد نیٹ نے کھڑکی بند کر دی۔ مارک پھر سے ٹیرس کی طرف بڑھنے لگا۔ جب وہ ٹیرس سے چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو ایک طرف سے ایک مسلح گارڈ نمودار ہوا۔ مارک فوراً اس جھاڑی میں دبک گیا جس کے پیچھے وہ چھپا ہوا تھا۔ گارڈ آس پاس کا معائنہ کرتا ہوا ٹیرس کی طرف ہی آ رہا تھا۔ گارڈ کی ہوشیاری دیکھ کر مارک کو اندازہ ہوا کہ کون کو اپنی حفاظت کی بہت فکر ہے اور اس نے ایسے گارڈز رکھے تھے جو رات کے اس پہر بھی پوری طرح مستعد تھے۔

گارڈ لان کا معائنہ کرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا تو مارک جھاڑی سے نکل کر ستونوں کے نیچے آ گیا۔ یہاں نسبتاً کم روشنی تھی اور وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ مارک نے رسی سے ایک ہک باندھا اور اسے گھما کر ٹیرس کی دیوار پر پھینکا۔ پہلی کوشش میں ہک نہیں پھنسا۔ دوسری کوشش بھی ناکام رہی لیکن جب اس نے تیسری بار ہک اچھالا تو وہ کہیں اٹک گیا۔ مارک نے رسی کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور پھر ستون پر پاؤں جماتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا۔ یہ کام اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا کسی عام شخص کے لیے سیڑھی سے اوپر جانا۔ ایک منٹ سے پہلے وہ ٹیرس پر تھا۔ یہاں تیز روشنی تھی اس لیے اوپر چڑھتے ہی وہ دیوار کی اوٹ میں ہو گیا ورنہ نیچے سے کوئی دیکھتا تو وہ اسے صاف نظر آ جاتا۔

www.pkdigest.com

جھکتے جھکتے وہ گلاس ڈور کی طرف بڑھا۔ اس کے دوسری طرف پردے تھے اس لیے اندر کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا۔ مارک نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن وہ بند تھا۔ اسے پہلے ہی توقع تھی۔ اس نے اپنی ران سے بندھی پتلی اور چپٹی ٹول کٹ نکالی۔ اس میں سے ایک گلاس کٹر اور اس کے ساتھ لگنے والا پرکار نکالا۔ اس پر ہیرے کا گلاس کٹر سیٹ کر کے اس نے پرکار کا چپک جانے والا حصہ شیشے پر لگایا اور پھر پرکار کا دائرہ گھمانے لگا۔ ہلکی آواز کے ساتھ شیشہ کٹنے لگا لیکن یہ بہت مضبوط کوئی انچ بھر موٹا شیشہ تھا اس لیے اسے کٹنے میں وقت لگا۔ مارک نے جلدی کرنے کے بجائے آرام سے شیشہ کاٹنا جاری رکھا۔ جلدی کی صورت میں آواز بلند ہو جاتی اور کوئی سن لیتا تو مارک کو اپنی جان بچانا مشکل پڑ جاتی اور وہ کم سے کم کون کو جہنم رسید کرنے تک زندہ رہنا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد بالآخر شیشہ کٹ گیا۔

مارک نے شیشہ پرکار کے چپک جانے والے حصے کی مدد سے باہر نکالا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ساری چیزیں ٹول کٹ میں ڈال کر وہ اندر جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اندر ہاتھ ڈال کر گلاس ڈور کا لاک کھولا اور دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ وہ بنا آہٹ کے کھلا اور مارک اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور پردے کے کونے کی طرف سرکا۔ اندر روشنی تھی اور اس کا سایہ صاف نظر آ جاتا۔ پردے کے سرے سے اس نے اندر جھانکا تو اسے ایک وسیع لاؤنج نما جگہ نظر آئی۔ سامنے ایک بہت بڑی اسکرین والا ٹی وی چل رہا تھا اور اس پر فٹ بال میچ آ رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک شخص آرام کرسی پر تقریباً لیٹ کر میچ دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹی وی کی آواز بند کر رکھی تھی۔

مارک نے باہر نکلنے سے پہلے لاؤنج کا جائزہ لیا۔ یہ کھلا ہوا ہال تھا اور اس میں آنے جانے کے کئی راستے تھے۔ جائزہ لے کر مارک دبے قدموں اس شخص کی طرف بڑھا اور عقب سے اس کے سر پر پستول رکھتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا۔ وہ کون ہی تھا۔ وہ ساکت رہ گیا۔

"اپنے ہاتھ سامنے رکھو۔" مارک نے سرگوشی میں کہا۔

اس نے حکم کی تعمیل کی اور پُرسکون لہجے میں بولا۔ "تو یہ تم ہو۔"

مارک نے ہاتھ مار کر اس کے گاؤن کی تلاشی لی اور ایک پستول برآمد کر کے پیچھے ہٹ گیا۔ "بالآخر میں نے تمہیں تلاش کر ہی لیا۔"

کون نے اسی انداز میں کہا۔ "میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم نے ملازمت سے استعفا دے دیا ہے اور مجھے تلاش کر رہے ہو۔"

"یہ درست ہے۔ دو سال سے میں نے سوائے تمہیں تلاش کرنے کے اور کوئی کام نہیں کیا ہے۔"

"اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ ویسے مجھے تعجب ہے کہ تم نے مجھے دیکھتے ہی شوٹ کیوں نہیں کر دیا؟"

"میں یہی ارادہ لے کر آیا تھا لیکن اندر آنے سے پہلے مجھے معلوم ہوا کہ تم نے میری بیوی نیٹ کو بھی قبضے میں لے رکھا ہے۔"

"تمہاری بیوی..."

"جھوٹ مت بولنا۔ میں نے خود کچھ دیر پہلے اسے ایک کمرے کی کھڑکی سے جھانکتے دیکھا ہے۔"

کون نے سر ہلایا۔ "ہاں... وہ نیٹ ہی ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔"

مارک کے اندر اشتعال کی لہر اٹھی۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا ورنہ وہ کون کو شوٹ کر دیتا۔ کون بے خوفی سے اسے گھور رہا تھا۔ جب مارک نے خود پر قابو پا لیا تو وہ مسکرایا۔ "کیا تم مجھے قتل کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہے ہو؟"

"اس کے برعکس میں خود کو تمہیں قتل کرنے سے روک رہا ہوں۔" مارک نے غرا کر کہا اور پستول کا دستہ کون کے ماتھے پر مارا۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا اور یقیناً اسے چکر آ گیا تھا کیونکہ اس نے کرسی سے سر ٹکا لیا تھا۔ اس کے حواس بحال کرنے کے لیے مارک نے وہسکی کا گلاس اس کے زخم پر الٹ دیا۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس نے کراہ کر سر تھام لیا۔

"نیٹ کہاں ہے؟"

"اسی محل میں ہے۔" کون چوٹ کھانے کے باوجود اسی دم خم سے بات کر رہا تھا۔ مارک اس کے انداز سے مشتعل ہونے لگا۔

"اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ کوئی تمہیں بچا لے گا تو تم غلطی پر ہو اس لیے جو کہہ رہا ہوں، اس کا صحیح جواب دو۔"

"ہاں... نیٹ اسی محل میں ہے اور اپنی مرضی سے ہے۔"

اس کے الفاظ پتھر کی طرح مارک کی سماعت سے ٹکرائے اور کچھ دیر بازگشت کی طرح اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ رفتہ رفتہ مفہوم اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے کون کے منہ پر پستول کے دستے سے پے در پے وار کیے اور اس کے سامنے والے دو دانت توڑ دیے۔ کون نے بچنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ مارک نے مسلسل وار کر کے اسے آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ ایک وار ناک پر کیا تو خون

فوارے کی طرح پھوٹ کر نکلا۔ اشتعال کے باوجود اس نے کوئی ایسا وار نہیں کیا تھا کہ کون ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا۔ جب وہ پیچھے ہٹا تو کون کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور اس کا منہ خون اور زخموں سے بھر گیا تھا۔ اسے شدید تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے منہ سے کوئی آواز نہیں نکالی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے چیخنے کی کوشش کی تو یہ اس کے منہ سے نکلنے والی آخری آواز ہوگی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔

مارک نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب تم بولنے سے پہلے ضرور سوچو گے۔"

کون نے ٹوٹ جانے والے دانت تھوک دیے اور جیب سے رومال نکال کر خون صاف کیا۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں ناک ٹوٹ جانے کی وجہ سے منمناہٹ آ گئی تھی۔ "تم نے کبھی سوچا کہ اس رات میرے آدمی تمہارے فلیٹ میں کیسے گھسے تھے؟"

اشتعال کے باوجود مارک نے اس پر مزید تشدد سے گریز کیا۔ "تمہارے آدمی آری سے لاک والا حصہ کاٹ کر اندر آئے تھے۔"

کون ہنسا۔ "وہ تو پولیس کو مس گائیڈ کرنے کے لیے بعد میں کاٹا گیا تھا ورنہ تم خود سوچو اس کی آواز سے تمہاری آنکھ نہ کھلتی؟ پھر اس رات تم اتنے چاق و چوبند نہیں تھے۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" مارک نے اسے غور سے دیکھا۔

"وہی جس کی وجہ سے تم نے میرا یہ حال کیا ہے لیکن یہ سو فی صد سچ ہے۔ نیٹ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہے اور وہ شروع سے میرے ساتھ تھی۔"

مارک کے ہاتھ پاؤں میں سنسنی سی ہونے لگی۔ "بکواس کر رہے ہو تم... وہ تمہارے ساتھ کیوں آنے لگی؟"

"کیونکہ اسے جو دولت اور آسائشیں میں دے سکتا تھا، وہ تم نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے اس نے میری پیشکش قبول کر لی۔ وہ مجھے تمہارے سرکاری کاغذات کی تصویریں فراہم کرتی تھی اور اسی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ تم میرے گرد گھیرا تنگ کر چکے ہو۔"

"بکواس..."

"آج کی عورت کو کوئی قید نہیں رکھ سکتا جب تک اس کی اپنی مرضی اس میں شامل نہ ہو۔"

"بھونک مت کتے۔" مارک کا ضبط جواب دینے لگا۔ "تمہارا مطلب ہے، اپنے بچوں کے قتل میں وہ خود بھی شامل ہے؟"

"نہیں، اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے آدمی وہاں کیا کریں گے۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اسے لے جانے اور تمہیں قتل کرنے آئے ہیں۔"

مارک نے بے یقینی سے کون کو دیکھا۔ "نیٹ مجھے قتل کروانے پر آمادہ ہو گئی تھی؟"

"ہاں کیونکہ تم نے اس سے شادی کے نام پر اس کے خواب چھین کر اسے بہت محدود سی زندگی دی تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ چاہتی تھی۔ وہ دولت اور آسائشوں کی بھوکی تھی اور تمہارے ساتھ اسے ترس ترس کر زندگی بسر کرنا پڑ رہی تھی۔"

"اس نے اپنے بچوں کا خیال بھی نہیں کیا؟"

"بچے وہ بعد میں حاصل کر سکتی تھی۔ اس کا یہی خیال تھا لیکن میرے پلان میں بچوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔"

"اس لیے تم نے انہیں... مروا دیا۔"

"نہیں، وہ تمہاری سزا تھی۔ میرے آدمیوں نے تمہیں کئی بار خبردار کیا لیکن تم نہیں مانے۔ پھر نیٹ سے رابطہ کیا تو وہ مان گئی۔ اس کی سب سے بڑی شرط یہ تھی کہ اسے تم سے نجات دلا دی جائے۔"

"اس کے لیے وہ اپنے بچوں کے قتل پر راضی ہو گئی؟" مارک کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "اور اب کسی خوشی تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔"

"کسی خوشی کا تو نہیں معلوم لیکن اسے جو درکار تھا، وہ میں نے اسے دے دیا ہے اور بچوں کا قتل تمہارے کھاتے میں چلا گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ تم نے مزاحمت کی اور اس دوران میں گولیاں چلنے سے بچے مارے گئے۔ اس کے بعد وہ تم سے اور بھی نفرت کرنے لگی۔"

"تم نے مجھے سزا دے دی... میرے بچوں کو مار دیا۔ میری بیوی کو مجھ سے چھین لیا۔ امریکا کے قانون سے بچ کر یہاں بھاگ آئے اور عیش کی زندگی گزارنے لگے۔ اب کیا خیال ہے، تم میرے ہاتھ سے بچ جاؤ گے؟"

کون حیرت انگیز طور پر قوت برداشت رکھتا تھا اور اس نے منہ پر شدید چوٹیں کھانے کے باوجود جلد خود کو سنبھال لیا تھا۔ "میں نے اس بارے میں کبھی سوچا نہیں کہ میں مر جاؤں گا یا نہیں۔ جو میری تقدیر میں لکھا ہے، وہ تو ہوگا۔"

"میرا خیال ہے کہ تقدیر نے تمہاری زندگی کا اینڈ کر دیا ہے۔" مارک نے پستول اس کی طرف سیدھا کر لیا۔ "لیکن اس سے پہلے میں نیٹ کو یہاں دیکھنا پسند کروں گا۔"

"اگر میں تمہاری بات نہ مانوں تو؟... قتل تو تم مجھے کرو

www.pkdigest.com

گے ہی۔''

''قتل کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ میں تمہیں جوڑوں پر ایک ایک گولی ماروں تو تم دس گولیاں کھا کر بھی نہیں مرو گے اور سر میں ایک گولی لگنے سے مر جاؤ گے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم کیا منتخب کرتے ہو۔''

''میں نیٹ کو نہیں بلا سکتا۔'' کون نے انکار کر دیا۔

''تمہاری مرضی۔'' مارک نے پستول کا رخ اس کے گھٹنے کی طرف کیا تھا کہ عقب سے آواز آئی۔

''رک جاؤ، میں آ گئی ہوں۔''

مارک نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔ نیٹ دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ اس کا رخ مارک کی طرف تھا۔

کون ہنسا۔ ''اب تم گولی چلا سکتے ہو۔''

''بکواس مت کرو۔'' مارک نے سرد لہجے میں کہا اور ایسا زاویہ اختیار کیا کہ دونوں کو دیکھ سکے۔ نیٹ ذرا آگے آ گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو تم نے ہمیں تلاش کر لیا۔''

''ہاں۔'' مارک کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''ابھی چند لمحے پہلے تک میں تمہیں بھی تلاش کر رہا تھا اور اب مجھے صرف اپنے بچوں کے قاتل چاہئیں۔''

نیٹ نے کون کی طرف دیکھا۔ ''اس نے تمہیں سب بتا دیا ہے؟''

''ہاں... اس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔'' مارک افسردہ ہو گیا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیونکہ مجھے آسائشیں اور دولت چاہیے تھی۔ وہ تم مجھے نہیں دے سکتے تھے۔'' نیٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس لیے تم نے اس قاتل سے اپنے بچوں کا سودا کر لیا۔'' مارک نے کون کی طرف اشارہ کیا۔ ''لگتا ہے تمہیں ذرا بھی شرمندگی نہیں ہے۔''

''یہ بکواس کر رہا ہے۔'' کون نے کہا۔ ''اب یہ تمہیں میرے خلاف بھڑکانے کے لیے جھوٹ بولے گا۔''

''نیٹ میری باتوں میں کب آنے والی ہے۔'' مارک ہنسا۔ ''ورنہ یہ میرا ساتھ کیوں چھوڑتی... اپنے بچوں کو قاتلوں کے حوالے کیوں کرتی؟''

''نیٹ! اس کی بکواس مت سنو۔ اسے شوٹ کر دو۔'' کون بولا۔

''اس سے پہلے میں تمہیں نہ شوٹ کر دوں لیکن پہلے میں نیٹ کو تمہارا اصل چہرہ دکھانا چاہوں گا۔''

''تم کیا کہو گے؟'' کون نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''نیٹ تم سے نفرت کرتی ہے۔ یہ تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کرے گی۔''

''نیٹ! اس نے وہ قاتل میرے لیے نہیں، میرے بچوں کے لیے بھیجے تھے جنہیں گھر میں آنے کا راستہ تم نے دیا تھا۔''

''یہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ وہ اسے مارنے آئے تھے لیکن اس نے بچوں کو ڈھال بنا لیا اور ان کو مروا دیا۔''

''تب وہ مجھے کیوں چھوڑ گئے؟'' مارک مشتعل ہو گیا۔

''بچوں کے مرنے سے میرے آدمی بدحواس ہو گئے تھے اس لیے وہ تمہیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔'' کون بولا۔

''نیٹ! کیا سوچ رہی ہو؟ شوٹ ہم۔''

''اتنی جلدی بھاگ نکلے کہ دروازے کا لاک والا حصہ کاٹنا نہیں بھولے تھے؟''

نیٹ ساکت کھڑی تھی اور کون بار بار اسے مارک کو شوٹ کرنے کو کہہ رہا تھا۔ کون نے کہا۔ ''نیٹ! کیا تم اس کی باتوں پر یقین کر رہی ہو جس نے تمہیں سوائے ترستی زندگی کے اور کچھ نہیں دیا؟''

''نہیں، میں اس کی بات پر کبھی یقین نہیں کرتی...'' نیٹ نے پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

مارک پھر واپس نہیں آیا۔ کاربو اگلی صبح اسے غائب دیکھ کر حیران تھا۔ جیسمین نے اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ رات کسی پہر چلا گیا تھا۔ وہ بتا کر نہیں گیا تھا اور اپنا سوٹ کیس بھی یہیں چھوڑ گیا تھا۔ دوپہر تک جوزف اسٹیٹ والی پہاڑیوں پر ہیلی کاپٹر اترنے لگے۔ یہ فوجی اور سرکاری ہیلی کاپٹرز تھے۔ کاربو دوربین سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسمین کو بتایا۔

''جوزف کی اسٹیٹ میں کچھ ہوا ہے۔ وہاں کئی ہیلی کاپٹر اترے ہیں۔''

یہ سن کر جیسمین برآمدے میں آئی، اس نے دوربین سے دیکھا۔ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ ''ہاں، واقعی وہاں کچھ ہوا ہے۔''

اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ مائنک کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن مائنک خود کہاں تھا اور وہ صحیح سلامت بھی تھا یا... اس سے آگے جیسمین سے سوچا نہیں گیا۔ اور وہ دل ہی دل میں مائنک کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کا اصل نام مارک ہے۔ اس نے پرس میں صرف اس کے بیوی بچوں کی تصویر دیکھی تھی۔ ان کے پاس ٹی وی نہیں تھا۔ کاربو شام کو جابا کون گیا تو وہاں سے پتا چلا کہ سرکاری فوج نے اسٹیٹ پر قبضہ کر لیا ہے۔ اگلے روز کے اخبارات سے بھی اتنا ہی معلوم ہوا کہ اسٹیٹ کا مالک جوزف جو اصل میں ایک مفرور امریکی منشیات فروش کون مارسیانو ہے، اپنے محل میں مردہ پایا گیا تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت مونی مارسیانو کی لاش بھی ملی تھی۔ وہ کون کی بیوی بتائی گئی تھی۔

جیسمین نے کئی اخبارات منگوائے پھر جابا کون جا کر ٹی وی پر اس کی خبر دیکھی۔ انٹرنیٹ پر تلاش کیا لیکن اسے مائنک کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس امریکی کے محل سے بڑی مقدار میں دولت اور منشیات برآمد ہوئی تھی اور محل کے سامنے والی پہاڑی میں زمین کو اس طرح سے تیار کیا جا رہا تھا جیسے وہاں منشیات اگانے کا ارادہ ہو۔ اسٹیٹ سے سو افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اور وہاں سے غیر قانونی اسلحے کی بڑی مقدار بھی ملی تھی۔

جیسمین کی بے چینی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں اور اسے شہر جانا تھا۔ کاربو اس کی بے چینی پر حیران تھا۔ ایک دن جیسمین چپکے سے جوزف کی اسٹیٹ پر موجود سرکاری اہلکاروں کے افسر سے ملی اور اس سے مائنک کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے مائنک نامی کسی شخص کے وجود سے انکار کر دیا۔ ''اس آپریشن میں مائنک نامی کوئی شخص نہ تو گرفتار ہوا ہے اور نہ ہی مارا گیا ہے۔''

جیسمین مایوس لوٹ آئی۔ اس کے جانے میں دو دن رہ گئے تھے۔ اس صبح وہ اپنے کپڑے تیار کر رہی تھی۔ کاربو کھیت میں کام کر رہا تھا کہ اچانک جیسمین کو کار کے انجن کی مانوس آواز آئی اور وہ کھڑکی کی طرف لپکی، اس نے نیچے دیکھا۔ مائنک کی جانی پہچانی کار اوپر آ رہی تھی۔ جیسمین بھاگتی ہوئی نیچے پہنچی تو کار مکان کے احاطے کے سامنے رک چکی تھی اور اس میں سے مارک نکل رہا تھا۔ وہ اسی طرح بھاگتی ہوئی جا کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور پوری جان سے کانپ رہی تھی۔ مارک نے آہستہ سے اس کی پشت سہلائی۔

''میں آ گیا ہوں۔''

جیسمین اس سے الگ ہوئی۔ ''پورے دس دن بعد... اور تمہیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہو گی؟''

''مجھے خیال آیا تھا لیکن میں کچھ کاموں میں پھنس گیا تھا اور یہاں رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اس لیے اطلاع نہیں دے سکا۔''

''اس رات کیا ہوا تھا؟'' جیسمین نے بے تابی سے پوچھا۔ ''مائنک! مجھے بتاؤ... کچھ مت چھپانا۔''

مارک نے گہری سانس لی۔ ''اس رات جو ہوا، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔''

جیسمین اسے برآمدے میں لے آئی اور کرسی پر بٹھا کر خود اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''مجھے بتاؤ۔''

مارک نے اسے سب بتا دیا۔ نیٹ نے اس کی اور کون کی پوری بات سن لی تھی اور اس پر پہلی بار انکشاف ہوا تھا کہ کون نے جان بوجھ کر اس کے بچوں کو مروایا تھا۔ وہ اتنے عرصے سے اپنے بچوں کے قاتل کی داشتہ بن کر رہ رہی تھی۔ اس نے کون سے کہا۔ ''میں کبھی مارک کی بات کا یقین نہ کرتی اگر میں نے اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا۔''

اس نے کون کو شوٹ کر دیا۔ فائر کی آواز پر کوئی وہاں نہیں آیا کیونکہ محل کا یہ حصہ سب سے الگ اور ساؤنڈ پروف تھا۔ مارک نے نیٹ کو راضی کرنا چاہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا اور مارک کو محل کی چھت پر لائی جہاں ایک چھوٹا سا ہیلی کاپٹر موجود تھا۔ کون آمد و رفت کے لیے اسے استعمال کرتا تھا۔ نیٹ وہیں رہ گئی اور مارک وہاں سے نکل گیا۔ بعد میں نیٹ نے خود کو بھی گولی مار لی تھی۔ مارک نے برازیل کے حکام اور پھر امریکی سفارت خانے کو کون مارسیانو کے بارے میں بتایا اور برازیل کی حکومت نے آپریشن کر کے اسٹیٹ پر قبضہ کر لیا جہاں سے کون اور نیٹ کی لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔

''یہ ہے ساری کہانی... کچھ معاملات نمٹانے اور پھر تمہاری حکومت سے یہاں رہنے کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں کچھ وقت لگ گیا اور جب مجھے اجازت مل گئی تو میں سیدھا یہاں آ گیا ہوں۔''

جیسمین خوش ہو گئی۔ ''تم یہاں رہو گے مائنک؟''

مارک نے سر ہلایا۔ ''ہاں اور اگر تم چاہو تو ہمیشہ کے لیے رہوں گا۔ ویسے میرا نام مائنک نہیں، مارک ہے۔''

''تم مائنک ہو یا مارک... اب میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔'' جیسمین نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں خود بھی اس پرسکون جگہ سے نہیں جانا چاہتا کیونکہ میں تھک گیا ہوں۔ مجھے سکون کی ضرورت ہے۔'' مارک نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس وقت اسے لگا کہ قدرت نے اس سے جو لیا تھا، اس کا ایک حصہ اسے واپس مل گیا ہے۔

www.pkdigest.com

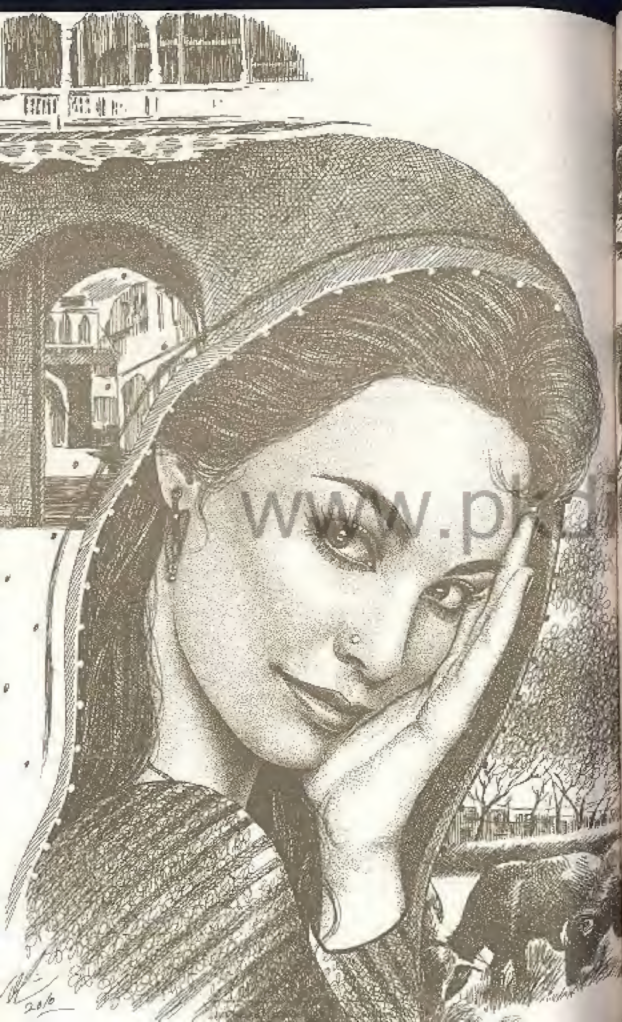

www.pkdigest.com

چودھویں قسط

اسماقادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور بااثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں۔ مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کتنی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانونٔ کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے...... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے...... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشی کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں...... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے...... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل...... ملنے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پُرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرِ نگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیرآباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری ظالم و جابر اور عیاش تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی ملی بھگت سے لکڑی اور کھالوں کی اسمگلنگ کر رہا تھا۔ شہریار نہ صرف یہ دھندے روک دیتا ہے بلکہ علاقے میں اسکول وغیرہ قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیتا ہے۔ پیرآباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگا..... آفتاب بھی چودھری کے ناپسندیدہ افراد میں سے ایک ہے جسے اسکول چلانے کے جرم میں چودھری اپنے آدمیوں کے ذریعے زدوکوب کرتا ہے لیکن آفتاب ہتھیار نہیں ڈالتا۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی محبت کی شدت کو دیکھتے ہوئے آفتاب کو اسے اپنے دل میں جگہ دینی پڑتی ہے اور دونوں کے درمیان ہونے والی چوری چھپے کی ملاقاتیں خفیہ نکاح تک جا پہنچتی ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیرآباد سے ہے۔ اس کے والدین بچپن میں ہی اسے اس کے خالہ خالو کو دے دیتے ہیں جن کے ساتھ وہ فیصل آباد میں رہتی تھی لیکن والدین اور بھائی بہنوں سے ملاقات کے لیے اس کا پیرآباد آنا جانا رہتا تھا۔ چودھری افتخار پیری مریدی کے چکر میں اپنے مرحوم دادا کا عرس بڑی شان و شوکت سے مناتا ہے۔ عرس کے دنوں میں جبراً حویلی کے کاموں کے لیے بلوائی جانے والی ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اگلی بار اس کا اپنی بہن کی شادی میں دوبارہ پیرآباد آنا ہوتا ہے۔ چودھری اسے اغوا کروالیتا ہے لیکن ماہ بانو ایک بار پھر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چودھری افتخار بہرصورت اس سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ماہ بانو شادی سے قبل ہی اپنی بہن زہرہ کے تعاون سے گھر سے بھاگ نکلتی ہے اور شہریار سے جا ملتی ہے۔ شہریار اسے اپنی گاڑی میں چھپا کر پیرآباد سے نکال دیتا ہے اور دارالامان بھجوا دیتا ہے لیکن چودھری کے آدمی وہاں بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن دارالامان کے چوکیدار کی مداخلت کی وجہ سے وہ ماہ بانو کو لے جانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔ شہریار ماہ بانو کو دارالامان سے چودھری کے سابق دوست موتی والا کی کوٹھی پر بھجوا دیتا ہے۔ موتی والا جو لکڑی کی اسمگلنگ میں چودھری کا دستِ راست تھا، اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کے بعد چودھری کا ساتھ چھوڑ کر شہریار سے مل جاتا ہے۔ چودھری غداری کرنے کے جرم میں موتی والا اور اس کی بیوی کو مروا دیتا ہے۔ کوٹھی کی انیکسی میں مقیم ماہ بانو موتی والا کے ڈرائیور سرمد کی مدد سے فرار ہو کر اس کے ایک دوست عامر کے گھر پہنچ جاتی ہے۔ عامر کے گھر ایک ایسی لڑکی کا آنا جانا ہوتا ہے جو درحقیقت تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا ایک گروہ اس لڑکی کے پیچھے پڑا ہوتا ہے اور لڑکی کو بچانے کے چکر میں ماہ بانو خود اس گروہ کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ خواجہ سراؤں کا گرو الماس بطور سزا اس سے وہی کام لیتا ہے جو اس کے گروہ کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک روز الماس اسے لے کر ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی پہنچتا ہے۔ راستے میں ٹیکسی والے کی بدتمیزی کی وجہ سے ماہ بانو زخمی ہو جاتی ہے۔ کوٹھی میں اسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ کوٹھی کے تہ خانے میں کئی خواجہ سرا جمع ہوتے ہیں جن کی موجودگی میں ان کا مہاگرو ایک نوجوان لڑکی کو ایک مورتی کے قدموں میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ وہ گرو الماس کے ساتھ واپس ٹھکانے پر آتی ہے اور وہاں ایک نیک فطرت خواجہ سرا انگار کو اس راز میں شریک کرلیتی ہے۔ انہی دنوں گرو انہیں ایک شادی پر بھیجتا ہے۔ وہاں ماہ بانو کو پتا چلتا ہے کہ دلہن نیلم وہ لڑکی ہے جسے موتی والا کا ڈرائیور سرمد پسند کرتا ہے اور لڑکی کی سوتیلی ماں اس کی زبردستی ایک بوڑھے سے شادی کروانے پر بضد تھی۔ وہ نیلم کو اپنے کپڑے پہنا کر انگار کے ساتھ وہاں سے نکال دیتی ہے۔ صبح شادی والے گھر پر چھاپا پڑتا ہے اور ماہ بانو کو عزت کے ساتھ تھانے لے جایا جاتا ہے جہاں شہریار کے ماموں زاد بھائی ڈی آئی جی سجاد رانا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی شیبا کی تلاش ہوتی ہے جسے خواجہ سراؤں کے ایک گروہ نے اغوا کرلیا تھا۔ چنانچہ جب اسے یہ اطلاع ملتی ہے کہ خواجہ سراؤں کے ایک گروہ میں ایک لڑکی دیکھی گئی ہے تو وہ اسے اپنی بیٹی سمجھ کر بازیافت کروانے کی کوشش کرتا ہے اور نتیجے میں ماہ بانو آزاد ہو جاتی ہے۔ ماہ بانو کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا ہے جہاں شہریار بھی موجود ہوتا ہے۔ وہیں وہ شیبا کی تصویر دیکھتی ہے اور شہریار کو بتاتی ہے کہ اس لڑکی کو ہندو سیٹھ کی کوٹھی میں ایک دیوی کے قدموں میں بھینٹ چڑھایا جا چکا ہے۔ ہندو سیٹھ کی کوٹھی پر چھاپا مارا جاتا ہے لیکن وہاں سے سیٹھ اور شیبا کو اغوا کرنے والے خواجہ سراؤں کی لاشوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ سجاد رانا کو اپنی بیٹی کے قاتلوں کی تلاش تھی اور یہ تلاش اس کی را کے ایجنٹوں سے مڈبھیڑ کروا دیتی ہے جس کا حتمی نتیجہ اس کے قتل کی صورت میں نکلتا ہے۔ چودھری، ماہ بانو کی سجاد رانا کے گھر موجودگی کی بھنک پاکر اسے وہاں سے اغوا کروانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاغان منتقل کر دیتا ہے۔ کاغان سے ماہ بانو مشابرم خان کے بھائی اکرم خان اور ماں کے ساتھ ہوتے ہوئے ایک شادی میں شرکت کے لیے جاتی ہے اور وہاں کی کیمپنگ سائٹ پر ایک گورے کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچ جاتی ہے لیکن وہ ماہ بانو کو اغوا کرا لیتا ہے اور اس کارروائی میں اکرم خان مارا جاتا ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ ماہ بانو کے بارے میں ساری معلومات حاصل کرلیتا ہے اور یہ جاننے کے بعد کہ چودھری ماہ بانو کی تلاش میں ہے، ایک منصوبہ تشکیل دیتا ہے۔ پیرآباد سے متصل جنگل کو اس کے مخصوص ماحول کی وجہ سے پوست کی کاشت کے لیے استعمال کرنا اس کے منصوبوں میں سے ایک ہے جس کے لیے وہ ماہ بانو کا لالچ دے کر چودھری کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ چودھری کے ظلم و جبر کی ایک نشانی فریدہ ہے۔ وہ نور پور گاؤں کے چودھری مختار کی بہن ہے۔ چودھری مختار کو افتخار عالم شاہ اس کی روشن خیالی اور اپنی غلامی نہ کرنے کی وجہ سے پسند نہیں کرتا تھا۔ فریدہ اپنے بھائی کے مخالفوں میں ایک نوجوان قربان کی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے اور اس کے ساتھ بھاگ کر پیرآباد چودھری کی پناہ میں آ جاتی ہے۔ وہاں اسے پناہ کے بجائے چودھری کی ہوس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چودھری اسے اپنے ذہنی معذور بیٹے کی دلہن بنا کر حویلی لے آتا ہے۔ یہ شادی ایک ڈھونگ تھی جس کی آڑ لے کر چودھری مسلسل رشتوں کا تقدس پامال کرتا رہتا ہے۔ شہریار اور چودھری کے درمیان مخاصمت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ چودھری ڈاکٹر ماریا نامی ایک لڑکی کے ساتھ اس کی قابلِ اعتراض تصویریں اتار کر اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ڈاکٹر ماریا کے تعاون کی وجہ سے شہریار وہ تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور چودھری کی چال سے بچ نکلتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اپنی پشت پر سے سنائی دینے والی بارعب آواز پر وہ دونوں پلٹ کر بولنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور دونوں کے سینے سے ہی بے اختیار ایک اطمینان بھرا سانس خارج ہوا۔ وہ منور شاہ تھا جو اپنے ننھے ہاتھوں میں ایک کھلونا کلاشنکوف اٹھائے ان کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کا رخ ان دونوں کی طرف تھا۔ ”میں نے آپ دونوں کو ڈرا دیا۔ اتنے بڑے ہو کر بھی آپ دونوں اتنے بزدل ہیں۔“ منور شاہ جس کی کھلونا کلاشنکوف کا رخ ان دونوں ہی کی جانب تھا، اس طرح انہیں ڈرا دینے کے اپنے کارنامے پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

”بہت شریر ہو گئے ہو تم شیطان!“ کشور نے اس کے قریب جا کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ویسے وہ اور آفتاب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ جھینپے ہوئے تھے کہ وہ ایک بچے سے ڈر گئے۔ اصل میں کچھ تو خوف ان کے اپنے اندر تھا اور کچھ منور آواز بھی بھاری بنا کر بالکل کسی بڑے آدمی کی طرح بولا تھا، اس لیے لمحہ بھر کے لیے وہ دونوں ہی سن پڑ گئے تھے۔

”آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اپنا کان کشور کی گرفت سے چھڑوانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے سوال نے انہیں احساس دلایا کہ منور کا یہاں آنا اور ان دونوں کو ساتھ دیکھ لینا اتنا بھی بے ضرر نہیں ہے۔ بے شک وہ بچہ تھا اور ان کے درمیان موجود تعلق کو نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن اپنی نادانی اور معصومیت میں وہ کسی کے سامنے اس بات کا تذکرہ تو کر سکتا تھا۔

”آپ جائیں آفتاب! میں اسے سنبھال لوں گی۔“ گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے کشور نے آفتاب کو پہلے وہاں سے رخصت کر دینا مناسب سمجھا۔ زیادہ تاخیر گیٹ پر موجود چوکیدار کی نظر میں آ سکتی تھی۔ اس کا مقصد سمجھتے ہوئے آفتاب نے بھی فوری طور پر وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا اور ننھے منور سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

”او کے ماسٹر! میں چلتا ہوں۔ تم اپنا ہوم ورک اچھی طرح کر لینا۔“

”یس سر! میں کرلوں گا بلکہ خالہ سے کہوں گا کہ یہ میرا ہوم ورک کروا دیں۔“ منور نے جواب دیا۔ اس تھوڑے سے عرصے میں وہ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ بڑے طریقے سلیقے سے بات چیت کرتا تھا۔ اصل میں ابھی وہ تھا بھی اتنا کم عمر کہ مزاج میں حاکمانہ خوبو پیدا نہیں ہوئی تھی۔ آفتاب نے اس کے معصومانہ انداز پر پیار سے اس کا رخسار تھپتھپایا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہو گیا۔

”آپ میرا ہوم ورک کروائیں گی نا خالہ؟“ کشور ابھی جانے والے کے قدموں کے نشانوں میں ہی محو تھی کہ منور نے اس کا ہاتھ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”بالکل کرواؤں گی۔ مگر ایک شرط پر۔“

”وہ کیا؟“ منور نے تجسس سے پوچھا۔

”آپ کسی کے سامنے ذکر نہیں کرو گے کہ آپ نے مجھے اور ماسٹر صاحب کو یہاں دیکھا تھا۔“

”نہیں کروں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ دونوں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ منور نے اس کی بات ماننے کی تو ہامی بھرلی لیکن فطری تجسس کے باعث سوال کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

”یہ بات میں تمہیں اندر چل کر بتاؤں گی۔“ کشور نے گزرتے وقت کا احساس کرتے ہوئے اس سے کہا اور پھر اس کی انگلی تھام کر واپسی کے راستے پر چل پڑی۔

”ہم یہاں سے اندر جائیں گے؟“ وہ واپس بچوں کے کمرے کی کھلی سلائڈنگ ونڈو کے پاس آکر ٹھہری تو منور نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، یہاں سے اندر جانے میں بہت مزہ آئے گا۔“ کشور نے اسے جواب دیا اور پہلے اسے سہارا دے کر کھڑکی پر چڑھنے میں مدد دی، اس کے بعد خود بھی کھلی کھڑکی سے گزر کر اندر پہنچ گئی۔

”کیوں آیا نا مزہ؟“ اندر پہنچ کر اس نے منور سے پوچھا۔

”بہت مزہ آیا۔“ وہ بچہ تھا اور اسے زندگی میں ہونے والا ہر نیا تجربہ انوکھا اور خوش کن ہی لگ سکتا تھا۔ چنانچہ اس وقت یوں کھڑکی پھلانگ کر اندر پہنچنے پر ہی خوش ہو گیا۔

”بس اسی لیے میں یہاں سے چھلانگ لگا کر باغ میں گھومنے کے لیے گئی تھی۔ مجھے بھی ایسے کھڑکی سے آنے جانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔“ وہ منور کا ذہن اپنی اور آفتاب کی ملاقات کی طرف سے صاف کرنے کے لیے اقدامات کر رہی تھی۔

”اور ماسٹر صاحب کس لیے باغ میں گئے تھے؟“ خالہ کی طرف سے کچھ مطمئن ہونے پر اس نے اپنے استاد کے بارے میں سوال کیا۔

”ان کا امرود کھانے کا دل چاہ رہا تھا اس لیے وہ وہاں گئے تھے۔“ کشور نے اسے بہلایا۔

”تو وہ مجھ سے کہہ دیتے۔ میں مالی سے بہت سارے امرود تڑوا کر انہیں دے دیتا۔“

”لیکن ان کا تو خود سے امرود توڑ کر کھانے کا دل چاہ رہا تھا۔ جیسے کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں آنے جانے میں

www.pkdigest.com

بہت مزہ آتا ہے۔ ایسے ہی خود اپنے ہاتھ سے امرود توڑ کر کھانے میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔'' کشور نے اسے سمجھایا۔

''اچھا تو یہ بات تھی... ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔'' منور شاہ یوں سر کو ہلا کر بولا جیسے کوئی بہت بڑی گتھی سلجھ گئی ہو۔

''اب آپ کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہیں کرنا ورنہ پاپا ماسٹر صاحب سے ناراض ہو جائیں گے اور ان کا یہاں آنا بند کروا دیں گے۔ ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے تو آپ کو پڑھائے گا کون؟'' وہ واقف تھی کہ منور، آفتاب کو اچھا خاصا پسند کرتا ہے اس لیے اس کی کمزوری کو پکڑتے ہوئے اسے زبان بندی کے لیے پابند رکھنے کی کوشش کی۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب آپ جلدی سے میرا ہوم ورک کروا دیں۔ ورنہ تائی جان آپ کو واپس بڑی حویلی لے جائیں گی۔'' منور نے اسے یقین دہانی کروائی اور اپنے مسئلے کی طرف متوجہ کروایا۔

''ٹھیک ہے۔ جاؤ، آپ اپنا بیگ لے کر آؤ۔ میں آپ کا ہوم ورک کروا دیتی ہوں۔'' کشور نے اس کی معصومانہ ادا پر اس کا رخسار چومتے ہوئے اس سے کہا تو وہ دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ کشور اس کے باہر نکلتے ہی بے دم سی ہو کر ایک فلور کشن پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ایک ننھے سے بچے کی مداخلت کی وجہ سے صورتِ حال کافی گمبھیر ہو گئی تھی۔ اپنے طور پر تو اس نے پکا انتظام کر دیا تھا کہ منور شاہ کسی کے سامنے زبان نہ کھولے لیکن ایک معصوم بچے پر کتنا بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اپنی معصومیت میں وہ غیر ارادتاً ہی کسی کے سامنے یہ سارا واقعہ دہرا دیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔

☆☆☆

ناشتا کرتے ہوئے ماہ بانو کا ذہن رات عمران سے ہونے والی گفتگو میں الجھا ہوا تھا۔ عمران کی داستانِ حیات واقعی بڑی پُردرد تھی۔ ایک امیرزادے کی ہوس نے ہنستے بستے گھر کو اجاڑ ڈالا تھا۔ وہ گھر جو عمران کی ماں نے اپنی شبانہ روز محنت سے تنکا تنکا جمع کر کے بنایا تھا، صرف اس لیے بکھر گیا تھا کہ عمران کی نادان بہن اس امیرزادے کی محبت کے جال میں پھنس گئی تھی۔ امیرزادے نے جال میں پھنسی اس چڑیا کی بے بسی سے خوب لطف اٹھایا اور اس بات کی پروا نہ کی کہ اس کی یہ حرکت ایک عزت دار سفید پوش گھرانے کے لیے کیسی مصیبت لے آئے گی۔ ماہ بانو کو اپنی اور عمران کی زندگی میں کافی مماثلت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بھی ہوس پرست و دولت کے پجاری چودھری افتخار عالم شاہ کی وجہ سے دربدر تھی۔ چودھری نے اس کی وجہ سے اس کے پورے خاندان کو برباد کر دیا تھا۔ نہ تو فیصل آباد میں موجود اس کا وہ چھوٹا سا گھر باقی رہا تھا جہاں وہ بے بے اور ابا کی محبت کی چھاؤں میں رہا کرتی تھی اور نہ ہی پیر آباد کا وہ کچا مکان جہاں اس کے سگے ماں باپ، بھائی بہن رہتے تھے۔ وہ بھی کبھی چھٹیوں میں گاؤں جاتی تھی تو اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ کچھ وقت گزار آتی تھی۔ اماں ابا سے بے شک اسے یہ شکوہ تھا کہ انہوں نے اسے بیٹی ہونے کی وجہ سے بوجھ جان کر پیدا ہوتے ہی دوسروں کو تھما دیا تھا لیکن بہرحال وہ اپنے دل سے ان کی فطری محبت نہیں نکال سکی تھی۔ چنانچہ جہاں اسے اپنی پرورش کرنے والے بے بے اور ابا کی ناگہانی موت رلاتی تھی، وہیں اپنا پیر آباد والا گھر اجڑ جانے کا غم بھی بے چین رکھتا تھا۔

وہ بالکل عمران کی طرح ہی خانماں برباد تھی۔ ان دونوں میں فرق تھا تو اتنا کہ ایک تو وہ عمران کی بہن فری کی طرح کسی کی ہوس کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی تھی، دوسرے وہ عمران کی طرح انتقام کی راہ پر نہیں چلی تھی۔ عمران نے اپنا گھر اجاڑنے والے سے اس کی زندگی چھین لی تھی جبکہ وہ ابھی تک اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ اس جدوجہد کے دوران اسے کبھی انتقام کا خیال آیا ہی نہیں تھا۔ وہ بس بھاگتی پھر رہی تھی کہ کسی طرح وہ گوشۂ عافیت میسر آجائے جہاں وہ چودھری کی دسترس سے محفوظ رہ سکے۔ اس خواہش نے اسے اس برف زار میں لا پھینکا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایک گرداب سے نکلے بغیر ہی دوسرے گرداب میں پھنس گئی ہے... جس سے باہر نکلنے کا اسے کل تک کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا لیکن گزشتہ رات عمران نے اسے آس دلائی تھی کہ وہ اسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ اس آس نے اس کے مایوسی میں گھر جانے والے دل میں ایک بار پھر امید کی شمع روشن کر دی تھی۔ وہ جو دکھ اور مایوسی کے باعث کھانا پینا تک ترک کر چکی تھی، ایک بار پھر جی اٹھی تھی اور اس وقت اپنے سامنے رکھا ناشتا کافی رغبت سے کر رہی تھی۔

پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود اسے اتنا اندازہ بہرحال تھا کہ یہاں سے فرار کا سفر بہت دشوار ثابت ہوگا اور اس دشواری کا مقابلہ کرنے کے لیے جسم میں توانائی کا ہونا ضروری تھا۔ اس توانائی کے حصول کی خاطر ہی اس نے پیٹ بھر کر ناشتا کیا۔ ناشتے کے بعد اس کا وقت حسبِ معمول تنہائی کے اذیت ناک لمحے شمار کرتے ہوئے گزرنے لگا... لیکن آج آزادی کی امید نے اس اذیت کو کافی کم کر دیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ قید جو نہ ختم ہوتی ہوئی نظر آتی تھی، اب اس سے نجات ملنے والی ہے۔ اس امید کے ساتھ ہی وقت

دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا اور صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی۔ شام کے سائے جب گہرے ہو کر رات کی تاریکی میں ڈھلنے لگے تو اسے تشویش محسوس ہونے لگی۔ پورے دن میں عمران نے اس سے ایک بار بھی رابطے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ماحول میں کوئی ایسی تبدیلی نظر آئی تھی جس سے یہ احساس ہو پاتا کہ وہاں کوئی غیر معمولی صورتِ حال ہے۔ اسی فکر میں مبتلا وہ اپنے مخصوص انداز میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس آہٹ کو سن کر بھی اس کے اندر کوئی تحریک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رات کے کھانے کا وقت ہے اور کوئی نہ کوئی اس کے لیے کھانا لے کر آیا ہوگا۔

''ماہ بانو!'' آنے والے نے جب اسے اپنی طرف متوجہ نہ ہوتے دیکھا تو کھانے کے برتن اس کے قریب رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ آواز شناخت کر کے فوراً ہی متوجہ ہوئی۔ وہ عمران ہی تھا جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

''اچھی طرح پیٹ بھر کر کھانا کھالو اور کچھ دیر آرام کر لو۔ چند گھنٹے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔'' سرگوشی کے انداز میں اسے یہ نوید سنا کر وہ ایک پل بھی مزید ٹھہرے بغیر تیزی سے واپس پلٹ گیا لیکن تشویش کا شکار ماہ بانو کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ اس اطلاع نے کہ چند گھنٹوں بعد وہ اس قید خانے سے نکل سکے گی، اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ ملنے والی آزادی کی امید نے اسے اتنا پُرجوش کر دیا کہ اس نے اس قید خانے میں پہلی بار بے حد رغبت سے کھانا کھایا۔ آج کھانا تھا بھی کافی پُرتکلف۔ مرغی کے شوربے والے سالن کے ساتھ ساتھ ٹونا فش کے تلے ہوئے قتلے بھی کھانے میں شامل کیے گئے تھے۔ ایک پیالے میں بھاپ اڑاتا کارن سوپ بھی تھا... یعنی پورا دعوت کا اہتمام تھا۔ اس نے جی بھر کر یہ غذائیت بخش کھانا کھایا اور حسبِ معمول اس مختصر سی جگہ میں ٹہلنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے کھانا ہضم ہونا مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے قید کے دنوں میں یہ معمول بنا لیا تھا کہ کھانا کھا کر تھوڑی دیر چہل قدمی ضرور کرتی تھی۔ حالانکہ ٹہلنے کے لیے وہ جگہ بے حد محدود تھی۔ آج بھی اس نے دس منٹ تک چہل قدمی کی اور پھر عمران کی حسبِ ہدایت آرام کی غرض سے لیٹ گئی۔ بہت دنوں بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور ذہن بھی کافی پُرسکون تھا، چنانچہ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

اسے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کتنی دیر سوئی ہے لیکن ماحول میں کوئی غیر معمولی تبدیلی آئی تھی جس نے اسے نیند سے جگا

کون کہتا ہے کہ؟
اولاد نہیں ہو سکتی
آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاء اللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہو سکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔
المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0547-521787
فون اوقات
صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک
آپ ہمیں صرف فون کریں
دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

www.pkdigest.com

دیا۔ وہ لمحہ بھر تو خالی الذہنی کی کیفیت میں اچانک اپنی آنکھ کھلنے کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس کی قوتِ سماعت نے احساس دلایا کہ وہ ماحول میں پیدا ہونے والے غیر معمولی شور کی وجہ سے جاگی ہے۔ اس جگہ جہاں کوئی مشکل سے ہی بولتا تھا اور وہ انسانی آواز سننے کے لیے ترس جاتی تھی، یہ شور بڑا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے کان لگا کر آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سماعت پر ذرا سا زور دینے پر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ لوگ اپنی بھونڈی آوازوں میں گانے کے ساتھ ساتھ بلند و بالا قہقہے لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہاں کوئی جشن منایا جا رہا ہو۔ اس کے اندر جشن کی نوعیت جاننے کے لیے تجسس جاگ اٹھا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دبے قدموں سے باہر کی طرف بڑھی۔ اسے کھانا پہنچانے چونکہ عمران خود آیا تھا، اس لیے قید خانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ وہ بے حد احتیاط سے چلتی آوازوں کی جانب بڑھتی چلی گئی۔ حسبِ معمول غار کے کشادہ حصے میں وہ سب جمع تھے اور محفل سجی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ان بے ہنگم حلیوں والے لوگوں میں سے بیشتر دیواروں کے ساتھ ٹیک لگا کر کچھ اس طرح بیٹھے ہوئے تھے کہ دائرہ سا بن گیا تھا اور اس دائرے میں پانچ چھ افراد رقص کے انداز میں جھوم رہے تھے۔ ناچنے والوں میں اور بیٹھے ہوئے دونوں افراد میں یہ قدرِ مشترک تھی کہ وہ بلند آواز سے گانے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں جام بھی تھامے ہوئے تھے۔ جام پر جام لنڈھاتے وہ جس مستی کی کیفیت میں تھے، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس محفل میں ام الخبائث گردش میں ہے جس کے زیرِ اثر وہ وحشی مرد جھوم رہے ہیں۔

ماہ بانو کے دیکھتے ہی دیکھتے رقص کرنے والوں میں سے ایک نے ایک جانب بیٹھے عمران کو ہاتھ تھام کر کھڑا کیا اور پھر اپنے کاندھوں پر بٹھا کر ناچنے لگا۔ اس کی اس حرکت سے محفل میں مزید گرمی آگئی اور بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے بھی مزید کچھ افراد کھڑے ہو کر ناچنے والوں میں شامل ہو گئے۔ عمران کو کاندھے پر بٹھانے والا درمیان میں رقص کر رہا تھا جبکہ باقی سب اس کے اردگرد ناچتے ہوئے بار بار عمران کے جسم کو تھپکی دیتے تھے۔ ان سب کے رویوں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے عمران کوئی دولہا ہو جس کی برات روانہ ہونے کو ہو... اور بے تکلف دوست اپنے یار کی شادی کا جشن منا رہے ہوں۔ کافی دیر تک یہ ہڑاہڑی جاری رہی پھر یک دم ان میں سے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ کے اشارے سے ناچنے گانے والوں کو خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ ''دوستو! تھوڑا صبر کرو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ بھائی صاحب آپ لوگوں سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔'' اس شخص کے یہ اعلان کرتے ہی وہاں ایسی خاموشی چھا گئی جیسے وہاں کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اس خاموشی کے چھا جانے کے بعد ایک دراز قد شخص اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ماہ بانو نے اس شخص کو پہچان لیا۔

بھائی صاحب کہلانے والے اس آدمی کو اس سے قبل وہ اس وقت بھی دیکھ چکی تھی جب پروجیکٹر پر عمران کی بہن کی عزت برباد کرنے والے جوان کے ذبح کیے جانے کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ بھائی صاحب کہہ کر پکارا جانے والا وہ آدمی جو وہاں ان لوگوں کا کمانڈر تھا، کھڑے ہونے کے بعد اپنا گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

''ساتھیو... میرے بہادر مجاہدو! آپ سب جانتے ہیں کہ ہم ایک بڑے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے اپنی جانیں تک قربان کرنے کا عہد کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جس نیک مقصد کے لیے ہم جدوجہد کر رہے ہیں، اس کے لیے اگر ہماری جان بھی چلی جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس قربانی کے بدلے میں پروردگار ہمیں اپنی جنتوں میں ہمیشہ کی زندگی بخشے گا۔ میری دعا ہے کہ پروردگار ہم میں سے ہر ایک کو یہ اعزاز نصیب کرے۔ فی الحال میں یہ بتاتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے درمیان سب سے کم وقت گزارنے والے اور ہم میں سے سب سے کم عمر عمران کے نصیب میں یہ خوش قسمتی لکھی گئی ہے کہ وہ ہم سب سے پہلے شہادت کی راہ پر چلنے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ آج کا جشن ہم عمران کے اعزاز میں ہی منا رہے ہیں۔ شہید کبھی مرتے نہیں بلکہ اسے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ اس لیے راہِ شہادت پر جانے والے کے لیے رونے اور اداس ہونے کے بجائے اسے بہت خوش دلی سے رخصت کرنا چاہیے۔ آپ سب آج رات دل کھول کر کھائیں پئیں، ناچیں گائیں۔ آج آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' کمانڈر کے اس اعلان نے وہاں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ ان میں سے کسی نے بھی یہ سوچے بغیر کہ ایک جیتے جاگتے، ہنستے کھیلتے جوان کو حرام موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے، تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔ تالیوں کی گونج تھمی تو کمانڈر نے عمران کو اپنے قریب بلایا اور اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''کیوں عمران! ڈر تو نہیں لگ رہا؟''

''نہیں بھائی صاحب! ڈرنے کا کیا سوال۔ میں تو آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کام کے لیے چُنا۔'' عمران نے مسکراتے ہوئے کمانڈر کی بات کا جواب دیا۔

''شاباش میرے شیر! مجھے تم سے اسی بہادرانہ جواب کی امید تھی۔'' کمانڈر نے اس کے جواب پر خوش ہو کر ایک بار پھر اس کی پیٹھ پر زوردار تھپکی دی اور بلند آواز میں بولا۔ ''میری طرف سے ایک جام عمران کی اس بہادری کے نام۔'' فوراً ہی کمانڈر کے اعزاز میں سکوت اختیار کرنے والے حرکت میں آگئے اور محفل میں ایک بار پھر جام گردش کرنے لگے۔

ماہ بانو پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا تماشا دیکھتی رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کے مجاہد ہیں جو شراب کے رسیا ہیں اور گانے بجانے سے دل بہلاتے ہیں۔ اپنی اس کیفیت میں اسے احساس بھی نہیں ہو سکا کہ وہ پوری طرح سے اوٹ میں نہیں رہی ہے اور اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس پر نظر پڑی بھی تو عمران کی ہی۔ اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اشارہ کیا کہ واپس پلٹ جاؤ۔ وہ خود بھی اسی کی طرف متوجہ تھی چنانچہ اس خفیف اشارے کو دیکھ لیا اور جس خاموشی سے وہاں تک آئی تھی، اسی خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر اس کے پاس انتظار کرنے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں تھا اور اب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت طویل لگ رہی تھیں۔ دل کے اندر یہی خواہش اٹھ رہی تھی کہ کسی طرح جلد از جلد یہاں سے نکلا جائے لیکن ادھر سے سنائی دیتے شور کو سن کر یوں لگ رہا تھا کہ رات بھر یہ محفل سجی رہے گی۔ آخر اللہ اللہ کر کے انتظار کی یہ گھڑیاں گزریں۔ پہلے آہستہ آہستہ باہر سے سنائی دیتی گانے بجانے کی آوازیں معدوم ہونا شروع ہوئیں اور پھر یوں لگا جیسے سارے ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا ہو۔ اس سکوت میں وہ قدموں کی تیز آہٹ سن کر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ حسبِ توقع اس طرف آنے والا عمران ہی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ سامان اٹھایا ہوا تھا۔

''جلدی سے یہ لباس اور جوتے موزے وغیرہ پہن لو۔ پانچ منٹ میں ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' وہ اپنے ہاتھ میں موجود سامان اسے تھما کر خود جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ ماہ بانو نے اس کی ہدایت کے مطابق وہ چیزیں پہننی شروع کر دیں۔ جو لباس اس نے اس وقت پہن رکھا تھا، وہ بھی خاصا گرم تھا جس پر اس نے عمران کا دیا ہوا موٹا اونی لبادہ بھی پہن لیا۔ اسے یہاں لاتے وقت بھی اسی قسم کا لباس پہنایا گیا تھا اور وہ اس کی وجہ سمجھ سکتی تھی۔ اس برف زار میں باہر کا موسم غار کے مقابلے میں بہت شدید تھا۔ غار کے اندر کی سردی باہر کے مقابلے میں کچھ نہیں تھی کیونکہ یہاں ان قاتل ہواؤں کا گزر نہیں تھا جو انسان کے جسم سے ٹکرائی تھیں تو اسے لگتا تھا کہ ایک برچھی سی جسم میں اتر گئی ہو۔ لباس پہننے کے بعد اس نے پیروں میں موٹے اونی جراب پہن کر جوگرز چڑھائے۔ جوگرز اس کے پیروں میں قدرے ڈھیلے تھے اور چلتے وقت دشواری کا باعث بن سکتے تھے۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ کچھ پریشان سی ہوئی پھر یک دم ہی اس کی نظر جرابوں کی دوسری جوڑی پر پڑی۔ اس نے جوگرز اتار کر وہ دوسری جوڑی بھی پہلے والے جرابوں پر چڑھا لی۔ اب اس نے دوبارہ سے جوگرز پہنے تو وہ پہلے کے مقابلے میں اس کے پیروں میں کافی بہتر تھے۔ عمران کے لائے ہوئے سامان میں سے پہننے کے لیے اب دو چیزیں رہ گئی تھیں۔ ایک اونی ٹوپی اور دوسرے مٹاف (پہاڑوں پر پہنے جانے والے خصوصی دستانے)۔ اس نے پہلے بالوں کو سمیٹ کر اونی ٹوپی اپنے سر پر جمائی اور پھر ہاتھوں پر مٹاف بھی چڑھا لیے۔ اب وہ پوری طرح تیار تھی۔

''تم تیار ہو گئیں... وری گڈ۔ چلو اب یہاں سے نکل چلتے ہیں۔'' اسی وقت عمران وہاں چلا آیا اور اسے تیار دیکھ کر بولا۔ اس وقت وہ خود بھی اس سے ملتے جلتے حلیے میں تھا اور اسی کی طرح اس حلیے میں اپنے اصل جسم سے کئی گنا زیادہ نظر آ رہا تھا۔

''ٹوپی کا باقی حصہ اپنے چہرے پر بھی چڑھا لو ورنہ باہر کی ٹھنڈی ہوا تمہارے چہرے کی جلد ادھیڑ ڈالے گی۔'' اس کا کھلا منہ دیکھ کر اس نے ماہ بانو کو ہدایت کی اور پھر ایک ذرا مختلف ساخت کی عینک اس کی طرف بڑھا دی۔ وہ خود بھی اپنی آنکھوں پر ایسی ہی عینک پہنا ہوا تھا۔ ماہ بانو نے خاموشی سے عینک تھام کر اپنی آنکھوں پر لگا لی۔ عینک لگانے کے بعد اسے لگا کہ وہ نیم تاریک ماحول پہلے کے مقابلے میں واضح ہو گیا ہو۔ یہ ان نائٹ گاگلز کا کمال تھا جو عمران کے کہنے پر اس نے ابھی ابھی پہنی تھیں۔

''آ جاؤ لیکن بہت احتیاط سے۔ سب لوگ نشے کی حالت میں دھت پڑے ہوئے ہیں... پھر بھی اگر آوازوں سے کسی کی آنکھ کھل گئی تو ہمارے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی ہے۔'' سرگوشی میں اسے یہ ہدایت کر کے وہ وہاں سے آگے بڑھا۔ ماہ بانو اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ عمران کا بے حد محتاط رویہ اسے بھی احتیاط پر کاربند کیے ہوئے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی مدہوشی کے باوجود وہ اتنا محتاط اور چوکنا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ریوالور بالکل تیار رکھا ہوا تھا۔ اگر وہاں کوئی اسے روکنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ اس کے سینے میں

www.pkdigest.com

اس ریوالور کی گولی بلاتکلف اتار دیتا۔ ریوالور کے علاوہ اس نے اپنے شانے سے ایک دور مار رائفل بھی لٹکائی ہوئی تھی۔ شاید لباس کے اندر بھی کچھ اسلحہ چھپایا تھا جس کو ماہ بانو دیکھ نہیں سکتی تھی، صرف اس کے بارے میں قیاس ہی کر سکتی تھی۔ مخصوص راستے پر سے گزرتے ہوئے وہ دونوں غار کے کشادہ ہال نما حصے میں پہنچے۔ وہاں مرغی کی چچوڑی ہوئی ہڈیاں، شراب کے خالی پیمانے اور انسانی جسم ایک جیسی بے ترتیب حالت میں ادھر اُدھر لڑھکے ہوئے تھے۔ وہ دونوں اس احتیاط کے ساتھ کہ ان کا پیر کسی کے جسم سے نہ ٹکرا جائے، وہاں سے گزر کر غار کے دہانے کی طرف بڑھے۔

"کون ہے؟" ابھی وہ دہانے تک پہنچے ہی تھے کہ کسی کی مدہوش سی آواز ابھری اور مُردوں کی طرح بے جان پڑے انسانی جسموں میں سے ایک نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ ماہ بانو کا دل اس صورتِ حال پر اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یوں قفس کے دروازے پر دھر لیے جانے کا سوچ کر ہی اس کا جسم پھڑپھڑانے لگا۔

"میں ہوں بھائی عمران۔ ذرا پیشاب کے لیے جا رہا ہوں۔" ماہ بانو کے برعکس عمران نے پُرسکون رہتے ہوئے متوازن آواز میں سوال کرنے والے کو جواب دیا جسے سن کر اس نے مطمئن ہو کر دوبارہ اپنی گردن فرش پر ڈال دی اور پہلے ہی کی طرح خراٹے لینے لگا۔ عمران نے ماہ بانو کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنے سینے میں اٹک جانے والا سانس آہستہ سے خارج کرتے ہوئے قدم بڑھا دیے۔ غار کے دہانے سے باہر قدم رکھتے ہی سرد نکیلی ہواؤں نے ان کا استقبال کیا اور باوجود پوری تیاری کے، ماہ بانو کو اپنے جسم میں سردی کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کپکپاتی ہوئی عمران کے ساتھ آگے بڑھی۔

باہر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ صرف چاند کی مدھم روشنی تھی جو منظر کو پوری طرح واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔ اگر ان دونوں نے اپنی آنکھوں پر نائٹ گاگلز نہیں لگائے ہوئے ہوتے تو بہت دشواری پیش آتی مگر گاگلز کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہو گئی تھی۔ ماہ بانو دیکھ سکتی تھی کہ وہاں وہی قوی ہیکل جانور کھڑا ہے جس پر لاد کر اسے یہاں لایا گیا تھا۔ رات کی تاریکی میں وہ اپنے بھاری جثے کے ساتھ اور بھی دہشت ناک لگ رہا تھا۔ ماہ بانو کو حیرت تھی کہ ان لوگوں نے کیونکر اس جانور کو سدھا کر اپنے استعمال کے لائق بنایا ہوگا۔ ایسے وحشی کو قابو کرنے کے لیے تو اس سے بڑھ کر وحشت کی ضرورت تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ لوگ کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، اس وقت تو ایک سیاہ پُرشکوہ یاک ان کی سواری کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اس پر سامان کا بڑا سا تھیلا بھی لدا ہوا تھا۔ یہ یقیناً زادِ راہ تھا جس کا عمران نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔

"ہمیں یہاں سے نکلنے کے لیے اس یاک کو استعمال کرنا ہوگا۔ اس برفانی علاقے میں یہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور پھر اس پر سواری کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ سدھائے ہوئے ہیں اور راستوں کو خوب پہچانتے ہیں۔ میں نے چونکہ خود بھی یہ جگہ اچھی طرح نہیں دیکھ رکھی اس لیے اندیشہ ہے کہ پیدل نکلنے کی صورت میں ہم راستہ بھٹک جائیں گے۔" یاک کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے عمران نے اسے بتایا اور پھر اس کے قریب پہنچ جانے پر ماہ بانو کو اس پر سوار ہونے میں مدد دینے لگا۔

"اپنی جگہ پر رک جاؤ عمران! اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مارے جاؤ گے۔" ابھی ماہ بانو سوار نہیں ہو پائی تھی کہ وہ دونوں عقب سے سنائی دینے والی اس آواز پر بری طرح چونک کر پلٹے۔ وہ نائب کمانڈر تھا جو ہاتھ میں گن لیے ان دونوں کو خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گن کا رخ تو ظاہر ہے سو فیصدی ان دونوں ہی کی طرف تھا۔

"مجھے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ تم کوئی گڑبڑ کرنے والے ہو اس لیے میں تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن بھائی صاحب اور میر ادونوں کا یہ خیال تھا کہ تم جو بھی گڑبڑ کرو گے، وہ شہر پہنچ کر کرو گے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم یہاں ہمارے اس ٹھکانے پر ایسی کوئی جرأت کر سکتے ہو۔ وہ تو آج کی محفل میں، میں نے اتفاق سے اوروں کے مقابلے میں کم شراب پی تھی اس لیے میری اس وقت آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھ لیا کہ تم اس لڑکی کو لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔ اب ایسا کرو کہ فرار کا خیال دل سے نکال کر اچھے بچوں کی طرح واپس اندر چلو۔ تمہارا فیصلہ صبح ہونے پر بھائی صاحب خود کریں گے۔" نائب کمانڈر نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں حکم صادر کرتے ہوئے کہا لیکن عمران اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور وہیں کھڑا اسے گھورتا رہا۔

"ہری اپ مین! ٹائم ویسٹ مت کرو۔ تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہاں کتنی سردی ہے اور میں نے تمہاری طرح سردی سے بچاؤ کا انتظام بھی نہیں کر رکھا۔" عمران کو اپنی جگہ سے ہلتے نہ دیکھ کر نائب نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کو خوب

انجوائے کر رہا ہے۔ عمران کو یوں عین موقع پر دھر لیے جانے کے کارنامے پر یقیناً وہ بہت خوش تھا اور اس سے یہ خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

"اور ہاں، دیکھو... آگے بڑھنے سے پہلے اپنے پاس موجود اسلحہ ضرور نیچے ڈال دو۔ یہ کافی خطرناک چیز ہے اس لیے تم جیسے بچے کے پاس اس کا رہنا مناسب نہیں۔" نائب نے ایک بار پھر عمران کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے حکم دیا۔ اس کا یہ حکم سن کر عمران نے ہاتھ میں موجود ریوالور نیچے ڈال دیا اور پھر شانے سے لٹکی رائفل اتارنے لگا۔ رائفل اتارتے اتارتے اچانک ہی اس نے بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پینترا بدلا اور بجائے رائفل نیچے پھینکنے کے سیدھی کر کے نائب کی طرف ایک فائر داغ دیا۔ رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر نائب کے بائیں شانے سے ذرا نیچے سوراخ بنا گئی۔ گولی کھا کر نائب کو زوردار جھٹکا لگا اور وہ پیچھے گر گیا۔ معلوم نہیں گولی نے اس کے دل کو متاثر کیا تھا یا نہیں... لیکن زخم بہرحال کاری تھا اور نائب زمین پر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ نہیں سکا تھا۔

"ہری اپ ماہ بانو! ہمیں بہت تیزی سے یہاں سے نکلنا ہوگا۔ گولی چلنے کی آواز سن کر اندر مدہوش پڑے ہوئے افراد میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگ گیا ہوگا۔ اگر زیادہ افراد اٹھ کر باہر نکل آئے تو میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔" اسے سوار کرواتے ہوئے وہ اس پر صورتِ حال واضح کرنے لگا اور پھر خود بھی اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ یاک پر سوار ہونے سے قبل وہ نیچے زمین پر گرا ہوا اپنا ریوالور اٹھانا ہرگز بھی نہیں بھولا تھا۔ سوار ہو کر اس نے جیسے ہی اشارہ کیا، یاک چل پڑا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی پھر بھی ان دونوں کو لگ رہا تھا کہ وہ بہت سست روی سے آگے بڑھ رہے ہوں۔ رگوں کو کاٹتی سردی کے ساتھ ہڈیوں کا گودا جما دینے والا خوف مل کر ان کے جسموں کو کپکپا رہا تھا اور دل میں خواہش ابھر رہی تھی کہ کاش کسی طرح اس یاک کو پر لگ جائیں اور وہ لمحوں میں اس جگہ سے بہت دور نکل جائیں۔ ایسے میں انہوں نے اپنے پیچھے کچھ آوازیں سنیں تو اور بھی زیادہ متوحش ہو گئے۔ دونوں نے بہ یک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ دو تین افراد تھے جو شاید گولی چلنے کی آواز سن کر جاگنے کے بعد غار سے باہر نکل آئے تھے اور اب نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے ابھی تک اس سمت نہیں دیکھا تھا جس طرف ماہ بانو اور عمران یاک پر سوار اڑے جا رہے تھے۔ ان کی یہ کوتاہی بے تحاشا شراب کے نشے کے سبب تھی ورنہ بھاری بھرکم یاک کے چلنے سے زمین میں جو دھمک پیدا ہوتی ہے اسے دور ہی سے محسوس کر لیا جاتا ہے۔

"یہاں اور بھی تو یاک ہیں۔ کہیں یہ لوگ ان پر سوار ہو کر ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہ کریں؟" ماہ بانو نے خوف زدہ سے لہجے میں عمران سے کہا۔

"فی الحال وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں نے یاکوں کو کافی مقدار میں شراب پلا دی تھی اس لیے اس وقت ہمارے اس یاک کے علاوہ کوئی دوسرا یاک سواری کے لائق نہیں ہوگا۔ اگر ان لوگوں نے زبردستی ایسی کوئی کوشش کی بھی تو بڑا نقصان اٹھائیں گے۔" عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنی توجہ پیچھے کی طرف ہی مرکوز رکھی تھی چنانچہ یہ نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکا کہ نائب کمانڈر کی لاش کے قریب کھڑے افراد ان کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ شور مچاتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے لیکن درحقیقت وہ دونوں ان کی رسائی سے بہت دور نکل چکے ہیں، اس بات کو محسوس کر کے ان میں سے ایک کو عقل سوجھی اور اس نے رک کر اپنی رائفل ان کی طرف تان لی۔

"نیچے جھک جاؤ۔" عمران نے اسے ہدایت کی اور خود بھی اپنا سر اور بالائی جسم جھکا لیا۔ اب وہ دونوں تیزی سے حرکت کرتے یاک کی پشت پر اس طرح محوِ سفر تھے کہ ان کے جسم اس کے سیاہ جثے سے لپٹے ہوئے تھے۔ پیچھے سے فائر داغا گیا جو کسی نشانے پر نہیں بیٹھ سکا، البتہ فائر کی آواز نے یاک کو بھڑکا کر اس کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

"خود کو مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جمائے رکھو۔ فائرنگ سے خوف زدہ مت ہونا۔ ہم بہت دور نکل آئے ہیں اور اتنے فاصلے سے ان لوگوں کے لیے ہمیں نشانہ بنانا ممکن نہیں۔" عمران نے یہ محسوس کر کے کہ کہیں وہ خوف کا شکار ہو کر یاک کی پشت سے گر نہ پڑے، اسے تسلی بھری ہدایت دی۔ اس نے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھتے ہوئے اس ہدایت پر عمل کیا پھر پے در پے ہونے والے اگلے مزید فائروں کی آواز نے عمران کی اس بات کی تصدیق بھی کر ڈالی کہ وہ فائرنگ رینج سے نکل چکے ہیں۔ پیچھے سے فائر کرنے والوں نے بھی اس بات کو سمجھ لیا اور فائرنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اب وہ جانے کون سا حربہ استعمال کر کے ان دونوں کو روکنے کی کوشش کرتے، فی الحال یہ واضح نہیں تھا۔ وہ دونوں یاک کی پشت سے چپکے تن بہ تقدیر انجانے راستوں پر.... تیزی سے گزرتے جا رہے تھے۔

☆☆☆

صبح پیش آنے والے واقعے نے مشاہرم خان کو بری

www.pkdigest.com

طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے نہایت چالاکی کے ساتھ بے وقوف بنایا گیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی نگرانی کر رہا تھا اور وہاں سے روانہ ہونے والی جیپوں پر نظر رکھے ہوئے تھا لیکن وہ ایک جیپ جس کی روانگی کا اسے انتظار تھا، نہایت صفائی سے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر روانہ کر دی گئی تھی۔ کسی نے عین موقع پر اسے اسپتال کے نمبر سے فون کر کے یہ اطلاع دی تھی کہ تمہاری ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر وہ نگرانی وغیرہ بھول گیا اور دیوانہ وار اسپتال کی طرف دوڑا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ماں کی طبیعت تو حسبِ معمول ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں آیا۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ یہ سارا ڈراما اسے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کے سامنے سے ہٹانے کے لیے رچایا گیا تھا۔

مخالف پارٹی کی اس چال نے جہاں اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کیا، وہیں اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ٹورسٹ کمپنی کا مالک اس کام میں ملوث ہے۔ چنانچہ اب وہ کمپنی کے مالک کے خلاف ڈائریکٹ ایکشن لینے کے بارے میں ہی غور کر رہا تھا۔ کافی غور کرنے کے بعد اس کے ذہن میں جو منصوبہ آیا اس کے مطابق اس نے ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی معمول کی نگرانی ترک کر دی اور چائے کے ہوٹل پر جا کر بیٹھنے کے بجائے سارا دن اپنی ماں کے ساتھ اسپتال میں گزارا۔ شام کے وقت جب اس کی معلومات کے مطابق دفتر بند ہونے کا وقت قریب آیا تو وہ اسپتال سے نکلا اور چپکے سے کمپنی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل وہ اپنے لیے کرائے کی ایک جیپ حاصل کرنا بالکل نہیں بھولا تھا۔ جیپ کے لیے اس نے دن میں ہی اسپتال سے فون کر کے بکنگ کروائی تھی لیکن احتیاطاً دن میں اپنے پاس جیپ رکھنے سے گریز کیا تھا کہ اگر کوئی اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہو تو جیپ کرائے پر لینے کی وجہ سے چونک نہ جائے۔

اسپتال سے روانہ ہوتے ہوئے بھی وہ اس طرف سے بہت محتاط رہا تھا لیکن اسے اپنے اردگرد کوئی ایسا مشکوک شخص نظر نہیں آیا جس کے بارے میں اسے یہ گمان ہوتا کہ وہ اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ شاید اپنا کام کر گزرنے کے بعد مخالفین نے اس کی نگرانی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ نگرانی کی طرف سے مطمئن ہو کر وہ جیپ میں اس راستے کی طرف روانہ ہوا جو ٹورسٹ کمپنی کے دفتر کی طرف جاتا تھا لیکن دفتر تک جانے کے بجائے راستے میں ہی ایک جگہ رک گیا۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے کمپنی کے مالک کو دفتر سے اپنے گھر جانے کے لیے لازماً گزرنا پڑتا۔ مشاہرم خان کو مالک کے گھر کا پتا معلوم تھا اور وہ چاہتا تو وہاں جا کر بھی اسے چھاپ سکتا تھا لیکن ڈرائیور نیاز علی کی ہلاکت کے بعد وہ اس معاملے میں محتاط ہو گیا تھا۔ نیاز علی کو وہ اس کے گھر سے ہی معلومات حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نیاز علی اپنی غلطی کے باعث کھائی میں گر کر ہلاک ہو گیا لیکن اس واقعے نے مشاہرم خان کی حیثیت مشکوک کر دی تھی۔ اسی وجہ سے ابھی تک اسے بلتستان چھوڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان حالات میں اگر ٹورسٹ کمپنی کے مالک کے ساتھ کچھ برا بھلا ہو جاتا اور اس کا نام سامنے آ جاتا تو اسے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جاتی، اسی لیے اس کی پوری کوشش تھی کہ خود کو پوشیدہ رکھے۔

کمپنی کے مالک کو راستے میں ہی روکنے کے لیے بھی اس نے ایسے مقام کا انتخاب کیا تھا جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس مقام پر اسے روکنے اور اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو جائے گا۔ اپنی جیپ اس نے سڑک سے اتار کر ایک طرف روک لی تھی اور راستے پر نظریں جما کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہاں رکنے کے بعد اسے زیادہ دیر انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ ٹورسٹ کمپنی کے مالک کی جیپ کو اس نے دور سے ہی شناخت کر لیا اس کی جیپ شناخت کرتے ہی وہ فوراً حرکت میں آیا اور اپنی جیپ اسٹارٹ کر کے عین سڑک کے درمیان میں لے گیا۔ سڑک پر سیدھے چلے آنے والے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اپنی جیپ کو ایمرجنسی بریکس لگانے پڑے۔

"کون پاگل کا بچہ ہے تو؟" جیپ رکتے ہی وہ غصے سے دہاڑتا ہوا باہر نکلا لیکن مشاہرم خان تو اپنی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود ہی نہیں تھا۔ جیپ عین سڑک پر روکنے کے بعد وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا اس سے کود کر نیچے سڑک پر رینگ گیا تھا۔ شام کے جھک آنے والے سایوں میں کمپنی کا مالک اس کی یہ نقل و حرکت نہیں دیکھ سکا، چنانچہ اب خالی ڈرائیونگ سیٹ دیکھ کر انگشت بدنداں تھا۔ اس کی اس حیرت میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب مشاہرم خان نے پیچھے سے آ کر اسے چھاپا۔ پھر کنپٹی پر لگنے والی مشاہرم خان کی نپی تلی ضرب نے اس کے حواس اس طرح غائب کیے کہ وہ حیرت سمیت کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہا اور لہراتا ہوا سڑک پر گرنے لگا لیکن مشاہرم خان نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا اور گھسیٹتا ہوا اپنی جیپ تک لے گیا۔ اسے جیپ کے پچھلے حصے میں ڈالنے کے بعد وہ خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور

سڑک پر ترچھی کھڑی جیپ کو ریورس کر کے اسے سیدھا کرتے ہوئے برق رفتاری سے دوڑا دیا۔ اتنی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے کے باعث جیپ کے پہیے بری طرح چرچرائے اور فضا میں چرچراہٹ دور تک پھیل گئی۔ اس دوران سڑک پر کوئی دوسری گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی اس لیے مشاہرم خان کو اطمینان تھا کہ اس سارے واقعے کا کسی کو علم نہیں ہو سکا۔ ویسے اس نے جس انداز میں اپنی جیپ ریورس کر کے اسے دوڑایا تھا، وہ انداز بہت رسکی تھا۔ ذرا سی غلطی جیپ کو غیر متوازن کر کے حادثے کا سبب بن سکتی تھی لیکن خیر گزری اور اس کی ڈرائیونگ میں مہارت نے کوئی حادثہ رونما نہیں ہونے دیا اور وہ اسی رفتار سے جیپ چلاتا ہوا اپنی طے شدہ منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

یہ ایک خوش کن اتفاق ہی تھا کہ ایک دن قبل ہی آذر نے اسے اپنے گھر پر رہائش اختیار کرنے کی پیشکش کی تھی۔ آذر مقامی ٹورسٹ گائڈ جو اکرم خان کے دوستوں میں سے تھا، بہت اچھا اور بااخلاق آدمی ثابت ہوا تھا۔ نیاز علی کی موت کے بعد ایک روز اتفاقاً اس کی مشاہرم خان سے چائے کے ہوٹل میں ملاقات ہو گئی تھی۔ اسے جب اس بات کا علم ہوا کہ مشاہرم خان کی ماں ہنوز اسپتال میں داخل ہے اور وہ ایک سرائے میں سکونت اختیار کیے ہوئے ہے تو اس نے بہت اصرار کر کے مشاہرم خان کو اپنے گھر پر ٹھہرنے کے لیے راضی کر لیا۔ آذر تنہا آدمی تھا جس کے ایک کمرے کے گھر میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا اور وہ خود بھی کم ہی اپنے گھر میں ٹک پاتا تھا۔ آئے دن اسے کسی نہ کسی ٹیم کے ساتھ پہاڑوں کے سفر پر جانا ہوتا تھا۔ مشاہرم خان نے اس کے خلوص سے ہار کر اس کی پیشکش قبول کر لی تھی اور اس کی گزشتہ رات آذر کے گھر پر ہی گزری تھی۔

آذر حسبِ معمول ایک نئے سفر پر روانہ ہو گیا تھا اور جاتے جاتے گھر کی چابیاں مشاہرم خان کو دے گیا تھا، چنانچہ مشاہرم خان کے لیے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اغوا کرنے کے بعد کسی ٹھکانے تک لے جانے کا کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ درحقیقت وہ یہ سارا منصوبہ بنا ہی اس لیے سکا تھا کہ اس کے پاس ایک مناسب ٹھکانا موجود تھا۔ دوسرے گھروں سے ہٹ کر بنا آذر کا چھوٹا سا گھر اس کے لیے موجودہ صورتِ حال میں بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے پہلے دروازے پر لگا تالا کھولا اور پھر جیپ کی پچھلی طرف پڑے ٹورسٹ کمپنی کے مالک کو اٹھا کر اندر لے گیا۔ اس نے عقل مندی کی تھی کہ اسے جیپ میں ڈالنے کے بعد ایک بڑے ترپال سے ڈھانپ دیا تھا اور اب اسی ترپال میں لپیٹے ہوئے ہی اندر لے گیا تھا۔ اگر کسی شخص نے اس کی نقل و حرکت دیکھ بھی لی ہوگی تو یہی گمان کیا ہوگا کہ وہ کوئی سامان مکان کے اندر لے جا رہا ہے۔

مکان کے اندر پہنچنے کے بعد اس نے ٹورسٹ کمپنی کے مالک صغیر بیگ کے ہاتھ پیروں کو رسی کی مدد سے باندھا اور ساتھ ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ سب اس نے احتیاطی تدبیر کے طور پر کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغیر بیگ آذر کے گھر کو شناخت کر سکے یا ہوش میں آنے کے بعد شور مچا کر کسی راہ چلتے شخص کو متوجہ کر سکے۔ آذر کا گھر دوسرے مکانات سے الگ تھلگ ہونے کے باوجود وہ اپنے طور پر پوری احتیاط کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ان انتظامات کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد وہ باورچی خانے میں گیا اور وہاں سے گوشت کاٹنے کی تیز دھار والی چھری کے ساتھ پانی کا جگ بھی بھر کر لے آیا۔

پانی کا بھرا ہوا جگ اس نے صغیر بیگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ وہ چہرے پر ٹھنڈا پانی گرنے پر جھرجھری سی لے کر ہوش میں آیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی نشانی یہ تھی کہ اس نے پانی ڈالے جانے کے بعد بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ پیر بندھے ہونے کی وجہ سے اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے آواز نکالنا تو یوں بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس صورتِ حال پر وہ بے چین ہو کر بری طرح کسمسانے لگا۔

"میں تمہارے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے لیے تیار ہوں صغیر بیگ... لیکن اس سے پہلے تمہیں مجھے یہ یقین دلانا ہوگا کہ تم غیر ضروری آوازیں نہیں نکالو گے اور میں جو کچھ پوچھوں گا، اس کا صحیح جواب دو گے۔" اس کی بے چینی ملاحظہ کرتے ہوئے مشاہرم خان نے گمبھیر لہجے میں اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی شرائط پیش کیں۔ جواب میں وہ شدومد سے اثبات میں سر ہلانے لگا۔ مشاہرم خان نے آگے بڑھ کر اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا باہر کھینچ لیا۔ کپڑا نکلتے ہی وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

"پپ... پانی۔" کھانسی کے دوران ہی اس نے بمشکل یہ ایک لفظ ادا کیا۔ مشاہرم خان نے جگ میں بچ جانے والے پانی میں سے دو گھونٹ اس کے منہ میں ڈال دیے۔

"کون... کون ہو تم؟ مجھے اس طرح اغوا کیوں کیا ہے؟" پانی نے خشک حلق کو تر کیا تو اس نے پوچھا۔

"سوال تم نہیں میں کروں گا اور تمہیں میرے ہر سوال کے جواب میں سچ بولنا ہوگا، ورنہ اپنے انجام کے تم خود ذمے

www.pkdigest.com

وار ہو گے۔" مشابرم خان نے اپنی آواز میں سفاکی سموتے ہوئے اسے دھمکی دی اور ساتھ ہی چھری کی نوک اس کے رخسار میں اس حد تک چبھوئی کہ وہاں سے خون کا ایک قطرہ نکل آیا۔

"م... میں سب بتانے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں روپیا پیسا چاہیے تو وہ میں تمہیں دے دوں گا... بلکہ تم خود جا کر نکال لو۔ میرے دفتر میں لکڑی کی الماری کے پیچھے ایک سیف..." وہ چھری کی صرف نوک چبھونے پر ہی اتنا خوف زدہ ہو گیا تھا کہ مشابرم خان کو کوئی لٹیرا سمجھ کر از خود اسے اپنے دفتر میں موجود خفیہ سیف کے بارے میں بتانے لگا۔

"مجھے تمہارے روپے سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ تم خود سے بک بک کرنے کے بجائے ان باتوں کا جواب دو جو میں تم سے پوچھوں۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی مشابرم خان نے اسے ڈپٹ دیا تو وہ سہم کر خاموش ہو گیا۔

"تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟" مشابرم خان نے اپنی تفتیش کا آغاز کیا۔

"کسی کے لیے نہیں۔ میرا اپنا ذاتی بزنس ہے۔ اسکردو پہنچ کر اوپر پہاڑوں پر جانے والے میرے تھرو سواری، پورٹرز اور دوسری ضروری چیزوں کا انتظام کرتے ہیں۔" اس نے نہایت بھولپن سے جواب دیا۔

"میں اس بزنس کے بارے میں تمہیں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے اس کام کے بارے میں بتاؤ جس کے لیے تم نیاز علی کو استعمال کرتے تھے۔ اب کون نیاز علی کی جگہ یہ کام کر رہا ہے؟" اس نے چھری کی نوک پر کچھ اور دباؤ ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"نیاز علی جیپ ڈرائیور تھا۔ اس کا کام ٹورسٹس کو لے جانا اور واپس لانا تھا۔ ابھی سیزن زوروں پر نہیں ہے اس لیے میں نے ابھی تک نیاز علی کی جگہ دوسرا ڈرائیور نہیں رکھا ہے۔" صغیر بیگ نے کراہتے ہوئے اسی معصومیت سے جواب دیا جس کا وہ اب تک مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم سیدھے طریقے سے میرے سوالوں کا جواب نہیں دو گے؟" مشابرم خان کو اس کا جواب سن کر اتنا غصہ آیا کہ اس نے صغیر بیگ کے رخسار میں چبھی چھری کی نوک کو بے دردی سے حرکت دے ڈالی۔ چھری کی نوک نے صغیر بیگ کے رخسار پر ڈیڑھ انچ کے قریب گہری سرخ لکیر کھینچ دی۔ اس زخم کو کھا کر صغیر بیگ کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی جس کو مشابرم خان نے درمیان میں ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھونٹ ڈالا۔

"سچ سچ بتاؤ کہ نیاز علی جب کسی ٹیم کو واپس لینے کے لیے جاتا تھا تو اپنے ساتھ کے راشن پانی سپلائی کرنے کے لیے لے جاتا تھا؟ کون ہیں وہ لوگ جو پہاڑوں پر چھپے ہوئے ہیں اور جنہوں نے اکرم خان کو قتل کرنے کے علاوہ اس کی مہمان لڑکی کو اغوا بھی کیا ہے؟" مشابرم خان نے قہر آلود لہجے میں اس سے سوال کرتے ہوئے اس کے منہ پر رکھا ہاتھ ہٹا دیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" صغیر بیگ نے سسکی لیتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تم سے معلوم کر کے رہوں گا۔" مشابرم خان نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور پھر اس پر پل پڑا۔ وہ بے دریغ اس پر لاتیں اور گھونسے برساتا جا رہا تھا۔ صغیر بیگ کا بندھا ہوا جسم اس کی لگائی گئی ہر ضرب پر تڑپتا لیکن وہ بالکل بے بس تھا اور اس کے پاس مار کھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر کار وہ مار سہہ سہہ کر ادھ موا ہو گیا اور اس کا جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مشابرم خان نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ صغیر بیگ یقینی طور پر بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ پانی کا خالی ہو جانے والا جگ اٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا اور ایک بار پھر جگ بھر کر کمرے میں واپس آیا۔ اس بار اس نے جگ میں موجود تمام پانی ایک ساتھ صغیر بیگ کے اوپر انڈیل دیا۔ ٹھنڈا پانی اسے بے ہوشی کی دنیا سے واپس لے آیا۔

"بولو، اب بھی سچ بتاؤ گے یا میں تمہاری اور خاطر کروں؟" مشابرم خان نے اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا بے دردی سے کھینچ کر باہر نکالتے ہوئے سوال کیا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں معلوم۔" صغیر بیگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کی وجہ سے اس کے آنسو تو بے شک بہتے ہوئے نظر نہیں آ رہے تھے اور نہ ہی ان میں موجود تاثرات کو پڑھ کر سچ جھوٹ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے مشابرم خان کو سوچ میں ڈال دیا۔ اتنی مار کھانے کے بعد اس قدر استقامت سے جھوٹ پر ڈٹے رہنا بہت ہی ڈھیٹ اور پیشہ ور مجرموں کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے لیکن صغیر بیگ جس قدر ڈھال اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ مجرموں کی اس قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

"اگر تم نیاز علی کی حرکتوں سے واقف نہیں تھے تو یہ بتاؤ

کہ وہ تمہاری کمپنی کی جیپ میں تمہارے علم میں آئے بغیر سامان لوڈ کر کے کیسے لے جاتا تھا؟ کیا کبھی تم نے نوٹ نہیں کیا کہ جب وہ کسی ٹیم کو لینے جاتا ہے تو اس کی جیپ خالی نہیں ہوتی؟" اس بار اس نے اپنا لہجہ ذرا نرم کرتے ہوئے صغیر بیگ سے سوال کیا۔

"نیاز علی میرا بہت پرانا ڈرائیور تھا۔ میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اسے جب پہاڑوں سے اترنے والی کسی ٹیم کو واپس لینے جانا ہوتا تھا تو وہ رات میں ہی مجھ سے جیپ لے جاتا تھا اور صبح دفتر آنے کے بجائے اپنے گھر سے ہی روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کی کبھی کہیں سے شکایت نہیں ملی تھی اس لیے میں بھی اس معمول پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔" صغیر بیگ نے گویا کوئی عقدہ کھولا جس پر مشابرم خان سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے وہ سمجھ رہا تھا کہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے عین وقت پر صغیر بیگ کے دفتر کے سامنے سے اس لیے ہٹایا گیا تھا کہ اسے خاص جیپ کی روانگی کا علم نہیں ہو سکے... لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آئی تھی، اس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مشکوک جیپ تو صغیر بیگ کے دفتر سے روانہ ہی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی اس نے اتنے دن دفتر کی نگرانی کر کے اپنا وقت ضائع کیا تھا لیکن بہر حال یہ کوئی حتمی بات نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ صغیر بیگ جھوٹ بول رہا ہو۔ وہ اس کے نیاز علی کے بارے میں دیے گئے بیان کی تصدیق کیے بغیر اس پر مکمل بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر صغیر بیگ سچا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اصل مجرم اس پر مکمل نظر رکھے ہوئے ہیں اور انہوں نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے ایسی حرکت کی تھی جس کے باعث وہ صغیر بیگ کے پیچھے پڑ جائے۔

"کیا تم پولیس والے ہو؟" وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ صغیر بیگ کی آواز نے اسے چونکایا۔

"ہاں۔" اس نے اس کے خیال کی تصدیق کرنا ہی مناسب سمجھا اور پھر سرد لہجے میں بولا۔ "تم نے جو کچھ مجھے بتایا ہے، اس کے سچ جھوٹ ہونے کا پتا لگا لیا جائے گا۔ سچ کی صورت میں رہائی اور جھوٹ کی صورت میں قہر تمہارا نصیب ہو گا۔ تم اپنے انجام کے لیے یہاں رک کر انتظار کرو۔" وہ ایک بار پھر صغیر بیگ کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر آذر کے گھر سے روانہ ہو گیا۔ عارضی طور پر قوتِ حرکت و گویائی سے محروم کردہ صغیر بیگ کی طرف سے اسے بے فکری تھی کہ وہ یہاں سے کسی طور نہیں بھاگ سکے گا۔

☆☆☆

"یہ کافی پی لو۔ اسے پی کر تمہارے جسم میں گرمی آ جائے گی۔" عمران نے بھاپ اڑاتا ہوا کافی کا کپ ماہ بانو کی طرف بڑھایا۔ وہ دونوں پاک کی پشت پر اندھیرے میں کیے جانے والے تکلیف دہ اور خطرناک سفر کو سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے بعد کچھ دیر کے لیے ترک کر کے ایک پہاڑی چٹان کے سائے میں رکے تھے۔ اس موقع پر عمران نے اپنے ساتھ لائے ہوئے بڑے سے تھیلے کو کھول کر اس میں سے مٹی کے تیل سے جلنے والا اسٹوو نکالا اور پھرتی سے کافی تیار کر ڈالی۔ کافی کے ساتھ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے جو اس نے کھانے کے لیے ماہ بانو کو پیش کیے۔

"جلدی سے ناشتے سے فارغ ہو جاؤ تاکہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ وہ لوگ ہمارے فرار کے بارے میں جاننے کے بعد آرام سے نہیں بیٹھیں گے... اور ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ لوگ ہمارے مقابلے میں ان راستوں سے بہت اچھی طرح آشنا ہیں اس لیے وہ زیادہ تیزی سے فاصلہ طے کر سکتے ہیں۔" کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے عمران نے بے حد صاف گوئی سے ماہ بانو کو حقیقت سے آگاہ کیا۔

"تو پھر چلو، ابھی چلتے ہیں۔" اس نے فوراً ہی اپنے ہاتھ میں موجود کپ نیچے رکھ دیا اور سراسیمگی سے بولی۔

"پہلے ناشتا کر لو۔ اس علاقے میں سروائیو کرنے کے لیے جسم میں طاقت ہونا بہت ضروری ہے ورنہ دشمن سے پہلے موسم کی سختی ہمیں ہلاک کر ڈالے گی۔ خصوصاً تمہیں تو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم عورت ہونے کے ناتے ویسے ہی کمزور ہو، اوپر سے قید کے دنوں اور ڈپریشن نے تمہیں اور بھی کمزور کر دیا ہے۔" عمران نے بردباری سے اسے سمجھایا تو وہ فوراً ہی قائل ہو گئی اور عمران کی پیروی کرتے ہوئے خود بھی ڈبل روٹی کے ٹکڑے تیزی سے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کافی کے بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگی۔ پانچ منٹ بعد وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں عمران جو کہ پہلے ہی ناشتے کو نمٹا چکا تھا، ناشتے کی تیاری کے لیے نکالا جانے والا سامان واپس رکھ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر سفر کا آغاز کر دیا۔ ابھی وہ مشکل سے چند گز ہی آگے بڑھے تھے کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور اگلے ہی لمحے عمران کے منہ سے ایک درد بھری چیخ نکلی۔ اس چیخ کو سن کر ماہ بانو نے اس پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر خوف زدہ ہو گئی کہ عمران کے بائیں شانے سے خون نکل کر اس کے اونی لباس پر پھیلتا جا رہا ہے۔

"اپنا سر جھکا لو اور نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش

www.pkdigest.com

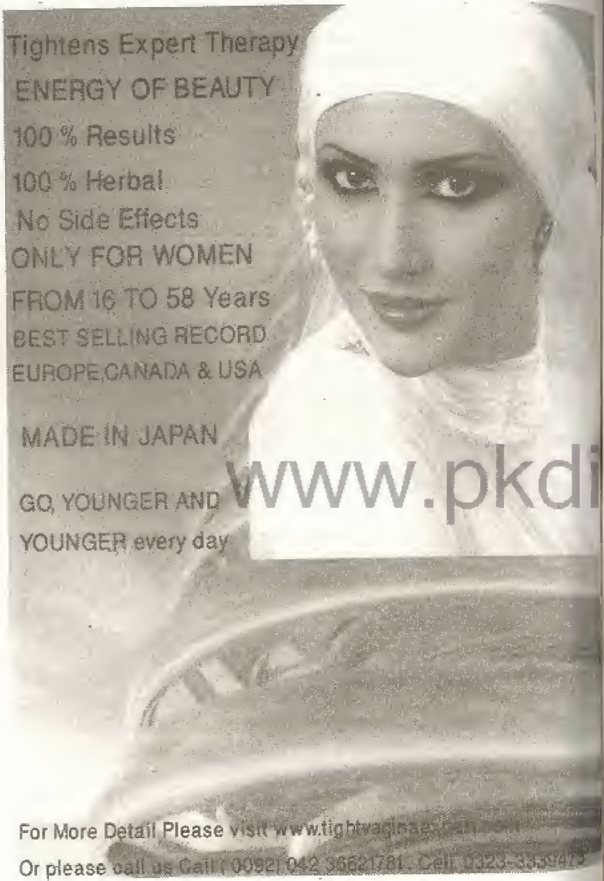

کرو۔'' پہلی بے ساختہ چیخ کے بعد خود پر قابو پاتے ہوئے اس نے بھنچی ہوئی آواز میں ماہ بانو کو ہدایات دیں۔ اتنی دیر میں کچھ اور گولیاں بھی سائیں سائیں کرتی ہوئی ان کے آس پاس سے گزر چکی تھیں۔ دشمن نے ان کی توقع سے بہت قبل انھیں آلیا تھا اور اب ان کی فرار کی راہ مسدود کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عمران جانتا تھا کہ بھاگنے کی کوشش کارگر ثابت نہیں ہوگی کیونکہ تعاقب میں آنے والے اس راستے پر سفر کرنے میں ان سے زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اب ان کے پاس یہی چارہ تھا کہ وہ رک کر اپنے پیچھے آنے والوں کا مقابلہ کریں اور ان سے جان چھڑانے کے بعد آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔

ماہ بانو نے بھی بڑے خودکار انداز میں یہ بات سمجھ لی تھی، چنانچہ نیچے چھلانگ لگانے سے قبل از خود ایک رائفل اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عمران یقیناً اس کی اس حرکت پر حیران ہوا ہوگا اور اس کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا ہوگا کہ یہ نازک اندام لڑکی بھلا رائفل کا کیا کرے گی؟ لیکن یہ موقع کسی قسم کے سوال جواب کا نہیں تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اسے ایک پہاڑی کی آڑ میں ہونے کا اشارہ کرتا ہوا خود بھی اس کی طرف دوڑ گیا۔ اس دوران میں ان پر مسلسل فائرنگ کی جاتی رہی تھی اور یہ محض خوش قسمتی تھی کہ وہ دونوں اب تک کسی گولی کی زد میں نہیں آئے تھے اور پہاڑی کی آڑ لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

آڑ میں پہنچنے کے بعد عمران نے رائفل سیدھی کر کے اس سمت فائرنگ کرنا شروع کر دی جس طرف ان کے تعاقب میں آنے والے موجود تھے۔ اس جوابی فائرنگ کا کوئی خاص نتیجہ اس لیے نہیں نکل سکا کہ آنے والے بھی اپنے تحفظ کا خیال رکھتے ہوئے آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ دو تین منٹ تک دونوں طرف سے فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ ماہ بانو نے اگرچہ عمران کے پاس موجود فاضل رائفل ہاتھ میں لے لی تھی لیکن ابھی تک اس نے کوئی فائر نہیں کیا تھا جبکہ دوسری طرف سے سنائی دینے والی فائرنگ کی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ تعداد میں کم از کم تین سے چار ہیں۔

''وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' یکا یک عمران کو احساس ہوا کہ فائرنگ پہلے کی طرح ایک سمت سے ہونے کے بجائے مختلف سمتوں سے ہو رہی ہے تو وہ سرسراتی ہوئی آواز میں ماہ بانو سے بولا۔ وہ جواب میں کچھ کہتی، اس سے قبل ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ ان کی سواری کا کام دینے والا یاک جو کہ اس سارے ہنگامے سے بُری طرح پریشان ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں اِدھر سے اُدھر بھاگا پھر رہا تھا، یک دم ہی گولیوں کی زد میں آگیا تھا۔ قوی ہیکل جانور کے گولی کھا کر تڑپنے کا وہ منظر بے حد دل دوز تھا۔ گولی کا زخم فوراً ہی اسے زمین بوس کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ البتہ اس زخم کو کھا کر وہ غضب ناک ہو کر بُری طرح اچھل کود کرنے لگا تھا۔ اس کے بھاری قدموں کی دھمک فائرنگ کے شور کے باوجود سنی جا سکتی تھی۔

اپنی اس غضب ناکی میں وہ بے قابو ہو کر بھاگا اور سیدھا اس شخص سے جا کر ٹکرایا جو رائفل اٹھائے جھکا جھکا آگے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ قوی ہیکل جانور کی ٹکر نے اسے کئی فٹ اوپر اچھالا اور پھر وہ ایک دل دوز چیخ کے ساتھ دوبارہ زمین پر آ کر گرا۔ اس کی رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کئی گز دور جا گری اور پھر مرے پر سو دُرّے کے مصداق بھاری بھرکم مشتعل یاک اسے روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یاک کے اس پر سے گزرنے کے بعد یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کی کوئی ہڈی سالم رہی ہوگی یا وہ ایک کے بعد دوسرا سانس لے سکا ہوگا۔ زخمی یاک کو بھی زیادہ سانسیں لینے کا موقع نہیں ملا۔ وہ طیش کے عالم میں کچھ اور تباہی مچاتا، اس سے قبل ہی ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور اس کے سر میں پیوست ہو گئی۔ یقیناً یہ گولی مرنے والے کے کسی ساتھی نے اپنے بھائی بند کی موت کا انتقام لینے کے لیے چلائی تھی۔

''وہ دیکھو... وہ راستہ اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اگر ہم وہاں سے اوپر چلے جائیں تو بہتر پوزیشن میں آ جائیں گے۔'' یاک کی موت کے بعد ماہ بانو نے عمران کی توجہ ایک تنگ سے راستے کی طرف مبذول کروائی۔ جس وقت عمران جوابی فائرنگ میں مصروف تھا، وہ ارد گرد کا جائزہ لینے کا ہی کام کر رہی تھی اور یہ راستہ اس کی نظر میں آ گیا تھا۔ عمران نے خود کو گھیرے جانے کا خدشہ ظاہر کیا تو اس نے حل کے طور پر اپنے ذہن میں آنے والی تجویز اس کے گوش گزار کر دی۔ عمران نے اس کی تجویز پر لمحے بھر کے لیے غور کیا تو اسے یہ ایک بہت ہی موزوں حل نظر آیا۔ بلندی کی طرف جانے کے باوجود اس راستے کی خوبی یہ تھی کہ وہ دونوں براہ راست فائرنگ کی زد میں نہیں آ سکتے تھے۔ جگہ جگہ ابھری ہوئی چٹانیں انھیں اوپر تک پہنچانے کے لیے بہترین آڑ فراہم کر سکتی تھیں۔

''چلو... ہری اپ۔'' عمران نے ماہ بانو سے کہا اور خود اس راستے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ کھڑے ہو کر سیدھے چلنے کے بجائے ہاتھ پیروں کے بل رینگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس طرح اگر کوئی دور سے دیکھ بھی

www.pkdigest.com

رہا ہوتا تو وہ فوراً اس کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ ماہ بانو نے بھی اس کی تقلید کرتے ہوئے اوپر چڑھنے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا۔ اب فائرنگ کی آوازیں جس طرح سے سنائی دے رہی تھیں، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ دشمن ان کی سابقہ پناہ گاہ سے بہت قریب پہنچ چکا ہے۔

پھر یکایک فائرنگ رک گئی۔ یقینی طور پر وہ لوگ عمران کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ بند ہونے پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔ خاموشی چھا جانے پر وہ دونوں اور بھی تیزی سے بلندی تک کا سفر طے کرنے لگے۔ اسی تیزی کی وجہ سے ماہ بانو سے ذرا سی بے احتیاطی ہوئی اور اس کے پیر تلے آنے والا ایک پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے کی طرف لڑھکتا چلا گیا۔ پتھر کے لڑھکنے کی آواز نے انہیں گھیرنے کی کوشش کرنے والوں کو متوجہ کر دیا۔ فوراً ہی ایک فائر ہوا اور ماہ بانو کے منہ کے قریب چٹان کے کئی ٹکڑے ادھر اُدھر اڑے۔ ایک نکیلا سا ٹکڑا اس کی پیشانی سے بھی آکر ٹکرایا اور اس نے شدید تکلیف کے ساتھ ساتھ پیشانی سے خون بھی نکل کر بہتا ہوا محسوس کیا لیکن موجودہ صورتِ حال میں یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔

وہ فائر کی زد میں آنے سے بال بال بچی تھی۔ اگر اس پر فائر کرنے والے کا نشانہ نہ چوکتا تو چٹان کے بجائے اس کی کھوپڑی کے ٹکڑے ادھر اُدھر اڑ رہے ہوتے۔ اس نے بری طرح گھبرا کر خود کو ایک چٹان کی آڑ میں چھپایا اور پلٹ کر اس طرف دیکھنے کی کوشش کی جہاں سے فائر ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے بلند چیخ کے ساتھ ایک شخص کو نیچے گرتے ہوئے دیکھا۔ یہ عمران کا کارنامہ تھا جو اس سے پہلے مطلوبہ مقام تک پہنچ گیا تھا اور ماہ بانو پر فائر کرنے والے کے نظر میں آجانے پر اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا تھا۔

ماہ بانو نے ایک گہرا سانس لیا اور مزید اوپر چڑھنے کا ارادہ ترک کر کے اسی چٹان کی آڑ میں بیٹھ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔ اس کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنے والے کی موت کے بعد دوسمتوں سے ان پر بڑی شدت سے فائرنگ کی جانے لگی تھی۔ فائرنگ کی آواز سے دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس نے اپنے پاس موجود رائفل سیدھی کی اور دائیں طرف موجود شخص کو اس کی فائرنگ کا جواب دیا۔ اسے میدانِ عمل میں اترتے دیکھ کر عمران کو کچھ تقویت سی محسوس ہوئی۔ اب تک وہ بہت بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتا رہا تھا ورنہ زخمی شانے کے ساتھ مسلسل فائرنگ کرنا اور اتنی بلندی پر چڑھنا آسان نہیں تھا۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد البتہ یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ بہتر پوزیشن پر آگیا تھا اور اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ حملہ آور کہاں سے فائرنگ کر رہے ہیں۔ بائیں طرف والے نے ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی جبکہ دائیں طرف والا ایک چھوٹی چٹان کے پیچھے تھا۔

عمران اِکا دُکا فائر کرتے ہوئے اس تاک میں لگا ہوا تھا کہ ان دونوں میں سے کسی سے غلطی ہو اور وہ جوش میں آکر اپنی پناہ گاہ سے جسم کا کوئی عضو باہر نکالنے کی غلطی کرے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکے۔ آخر کار بائیں جانب والے نے اسے یہ موقع فراہم کر دیا۔ اس کی طرف سے فائرنگ میں وقفے کی وجہ سے اس نے شاید کوئی چانس لینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوشش اسے مہنگی پڑی اور جونہی اس کا سر پتھر کی آڑ سے باہر آیا، عمران کی رائفل سے نکلی ہوئی گولی سیدھی جا کر اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ اب صرف ایک دشمن باقی رہا تھا جس سے انہیں اپنی جان چھڑانی تھی لیکن وہ بے حد محتاط تھا اور اس نے اپنی پناہ گاہ سے انگلی تک باہر نکالنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے اپنے ساتھی کی رائفل خاموش ہونے پر اس کی موت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔

”خبیث... بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے۔“ یک دم ہی عمران کو احساس ہوا کہ مقابل کی طرف سے فائر تو کیا جا رہا ہے لیکن اس کی آواز دور ہوتی جا رہی ہے۔ سو وہ غصے سے بڑبڑایا اور پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے پاس موجود ہینڈ گرینیڈ نکالا۔ اگلے ہی پل اس کے دائیں بازو نے فضا میں قوس بناتے ہوئے حرکت کی اور ہینڈ گرینیڈ درمیان کا اچھا خاصا فاصلہ طے کرتا ہوا اس چٹان کے عقب میں جا کر گرا جس کے پیچھے ان کا آخری دشمن اب تک چھپا رہا تھا۔

پہاڑوں میں ایک کان پھاڑ دھماکا گونجا اور چٹان کے عقب سے مٹی اور پتھروں کے اٹھتے طوفان کے ساتھ اس نے انسانی اعضا کو بھی اڑتے ہوئے دیکھا۔ دل کو کپکپا دینے والے اس منظر نے وقت کے اس پل میں اسے حقیقتاً بے حد سکون بخشا تھا۔ کسی انسان کی ایسی عبرت ناک موت لاکھ ناپسندیدہ سہی لیکن یہ سچ تھا کہ جو لوگ ابھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے، اسے ان میں سے کسی کی بھی موت کا افسوس نہیں تھا۔ ان افراد کی موت نے اس کے اور ماہ بانو کے علاوہ اور بھی بہت سے انسانوں کی زندگی کو بقا بخشی تھی۔ وہ جو ابھی ان پہاڑوں میں حقیر چوہوں کی طرح مارے گئے تھے، درحقیقت خود چلتی پھرتی موت تھے... جو اگر جیتے تو جانے کتنوں کی زندگیوں کا چراغ گل کر ڈالتے۔

آخری دشمن کے بھی موت کے گھاٹ اتر جانے کے

بعد عمران کچھ نڈھال سا ہو کر وہیں اپنی جگہ پر ہی لیٹ گیا۔ ماہ بانو جو کہ اس لڑائی میں کسی دشمن کو ٹھکانے نہیں لگا سکی تھی لیکن عمران کی معاونت کرتی رہی تھی، امن ہو جانے پر اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

”تمہارا تو بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔“ عمران کے خون سے تر لباس کو دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ کر اس کے زخمی شانے کا معائنہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ میرے خیال میں ہمیں یہاں مزید ٹھہرنے کا خطرہ مول لینے کے بجائے آگے کا سفر شروع کرنا چاہیے۔“ عمران نے اسے معائنے کے لیے اپنا زخمی شانہ پیش کرنے کے بجائے آہستہ سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر واپس نیچے کی طرف جانے لگا۔ ماہ بانو نے بھی کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اس کی پیروی کی۔ وہ دونوں انسانی لاشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچے جہاں ان کی سواری کا کام دینے والے یاک کا مُردہ جسم پڑا ہوا تھا۔ ان کے سامان کا تھیلا اب بھی یاک کی پشت سے بندھا تھا اور سواری سے محروم ہو جانے کے باوجود یہ بات خوش آئند تھی کہ یاک ایسے رخ سے گرا تھا کہ ان کے سامان کا تھیلا اس کے دیو ہیکل جسم کے نیچے آنے سے محفوظ رہا تھا، ورنہ دوسری صورت میں وہ دونوں کسی طور بھی اس کے پہاڑ جیسے وجود کو ہٹا کر اس کے نیچے سے اپنا سامان نہیں نکال سکتے تھے۔

”یہ تو گیا۔ اب ہمیں پیدل ہی سفر کرنا ہوگا۔“ یاک پر سے اپنا تھیلا اتارتے ہوئے عمران بولا۔

”ہمارے تعاقب میں آنے والے بھی تو کسی سواری پر آئے ہوں گے۔“ اس کی بات سن کر ماہ بانو نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”یہ لوگ دو یاکوں پر آئے تھے لیکن وہ دونوں یاک فائرنگ کے شور سے بدک کر بہت پہلے ہی یہاں سے بھاگ چکے ہیں۔ اب اگر ہم نے کسی طرح ان یاکوں کو تلاش بھی کر لیا تو ان پر قابو پا کر ان پر سواری نہیں کر سکیں گے۔“ عمران نے سنجیدگی سے اس کی بات کا جواب دیا اور سامان کے تھیلے میں سے ایک نسبتاً چھوٹا تھیلا نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

”میں شرمندہ ہوں لیکن مجبوری ہے کہ تمہیں بھی اس سفر میں کچھ وزن اٹھانا پڑے گا۔“ وہ یقیناً اپنے زخمی شانے کی وجہ سے ایسا کہہ رہا تھا۔

”سامان میں دوائیں وغیرہ بھی موجود ہیں یا نہیں؟“ اس کے ہاتھ سے تھیلا تھامتے ہوئے ماہ بانو نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”بالکل ہیں بلکہ اسی تھیلے میں ہیں جو میں نے ابھی تمہیں دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے تو پھر تم کچھ دیر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہارے زخمی شانے کی مرہم پٹی کروں گی پھر ہم آگے کا سفر کریں گے۔“ عمران کا جواب سن کر وہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

”میرا خیال تھا کہ ہم کچھ فاصلہ طے کر لیتے پھر اس کے بعد یہ مرہم پٹی کا کام ہوتا رہتا۔“ عمران نے انکار کرنا چاہا۔

”نہیں، تم بہت زخمی ہو اور اس حالت میں تمہارا وزن اٹھا کر ایسے ہی سفر جاری رکھنا مناسب نہیں۔“ ماہ بانو کے انداز میں جو قطعیت تھی، اس سے عمران کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹے گی چنانچہ اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ماہ بانو نے اچھی خاصی مہارت سے کام لیتے ہوئے اس کے زخمی شانے کی مرہم پٹی کی اور دواؤں میں موجود ایک پین کلر اسے کھانے کے لیے دی۔ کالج میں بھی شوق میں لی جانے والی فرسٹ ایڈ کی ٹریننگ اس ویران برفانی پہاڑی علاقے میں کام آئے گی، اسے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی تربیت کی اچھی خاصی لاج رکھتے ہوئے عمران کی ٹھیک ٹھاک قسم کی بینڈیج کر تو دی تھی لیکن اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ گولی اندر ہی موجود ہے اور وہ اس گولی کو نکالنے سے معذور تھی۔ اس کام کے لیے نہ تو اس کے پاس مطلوبہ مہارت تھی اور نہ ہی سامان۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ جلد از جلد کسی محفوظ پناہ گاہ تک پہنچ جائیں جہاں طبی سہولتیں بھی میسر آسکیں۔ پھر اس نے عمران کی معیت میں آگے کا سفر شروع کر دیا۔ ایک ایسا سفر جس کے راستوں کا انہیں علم نہیں تھا۔ وہ جسے ان راستوں پر چلنے کی تربیت دی گئی تھی، ایک مٹی کے تودے کی طرح بے جان پڑا تھا۔ ایک جانور کی موت نے انہیں سواری ہی نہیں راہنما سے بھی محروم کر دیا تھا اور اب وہ اپنا بوجھ خود اٹھائے انجانے راستوں پر تن بہ تقدیر سفر کرنے پر مجبور تھے۔

☆☆☆

”تم یہیں رکو، اندر میں اکیلی جاؤں گی۔“ درگاہ کے احاطے میں پہنچنے کے بعد کشور نے اپنے ساتھ آئی ہوئی شادو سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”لیکن بی بی... وڈی چودھرائن نے تو کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں۔“ اس نے فوراً ہی اعتراض کیا۔

کشور کی درگاہ پر حاضری کی خواہش پر وڈی چودھرائن نے یوں تو کوئی اعتراض نہیں کیا تھا لیکن اپنی خاص ملازماؤں میں سے شادو کو اس کے ساتھ روانہ کر دیا تھا۔ حویلی کی عورتیں تنہا صرف ڈرائیور کے ساتھ کہیں جاتی بھی نہیں تھیں۔ ایسے ہر موقع پر ان کے ساتھ کوئی نہ کوئی ملازمہ ضرور موجود ہوتی تھی لیکن کشور جانتی تھی کہ اس وقت شادو کو اس کے ساتھ بھیجنے کا مقصد روایت کی پاسداری نہیں بلکہ اس کی نگرانی ہے اور اب شادو کے جملے نے اس بات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔

''ساتھ رہنے کو کہا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ میرے سر پر ہی سوار ہو جانا۔ یہاں تک ساتھ آ گئی ہے نا، بس کافی ہے۔ اندر حاضری کے وقت میں تجھ کو اپنے سر پر نہیں برداشت کر سکتی۔ حویلی واپس جا کر تو وڈی چودھرائن کو بتا دینا کہ میں نے تجھے باہر روک دیا تھا۔'' کشور نے سخت لہجے میں اسے جھڑک کر اپنے ساتھ اندر جانے سے روک دیا۔ وہ عموماً ملازماؤں سے ایسا برتاؤ کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن اس وقت صورتِ حال ایسی تھی کہ اسے شادو سے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا لہجہ اختیار کرنا پڑا۔ ویسے بھی جیجی، شادو اور ان کی ماں جس طرح ہر وقت بڑی چودھرائن کی چمچہ گیری کرتی رہتی تھیں، اسے ان سے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔

''لا، یہ مجھے دے۔'' شادو جھڑکی سن کر تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی کہ اسے مزید کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اس نے اس کے ہاتھ میں موجود بڑا سا تھال خود تھام لیا اور حسبِ قاعدہ پیروں سے چپل اتار کر اس بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی جس کے بالکل وسط میں اس کے دادا چودھری مراد عالم شاہ کی قبر بنائی گئی تھی۔ اس کا حتمی انداز دیکھتے ہوئے شادو ہمت نہیں کر سکی تھی کہ اس کے پیچھے اندر داخل ہو۔ اس نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور کنڈی چڑھا دی۔ قیمتی سنگِ مرمر لگی دیواروں والے اس ہال کے اندر ٹھنڈک کا احساس تھا۔ مختلف مقامات پر لگے بلبس کے علاوہ عین قبر کے اوپر موجود بڑے سے فانوس کی دودھیا روشنی نے ماحول میں ایک عجیب سا تقدس بھرا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس احساس کو تقویت دینے کے لیے وہ خوشبوئیں بھی اہم کردار ادا کر رہی تھیں جنہیں قبر پر موجود چادر کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا گیا تھا۔

سادہ لوح ان پڑھ دیہاتی یہ سب دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے تھے اور ان کے دینی تعلیم و شعور سے ناواقف ذہن اندھی عقیدت کے تاریک گڑھے میں بھٹکنے لگتے تھے... لیکن کشور کے لیے یہ سب کچھ کسی ڈرامے کے سیٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ جس شخص کی تربیت نے اس کے باپ جیسے شیطان صفت آدمی کو جنم دیا ہے، وہ خود اخلاقی اعتبار سے کس قدر پستی میں ہوگا۔ ایسے شخص سے کسی بھی قسم کی عقیدت محسوس کرنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ یوں بھی اس کا شعور اسے قبروں کی پوجا سے روکتا تھا چنانچہ وہ اس سارے سیٹ اپ سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر سپاٹ سے انداز میں چلتی ہوئی قبر کے قریب پہنچی اور اپنے ہاتھ میں موجود تھال اس کے سرہانے رکھ دیا۔ اس تھال میں جلتا ہوا دیا، سبز رنگ کی قیمتی چادر، گلاب کے پھول، خشک میوہ جات اور نذرانے کی موٹی رقم موجود تھی۔

درگاہ پر حاضری کے لیے آنے والوں کے لیے مثال قائم کرنے کی خاطر حویلی کے مکین وقتاً فوقتاً اسی اہتمام کے ساتھ یہاں آتے رہتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کی پیروی کرتے ہوئے دوسرے لوگ بھی کوشش کرتے کہ اسی طرح کا اہتمام کر سکیں۔ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اپنے ساتھ نذرانے کے لیے جو کچھ بھی لاتا، درگاہ کے خدام اسے فوراً قبضے میں لے لیتے لیکن چونکہ اس وقت چودھری افتخار عالم شاہ کی بیٹی وہاں حاضری دینے آئی تھی، اس لیے کسی خادم کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس ہال میں رک سکے۔ اس کی وہاں موجودگی تک دیگر عقیدت مندوں کا بھی وہاں آنا ممکن نہیں تھا بلکہ انہیں تو درگاہ کے احاطے میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ بی بی کشور اپنے دادا کی قبر پر چڑھاوا چڑھا کر واپس جاتی تو پھر عام لوگ اپنی عقیدت مندی کے اظہار اور حاجات کے بیان کے لیے یہاں قدم رکھ سکتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ کشور بی بی کا یہاں سے واپس حویلی لوٹنے کا کوئی پروگرام ہی نہیں تھا۔ وہ یہاں سے نئی دنیاؤں کے سفر پر روانہ ہونے کا ارادہ کر کے حویلی سے نکلی تھی، چنانچہ نذرانوں سے بھرے تھال کو قبر کے سرہانے رکھنے کے بعد پھرتی سے چلتی ہوئی ہال کے اس دروازے کی طرف بڑھی جو دوسری سمت میں موجود تھا۔

عرس وغیرہ کے موقع پر جب درگاہ پر لوگوں کا بے حد رش ہوتا تھا، صرف ایک دروازہ کافی نہیں ہوتا تھا۔ لوگ اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کے چکر میں ایک دوسرے کو روندنے لگتے تھے۔ چنانچہ اس بدنظمی پر قابو پانے کے لیے ہال کی چاروں دیواروں میں ایک ایک دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ عام دنوں میں تین دروازے بند رہتے تھے اور صرف وہ ایک دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا جس سے گزر کر کشور اندر داخل ہوئی تھی۔ اپنے باہر نکلنے کے لیے اس نے تین بند دروازوں میں

سے اس دروازے کا انتخاب کیا تھا جو درگاہ کی عقبی دیوار سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔

دروازے کی موٹی کنڈی اندر سے بند تھی لیکن اس پر کوئی تالا وغیرہ نہیں لگا تھا۔ کشور نے ہاتھ بڑھا کر اس کنڈی کو کھولنے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ وہ کافی سختی سے بند ہے اور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہی ہے۔ شاید بہت کم استعمال ہونے کی وجہ سے کنڈی جام ہو گئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر اسے کھولنے کی کوشش کی۔ زیادہ طاقت کے استعمال سے کنڈی نے تھوڑی سی حرکت تو ضرور کی لیکن ساتھ ہی رگڑ کا شور بھی بلند ہوا۔ یہ شور کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا تھا، خصوصاً باہر موجود شادو کی طرف سے اسے خطرہ تھا کہ وہ بے شک اس کے ساتھ اندر داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن کان اسی طرف لگا کر کھڑی ہوگی کہ کوئی بھی غیر معمولی بات ہو تو فوراً اس کے علم میں آ سکے۔

اس نے کنڈی پر زور لگانا چھوڑ کر لمحہ بھر کے لیے اس مسئلے کا حل سوچا اور پھر پلٹ کر قبر کی طرف آ گئی۔ سرہانے رکھے تھال میں موجود دیا ہنوز جل رہا تھا۔ اس نے پھونک مار کر اسے بجھایا اور تھال سے اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیا ہاتھ میں لیے وہ واپس دروازے کی طرف آئی اور اس میں موجود تیل کنڈی پر ڈالنے لگی۔ کنڈی کو تیل دینے کے بعد اس نے تقریباً تیس سیکنڈ تک انتظار کیا اور ایک بار پھر اس پر طبع آزمائی کرنے لگی۔ اس بار کنڈی نسبتاً آسانی سے اور کم شور کے ساتھ حرکت کرنے لگی۔

اس نے مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری کنڈی کھلنے تک اپنے ہاتھوں کو نہیں روکا۔ اس ذرا سی مشقت پر اس کی آئندہ زندگی کا دارومدار تھا چنانچہ وہ کسی طور پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ کنڈی کھلی تو اس نے بے حد احتیاط سے زور لگا کر دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی شام کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ کنڈی کھولنے کی مشقت میں اس کے چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو اس نے بڑی فرحت محسوس کی اور ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے قدم باہر رکھ دیے۔

مغرب کا وقت قریب تھا چنانچہ ماحول اتنا روشن نہیں تھا۔ شام کے اترتے سایوں نے دن کی روشنی کو شکست دینا شروع کر دی تھی۔ درگاہ کے احاطے کی لائٹیں بھی فی الحال روشن نہیں کی گئی تھیں اس لیے بھی کچھ اندھیرا سا ہو رہا تھا۔ اس کے لیے یہ نیم تاریکی ایک نعمت کے مانند تھی۔ وہ محتاط قدموں سے چلتی ہوئی احاطے کی دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے آفتاب نے یہیں تک کے ایکشن کے بارے میں ہدایات دی تھیں۔ اس کے مطابق آگے کے معاملات وہ خود سنبھال لیتا۔ وہ اپنے حصے کا کام کرنے کے بعد کچھ ہراساں سی عقبی احاطے میں کھڑی تھی کہ کسی نے آہستہ سے اسے پکارا۔

''کشور بھابی! آپ میرے ساتھ آ جائیں۔'' اس پکار پر وہ چونک کر پلٹی تو افضل کی جانی پہچانی شکل نظر آئی۔ اسے دیکھ کر اس نے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس کی اور وہ بنا کوئی سوال جواب کیے اس کے ساتھ چل پڑی۔

''یہاں سے باہر نکلنے کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑی سی زحمت کرنی پڑے گی۔ ویسے دیوار زیادہ بلند نہیں ہے۔ آپ میری پیٹھ پر پیر رکھ کر آرام سے اس پر چڑھ سکتی ہیں۔'' وہ چند قدم چلنے کے بعد دیوار کے قریب پہنچے تو افضل نے اس سے کہا۔ کشور جو دیوار کی جڑ میں بے ہوش پڑے آدمی کو دیکھ کر الجھ گئی تھی، اس کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ زمین پر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل گھوڑا بنا ہوا تھا۔ بے ہوش آدمی کے مخصوص سبز لباس کی وجہ سے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ وہ درگاہ کا کوئی خادم ہے، جو یقیناً اس طرف پہرے کا فریضہ انجام دے رہا تھا اور افضل کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا ہے، وہ افضل کی ہدایت کے مطابق اس کی پیٹھ پر چڑھ گئی۔

وہ دیوار پر چڑھی تو افضل پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا اور اچک کر خود بھی دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد اس نے کشور کو سہارا دے کر آہستہ سے نیچے اتار لیا۔ احاطے کی دوسری طرف دور تک گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگوں کا عموماً اس طرف گزر نہ ہونے کی وجہ سے یہ جگہ زیادہ تر سنسان ہی پڑی رہتی تھی، اسی لیے کشور کے فرار کا منصوبہ بناتے وقت اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ کشور دیکھ سکتی تھی کہ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے اور گاڑی کی عقبی نشست پر ایک نقاب پوش عورت بھی موجود ہے۔ عورت کے بارے میں اس نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ افضل کی بیوی مہتاب ہے۔ افضل نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا تو اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مہتاب نے والہانہ انداز میں اسے اپنے گلے سے لگا کر پیار کرتے ہوئے سلام کیا جس کا کشور نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ البتہ افضل ان دونوں کی طرف سے یکسر انجان بنا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا اور اب اس کی گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ کشور جو پہلے

www.pkdigest.com

ہی خود کو چادر سے ڈھانپے ہوئے تھی، تھوڑا سا اور گھونگھٹ نکال کر بیٹھ گئی۔ ابھی وہ لوگ گاؤں کی حدود میں موجود تھے چنانچہ اس کے لیے بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ افضل اور مہتاب کی سلامتی کے لیے بھی پریشان تھی۔

اگر کسی کے علم میں یہ بات آجاتی کہ وہ اسے لے کر یہاں سے فرار ہو رہے ہیں تو اس سے پہلے ان لوگوں کو بدترین انجام سے دوچار ہونا پڑتا۔ زیرِ لب دعائیں مانگتے ہوئے، دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے وہ سارا راستہ طے کیا۔ مہتاب اور افضل کی خاموشی سے بھی پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ بھی اعصابی تناؤ کا شکار ہیں۔ کشور کو پیر آباد سے نکال کر لے جانا شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ چنانچہ ان کا اعصاب زدہ ہونا کچھ ایسا انوکھا بھی نہیں تھا۔

''آفتاب کہاں ہیں؟ وہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟'' گاڑی پیر آباد کی حدود سے کافی آگے نکل کر بڑی سڑک تک پہنچی تو کشور نے سکون کا سانس لیتے ہوئے بہت دیر سے ذہن میں اٹکا ہوا سوال دھیمی آواز میں مہتاب سے کیا۔

''آفتاب کو میں نے جان بوجھ کر اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے کسی بھی طرح کے شک سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہیں سب کی نظروں کے سامنے موجود رہے۔'' دھیمی آواز کے باوجود اگلی نشست پر موجود افضل نے اس کا سوال سن لیا تھا چنانچہ خود اسے جواب دیا۔

''تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے تم دونوں کے مستقبل کی سلامتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے، چنانچہ ہم نے بہت سوچ سمجھ کر اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ساری منصوبہ بندی کی ہے۔ آفتاب نے جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت زیادہ پُرخطر تھا۔ افضل نے دماغ لڑا کر اس کی خطرناکی کو ذرا کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اور افضل اس وقت تنہا پیر آباد نہیں آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک اور گاڑی میں میڈیا کے چند دوسرے نمائندے موجود تھے جو افضل کے ایما پر پیر آباد اور اردگرد کے دوسرے دیہاتوں میں ہونے والے ترقیاتی کاموں پر ایک رپورٹ تیار کر کے اپنے چینل پر چلائیں گے۔ وہ لوگ چینل کی گاڑی میں آئے ہیں جبکہ ہم نے یہ کار کرائے پر لے لی تھی۔ چینل کے جو نمائندے ہمارے ساتھ آئے ہیں، انہیں ہمارے اس منصوبے کا کچھ علم نہیں۔ افضل نے ان سے کہا تھا کہ میری بیوی کو دیہاتی زندگی دیکھنے کا بہت شوق ہے اور وہ اس دورے پر میرے ساتھ جانا چاہتی ہے اس لیے میں آپ کی گاڑی کے بجائے الگ گاڑی میں چلوں گا۔ ان لوگوں کو ظاہر ہے کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ پروگرام چونکہ سارا افضل نے ترتیب دیا تھا، اس لیے ہمیں آفتاب کے تم سے طے کیے گئے وقت کے مطابق درگاہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بس مجھے ذرا سی ایکٹنگ کرنی پڑی۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے مہتاب دھیرے سے ہنسی۔

''ایکٹنگ... وہ کیوں؟'' کشور نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے اپنی قبل از وقت روانگی کے لیے کوئی بہانہ چاہیے تھا چنانچہ میں نے عین موقع پر یہ ڈراما شروع کر دیا کہ میرے گردے میں شدید درد ہو رہا ہے۔ افضل نے اپنے ساتھیوں سے معذرت کی کہ وہ مزید ان کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ انہیں اپنی وائف کو اسپتال لے جانا پڑے گا۔ بس پھر ہم بہانے سے وہاں سے نکل آئے۔ تمہارے میاں جی البتہ گھرے ہوئے تھے میڈیا والوں کے درمیان اور انہیں بتا رہے تھے کہ کس طرح ان کا اسکول ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ میں آتے آتے ان چھپے رستم کو آنکھ مار کر آئی ہوں۔ بے چارے بڑے جھینپے لیکن سب کے سامنے مجھے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔'' مہتاب نے اپنی بات کے اختتام پر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ جوں جوں وہ لوگ فاصلے طے کرتے جا رہے تھے، اعصابی تناؤ کم ہوتا جا رہا تھا اور ان کی حرکات و سکنات اور رویے میں واضح فرق نظر آرہا تھا۔

''منصوبہ تو واقعی آپ لوگوں نے بہت اچھا بنایا ہے۔ اگر آپ لوگ چینل والوں کے ساتھ آنے کے بجائے ایسے ہی آجاتے تو گاڑی کی وجہ سے فوراً ہی ابا جی کے کارندوں کی نظر میں آجاتے اور پھر وہ لوگ آپ کی یہاں آمد کا مقصد جانے بغیر آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔'' کشور جو اس کی بات پر خود بھی دھیرے سے ہنسی تھی، سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی۔

''اس منصوبے سے ہمیں ہی نہیں آفتاب کو بھی بہت سیفٹی ملے گی۔ جس وقت آپ کے گاؤں سے غائب ہونے کا واقعہ پیش آیا ہے، وہ مسلسل سب کی نظروں کے سامنے رہا ہے۔ پھر چینل والوں کی موجودگی سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ گاؤں کے بیشتر لوگ ٹی وی والوں کو دیکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہمیں میدان صاف مل گیا۔'' افضل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے اس سارے معاملے کے مزید پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

''میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں افضل بھائی۔ آپ اور مہتاب بھابی اتنا ساتھ نہیں دیتے تو میں بڑی مشکل میں پڑ جاتی۔'' کشور کی آنکھوں میں یک دم نمی اتر آئی۔

''بے وقوف... اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ تم ہمارے لیے چھوٹی بہنوں جیسی ہو۔ اس مشکل گھڑی میں ہم تمہارا ساتھ نہ دیتے، یہ کیسے ممکن تھا۔'' مہتاب نے اسے آہستہ سے اپنے ساتھ لگایا۔

''مہتاب ٹھیک کہہ رہی ہے بھابی! ویسے بھی مجھے تو لڑکی بھگانے کا پرانا تجربہ ہے۔ ضرورت پڑنے پر یہ تجربہ میرے دوست کے کام آگیا تو اس میں کیا حرج ہے۔'' افضل نے بھی شوخ لہجے میں بولتے ہوئے ماحول کی اداسی کو کم کرنے کی کوشش کی۔

''فضول نہ بولیں۔ اللہ نہ کرے کہ ہم بلاوجہ کسی لڑکی کو اس کے گھر سے نکلنے کی ترغیب دیں۔ میرے اور کشور کے کیس میں صرف محبت گھر چھوڑنے کا سبب نہیں بنی ہے۔ ہم دونوں ایسی خواتین ہیں جنہیں اگر اپنے گھر والوں کی محبت اور اعتماد حاصل ہوتا تو ہم ہرگز گھر کی دہلیز پار نہیں کرتے لیکن جب ہم نے دیکھا کہ ہمارے اپنے ہمارے بنیادی حقوق سلب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہمیں مجبوراً یہ قدم اٹھانا پڑا۔'' مہتاب نے افضل کی بات کا کچھ بُرا مانتے ہوئے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

''سوری بیگم صاحبہ! آپ تو بُرا ہی مان گئیں۔ میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا۔ میں صرف مذاق کر رہا تھا ورنہ میرے دل میں تمہاری جتنی قدر ہے، اس کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں کہ میں تمہارے لیے کوئی غلط لفظ استعمال کروں۔'' افضل نے جلدی سے معذرت کی۔

''مجھے معلوم ہے افضل... آپ صرف مذاق کر رہے تھے لیکن صرف اپنی مرضی سے میکے کی دہلیز پار کرنے والی عورت کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی بھر اس بات سے ڈرتی رہتی ہے کہ کہیں کوئی اسے ''بھاگی ہوئی عورت'' کا طعنہ نہ دے دے۔ اس لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کی بات کا بُرا مان گئی تھی۔'' مہتاب نے اس کی معذرت سن کر اداس سے لہجے میں اپنے رویے کی وضاحت کی تو کشور کا دل بھی عجیب سی اداسی میں گھر گیا۔

اداسی کے اس احساس کو ختم کرنے کے لیے اس نے موضوعِ گفتگو بدلا اور مہتاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''یہ تو بتائیں بھابی کہ آپ کے وہ دونوں بلونگڑے کہاں ہیں؟ آپ دونوں سیر کرنے کے لیے نکلے ہوئے ہیں تو انہیں کہاں چھوڑا ہے؟''

''وہ دونوں گھر پر ہی ہیں۔ میں نے کام والی کو ایکسٹرا پیسے دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ آج رات تک ہمارے گھر پر بچوں کے ساتھ رک جائے۔ اچھی اعتماد کی عورت ہے، میرے کہنے پر فوراً راضی ہو گئی۔ بچے بھی اس سے مانوس ہیں اس لیے آرام سے اس کے ساتھ رک گئے۔ اب ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر گھر جائیں گے تو خوب خوش ہوں گے کہ چچی آئی ہیں، تو بہت یاد کرتے ہیں تمہیں۔ اصل میں بے چارے ننھیال، ددھیال دونوں سے ہی محروم ہیں اس لیے کوئی بھی بھولا بھٹکا مہمان گھر آجائے تو بڑے خوش ہوتے ہیں۔'' مہتاب ابھی تک مکمل طور پر اداسی کے حصار سے نہیں نکل سکی تھی۔

''چلیں اب تو مہمان بلائے جان بن کر آپ کے گھر میں نازل ہو رہے ہیں۔ جانے کتنا عرصہ مجھے آپ کے ہاں قیام کرنا پڑے۔ بچوں کا خوش ہو ہو کر بھی دل بھر جائے گا۔'' کشور کی اپنی کیفیت اندرونی طور پر مہتاب جیسی ہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھال کر اسے اداسی کے حصار سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''خوامخواہ... تم کیوں ہونے لگیں بلائے جان؟ ذرا ہمارے ساتھ رہ کر تو دیکھو پھر دیکھنا ہم تمہیں کیسے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھتے ہیں۔'' حسبِ توقع مہتاب اسے ٹوکتے ہوئے اپنی سابقہ ٹون میں لوٹ آئی۔

''اب یہ تو آزمانے پر ہی معلوم ہوگا۔'' کشور نے جان بوجھ کر اسے چھیڑا۔ جواباً وہ اسے مصنوعی غصے سے گھورنے لگی اور پھر یک دم دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس دیں۔ ایک ایسی ہنسی جس میں زندگی اور امید تھی۔

☆☆☆

وڈی چودھرائن کے سامنے کھڑی شادو بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ شدید خوف کے باعث اس میں یارا نہیں تھا کہ وڈی چودھرائن کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ وہ بس نظریں جھکائے کھڑی اس کی گھن گرج سن رہی تھی۔

''جانتی ہے تیرا کیا انجام ہو سکتا ہے؟ میں نے تیرے ذمے ایک کام لگایا تھا اور وہ بھی تجھ سے نہیں کیا گیا۔ اپنا منحوس بوتھا لے کر میرے سامنے آگئی ہے کہ کشور بی بی درگاہ سے کہیں غائب ہو گئی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں کہ تیرے ہوتے ہوئے وہ کیسے غائب ہو گئی؟ تو نے بھنگ پی رکھی تھی جو تجھے اتنی وڈی کڑی کے کہیں جانے کا پتا نہیں لگا؟'' اس پر گرجتی چودھرائن درحقیقت اندر سے خود لرزاں تھی۔ چودھری کی غیر موجودگی میں حویلی کے اندرونی معاملے کلی طور پر اس کے ذمے ہوتے تھے۔ ایسے میں کشور کا غائب ہو جانا خود اس کے لیے باعثِ عتاب بن سکتا تھا۔

www.pkdigest.com

"میں تو پورا ٹیم (ٹائم) ہوشیار ہی کھڑی تھی وڈی چودھرائن جی... پر آپ کے حکم کے مطابق کشور بی بی کے ساتھ اس لیے نہیں رہ سکی کہ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر باہر رکنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اندر درگاہ میں سے غائب ہو جائیں گی۔ میں تو وڈی دیر تک باہر کھڑی ان کے اندر سے نکلنے کا ہی انتظار کرتی رہی۔ وہ تو جب درگاہ کے خادموں میں شور مچا کہ ان کا ایک ساتھی باہر بے ہوش پڑا ہے اور درگاہ کا پچھلا دروازہ کھلا ہے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں فوراً اس دروازے سے اندر گئی، پر کشور بی بی کا اندر نام و نشان نہیں تھا۔ چڑھاوے کا تھال جو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں، وہ ادھر ہی تھا لیکن بی بی کا کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کسی سے بی بی کے بارے میں تو پوچھ نہیں سکتی تھی کہ اس میں حویلی کی بدنامی تھی۔ میں آپ ہی ساری درگاہ میں گھوم پھر کر بی بی کو تلاش کرتی رہی پر وہ اندر کہیں تھی ہی نہیں۔" شادو نے وہ ساری تفصیلات جن سے وہ حویلی پہنچتے ہی وڈی چودھرائن کو آگاہ کر چکی تھی، ایک بار پھر دہرائیں۔

"ڈرائیور سے کیا کہا تھا تُو نے کہ بی بی تیرے ساتھ واپس حویلی کیوں نہیں جا رہی ہیں؟" وڈی چودھرائن نے اسے گھورتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ بی بی ابھی کچھ دیر اور درگاہ پر رکیں گی۔ مجھے انہوں نے حویلی میں کچھ کام بتایا ہے اس لیے مجھے حویلی لے چل۔ بی بی کو لینے کے لیے وڈی چودھرائن بعد میں دوسری گڈی بھیج دیں گی۔" شادو کا جواب سن کر وڈی چودھرائن نے ایک ہنکارا بھرا اور پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی پیشانی پر پھیلی لکیروں کا جال اس کے گہرے تفکر کا پتا دے رہا تھا۔ اسی کمرے میں اس کے ساتھ کشور کی سگی ماں چودھرائن ناہید بھی موجود تھی لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھنے کے علاوہ کسی بھی قسم کے ردِعمل سے محروم تھی۔ بیٹی کے اس طرح سے غائب ہو جانے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں گم کر دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور بیٹی کے اس فعل کی سزا اسے بھی بھگتنی ہوگی۔

"نجمی کہاں ہے؟ اس کو یہاں بلا کر لا۔" وڈی چودھرائن کی پیشانی پر پھیلی لکیریں کچھ کم ہوئیں تو اس نے شادو کو حکم دیا۔ وہ تیر کی طرح اس حکم کی تعمیل کے لیے کمرے سے باہر نکلی۔

"اب سر پکڑ کر بیٹھی ہو، اگر پہلے ہی دھی کی لگام کھینچ کر رکھی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مجھے تو بہت دنوں سے کُڑی کی حرکتیں شک میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اپنے طور پر کوشش بھی کی کہ اصل معاملے کی کھوج لگا سکوں، پر تیری دھی تھی وڈی ہوشیار۔ میری آنکھوں میں بھی دھول جھونک گئی۔ ویسے بھی میں اکیلی جان کون کون سے دھندے نبیڑوں۔ حویلی کی ساری ذمے داری میرے کندھوں پر ہے۔ تم تو ساری حیاتی بس عیش ہی کرتی رہیں۔ نہ کوئی ذمے داری سنبھالی، نہ ہی اپنی اولاد۔ کچھ نہیں اپنی اولاد کو ہی دیکھا ہوتا تو آج یہ مشکل سر پر کھڑی نہ ہوتی۔ اب بتا تو چودھری صاحب کو کون جواب دے گا؟ وہ تو جان کھا جائیں گے ساروں کی۔"

شادو کے باہر نکلنے کے بعد وڈی چودھرائن نے چودھرائن ناہید کے لتّے لینا شروع کر دیے۔ شادو کے تنہا درگاہ سے واپس لوٹنے کا معاملہ ابھی ان تینوں کے ہی درمیان تھا اور بات وڈی چودھرائن کے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ کسی کو کچھ معلوم ہو جاتا تو حویلی کی عزت خاک میں مل جاتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر بے حد چراغ پا ہونے کے باوجود وڈی چودھرائن بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔

"تُسی کچھ کرو وڈی آپا! کسی طرح اس نابنجار کو ڈھونڈ کر واپس حویلی لاؤ، ورنہ چودھری صاحب تو میری چوٹی ہی گدی سے اکھاڑ ڈالیں گے۔" سوکن سے ڈانٹ کھانے کے بعد بجائے بُرا ماننے کے چودھرائن ناہید اس کی منت سماجت کرنے لگی۔

"چوٹی تو وہ میری بھی اکھیڑ دیں گے۔ بس اب تو دعا کر کہ کسی طرح یہ معاملہ نبٹ جائے ورنہ پھر چودھری صاحب کو امریکا فون کر کے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ ابھی تو میں اس... کا بندوبست کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ کسی کو کشور کے غائب ہو جانے کی خبر نہ ہو سکے۔ کُڑی کو تو بعد میں چودھری صاحب ڈھونڈ ہی نکالیں گے لیکن ابھی حویلی کی عزت بچانا سب سے اہم ہے۔" وڈی چودھرائن کے لہجے سے پریشانی ہویدا تھی۔ وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہی ہوئی تھی کہ شادو، نجمی کے ساتھ وہاں پہنچ گئی۔ چودھرائن جانچتی ہوئی نظروں سے نجمی کا جائزہ لینے لگی اور پھر کچھ مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلایا۔

"کشور کی الماری میں سے کوئی چنگا سا جوڑا نکال کر پہن لے اور چپکے سے درگاہ پہنچ جا۔ وہاں سے شادو تجھے ڈرائیور کے ساتھ جا کر لے آئے گی۔ اپنا منہ چنگی طرح چھپا لینا۔ ڈرائیور کو خبر نہ ہونے پائے کہ تو کشور نہیں نجمی ہے۔" اس نے نجمی کو حکم دیا تو دونوں بہنیں سمجھ گئیں کہ وڈی چودھرائن کشور کے غائب ہونے کے معاملے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ تاثر دینا چاہتی ہے کہ کشور درگاہ سے

واپس لوٹ آئی ہے۔

"چنگا وڈی چودھرائن" کہتی ہوئی وہ دونوں حکم کی تعمیل کے لیے باہر نکل گئیں۔ ان کے باہر جانے کے بعد وڈی چودھرائن نے ایک ملازمہ کے ذریعے منشی کو طلب کیا اور خود ملاقات کے کمرے میں پہنچ گئی۔ پردے کے پیچھے منشی اس کا منتظر تھا۔

"منشی! تجھے گاؤں کی کچھ خبر ہے؟ گاؤں میں کوئی نئی گل ہوئی ہے تو مینوں بتا۔"

"ایسی کوئی خاص گل تو نہیں ہوئی چودھرائن جی۔ بس آج ٹی وی والے ادھر آئے ہوئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ یہاں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں، ان کے بارے میں فلم تیار کریں گے۔ اسی اے سی نے بھیجا ہوگا انہیں اپنی شہرت کے لیے۔" منشی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

"اور اس ماسٹر کے بارے میں کیا خبر ہے؟ وہ گاؤں میں ہی ہے یا کہیں گیا ہوا ہے؟" چودھرائن کو کشور اور آفتاب کے تعلقات کے بارے میں حتمی طور پر کچھ معلوم نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے شک سا رہتا تھا اس لیے اس نے آفتاب کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

"وہ تو گاؤں میں ہی ہے جی۔ وہ تو بے ہی اے سی کا چمچہ... آج وہ کیسے گاؤں سے کہیں جا سکتا تھا۔ لگا ہوا ہے ٹی وی والوں کے سامنے اے سی کی تعریفیں کرنے میں۔" منشی نے رپورٹ دی تو چودھرائن پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ اس کے حساب سے تو اگر کشور غائب تھی تو آفتاب کو بھی منظر سے غائب ہونا چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہے منشی! تُو جا... اور ہاں، ارد گرد نظر رکھنا۔ چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں تجھے ہی ہر معاملے پر نگاہ رکھنی ہے۔" وہ منشی کو ہدایت دیتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔ اب اسے نجمی اور شادو کا انتظار تھا۔ دوسرے وہ چودھری کو امریکا فون کر کے اس حادثے کی اطلاع کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی تاکہ اس کی ہدایات کے مطابق ایکشن لے سکے۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ خود سے اسے کچھ سجھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

"منشی جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں وڈی چودھرائن جی۔" ابھی اسے ملاقاتی کمرے سے واپس آئے پانچ منٹ نہیں گزرے تھے کہ ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی۔ وہ تیزی سے منشی سے ملنے کے لیے پہنچی کہ شاید کوئی نئی خبر مل جائے۔

"معافی چاہتا ہوں وڈی چودھرائن۔ گل تو اتنی خاص نہیں کہ میں آپ کو پریشان کرتا لیکن فیر بھی میں نے سوچا کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔"

"کیا گل ہے؟"

"ابھی ابھی درگاہ کا ایک خادم میرے پاس آیا ہے۔ کہتا ہے کہ وہاں کسی نے پچھلی طرف پہرا دینے والے خادم کو بے ہوش کر دیا ہے۔ وہ کون تھا اور کیوں آیا تھا، کسی کو کچھ نہیں آیا لیکن میں اس لیے پریشان ہو گیا کہ مجھے خبر ملی تھی کہ آج کشور بی بی درگاہ گئی ہوئی ہیں۔" اس کے پوچھنے پر منشی نے وہ اطلاع دی جو شادو کی زبانی پہلے ہی اس تک پہنچ چکی تھی۔

"کشور کے لیے پریشان نہ ہو۔ شادو ڈرائیور کے ساتھ اسے لینے گئی ہوئی ہے، ابھی واپس آ جائے گی... لیکن یہ ملوم کرنے کی کوشش ضرور کرو کہ وہ کون تھا جس نے خادم کو بے ہوش کیا۔" چودھرائن منشی کو حکم دے کر ایک بار پھر اپنے کمرے میں واپس پہنچ گئی جہاں چودھرائن ناہید ہنوز پہلے والی پوزیشن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے وہ اپنی وسیع و عریض مسہری پر نیم دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد شادو واپس پہنچ گئی۔

"میں نے نجمی کو کشور بی بی کے کمرے میں پہنچا دیا ہے وڈی چودھرائن۔ آپ بتائیں میرے لیے اور کیا حکم ہے؟" چودھرائن کی خود پر جمی نظروں سے گھبرا کر اس نے اطلاع دینے کے ساتھ ساتھ آگے کے لیے بھی ہدایت چاہی۔

"چنگی گل ہے۔ اب ایسا کر کہ نجمی سے بول کہ واپس اپنے کپڑے پہن کر باہر آ جائے۔ فیر تم دونوں بہنیں تہ خانے کے دروازے پر پہنچ جاؤ۔ میں بھی ادھر ہی آ رہی ہوں۔"

"چنگا وڈی چودھرائن۔" اس کا حکم سن کر شادو مستعدی سے بولتی ہوئی پلٹی۔

"گل سن..." چودھرائن نے اسے پکارا۔

"جی وڈی چودھرائن۔" شادو نے فوراً اس کی پکار کا جواب دیا۔

"تم دونوں بہنوں کے علاوہ اور کس کس کو اس معاملے کی خبر ہے؟" اس کو اندر تک اتر جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چودھرائن نے دریافت کیا۔

"کسی کو نہیں چودھرائن جی۔ ہم نے تو اپنی اماں کو بھی ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔"

"ٹھیک ہے، فیر تُو جا اور نجمی کو اپنے ساتھ لے کر تہ خانے تک پہنچ۔" اس حکم کی شادو نے پھرتی سے تعمیل کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں بہنیں تہ خانے کے راستے پر پہنچ گئیں اور سہمی ہوئی وڈی چودھرائن کا انتظار کرنے لگیں۔ تین چار منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے وڈی چودھرائن کو چابیوں

www.pkdigest.com

کے گچھے کے ساتھ وہاں آتے دیکھا۔

''تالا کھول۔'' اس نے چابیوں کا گچھا شادو کو تھمایا تو اس نے کانپتے ہاتھوں سے گچھا تھام کر چودھرائن کی نشان دہی کردہ چابی سے تالا کھول دیا۔ پھر اس کے اشارے پر دونوں بہنیں سیڑھیاں اتر گئیں۔ خود چودھرائن بھی اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالے ان کے پیچھے تھی اور بُری طرح ہانپتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ کئی کوٹھریوں پر مشتمل اس تہ خانے میں پہنچ کر اس نے شادو کے ہاتھ سے ہی ایک کوٹھری کا دروازہ کھلوایا اور پھر اس سے چابیوں کا گچھا لیتے ہوئے دونوں بہنوں کو اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ وہ دونوں جواب کسی حد تک خود کو یہاں تک لائے جانے کا مقصد سمجھ گئی تھیں، اندر داخل ہونے کے بجائے اس کے پیروں میں گر گئیں۔

''ہمیں معافی دے دیں چودھرائن جی۔ ہمیں اس کال کوٹھری کی سزا نہ دیں۔'' چودھرائن کے قدموں سے لپٹی وہ آہ و زاری کرتے ہوئے اس سے استدعا کرنے لگیں۔

''دور ہٹو نمک حراموں۔ تمہاری غلطی کی وجہ سے اتنا بڑا حادثہ ہوگیا۔ اب کیا دوسری غلطی میں کروں اور تمہیں آزاد چھوڑ دوں کہ تم لوگوں کے سامنے سب بکتی پھرو۔'' چودھرائن نے اپنی بھاری ٹانگ ان دونوں کو رسید کرتے ہوئے انہیں پیچھے دھکیلا۔

''ہم کسی سے کچھ نہیں کہیں گے وڈی چودھرائن! ہم تو ہمیشہ سے آپ کے وفادار رہے ہیں۔ ہماری ماں نے بھی ساری حیاتی آپ کی خدمت کی ہے اور ہم بھی ہمیشہ آپ کی خدمت کریں گے۔'' اب وہ دونوں اپنے ہاتھ جوڑے اپنی خدمتوں کا واسطہ دیتے ہوئے اس کا دل نرم کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''تمہاری خدمتوں کا ہی خیال ہے جو میں تمہیں صرف اس کوٹھری میں قید کررہی ہوں۔ کوئی اور ملازمہ ایسی غلطی کرتی تو میں اس پر کتے چھڑوا دیتی۔ اب بھی تم نے زیادہ شور مچایا تو پھر مجھے اسی طریقے سے تمہارا منہ بند کرنا پڑے گا۔'' چودھرائن کی دھمکی اتنی خطرناک تھی کہ دونوں بہنوں کی آوازیں حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئیں اور وہ از خود اس اندھیری کوٹھری میں داخل ہوگئیں۔ آج انہوں نے جان لیا تھا کہ دوسروں کے خلاف سازش کر کے مالکوں کا قرب حاصل کرنے سے کامیابی نہیں ملتی کیونکہ جن کو ظلم کی عادت ہو، وہ رحم بھی ایسے کرتے ہیں کہ ان کے ظلم سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔

☆☆☆

''لنڈا... مائی ڈارلنگ! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ تمہاری قربت میں کیسا جادو ہے۔ میں اس سے پہلے بھی بہت بار نیویارک آیا ہوں لیکن اس سے پہلے مجھے نیویارک اتنا حسین کبھی نہیں لگا جتنا کہ اب لگ رہا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا ویزا بڑھوا کر مزید کچھ عرصہ یہاں رک جاؤں۔'' چودھری کی انگلیاں لنڈا کے عریاں بازو پر تھرک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے شراب و شباب کا نشہ چھلکا پڑ رہا تھا۔

''ویزا تو آپ کا ابھی کافی باقی ہے چودھری صاحب... لیکن ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس سے پہلے ہی واپس روانہ ہوجائیں۔ آپ یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی میزبانی کرنا ہمیں بھاری پڑ رہا ہے مگر وہاں پاکستان میں کچھ کام ہیں جن کے لیے آپ کا وہاں ہونا ضروری ہے۔ رہا لنڈا کا مسئلہ ہے، یہ خود آپ سے ملنے وہاں آجائے گی۔''

ڈیوڈ کی بے وقت انٹری نے چودھری کے رومانٹک موڈ کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا لیکن اس کا آخری جملہ ایسا تھا کہ اس نے ڈیوڈ کی بات کی تلخی کو کچھ کم کردیا اور چودھری دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ''اگر لنڈا وہاں آگئی تو پھر تو ہمیں اپنا... ہیرآباد آپ کے نیویارک سے بھی زیادہ حسین لگنے لگے گا۔''

''آپ نے خوب چٹری بدلی ہے چودھری صاحب! ہیرآباد سے نکلے تھے تو ماہ بانو کے سوا کچھ یاد نہیں تھا اور اب لنڈا میں یوں کھوئے ہیں کہ ماہ بانو بالکل بھول گئی ہے۔'' ڈیوڈ نے اسے چھیڑا۔

''وہ بالکل الگ معاملہ ہے مسٹر ڈیوڈ! لنڈا سے تو ہمیں عشق ہوگیا ہے جبکہ ماہ بانو ہماری ضد ہے۔ اس لڑکی نے ہماری انا کو للکارا ہے۔ ہم جب تک اسے خاک میں نہیں ملائیں گے، ہمیں چین نہیں آئے گا۔'' چودھری نے پُر رعونت انداز میں جواب دیا۔

''چلیں آپ پاکستان واپس پہنچیں، آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔ ہماری طرف سے ہماری دوستی کا ثبوت ماہ بانو کی شکل میں آپ تک پہنچ جائے گا اور لنڈا تو ہے ہی آپ کی۔ جب آپ اسے یاد کریں گے، تب یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔'' بلتستان کے پہاڑی کیمپ کے انچارج نے ابھی تک ماہ بانو کے فرار کی خبر ڈیوڈ تک نہیں پہنچائی تھی اور فی الحال اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مفرور ماہ بانو اور عمران کو ڈھونڈ نکالے اس لیے ڈیوڈ بڑے پُراعتماد لہجے میں چودھری کے سامنے دعویٰ کر رہا تھا۔ درحقیقت پہلے تو خود اس کی نیت ماہ بانو پر خراب ہوئی تھی۔ مشرقی حسن کا نمونہ ماہ بانو پہلی نظر میں ہی اس کے دل کو بھا گئی تھی۔

پہلی بار اس نے اسے اس وقت ہشام ہوٹل کے باہر

دیکھا تھا جب وہ ایک ایکسپی ڈیشن ٹیم کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو رہا تھا۔ اس وقت وہ شہریار کے ساتھ تھی اور چونکہ وہ خود بھی وہاں سے روانہ ہو رہا تھا اس لیے اس کی طرف ایک فلائنگ کس اچھال کر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ بعد میں وہ اتنا مصروف رہا کہ اسے ماہ بانو کا خیال بھی نہیں رہا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں جا کر ہائیکنگ کے بہانے وہ ان پہاڑوں کے محل وقوع اور مختلف جغرافیائی حالات کے بارے میں بیش قیمت معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ انجینئرنگ کی پیشہ ورانہ تعلیم اور تنظیم کی طرف سے دی گئی تربیت کی وجہ سے اسے اپنے کام میں خاص مہارت حاصل تھی۔ سیر و تفریح اور ایڈونچر کے بہانے مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اس نے کئی اہم اور قیمتی نقشے تیار کر لیے تھے جو نہ صرف ان کی اپنی تنظیم کے پاس ریکارڈ میں موجود تھے بلکہ وقتاً فوقتاً وہ ان معلومات کا بھارتی سیکرٹ سروس را سے بھی تبادلہ کرتے رہتے تھے۔ ان معلومات کی فراہمی کے عوض را کو بھی ان کے لیے خدمات انجام دینی پڑتی تھیں لیکن چونکہ یہ خدمات پاکستان مخالف سرگرمیوں پر ہی مشتمل ہوتی تھیں اس لیے را والے بنا احتجاج خاموشی سے ان کا یہ کام کردیتے تھے۔

بعض اوقات معلومات کی اس فراہمی پر وہ لوگ صرف پاکستان کے خلاف کارروائی کروانے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ نقد معاوضہ بھی وصول کرتے تھے۔ اپنی پاکستان دشمنی میں بھارتی حکومت کو یہ سودا بھی مہنگا نہیں لگتا تھا کیونکہ موساد سے حاصل کردہ معلومات انہیں پاکستان کے خلاف شرانگیز کارروائیاں کرنے میں مدد دیتی تھیں۔ موساد کا اہم ترین ایجنٹ ڈیوڈ اپنے پاکستان کے دوروں میں نہ صرف یہ معلومات جمع کرتا تھا بلکہ موساد ہی کی پالیسی کے تحت قائم کردہ ایک مذہبی انتہاپسند تنظیم جو درحقیقت دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث تھی، اس کے مختلف مراکز کا دورہ بھی کر ڈالتا تھا۔ اس بار بھی اس نے پہاڑوں پر موجود خفیہ کیمپ کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے انچارج سے زیرِ تربیت افراد کے بارے میں رپورٹ حاصل کرنے کے علاوہ ہتھیاروں اور بارود کی مزید فراہمی کے بارے میں بھی ان کی ضروریات کے بارے میں جان کر آیا تھا۔ یہ ہتھیار اور بارود، فوڈ سپلائی کے ساتھ ہی چھپا کر کیمپ تک بھیجے جاتے تھے لیکن انہیں لے جانے والے جیپ ڈرائیورز کو اس بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی اور وہ اچھے معاوضے کے عوض ایک بہ ظاہر بے ضرر نظر آنے والا کام بہ خوشی انجام دے دیا کرتے تھے۔

ڈیوڈ اپنے معمول کے کامیاب دورے سے واپس لوٹ رہا تھا جب اس نے ہوشے میں ماہ بانو کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس موقع پر وہ مخصوص پہاڑی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی اور ہشام کے باہر نظر آنے والی ماہ بانو کے مقابلے میں خاصی مختلف نظر آنے کے باوجود اپنی شخصیت کی خاص دل آویزی کے باعث وہاں موجود سب خواتین سے ممتاز لگتی تھی۔ اس موقع پر ڈیوڈ نے بے ساختہ ہی اس کی کئی تصویریں کھینچ ڈالیں۔ جواب میں اس نے ماہ بانو کے چہرے پر پھیلنے والا ناگواری کا تاثر بھی دیکھا تھا لیکن پروا نہیں کی۔ البتہ خواہش کے مطابق وہ وہاں اس سے ملنے یا چھیڑ چھاڑ کرنے کی جرأت بھی نہیں کرسکا۔

کئی برسوں سے ان علاقوں میں سفر کرتے رہنے کے باعث اسے وہاں کے لوگوں کے مزاج کے بارے میں... بہ خوبی علم تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اسے لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں... مگر اگلی صبح جب اس نے ماہ بانو کو اپنی کیمپنگ سائٹ پر دیکھا تو شدید غلط فہمی کا شکار ہوگیا۔ اس نے گمان کیا کہ ماہ بانو ان لڑکیوں میں سے ہے جو غربت سے تنگ آکر اور روپیا کمانے کے لیے غیر ملکی سیاحوں کا کھلونا بننا قبول کر لیتی ہیں۔ اسی حساب سے اس نے اسے اپنے خیمے میں گھسیٹ کر اس سے زبردستی کرنی چاہی لیکن ماہ بانو کے ردِعمل نے اسے بتا دیا کہ وہ غلطی پر ہے۔ پھر اکرم خان کی مداخلت کی وجہ سے نہ صرف اسے اپنے مکروہ ارادے میں ناکام ہونا پڑا بلکہ اکرم خان کے ہاتھوں شدید ہزیمت بھی اٹھانی پڑی۔

جہاں وہ اپنی اس ذلت پر بُری طرح چڑا، وہیں ماہ بانو کی شخصیت کے بارے میں بھی کھٹک گیا۔ اس کے پہاڑی لڑکیوں سے مختلف نین نقش ویسے ہی چونکا دینے والے تھے، اس پر سے اس کی اس سے جو مختصر گفتگو ہوئی، اس سے بھی یہ بات سامنے آگئی کہ وہ کوئی پہاڑی دوشیزہ نہیں ہے۔ ایک مختلف ماحول کی لڑکی ان پہاڑی وادیوں میں کیا کررہی ہے، اس کے ذہن میں تجسس جاگ اٹھا۔ رہی سہی کسر اس کے پاس کی نہیں تھی۔ وہ پاکستان میں موجود اپنے نیٹ ورک کو حرکت میں لے آیا۔ نتیجتاً اسے ماہ بانو کی ساری ہسٹری معلوم ہوگئی۔ چودھری افتخار کا نام اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پہلے ہی ان کی لسٹ میں موجود تھا۔ چودھری کو لالچ دینے کے لیے اس نے بہتر سمجھا کہ ماہ بانو کو کسی طرح اپنے قبضے میں لے لیا جائے۔ ہوشے سے اسے اغوا کر کے کسی بڑے شہر تک فوری طور پر پہنچانے میں خطرہ ہوتا چنانچہ اس نے اس کام کے لیے اپنے پہاڑی کیمپ پر موجود بندوں کو استعمال کیا اور یوں ماہ

www.pkdigest.com

بانو ہوشے سے نکل کر برف زار کے ایک غار میں پہنچ گئی۔

ڈیوڈ کو اطمینان تھا کہ وہ ماہ بانو کی تلاش کا سلسلہ ٹھنڈا پڑنے پر جب چاہے گا اسے وہاں سے نکال کر چودھری تک پہنچا دے گا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے۔ چودھری بھی ان کی مٹھی میں آجاتا اور ماہ بانو سے وہ اپنی ذلت کا بدلہ بھی چکا دیتا۔ اکرم خان کو تو پہلے ہی اس کے آدمی ٹھکانے لگا چکے تھے۔ جدید دنیا کا باسی... بہ ظاہر بہت مہذب دکھائی دینے والا ڈیوڈ درحقیقت پیرآباد کے چودھری افتخار سے فطرت میں مختلف نہیں تھا۔ چودھری کو اگر اپنی چودھراہٹ اور جاگیر کا غرور تھا تو ڈیوڈ بھی اپنے اختیارات پر نازاں تھا۔ یہ غرور اور ناز ایسے جذبات نہیں جو آدمی کو آپے میں رہنے دیں۔ ''میں اوروں کے مقابلے میں بااختیار ہوں...'' یہ احساس بہت کم ہی افراد میں عاجزی اور خدمت گزاری کا وصف پیدا کرتا ہے، ورنہ عموماً تو لوگ خود کو زمینی خدا تصور کرنے لگتے ہیں جنھیں خلافِ مزاج کچھ گوارا نہیں ہوتا اور جب کچھ مرضی سے ہٹ کر ہو جائے تو پھر وہ اس کا بدلہ لیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

''کیا بات ہے مسٹر ڈیوڈ! آپ ہم سے بات کرتے کرتے کن خیالات میں ڈوب گئے؟'' چودھری سے ماہ بانو کا ذکر کرتے ہوئے ڈیوڈ کو خود بھی بہت کچھ یاد آگیا تھا چنانچہ وہ کچھ دیر کے لیے ماحول سے کٹ گیا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے چودھری نے اسے ٹوکا۔

''ہمیں کس کے خیالوں میں ڈوبنا ہے چودھری صاحب! یہ تو آپ خوش نصیب ہیں جو ہر جگہ ایک حسینہ آپ کی منتظر ہے۔'' ڈیوڈ نے ہنس کر مذاق میں بات ٹالی تو چودھری بھی زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس قہقہے کی گونج میں ہی اسے اپنے موبائل کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے موبائل نکال کر اسکرین پر آنے والا نمبر دیکھا۔ حویلی کے نمبر سے کال کی جارہی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا کہ لائن کاٹ دے پھر یہ سوچ کر کہ ہو سکتا ہے کوئی اہم معاملہ درپیش ہو، کال ریسیو کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ شہریار کے اغوا والے معاملے کے بعد وہ اپنی فون کالز کی طرف سے خاصا محتاط تھا۔ اس وقت بھی موبائل فون بند رکھنے کی وجہ سے اس کا اپنے بندوں سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا اور کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

''سلام چودھری صاحب! میں وڈی چودھرائن گل کررہی ہوں۔'' چودھری نے جیسے ہی کال ریسیو کی، دوسری طرف سے اپنی بیگم نمبر ایک کی آواز سنائی دی جسے خود کو وڈی چودھرائن کہلوانے کی اس قدر عادت پڑ چکی تھی کہ اپنے نام کا استعمال وہ خود بھی ترک کر چکی تھی اور خود کو اکثر وڈی چودھرائن ہی کہہ کر متعارف کروائی تھی۔

''کی گل ہے؟ اس وقت تو نے مجھے کیسے فون کیا ہے؟'' جوان و حسین لنڈا کی قربت میں اپنی موٹی بھدی اور برسوں پرانی بیوی کی آواز سننا بھی اسے سخت ناگوار گزرا تھا، چنانچہ اس کے سلام کا جواب دیے بغیر بیزاری سے پوچھا۔

''وڈی خاص گل تھی چودھری صاحب... اس لیے مجھے آپ کو فون کرنا پڑا۔ آپ اتنی دور ہو، کچھ چنگی گل نہیں لگتی کہ آپ کو پریشان کروں، پر میں بھی مجبور ہوں... گل ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ کو بتائے بغیر رہا بھی نہیں جا سکتا۔ میری تو اپنی مت ماری گئی ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ اب آپ ہی کچھ مشورہ دیں گے تو میں کچھ کر سکوں گی۔''

''کیا پہیلیاں بھجوائے جارہی ہے... سیدھی طرح بتا کہ کیا گل ہے؟'' وڈی چودھرائن کے لہجے سے اس نے اتنا تو بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آچکا ہے لیکن یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کون سی غیر معمولی صورتِ حال ہو گی جس کے لیے وڈی چودھرائن نے اسے اتنی دور کال کر کے اطلاع دینا ضروری سمجھا ہے؟ اس لیے ذرا غصے اور چڑچڑے پن سے سوال کیا۔

''کیا بتاؤں چودھری صاحب اگل ہی کچھ ایسی ہے کہ بتاتے ہوئے میری زبان رکتی ہے۔ حویلی کی عزت داؤ پر لگی ہے اور میری کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ کیا کروں؟'' اپنی بات کے اختتام پر وڈی چودھرائن نے باقاعدہ رونا شروع کردیا تھا۔

''میں کہتا ہوں مینوں اصل گل دس، پہیلیاں نہ بجھوا۔'' چودھری اعصاب زدہ ہو کر حلق کے بل دہاڑا۔

''کشور کہیں غائب ہو گئی ہے چودھری صاحب! آپ کی دھی ہمارے منہ پر کالک مل گئی ہے۔'' وڈی چودھرائن نے ایسے الفاظ اور انداز میں اطلاع دی کہ حادثے کی شدت دگنی ہو کر چودھری تک پہنچی۔

''کیا بک رہی ہے... ہوش میں تو ہے یا نہیں؟'' اس نے یقیناً چیخنے کی ہی کوشش کی تھی لیکن آواز حلق کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئی تھی اور وہ بس سرگوشی میں ہی وڈی چودھرائن سے یہ سوال کر سکا تھا۔

''ہوش تو میرے سچ مچ گم ہو گئے ہیں چودھری صاحب! لیکن جو کچھ میں نے آپ کو بتایا ہے وہ بالکل سچ ہے۔''

''مجھے تفصیل سے ساری گل بتا۔ آخر تیرے ہوتے ایسا کس طرح ہو گیا؟ کیا میرے پیچھے تو نے حویلی کے معاملات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں؟'' وہاں ڈیوڈ

اور لنڈا کی موجودگی کی وجہ سے اس نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا لیکن پھر بھی لہجے سے دبا دبا غصہ جھلک ہی رہا تھا۔ ڈیوڈ کی اردو اور پنجابی سے واقفیت کی بنا پر اسے خاص طور پر احتیاط برتنی پڑ رہی تھی۔

''میری آنکھیں بند نہیں تھیں مگر وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ حویلی سے درگاہ جانے کی اجازت لے کر نکلی تھی۔ شادو اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھے لیکن جانے اس نے کیا چکر چلایا کہ ان دونوں کو خبر بھی نہیں ہوئی اور وہ درگاہ سے غائب ہو گئی۔ جانے کون ہے جس نے اس کو یہ راہ دکھائی اور اپنے ساتھ لے اڑا۔ میں تو پہلے ہی اس کڑی کے کرتوتوں کی طرف سے فکر میں تھی لیکن اس کی ماں کی شہ اور آپ کی ڈھیل کی وجہ سے ہر واری مجھے ہی چپ ہونا پڑا۔'' وہ بہت عرصے سے کشور کے خلاف اپنے دل میں جمع زہر اگلنے لگی۔

''یہ وقت ایسی گلاں کرنے کا نہیں۔ تو ایسا کر کہ اس کی سب سے قریبی ملازمہ رانی کو ٹٹول۔ مجھے یقین ہے کہ اس کو ضرور کچھ نہ کچھ خبر ہو گی۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا اپارٹمنٹ کی بالکنی کی طرف چلا گیا اور دھیمی آواز میں چودھرائن کو مشورہ دیا۔

''ہاں چودھری صاحب! میں ابھی بندہ دوڑاتی ہوں۔ رانی آج کل شہر والی کوٹھی میں رہ رہی ہے۔ اسے گاؤں بلوا کر میں اس کے حلق سے اگلواتی ہوں کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟'' چودھری کا مشورہ سن کر وہ فوراً جوش میں آگئی۔ کشور کی ملازمۂ خاص رانی پر پہلے ہی اسے شک رہتا تھا کہ وہ حویلی سے زیادہ کشور کی وفادار ہے لیکن آج کل چونکہ رانی لاہور میں رہ رہی تھی، اس لیے کشور کے غائب ہوتے ہی اسے رانی کا خیال نہیں آیا تھا۔

''تو یہ کام کر۔ میں پہلی فلائٹ ملتے ہی واپس آتا ہوں۔ اور ہاں... خیال رکھنا کہ کسی کو کانوں کان اس گل کی خبر نہ ہو سکے۔''

''تسی فکر نہ کرو چودھری صاحب! کسی نوں کچھ خبر نہیں ہے۔ صرف شادو اور اس کی بہن چھمی کو علوم تھا، ان دونوں کو میں نے حویلی کے تہ خانے میں ڈال دیا ہے۔'' چودھری کی ہدایت کے جواب میں اس نے فخر سے اپنا کارنامہ سنایا۔

''چنگی گل ہے۔ اب تو فون بند کر۔ میں کچھ دوستوں کے ساتھ ہوں زیادہ کھل کر گل نہیں کر سکتا۔'' چودھری نے کہتے ہوئے خود ہی لائن کاٹ دی اور پھر موبائل جیب میں رکھ کر چہرے پر ایک نمائشی سی مسکراہٹ سجائے ہوئے کمرے میں واپس آیا۔

''خیریت چودھری صاحب! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟ کوئی مسئلہ ہے تو بتائیں... آخر ہم آپ کے دوست ہیں، آپ کی پریشانی برداشت نہیں کر سکتے۔'' اس کی مسکراہٹ کے باوجود ڈیوڈ نے اس کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں مسٹر ڈیوڈ! بس ایک چھوٹا سا پرسنل پرابلم ہے، میں خود ہی سولو کرلوں گا... بلکہ ابھی آپ ذکر کر ہی رہے تھے کہ مجھے واپس پاکستان چلے جانا چاہیے تو بس سمجھیں کہ ایسا سبب بن گیا ہے کہ میں خود بھی فوری طور پر واپس جانا پسند کروں گا۔'' جو حادثہ اس کے ساتھ پیش آچکا تھا، وہ اس کے بارے میں اپنی زبان سے کسی کو کیسے کچھ بتا سکتا تھا؟ چنانچہ ڈیوڈ کے سوال کرنے پر اسے ٹال گیا اور پھر فوری طور پر اس سے اور لنڈا سے اجازت لے کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ابھی وہ جس پریشانی میں مبتلا تھا، اس کے ہوتے لنڈا کا حسین وجود بھی اپنی کشش کھو بیٹھا تھا۔ لنڈا اور ڈیوڈ نے اس کا یہ انداز دیکھا تو چونک پڑے۔

''مجھے لگتا ہے کہ چودھری کے ساتھ کوئی بڑا مسئلہ ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے ہم اس کے مسئلے سے کوئی فائدہ اٹھا سکیں۔ تم فون کر کے پیرآباد میں موجود ایجنٹ کی ڈیوٹی تو لگاؤ کہ وہ ذرا اس معاملے کی کھوج لگائے۔'' ڈیوڈ نے لنڈا کو ہدایت کی تو وہ ٹیلی فون پر مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔ رابطہ ملنے پر اس نے ڈیوڈ کا حکم دوسری طرف سنایا اور پھر اس اطمینان کے ساتھ کہ جلد اصل معاملہ ان کے سامنے آجائے گا، کال منقطع کردی۔

☆☆☆

''تم شہر کس کام سے آئے تھے؟'' گاڑی کی پچھلی نشست پر اپنے سامان کی گٹھڑی کے ساتھ بیٹھی رانی نے ڈرائیور سے پوچھا۔ اسے اتنی اچانک واپسی کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ ڈھنگ سے اپنا سامان بھی سمیٹ نہیں پائی تھی۔ اب گاڑی میں بیٹھ کر اسے یاد آرہا تھا کہ کوٹھی کی عقبی جانب اس نے اپنا بالکل نیا جوڑا دھو کر ڈالا تھا اور جلدی میں وہ جوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ یہ جوڑا اسے کشور نے اپنے لاہور میں قیام کے عرصے میں خرید کر دیا تھا اور اسے خاصا پسند تھا۔ اس کے علاوہ اس کی چاندی کی بالیاں بھی جو کہ حاجرہ نے اس سے مستعار لے کر پہنی تھیں، وہیں رہ گئی تھیں۔ دوسرے بھی کئی چھوٹے چھوٹے معاملات تھے جن پر اس کے خیال میں وہ ڈرائیور کے جلدی مچانے کی وجہ سے خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکی تھی لیکن اب چلتی گاڑی میں بیٹھ کر کچھ ہو بھی نہیں سکتا تھا اس لیے وقت گزاری کے لیے ڈرائیور سے گفتگو شروع کردی۔

www.pkdigest.com

"نہیں، مجھے شہر میں کوئی کام نہیں تھا۔ بس میں تجھے لینے کے لیے ہی آیا تھا۔ سویرے سورج نکلنے سے بھی پہلے وڈی چودھرائن کا حکم ملا کہ شہر جا کر رانی کو لے آؤ تو میں تجھے لینے آ گیا۔" ڈرائیور نے اس کے سوال کے جواب میں بیزاری سے بتایا۔ اسے اپنا منہ اندھیرے جگا کر شہر روانہ کیا جانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن اسے کیا خبر تھی کہ وڈی چودھرائن نے رات بھی کس مشکل سے گزاری ہے۔ کشور کے غائب ہونے کا علم ہونے کے بعد دیگر معاملات سے نمٹنے اور چودھری سے رابطہ ہونے میں اچھا خاصا وقت لگ گیا تھا، ورنہ ممکن تھا کہ وہ رات کو ہی اسے لاہور روانہ کر دیتی۔

"کشور بی بی تو خیریت سے ہیں نا؟ کہیں انہوں نے ہی تو مجھے نہیں بلوایا؟" رانی چونکہ اسے اچانک بلائے جانے پر حیران تھی اس لیے اس اچانک طلبی کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں کشور کی ضد ہی اس کی واپسی کا سبب بن سکتی تھی اس لیے اس کے بارے میں سوال کیا۔

"مجھے تو وڈی چودھرائن کا حکم ملا تھا۔ اب ان سے کس نے کیا کہا مجھے خبر نہیں۔ ویسے تو اطمینان رکھ، کشور بی بی بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کل ہی میں عصر کے بعد انہیں درگاہ پر حاضری کے لیے لے کر گیا تھا۔" اس کی فکرمندی دیکھتے ہوئے ڈرائیور نے اسے تسلی دی تو وہ ذرا دیر کے لیے خاموش ہو گئی لیکن تشویش اپنی جگہ قائم تھی۔ بغیر وجہ کے وہ خاص طور پر گاڑی بھیج کر اپنے بلوائے جانے کو کسی طرح قبول نہیں کر پا رہی تھی۔

"میرے گھر پر تو سب ٹھیک ہے نا؟" مختصر سی خاموشی کے بعد اس نے دل میں آنے والے ایک اندیشے کے تحت سوال کیا۔

"ہاں ہاں، سب ٹھیک ہے۔ اگر ٹھیک نہیں بھی ہوتا تو کیا تیرے خیال میں حویلی والے اتنے رحم دل ہیں کہ تیرے گھر کی پریشانی پر گاڑی بھیج کر تجھے شہر سے بلواتے۔ ان کا اپنا ہی کوئی کام ہوگا جو انہوں نے تجھے بلوایا ہے۔" ڈرائیور نے جھنجلاہٹ زدہ لہجے میں جو جواب دیا، وہ تلخ ہونے کے باوجود اپنی جگہ بالکل سچ تھا جسے سن کر رانی کو خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اسی خاموشی میں اونگھتے جاگتے واپسی کا سفر طے ہو گیا اور وہ پیر آباد کی حدود میں داخل ہو گئے۔ گاڑی کے پیر آباد میں داخل ہوتے ہی رانی کے دل نے بے حد خوشی محسوس کی۔ لاہور جیسے بڑے اور پُررونق شہر میں رہ کر بھی اسے اپنے اس کچے پکے گھروں والے پیر آباد کی یاد مسلسل ستاتی رہی تھی اور اب جبکہ وہ پیر آباد کی فضاؤں میں سانس لے رہی تھی تو یہ اس کے لیے ازحد خوشی کا مقام تھا۔ خوشی کی اس کیفیت میں ڈوبی وہ آنے والے ظالم وقت کی آہٹیں سنے بغیر حویلی تک پہنچ گئی۔

"سیدھی وڈی چودھرائن کے پاس چلی جا۔ انہوں نے کہا تھا کہ رانی کو لاتے ہی فوراً میرے پاس بھیجنا۔" وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ ڈرائیور نے اسے وڈی چودھرائن کا پیغام پہنچایا۔ وہ جو حویلی پہنچتے ہی کشور کے کمرے کا رخ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس حکم کو سن کر ٹھٹک گئی۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے کشور کے اصرار پر حویلی واپس بلوایا گیا ہوگا لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ گڑبڑ کا پتا وڈی چودھرائن سے ملنے کے بعد ہی چل سکتا تھا چنانچہ وہ اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ اس کے سامان کی گٹھڑی بھی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

"وڈی چودھرائن اپنے کمرے میں نہیں ہے رانی! میرے ساتھ آ میں تجھے ان کے پاس لے چلوں۔" ابھی وہ وڈی چودھرائن کے کمرے کی طرف جانے والی راہداری میں مڑی ہی تھی کہ اسے چھچھی مل گئی۔

"خیر تو ہے... تو بڑی کمزور لگ رہی ہے... چہرہ اترا ہوا سا ہے۔ کیا بیمار رہی ہے؟" چھچھی کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے اس نے اس سے دریافت کیا۔

"ٹھیک ہوں میں۔" چھچھی نے جس کی شکل ایک دن کی قید کے بعد ہی بالکل اتر کر رہ گئی تھی، سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا تو اس کی مزید سوال کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ویسے بھی چھچھی اور اس کی بہن شادو سے اس کے تعلقات کبھی بھی زیادہ اچھے نہیں رہے تھے۔ وہ ان خوشامدی اور سازشی لڑکیوں سے دور ہی رہنا پسند کرتی تھی۔

"وڈی چودھرائن ادھر ہے؟" جب چھچھی اسے لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ جواباً چھچھی نے محض اثبات میں سر کو جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

"پر وہ ادھر کیا کر رہی ہے؟" اسے تہ خانے میں جاتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

"اس کی مرضی جو چاہے کرے۔ تو اور میں کون ہوتے ہیں سوال کرنے والے؟" چھچھی کا لہجہ اگرچہ جھنجلایا ہوا تھا لیکن بات اس نے سولہ آنے درست کہی تھی۔ واقعی کسی ملازمہ کی کیا مجال تھی کہ وہ مالکن سے سوال کر سکتی۔ رانی کو بھی چار و ناچار تہ خانے کی سیڑھیاں اترنی پڑیں لیکن اب اس کے دل میں خوف اس طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ گاؤں آنے کی ساری خوشی اڑن چھو ہو گئی تھی۔ سیڑھیاں اترنے کے بعد چھچھی اسے

لیے تہ خانے کے ایک کمرے کی طرف بڑھی۔ رانی کا آج پہلی بار تہ خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس تہ خانے کے بارے میں اس نے بہت سی کہانیاں ضرور سن رکھی تھیں۔ سنا تھا کہ یہ تہ خانہ چودھری کے دادا نے حویلی تعمیر کرتے وقت بنوایا تھا اور اس تہ خانے کی حیثیت ایک نجی جیل جیسی تھی جہاں وہ اپنے ناپسندیدہ افراد کو قید میں رکھتے اور ایذا دیتے تھے۔ دادا کے بعد چودھری کا باپ بھی اس تہ خانے کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن چودھری کے بارے میں یہی سننے میں آیا تھا کہ اس نے تہ خانے کا یہ استعمال بند کر دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی رحم دلی نہیں بلکہ عقل مندی تھی۔ بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر اس نے یہ احتیاط کی تھی کہ اپنی ذاتی رہائش گاہ کو کسی متنازع کام کے لیے استعمال نہ کرے۔ دوسرے وہ اپنے باپ دادا کی طرح اپنے مخالفین کو مستقل قید میں رکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا تھا۔ عموماً اس کے مجرم و دشمن چند دن کی قید اور ایذا سہہ کر اپنے انجام کو پہنچ جاتے تھے... اور اس مقصد کے لیے ڈیرا حویلی سے زیادہ مناسب تھا جہاں معاملات اہل خانہ سے بھی مخفی رہتے ہوئے بالا ہی بالا نمٹ جاتے تھے۔ بہرحال جو بھی تھا، فی الحال تو رانی اس بدنام تاریخی پس منظر رکھنے والے تہ خانے کی گھٹن زدہ فضا میں خود کو نہایت خوف زدہ اور مجبور محسوس کر رہی تھی۔ چھچھی اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں موجود وڈی چودھرائن کے چہرے کے تاثرات نے اس کے خوف کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا۔ وہ قہر برساتی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سلام وڈی چودھرائن۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں سلام کیا۔ اپنا جرم معلوم نہ ہونے کے باوجود اتنا اندازہ تو لگا چکی تھی کہ کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہے جس نے وڈی چودھرائن کو اس کی طرف سے برگشتہ خاطر کر دیا ہے۔

"شادو، چھچھی! اسے پکڑ کر رسیوں سے باندھ دو۔" اس کے سلام کا جواب دیے بغیر وڈی چودھرائن نے اپنی چمچیوں کو حکم دیا۔ وہ دونوں فوراً ہی حرکت میں آ گئیں۔ خود ان کے ساتھ وڈی چودھرائن نے جو سلوک کیا تھا، اس کے پیش نظر تو اصولاً ان دونوں کی ہمدردیاں رانی کے ساتھ ہونی چاہیے تھیں لیکن وہ اپنی لالچی اور مکار فطرت کی وجہ سے ایک بار پھر وڈی چودھرائن کے جھانسے میں آ گئی تھیں۔

وڈی چودھرائن نے ان سے کہا تھا کہ میں جانتی ہوں تم دونوں میری وفادار ہو اور کشور والے معاملے میں بھی تم نے وفاداری نبھاتے ہوئے رازداری برتو گی لیکن میں تمہیں قید کرنے پر مجبور تھی کیونکہ یہ چودھری صاحب کا حکم تھا۔ اب ایسا ہے کہ تم دونوں کی جان اسی طرح چھوٹ سکتی ہے کہ کسی طرح کشور ہمارے پاس واپس آ جائے۔ اسے واپس لانے کے لیے ہم جو کوششیں کر رہے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کشور کی ملازمۂ خاص رانی سے کسی طرح اس شخص کا نام پتا اگلوایا جائے جس کی خاطر کشور نے ایسی حرکت کی ہے۔ میں رانی کو یہاں بلوا کر پوچھ گچھ کروں گی۔ ظاہر ہے، وہ آسانی سے تو بتائے گی نہیں اس لیے ہو سکتا ہے کہ اسے مار پیٹ کر سچ اگلوانے کی کوشش کرنی پڑے۔ میں خود تو یہ کام نہیں کر سکتی اس لیے تم دونوں کو میری مدد کرنی ہوگی۔ اگر تم رانی سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہو سکیں تو میں چودھری صاحب سے تمہاری سفارش کر کے تمہیں یہاں سے باہر نکلوا دوں گی۔

آزادی کے لالچ میں دونوں بہنوں نے اس کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور یہ بھول گئی تھیں کہ حکمرانوں کے وعدے بھی انہی کی طرح چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس وقت چودھرائن نے جو پیشکش کی تھی، وہ اپنی غرض سے تھی۔ رانی سے سچ اگلوانے کا کام وہ خود نہیں کر سکتی تھی اور کسی اور ملازم کو اس کام کے لیے استعمال کرنا بات کو پھیلانے کا سبب بنتا چنانچہ جو پہلے ہی سے باعلم تھے، انہی کو استعمال کرنا بہتر تھا۔

"چھوڑو... مجھے کیوں باندھ رہی ہو؟" دونوں بہنیں اسے بازو سے پکڑ کر رسی تک لے گئیں تو وہ احتجاجاً چلائی مگر انہوں نے اس کی مزاحمت کے باوجود اسے دو مخالف دیواروں میں لوہے کے کنڈے کی مدد سے دیوار سے لگی ہوئی رسیوں تک پہنچا کر دم لیا۔ پہلے اس کے دائیں ہاتھ کو رسی کی مدد سے باندھا گیا اور پھر بائیں ہاتھ کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اب وہ فرش پر اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں بندھی رسیوں سے لٹکے ہوئے تھے۔

"میرا قصور کیا ہے وڈی چودھرائن! میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے کہ آپ مجھے ایسی سزا دے رہی ہیں؟" خود کو باندھے جانے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر کے وڈی چودھرائن سے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ معصوم نہ بن۔ مجھ سے اپنا قصور پوچھتی ہے نمک حرام! تو ہی تو ہے جس کے سہارے وہ کشور کی بچی اتنا بڑا کام کر گئی ہے۔ اب تو ہمیں بتائے گی کہ وہ حویلی سے بھاگ کر اپنے کس یار کے پاس گئی ہے؟" وڈی چودھرائن نے قہر آلود لہجے میں پوچھا۔

"کشور بی بی حویلی سے چلی گئیں؟" رانی حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں بولی۔

www.pkdigest.com

"ہاں... اور اب تُو ہمیں بتائے گی کہ وہ بھاگ کر کہاں گئی ہے؟" چودھرائن نے اس کا انداز بھانپ لیا اور دوٹوک لہجے میں بولی۔

"میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں جی! میں تو حویلی میں تھی ہی نہیں۔ مجھے بھلا کیا خبر کہ وہ کہاں گئی ہیں؟" رانی نے تجاہل برتتے ہوئے اپنی قطعی لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

"شادو..." اس کا جواب سن کر وڈی چودھرائن بلند آواز سے چیخی۔ نتیجتاً رانی کے بائیں جانب ہاتھ میں چمڑے کا بیلٹ لے کر کھڑی ہوئی شادو کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ بیلٹ کا بکل لوہے کا تھا اور شادو نے اسے اس انداز سے پکڑا ہوا تھا کہ بیلٹ حرکت کرتا ہوا اس کی پیٹھ کی طرف بڑھا تو اس کا بکل والا سرا آزاد تھا جو ٹھک سے آکر اس کی پیٹھ پر لگا۔ کھا کھا کر جسم میں چربی جمع کر لینے والی شادو کے اس وار میں بڑی طاقت تھی۔ رانی اچھی خاصی سخت جان ہونے کے باوجود بلبلا کر رہ گئی۔

"اب بھی وقت ہے، مجھے سب کچھ بتا دے ورنہ میں تیری کھال اُدھڑوا کر رکھ دوں گی۔" اسے بلبلاتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے اسے خبردار کیا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔" چودھرائن کی دھمکی کے باوجود رانی اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹی۔ وہ ہمیشہ کشور سے وفاداری کا دم بھرتی رہی تھی اور آج وہ وقت آگیا تھا کہ وہ اپنی وفاداری کو ثابت کر دکھاتی۔ چنانچہ نتائج کی پروا کیے بغیر اپنی لاعلمی کے دعوے پر قائم رہی۔

"ٹھیک ہے پھر۔ تیری چمڑی کو مار ہی چاہیے تو اب میں ان دونوں کو نہیں روکوں گی۔ جب تیرا مار کھا کھا کر دل بھر جائے تو آپ مجھے بتا دینا۔" چودھرائن سفاکی سے کہتے ہوئے کرسی کی پشت سے اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور منکر نکیر کی طرح رانی کے دائیں بائیں کھڑی پچھی اور شادو کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں کمرے میں موجود واحد کرسی پر براجمان چودھرائن کے اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آگئیں اور ان کے ہاتھ متواتر چمڑے کی بیلٹوں سے رانی کی پشت پر ضرب لگانے لگے۔ ہر ضرب پر رانی کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکلتی لیکن مارنے والے ہاتھ اور تماشا دیکھنے والی آنکھیں رحم سے ناواقف تھیں۔

"مجھے چھوڑ دو۔ مجھے کچھ نہیں معلوم۔" چیخوں کے درمیان رانی کا تواتر سے کہا جانے والا یہ جملہ بھی گویا کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بالآخر پہلے اس کے الفاظ گم ہوئے اور پھر حلق سے نکلتی چیخیں بھی دم توڑ گئیں۔ وہ اس بہیمانہ تشدد سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اس کا سر ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ اگر اس کے دونوں ہاتھ دیوار کے ساتھ بندھی رسیوں میں نہ جکڑے ہوتے تو وہ فرش پر گر پڑتی لیکن اب اس کا بے ہوش وجود کسمپرسی کے عالم میں جھول رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہوئی تو پچھی اور شادو نے اپنے ہاتھ روک لیے۔ وہ خود اس مشقت کی وجہ سے ہانپ سی گئی تھیں۔

"ہوش میں لاؤ اسے۔ مکر کر رہی ہے نمک حرام۔ اسے سارے چکر کا چنگی طرح پتا ہے۔ دن رات کشور کے پاس گھسی رہتی تھی۔ اس کی رازداں تھی جب ہی تو وہ ہر وقت اس کی طرفداری کرتی تھی۔ اس کے سوا کسی اور نوکرانی کو تو اس نے کبھی اتنا سر نہیں چڑھایا۔" رانی کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر وڈی چودھرائن نے نفرت زدہ لہجے میں حکم جاری کیا۔ اس کے حکم پر شادو نے وہاں موجود پانی کا جگ رانی کے چہرے پر الٹ دیا۔ پانی کی ٹھنڈک سے وہ جھرجھری سی لے کر ہوش میں آگئی۔

ہوش میں آنے کے بعد تکلیف کے شدید ترین احساس کے ساتھ اس نے جو دوسری بات محسوس کی وہ یہ تھی کہ چہرے اور گردن کو بھگونے کے بعد قمیص کو بھی تر کر کے زمین پر گرنے والے پانی کے قطروں کے علاوہ کوئی اور سیال بھی ہے جو اس کے جسم پر سے قطروں کی صورت پھسلتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔ اس سیال کی حرکت وہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ ذرا سا جھکا کر نیچے اپنے قدموں کی طرف دیکھا تو پانی کے ساتھ گھلتے ملتے سرخ رنگ نے اس پر حقیقت عیاں کر دی۔ لوہے کے بکل سے اُدھڑ جانے والی پیٹھ سے خون کا اخراج شروع ہو گیا تھا اور یہ خون قطرہ قطرہ کر کے نیچے گر رہا تھا۔

"کچھ یاد آیا تجھے... یا یاد کروانے کے لیے کچھ اور انتظام کروں؟ میرے پاس ابھی تجھ سے سچ اگلوانے کے لیے بہت طریقے ہیں۔" چودھرائن نے اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنز سے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں جانتی جی! میں تو یہاں تھی ہی نہیں۔" رانی نے نقاہت زدہ لہجے میں اپنا پچھلا بیان دہرایا۔

"اچھا چل، مان لیا کہ تو یہاں نہیں تھی اس لیے تجھے کچھ خبر نہیں کہ تیری بی بی کس کے ساتھ اور کس طرح بھاگی ہے، جب تو یہاں تھی، تب کی گل تو بتا سکتی ہے۔ مجھے بتا کہ وہ کس سے چھپ چھپ کر فون پر گل کرتی تھی۔ اس کے پاس جو موبائل تھا وہ اسے کس نے دیا تھا؟" چودھرائن نے طراری کے ساتھ اس سے سوال کیا۔

"مجھے نہیں خبر۔ میں نے ان کے پاس کوئی موبائل

نہیں دیکھا۔" اس نے چودھرائن سے نظریں چراتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"تُو بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ تیری اس ڈھٹائی کا علاج کرنا ہی پڑے گا۔" چودھرائن اس کا جواب سن کر چراغ پا ہو گئی اور اپنی چمچیوں کو ہاتھ سے کوئی اشارہ کیا۔ اس اشارے کو پا کر پچھی نے ایک جانب رکھی پلاسٹک کی برنی اٹھائی اور اس میں موجود نمک اور سرخ مرچوں کا مکسچر مٹھی میں بھر کر رانی کی زخمی پیٹھ پر مل ڈالا۔ پہلے ہی ٹیسیں دیتے زخم، نمک اور مرچ لگتے ہی جل اٹھے۔ رانی کو بالکل ایسا لگا کہ اس کی پیٹھ پر کسی نے آگ بھڑکا دی ہو۔ وہ تکلیف کی شدت سے ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح چیخنے لگی۔ یہ تکلیف اتنی شدید تھی کہ ایک دفعہ تو اسے وفاداری کا سبق بھی بھولنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ وڈی چودھرائن کو سب کچھ بتا کر اس عذاب سے نجات حاصل کر لے لیکن یہ خیال بس لمحاتی ہی تھا۔ شدید تکلیف کے عالم میں بھی عقل نے اس کا دامن تھام لیا اور وہ سچ اگلتے اگلتے اپنے لبوں کو بھینچ گئی۔

یک دم ہی اسے خیال آگیا تھا کہ سچ بولنے کے بعد بھی اس کی جاں بخشی ہونا ممکن نہیں۔ کشور کے جرم میں اس کا ساتھ دینے اور اس کے راز کو راز رکھنے کا قصور اتنا بڑا تھا کہ وہ سب بتا کر بھی سزا سے نہیں بچ سکے گی۔ حویلی والوں کی یہ روایت رہی تھی کہ وہ اپنی کسی بہو بیٹی کے قدم لڑکھڑانے پر اس سے بعد میں حساب لیتے تھے، اس کے مددگاروں کو پہلے ٹھکانے لگاتے تھے۔ یعنی یہ طے تھا کہ وہ زبان بند رکھے یا کھول دے، خود کسی صورت نہیں بچ سکتی تھی... تو پھر بہتر تھا کہ اپنی وفاداری پر آنچ نہ آنے دیتی اور کشور کو جس سے وہ حقیقتاً خود بھی بہت محبت کرتی تھی، ایک بار اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے کا موقع فراہم کر دیتی۔ ذہن و دل میں بیک وقت ابھرنے والے یہ خیالات و جذبات ایسے تھے کہ پیٹھ پر بھڑکتے شعلوں کی آنچ کم ہونے لگی اور اس کے حلق سے نکلتی چیخیں دم توڑ گئیں۔ درحقیقت وہ ایک بار پھر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر بازوؤں میں بندھی رسی سے جھول گئی تھی۔

"اسے ایسے ہی بندھا رہنے دو۔ دوبارہ ہوش آئے تو کھانا پانی دینے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہوش میں آنے کے بعد ایک بار پھر اس کے زخموں میں نمک بھر دینا اور ناک میں مرچوں کی دھونی دینا۔ یا تو یہ اپنی زبان سے سچ نکالے گی یا پھر اس کے جسم سے روح نکلے گی۔" رانی کی مستقل مزاجی نے وڈی چودھرائن کو وقتی طور پر تو ہار ماننے پر مجبور کر دیا تھا لیکن وہ اسے چھوڑنے یا اس کی بات پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ چنانچہ رعونت سے حکم جاری کرنے کے بعد اپنے بھاری بھرکم جثے کو سنبھالتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

"باجوہ والے معاملے کی تحقیق کروائی تم نے عبدالمنان! کچھ معلوم ہوا کہ تارڑ کے بیان میں کتنی سچائی ہے؟" طبیعت ذرا بہتر پا کر شہریار نے اسپتال سے چھٹی لے لی تھی اور اپنی ڈیوٹی پر واپس آگیا تھا۔ اسپتال میں داخل رہنے کے دوران بھی وہ اپنے ضلع کے معاملات سے یکسر بے خبر نہیں رہا تھا اور فون پر عبدالمنان کو ہدایات جاری کرتا رہتا تھا۔ باجوہ والا معاملہ بھی اس نے فون پر اسے بتا دیا تھا۔ تارڑ اسپتال میں اس سے ملاقات کے لیے آیا تھا تو اس نے دبے لفظوں میں یہ شک بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اس قتل کے پیچھے چودھری کا ہاتھ ہو سکتا ہے کیونکہ اب باجوہ قانون کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے لیے زیادہ مفید نہیں رہا تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ نیا فاریسٹ آفیسر اپنی مرضی کا لے آئے گا لیکن اتفاق سے ڈاکٹر ماریا کی سفارش پر شہریار کو عابد انصاری جیسا بندہ مل گیا۔ شہریار اس سے ملاقات کر کے کافی مطمئن ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ یہ شخص اس کی خواہش کے مطابق بہت اچھے طریقے سے کام کرے گا۔ بہرحال، عابد انصاری کی کارکردگی تو ابھی سامنے آنی تھی لیکن اس سے پہلے وہ باجوہ والے معاملے کو پرکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے عبدالمنان کی ڈیوٹی لگا دی تھی جس کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح یہ کام سرانجام دے ڈالے گا۔

"یس سر! میں نے ساری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ باجوہ کا آبائی گاؤں الگ ضلع میں ہونے کی وجہ سے معلومات حاصل کرنے میں کچھ وقت تو لگا لیکن تارڑ کے بیان کی تصدیق ہو گئی ہے۔ میرے اعتماد کے ایک آدمی نے گورکن سے مل کر یہ تصدیق کر لی ہے کہ باجوہ کی قبر کھود کر وہاں سے اس کی ڈیڈ باڈی نکالی گئی ہے اور ڈیڈ باڈی نکالنے والے سرکاری اہلکار تھے۔ وہ شخص باجوہ کی خالی قبر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے اس پولیس سرجن کو بھی اپروچ کر لیا ہے جس نے باجوہ کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ وہاں سے بھی یہ تصدیق ہو گئی ہے کہ تارڑ کی آپ کو دی ہوئی انفارمیشن درست ہے۔ باجوہ کی موت واقعی ہارٹ فیل سے نہیں بلکہ زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی ہے۔" حسب توقع عبدالمنان کے پاس مکمل رپورٹ موجود تھی۔

"جب اتنی باتیں درست ہیں تو تارڑ کا یہ شک بھی درست ہو سکتا ہے کہ باجوہ کی موت کے پیچھے چودھری کا ہاتھ

www.pkdigest.com

ہے لیکن مسئلہ وہی ہے کہ ہمارے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں جس کی بنیاد پر ہم چودھری پر ہاتھ ڈال سکیں۔ خود تارڑ بھی اس سے خوف زدہ نظر آرہا ہے اور ملک سے باہر نکلنے کے چکر میں ہے بلکہ سمجھو کچھ دن میں روانہ ہی ہو جائے گا۔"

"آپ کا خیال درست ہے سر... لیکن سر دست ہم اس مسئلے پر کچھ نہیں کر سکتے اور بہت سے معاملات کی طرح ہمیں اس معاملے کو بھی فی الحال نظر انداز ہی کرنا ہوگا۔" عبدالمنان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

"ایسا ہے تو ایسا ہی سہی لیکن تم دیکھنا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب چودھری کو اپنے اعمال کا حساب اسی دنیا میں دینا پڑے گا۔ اس کی گردن کب گرفت میں آتی ہے، یہ ابھی مجھے بھی نہیں معلوم لیکن وہ پکڑا ضرور جائے گا۔"

"ضرور سر! انشاء اللہ۔" عبدالمنان نے صدق دل سے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "آپ نے کہا تھا کہ آپ کے مختلف دیہاتوں میں دورے کا شیڈول تیار کر دوں، وہ میں نے کر دیا ہے۔ آج آپ کو لنچ ٹائم کے بعد وزٹ کے لیے نور پور جانا ہوگا۔"

"اوکے! یہ تم نے اچھا کیا کہ سب سے پہلے نور پور کا وزٹ رکھ لیا۔ میں کافی دنوں سے چودھری بختیار سے ملنا چاہ رہا ہوں لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب جاؤں گا تو مل لوں گا۔" عبدالمنان کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے شہریار نے ایک بار پھر اپنے دل میں اس شخص کی صلاحیتوں کو بہت گہرائی سے محسوس کیا۔ اپنے آفیسر کا اس حد تک مزاج آشنا پی اے مل جانا بڑے شکر اور خوشی کا مقام تھا۔

"ایک کام اور کرو عبدالمنان! میری ایس پی تارڑ سے بات کروا دو۔ اس شخص میں بہتری کے آثار نظر آرہے ہیں تو کیوں نہ موقع کا فائدہ اٹھا لیا جائے۔" عبدالمنان نے فوراً ہی اس کے حکم کی تعمیل کی اور تارڑ کا نمبر ملا کے اس کے لائن پر آنے کے بعد ریسیور شہریار کو تھما دیا۔

"خیریت سر! آج صبح صبح ہماری یاد کیسے آگئی آپ کو؟" شہریار کی ہیلو کے جواب میں تارڑ نے خوش گوار لہجے میں اس سے سوال کیا۔

"میں نے سوچا کہ اب تو آپ رخصت ہونے والے ہیں، آپ سے معلوم کر لوں کہ کوئی کام وغیرہ میرے لائق ہو تو بتائیں۔" شہریار نے بھی جوابی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"کام تو کوئی نہیں، ہاں ایک خواہش ہے کہ اگر میرے جانے سے پہلے آپ میرے ساتھ کسی روز ڈنر کر لیں تو بہت اچھا رہے گا۔" تارڑ نے پیشکش کی۔

"چلیں ٹھیک ہے، ایسا کر لیتے ہیں لیکن ڈنر میری طرف سے ہوگا۔ آپ نے پہلے ذکر چھیڑ دیا ورنہ اصولی طور پر مجھے آپ کو اس الوداعی ڈنر کی دعوت دینی تھی۔ آپ ایسا کریں کہ اس سنڈے کو میرے بنگلے پر تشریف لے آئیں، ساتھ بیٹھ کر ڈنر بھی کر لیں گے اور کچھ گپ شپ بھی رہے گی۔" اس نے جوابی پیشکش کی جس سے انکار ظاہر ہے تارڑ کے لیے ممکن نہیں تھا۔

"مجھے آپ سے ایک کام اور تھا تارڑ صاحب! امید ہے کہ آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔" رسمی گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اس نے اصل مطلب پر آتے ہوئے تارڑ سے کہا۔

"حکم فرمائیے سر! اگر میرے اختیار میں ہوا تو میں ضرور آپ سے تعاون کروں گا۔"

"نور پور بم بلاسٹ میں خودکش حملہ آور لڑکے کے والدین اور بڑے بھائی کو آپ نے گرفتار کر لیا تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ گرفتار تو وہ میرے کہنے پر کیے گئے تھے لیکن بعد میں آپ نے انہیں اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا۔ ان لوگوں کا بعد میں کچھ پتا نہیں چلا حالانکہ میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور ہوں کہ ان بے چاروں کا اس بم بلاسٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ بالکل بے قصور تھے۔ آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ان لوگوں کے بارے میں انفارم کر دیں۔" اس کی اس درخواست کے جواب میں تارڑ پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر بولا تو اس کے لہجے میں ندامت تھی۔

"آئی ایم سوری اے سی صاحب! اس فیملی کا تو مجھے بھی کچھ اتا پتا معلوم نہیں ہے۔ ایکچولی بلاسٹ کی انویسٹی گیشن شروع کرتے ہی ایجنسیز والوں نے ان لوگوں کو اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا، چنانچہ بعد میں میرا بھی ان لوگوں سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔" تارڑ کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا۔ وہ افسر شاہی کا ایک پرزہ تھا اور بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ایجنسیز کے ہاتھ لگ جانے والوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنا آسان نہیں ہوتا۔

"اوکے تارڑ صاحب! آپ نے جتنا بتا دیا، یہ بھی کافی ہے۔ اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے کچھ اور بھی ضروری امور نمٹانے ہیں۔" ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور پل بھر کے توقف کے بعد اپنا موبائل نکال کر مشابرم خان کا نمبر ملانے لگا۔ عبدالمنان کو وہ تارڑ سے گفتگو کے دوران ہی اشارے سے جانے کی اجازت دے چکا تھا چنانچہ اس وقت اپنے دفتر میں بالکل تنہا تھا۔ اس تنہائی

نے اسے ماہ بانو کی یاد دلائی تھی، تب ہی اسے اس کی تلاش میں سرگرداں مشابرم خان سے رابطے کا خیال آیا تھا۔ اس کے نمبر ملانے پر بہت دیر تک بیل جاتی رہی لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اللہ جانے مشابرم خان کہاں مصروف تھا کہ اسے اس کی کال ریسیو کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے بلتستان میں موجود اپنے ہم منصب سے رابطہ کیا۔

"ماہ بانو نامی لڑکی کے اغوا کے کیس میں کچھ پیش رفت ہوئی جناب یا نہیں؟" رسمی سلام دعا اور حال احوال کے بعد اس نے وہ سوال کیا جس مقصد کے تحت کال کی تھی۔

"سوری مسٹر شہریار! میں بہت شرمندہ ہوں کہ ابھی تک ہم لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکے بلکہ یہ کیس بہت پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ پہلے ٹورسٹ کمپنی کا وہ ڈرائیور حادثاتی موت کا شکار ہوا جس کی جیپ چھین کر اسے ماہ بانو کے اغوا کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور اب ٹورسٹ کمپنی کا مالک صغیر بیگ غائب ہے۔ صغیر بیگ کی گاڑی ایک جگہ خالی کھڑی پائی گئی ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہے لیکن کڈنیپر کون ہے، اس کے بارے میں ابھی تک کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔" دوسری طرف سے قدرے شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا گیا۔

"یہ تو واقعی بہت پیچیدہ صورت حال ہے۔ بہرحال آپ خیال رکھیے گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات معلوم ہو، پلیز مجھے انفارم کر دیجیے گا۔" وہ جانتا تھا کہ ان لوگوں کا اپنا طریقہ تفتیش ہے جو ان کی سیدھی سادی زندگیوں کے باعث اتنا زیادہ تیز رفتار نہیں۔ ویسے بھی پولیس کی کارکردگی تو لاہور اور کراچی جیسے بڑے شہروں میں بھی اتنی واجبی تھی کہ اسے دشوار گزار علاقے میں ان سے کوئی اچھی امید رکھنا عبث تھا۔

اس کال سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر مشابرم خان کا نمبر ٹرائی کیا۔ اس بار بھی بیل جاتی رہی لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ بالآخر وہ مایوس ہو کر سلسلہ منقطع ہی کرنے لگا تھا کہ کسی نے کال ریسیو کر لی۔ کال ریسیو کرنے والے کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کا کم عمر لڑکا ہے۔

"کون بات کر رہا ہے؟ یہ مشابرم خان کا فون ہے نا تو وہ خود کہاں ہے؟" اس نے تیز لہجے میں لڑکے سے سوال کیا۔

"ہم نہیں جانتا صاحب کہ مشابرم خان کون ہے۔ یہ فون ہمیں راستے میں پڑا ہوا ملا تھا تو ہم نے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔" لڑکے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا اور قدرے نرمی سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہم سمندر خان ہے۔ یہاں ایک موٹیل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔" لڑکے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

"سنو سمندر خان! یہ موبائل جس شخص کا ہے، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔ تم ایسا کرو کہ ہوٹلوں میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ مشابرم خان کہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ مل جائے تو یہ فون اسے دے دینا۔ اس کے بدلے تمہیں انعام مل جائے گا۔" بہت سمجھانے والے انداز میں اس نے لڑکے کو یہ ہدایت دی۔

"ٹھیک ہے جناب! ہمیں وقت ملا تو کوشش کرے گا۔" لڑکے کا انداز ٹالنے والا تھا۔

"وقت کی بات مت کرو، تمہیں ہر حال میں مشابرم خان کو تلاش کرنا ہے۔ انعام میں، میں تمہیں اس سے بھی اچھا موبائل دلوا دوں گا۔" یہ محسوس کر کے کہ لڑکا موبائل کے لالچ میں مشابرم خان کو ڈھونڈنے میں آنا کانی کر رہا ہے، اس نے اسے لالچ دیا۔

"سچ کہہ رہے ہو صاحب؟" اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

"سو فیصد سچ کہہ رہا ہوں۔ بس تم میرا کام کر دو... اور ہاں، اس موبائل کو آف مت کرنا۔ میں اسی نمبر پر تم سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رابطہ کرتا رہوں گا۔" اس نے لڑکے کو پابند کرنے کے لیے کہا۔ دراصل وہ مشابرم خان کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا موبائل کسی جگہ پڑا ملنا کوئی اچھی علامت نہیں تھا۔ یہاں بیٹھ کر وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ موبائل مشابرم خان سے بے خیالی میں گر گیا تھا یا وہ کسی غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہوا تھا اور کسی سے لڑائی جھگڑے میں اس کا موبائل گرنے کی نوبت آگئی تھی۔

"سنو سمندر خان! ایک کام کرو۔ ہوٹلوں میں معلوم کرنے سے پہلے سب سے پہلے دوا خانے (اسپتال) جاؤ۔ وہاں مشابرم خان کی ماں داخل ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو مشابرم خان مل جائے گا یا پھر اس کے بارے میں کوئی خبر ہی مل جائے گی۔" وہ فون بند ہی کرنے لگا تھا کہ مشابرم خان کی تلاش کا ایک نسبتاً آسان راستہ دکھائی دیا چنانچہ سمندر خان کو ہدایت دی۔

"ٹھیک ہے صاحب! ہم ایسا ہی کرے گا۔" سمندر خان نے جواب دے کر فون بند کر دیا تو وہ بھی اپنا سر جھٹک کر دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن یہ توجہ خالصتاً پیشہ

www.pkdigest.com

درانہ نوعیت کی تھی۔ اس مصروفیت کے دوران بھی دل اس پریشانی میں مبتلا تھا کہ جانے ماہ بانو کہاں اور کس حال میں ہو گی؟ اپنی بے پناہ مصروفیات اور مسائل کے باوجود وہ زندگی میں آنے والی اس بہ ظاہر عام سی لڑکی کو فراموش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ہر پریشانی، ہر مصروفیت اور ہر کام کے دوران اس کا خیال ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح پل پل خیال میں رہنے والی ہستی درحقیقت زندگی میں سب سے اہم مقام کی حامل ہوتی ہے۔ اے سی شہریار عادل کو ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ محبت میں اس مقام تک نہیں پہنچا تھا جہاں کام عشق کے آڑے آنا چھوڑ دیتا ہے اور بندہ صرف محبوب کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جو بھی تھا، فی الحال تو وہ اپنے فرائضِ منصبی کو ہی ترجیح دیتا تھا چنانچہ خیال کے پردے پر بار بار ابھرنے والی ماہ بانو کی شبیہہ سے نظریں چرا کر لنچ ٹائم تک اپنے معمول کے کام نمٹاتا رہا۔ لنچ کے فوراً بعد وہ اور عبدالمنان نور پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ نور پور تک کا راستہ کافی طویل ہونے کی وجہ سے یہی امید تھی کہ انہیں واپسی میں مغرب تک کا وقت تو ضرور ہی ہو جائے گا۔

"نور پور میں کنسٹرکشن کی کیا صورتِ حال ہے؟" دورانِ سفر اس نے عبدالمنان سے پوچھا۔

"کام تو حتی الامکان تیزی سے ہی ہو رہا ہے۔ اسکول اور مرکزِ صحت دونوں کی عمارتیں تیاری کے تقریباً آخری مراحل میں ہیں۔ ہم نے اسٹاف کے اپائنٹمنٹ کی کارروائی بھی شروع کر دی ہے لیکن نور پور کا اہم مسئلہ یعنی بجلی کی فراہمی... ابھی تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا ہے۔ چیمہ صاحب نے اس سلسلے میں جو وعدہ کیا تھا، وہ ابھی تک بس وعدہ ہی ہے۔ میری چودھری بختیار سے جو آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں اس نے اس معاملے کی طرف توجہ دلوائی تھی۔ اصل میں اس نے گاؤں میں چھوٹی صنعتوں کے آغاز کا جو منصوبہ بنا رکھا ہے، اس پر عمل درآمد کے لیے بجلی کی عدم موجودگی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔" عبدالمنان نے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

"واقعی یہ تو بہت اہم مسئلہ ہے۔ میں بھی پچھلے سارے عرصے میں اتنی بری طرح الجھا رہا کہ اس معاملے کو بھول ہی گیا۔ تم ذرا چیمہ صاحب کا نمبر ملاؤ۔ ابھی اسی وقت انہیں یاد دہانی کروا دیتے ہیں۔" اپنی کوتاہی پر دلی افسوس محسوس کرتے ہوئے اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس پر اس نے فوراً ہی عمل درآمد کیا۔

"میں اے سی شہریار عادل صاحب کا پی اے عبدالمنان بات کر رہا ہوں۔ اے سی صاحب مسٹر چیمہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت یہ ممکن ہو سکے گا؟" رابطہ ہونے پر اس نے مہذب لہجے میں دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے چیمہ کے پی اے سے پوچھا۔

"آئی ایم سوری مسٹر عبدالمنان! فی الحال چیمہ صاحب ایک اہم میٹنگ میں ہیں اس لیے ان سے بات کروانا ممکن نہیں۔ جیسے ہی وہ میٹنگ سے فارغ ہوتے ہیں، میں انہیں میسج دے دیتا ہوں۔" دوسری طرف سے بھی اسی پیشہ ورانہ تہذیب کا مظاہرہ کیا گیا۔ ویسے چیمہ کا پی اے چونکہ شہریار اور چیمہ کی ملاقات کے دوران موجود رہا تھا، اس لیے وہ اس سے اور اس کے خاندانی پس منظر سے اچھی طرح واقف تھا... ورنہ ممکن تھا کہ ایک وفاقی وزیر کا پی اے، ایک چھوٹے ضلع کے اے سی کے پی اے سے اتنی رواداری کا مظاہرہ نہ کرتا۔

"او کے! فی الحال تو بات نہیں ہو سکی لیکن تمہیں خود دوبارہ اب دھیان سے میری چیمہ صاحب سے بات کروانی ہو گی۔" عبدالمنان نے دوسری طرف سے ملنے والا جواب شہریار کے گوش گزار کیا تو اس نے اسے تاکید کی اور پھر فوراً ہی سامنے کے منظر میں الجھ گیا۔ وہ تقریباً دس بارہ افراد تھے جو ایک چارپائی اٹھائے سڑک پر آ نکلے تھے۔ چارپائی پر کوئی مختصر سا وجود دراز ہے، یہ فاصلہ ہونے کے باوجود شہریار نے دیکھ لیا تھا۔

"گاڑی روک دو۔" ہجوم تقریباً سڑک کے درمیان آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈرائیور اس سے کنی کاٹ کر آگے نکل جاتا، شہریار نے اسے حکم دیا۔ ڈرائیور نے حکم کی تعمیل کی۔ شہریار اور عبدالمنان گاڑی سے نکل آئے۔

"یہ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ اس طرح بیچ سڑک پر کیوں کھڑے ہو؟" عبدالمنان نے آگے بڑھ کر ان لوگوں سے سوال کیا۔

"یہ میرا بھانجا ہے صاحب! اس کی حالت بہت خراب ہے۔ اگر اسے فوراً اسپتال نہیں پہنچایا گیا تو یہ مر جائے گا۔ ہم اپنے گاؤں سے اسے منجی پر ڈال کر یہاں تک لائے ہیں کہ اگر کوئی لاری یا ٹرک سڑک سے گزرے تو اسے نور کوٹ کے اسپتال تک پہنچا سکیں۔" ایک مختنی سے شخص نے آگے بڑھ کر عبدالمنان کے سوال کا جواب دیا۔ اس دوران لوگوں نے چارپائی نیچے رکھ دی تھی اور اس پر لیٹا بارہ تیرہ سال کا لڑکا صاف نظر آ رہا تھا۔ لڑکے کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کی باچھوں سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ خود تقریباً غشی کے عالم میں تھا۔

"اسے گاڑی میں بٹھاؤ عبدالمنان۔ ہم واپس نور کوٹ جائیں گے۔" لڑکے کی حالت کے پیشِ نظر شہریار نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے عبدالمنان کو حکم دیا اور خود واپس گاڑی کی اگلی نشست پر جا بیٹھا۔ اس کے حکم پر لڑکے کو چارپائی سے اٹھا کر گاڑی کی پچھلی نشست پر منتقل کیا گیا۔ اس کے ساتھ عبدالمنان اور لڑکے کا ماموں بھی موجود تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ صاحب! یہ لڑکا میری بہن کا اکلوتا پتر ہے۔ اس کا پیو وڈی خراب طبیعت کا مالک ہے۔ اگر منڈے کو کچھ ہو گیا تو وہ میری بہن کو جان سے مار دے گا۔" ڈرائیور نے گاڑی موڑ کر واپس نور کوٹ جانے والے راستے پر ڈالی تو بچے کا ماموں شکر گزار لہجے میں بولا۔

"اس بچے کو ہوا کیا ہے؟" شہریار نے بچے کی غیر ہوتی حالت دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"رب جانے صاحب کہ کیا ہو گیا۔ چنگا بھلا ہی تھا سویرے تک۔ دوپہر میں تاپ چڑھا تو ماں ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ اس نے جانے کیسا ٹیکا لگایا کہ بچہ ہاتھوں میں آنے لگا۔ خبیث بولا کہ پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ بچے کو گھر لے جاؤ تھوڑی دیر بعد طبیعت سنبھل جائے گی۔ میری بہن سیدھی سادی عورت اس کی چال میں آ گئی اور گھر جا کر تو بچے کی حالت ہی بگڑ گئی۔ اس کو جھٹکے لگنے لگے۔ بہن دوبارہ ڈاکٹر کی دکان کی طرف بھاگی کہ اسے بلا کر بچے کی حالت دکھائے لیکن وہ مردود تو وہاں پر تھا ہی نہیں۔ اردگرد والوں نے بتایا کہ وہ تو ایک تھیلے میں اپنا سامان رکھ کر اپنی ویسپا پر بھاگ نکلا۔ میں نے کہا اس مردود سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے بچے کو تو اسپتال پہنچانے کی کوشش کریں۔ بس اللہ نے ساتھ دیا کہ سڑک پر آتے ہی آپ کی گڈی مل گئی۔ بچہ چنگا بھلا ہو کر خیر نال گھر آ جائے، باقی اس ڈاکٹر دے پتر سے تو اس کا پیو خود ہی بعد میں دو دو ہاتھ کر لے گا۔ وڈا اوکھری بندہ ہے وہ۔ جھٹ پٹ ایسا کہ گل بعد میں کرتا ہے بندے کی گدی پہلے پکڑتا ہے۔" بچے کا ماموں مسلسل بولتا ہوا انہیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔

"اس ایریے میں ڈاکٹر کہاں سے آیا؟ ہمیں اپنے ہیلتھ یونٹس کے لیے تو ڈاکٹرز ملتے نہیں ہیں۔" شہریار نے پلٹ کر عبدالمنان سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر واکٹر کیا سر... اس طرح کے علاقوں میں جہاں میڈیکل کی سہولیات دستیاب نہیں ہوتیں، اتائی ایسی دکانیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور خود کو ڈاکٹر کہلوانے لگتے ہیں۔ ان نان کوالیفائیڈ ڈاکٹرز کی کم علمی اور اناڑی پن کی وجہ سے اس طرح کے واقعات رونما ہونے کی اطلاع ملتی رہتی ہے... جیسا کیس اس وقت ہمارے سامنے ہے۔" عبدالمنان نے اپنے سامنے موجود بچے کی طرف اشارہ کیا جس کی حالت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دگرگوں ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"یہ تو سیدھا سیدھا کرائم ہے۔ ایسے افراد کے خلاف تو سخت ایکشن لینا چاہیے۔ آخر ہم کیسے کسی کو اجازت دے سکتے ہیں کہ وہ انسانی زندگیوں کے ساتھ کھیلے۔" بچے کی حالت شہریار کو غصے میں مبتلا کر رہی تھی۔ وہ ذرا سا رخ موڑ کر بچے کے ماموں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ اس جعلی ڈاکٹر کا حلیہ اور اس کی ویسپا کا نمبر بتا سکتے ہیں؟"

"ویسپا کا نمبر تو مجھے نہیں مالوم صاحب! بس اتنا پتا ہے کہ نیلے رنگ کی ویسپا ہے۔ رہی اس خبیث کے حلیے کی گل تو حلیہ تو اس کا ایسا ہے کہ دیکھتے ہی اس کی خباثت کا مالوم پڑ جاتا ہے۔ کالی سیاہ توے جیسی رنگت، بوٹا سا قد، خوب باہر کو نکلی ہوئی توند اور وڈی وڈی مونچھیں ہیں اس کی۔" بچے کا ماموں جو شہریار کو بطور اے سی نہیں پہچانتا تھا، اس کے بارعب لہجے اور انداز سے اس کی بااختیار حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے مرعوب سے لہجے میں بتانے لگا۔

"عبدالمنان! ڈی ایس پی منظور کو فون کرو کہ ساری چیک پوسٹس پر پیغام دے دے کہ نیلے رنگ کی ویسپا پر ایسے حلیے والا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ابھی اتنی زیادہ دیر نہیں ہوئی ہے۔ وہ شخص ضلع سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہو گا۔" اس نے عبدالمنان کو حکم دیا جس کی تعمیل کے لیے وہ اپنا موبائل نکال کر فوراً ہی ڈی ایس پی منظور کو کال کرنے لگا۔

"یہ کون صاحب ہیں جناب؟" وہ کال کر کے فارغ ہوا تو بچے کے مختنی سے ماموں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"یہ ہمارے ضلع کے اے سی صاحب ہیں۔" عبدالمنان نے جواب دیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ یقیناً کسی سرکاری افسر کا ایسا ہمدردانہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اسے اپنی اس حیرت کا زبان سے اظہار کا موقع نہیں ملا اور گاڑی نور کوٹ کے اسپتال کے سامنے رک گئی۔ ڈرائیور اور بچے کے ماموں مل کر بچے کو گاڑی سے اتار کر اسپتال میں منتقل کرنے لگے۔ اسپتال کے عملے کے لیے شہریار کی گاڑی جانی پہچانی تھی چنانچہ فوراً ہی ایک ذمے دار بھاگا ہوا باہر آیا۔

"اس بچے کا ٹریٹمنٹ بہت کیئر فل ہو کر کرنا ہے۔ بعد

www.pkdigest.com

میں مجھے اس کی حالت کے بارے میں انفارم کیجیے گا۔"

شہریار نے اسے ہدایت دی جس کے جواب میں اس نے تیزی سے اپنی گردن کو حرکت دی اور بولا۔ "آپ فکر نہ کریں سر! ہم بچے کا پورا دھیان رکھیں گے۔"

"واپس دفتر چلو۔" اسپتال کے گیٹ پر عملے کے کسی فرد نے ڈرائیور کی جگہ سنبھال لی تھی اس لیے وہ واپس آگیا تھا۔ شہریار نے یہ جملہ اسی سے کہا تھا۔ اس نے فوراً حکم پر عمل درآمد کیا اور گاڑی دفتر کی طرف چل پڑی۔ اس ایمرجنسی کیس کی وجہ سے ان کا آج نور پور جانے کا پروگرام ملتوی ہو گیا تھا لیکن شہریار مطمئن تھا۔ ایک انسانی زندگی اس کے نور پور کے دورے سے زیادہ اہم تھی۔

"اس جعلی ڈاکٹر کو گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔" وہ لوگ ابھی دفتر واپس نہیں پہنچے تھے کہ عبدالمنان کے موبائل پر کال موصول ہوئی اور اس نے شہریار کو اطلاع دی۔

"گڈ... وری گڈ۔ خیال رکھنا کہ یہ شخص کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب نہ ہو۔ اس کے علاوہ اس طرح کے جو دوسرے افراد مختلف علاقوں میں سرگرم ہیں، ان کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر کے ان کے خلاف ایکشن لو۔ ہم لوگوں کی زندگیاں ان اتائیوں کے ہاتھ میں دینے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے۔" جعلی ڈاکٹر کی گرفتاری پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس نے مزید ہدایات جاری کیں لیکن خود اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ عوام کو اتائیوں کے چنگل سے نکالنے کے لیے صرف ان افراد کے خلاف ایکشن لینا کافی نہیں ہوگا۔ اسے جلد از جلد لوگوں کو علاج کی ایسی سستی سہولیات فراہم کرنی ہوں گی کہ اگر کوئی اتائی کہیں بے خبری میں اپنا دھندا جمانا بھی چاہے تو از خود ناکام ہو جائے۔ طبی سہولیات کی ناقص فراہمی یا عدم دستیابی ملک بھر کا مسئلہ ہے، وہ جانتا تھا لیکن پورے ملک کے مسائل کو حل کرنا اس کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دائرۂ عمل میں رہ کر جو اور جتنا کر سکتا تھا، اتنا کر رہا تھا اور مزید بھی کرتے رہنے کا عزم دل میں رکھتا تھا۔

☆☆☆

ان کے ہر سُو برف ہی برف تھی۔ وہ گھنٹوں چلتے تھے اور پھر بھی خود کو اسی برف زار میں پاتے تھے۔ انہیں خود بھی ادراک ہو چکا تھا کہ وہ اس برف زار میں بھٹک گئے ہیں۔ درحقیقت وہ دونوں ہی راستوں سے قطعی نا آشنا تھے۔ انہوں نے فرار کا منصوبہ بناتے وقت صرف ایک بات کو مدِنظر رکھا تھا اور وہ یہ کہ تربیت یافتہ یاک انہیں جانے پہچانے راستوں سے گزار کر خود ہی منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا لیکن قسمت کی خرابی سے وہ پہلے ہی مرحلے پر یاک سے محروم ہو گئے تھے۔ انہیں فرار سے روکنے کی کوشش کرنے والوں نے جب ان پر فائرنگ کی تھی تو اس فائرنگ کی زد میں ان کی سواری کا ذریعہ اور راہبر یاک آگیا تھا۔ یاک کے بغیر وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گئے تھے۔ اوپر سے عمران خود بھی زخمی تھا۔ ماہ بانو مخصوص وقفے کے بعد اس کے زخم کی مرہم پٹی کر دیتی تھی۔ وہ درد کم کرنے اور بخار اتارنے کی گولیاں بھی باقاعدگی سے کھا رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کی حالت مسلسل دگرگوں ہوتی جا رہی تھی۔

ایسا اس گولی کی وجہ سے تھا جو ابھی تک جسم میں پیوست تھی اور زخم کو خراب کرنے کا سبب بن رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ تکلیف کی شدت سے نڈھال تھا اور ساتھ ہی اس کے چہرے کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی سرخی اس بات کی نشان دہی کر رہی تھی کہ بخار ایک بار پھر کافی زیادہ ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کے باوجود اس نے اپنے قدم نہیں روکے تھے اور مسلسل چل رہا تھا۔ اس کے صحت مند شانے سے وہ تھیلا ابھی لٹکا ہوا تھا جس میں ان کی ضرورت کا سامان تھا۔ ایسا ہی ایک تھیلا ماہ بانو کے پاس بھی تھا۔ یاک کی موت اور عمران کے زخمی ہونے کے بعد انہوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سامان دو حصوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تھیلوں میں رکھ لیا تھا۔ ماہ بانو کے حصے میں جو تھیلا آیا تھا، اس میں خوراک اور ادویات موجود تھیں جبکہ عمران کے تھیلے میں سلیپنگ بیگز، اسٹوو، پانی کی بوتلیں اور کچھ ایسی چیزیں موجود تھیں جو کسی برفانی علاقے میں سفر کے دوران معاون ثابت ہوتی ہیں۔ اسلحہ بھی زیادہ تر اس نے اپنے پاس ہی رکھا تھا اور ماہ بانو کے پاس صرف ایک ہلکی سی رائفل تھی۔ اگر وہ زخمی نہیں ہوتا تو یقیناً سارا بوجھ خود ہی اٹھانا پسند کرتا لیکن اب مجبوری تھی اس لیے ماہ بانو کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔

وہ دونوں ہی بے حد تھک چکے تھے لیکن ایک بار پھر زندگی کی رونقوں میں شامل ہونے کی خواہش نے انہیں سفر جاری رکھنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ اس خواہش کا دامن تھامے، اس وقت وہ ایک گلیشیر پر سے گزر رہے تھے۔ قدرے سخت برف والے اس گلیشیر پر قدم جما کر چلنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آ رہی تھی لیکن تیز نکیلی ہوائیں خوب مزاج پوچھ رہی تھیں۔ ان ہواؤں کی ٹھنڈک میں ایسی کاٹ تھی کہ بارہا انہیں محسوس ہوتا جیسے ہوا کے ساتھ برف کی کرچیاں سی آ کر ان کے چہرے سے ٹکرا رہی ہوں۔ ان کاٹ دار ہواؤں سے

بچنے کے لیے انہوں نے اپنے سروں پر پہنی مخصوص ٹوپیوں کو چہرے پر بھی کھینچ لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں ہی کھلی تھیں جن پر انہوں نے چشمے چڑھا لیے تھے... لیکن برف زاروں کی موسمی شدت کا مقابلہ کرنا اتنا آسان کہاں ہوتا ہے... یہاں موسم اتنی تیزی سے اور اچانک بدلتے ہیں کہ ہر احتیاطی تدبیر ناکام ہوتی چلی جاتی ہے۔

ان کے ساتھ بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ پہلے ٹھنڈی یخ ہواؤں کا ساتھ دینے کے لیے موٹے موٹے بارش کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر بڑی تیزی سے ان قطروں نے منجمد ہو کر برف کی شکل اختیار کر لی۔ روئی کے گالوں کی طرح تواتر سے گرتی برف جہاں سردی کے احساس کو بڑھا رہی تھی، وہیں اس نے اردگرد کے منظر کو بھی دھندلا ڈالا تھا۔ ان کے لیے چند فٹ آگے کا راستہ دیکھنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ قدم اٹھانے پر مجبور تھے کیونکہ آس پاس کوئی ایسی پناہ گاہ بھی نہیں تھی جہاں کچھ دیر رک کر اس برف باری سے محفوظ رہا جا سکے۔

"ماہ بانو! میرا ہاتھ تھام لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس دھند میں ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔" ماہ بانو کو اپنے قریب سے عمران کی مدھم سی آواز سنائی دی تو اس نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل درآمد کیا۔ اس ویران برف زار میں تنہا رہ جانے کا خیال ہی بہت خوفناک تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ جگہ جہاں عمران کے ساتھ ہونے کے باوجود زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا دشوار محسوس ہو رہا ہے، تنہا رہ جانے کی صورت میں دشوار ترین ہو جائے گی۔

"پتا نہیں ہم یہاں سے نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟" لحظہ بہ لحظہ اپنے لباس پر موٹی ہوتی برف کی تہ کو محسوس کرتے ہوئے اس نے قدرے مایوس کن لہجے میں عمران سے کہا۔

"انشاء اللہ... ہم یہاں سے ضرور نکلنے میں کامیاب ہوں گے۔ تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے اللہ تمہیں پہلے ہر مصیبت سے بچاتا رہا ہے، ویسے ہی یہاں سے بھی بچا کر نکال دے گا۔" عمران نے اسے تسلی دی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ..." ابھی اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ایک زوردار جھٹکا لگا اور اس نے اپنے بڑھتے ہوئے دائیں قدم کے نیچے سے زمین کو غائب پایا۔ اس کا بایاں قدم ابھی زمین پر ہی تھا لیکن وہ بھی اتنی مضبوطی سے نہیں جما ہوا تھا کہ وہ خود کو سنبھال پاتی۔ اضطراری طور پر اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی پھر اس کے جسم کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ یہ عمران تھا جس نے پوری قوت سے اسے پیچھے کی طرف کھینچا تھا۔ نظر اسے ابھی کچھ نہیں آیا تھا لیکن ماہ بانو کا ہاتھ گرفت میں ہونے کی وجہ سے اس نے اس کے جسم کو لگنے والا جھٹکا فوری طور پر محسوس کر لیا تھا اور فوری ردِعمل کے طور پر اسے پیچھے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ اس خوفناک لمحے سے گزرنے کے بعد انہوں نے بغور جائزہ لیا تو ایک دراڑ نظر آئی۔ کسی گلیشیر پر موجود ایسی دراڑیں نہایت قاتل ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص بے دھیانی میں دراڑ میں گر جائے تو پھر اس کا بچنا ممکن نہیں رہتا۔ نیچے موجود یخ برف جیسا پانی لمحوں میں اسے منجمد کر کے زندگی سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ ماہ بانو کی خوش قسمتی تھی کہ دراڑ نے اسے نگلتے نگلتے یک دم ہی بخش دیا تھا اور عمران کا ہاتھ تھامنا اس کے کام آگیا تھا۔

جو حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا، اس کے خوف نے انہیں مزید قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں کرنے دی اور وہ وہیں رک کر برف باری رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا اور برف باری جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اسی طرح اچانک رک گئی... لیکن اتنی دیر میں ان دونوں کا حشر خراب ہو چکا تھا۔ ان پر اتنی برف گر چکی تھی کہ وہ خود برف سے بنے ہوئے پتلے لگ رہے تھے۔ برف باری رکی تو انہوں نے اپنے اوپر سے برف کی تہ جھاڑی اور آگے کا سفر شروع کیا۔

جس دراڑ میں ماہ بانو گرتے گرتے بچی تھی، وہ زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ان دونوں نے آرام سے وہ دراڑ پھلانگ لی اور آگے کا سفر شروع کیا لیکن اب وہ بہت زیادہ محتاط تھے اور ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلز کو واکنگ اسٹک کی طرح ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اس طرح وہ برف کی کسی پتلی تہ کے نیچے چھپی دراڑ سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ آگے کا سفر زیادہ طویل نہیں تھا۔ وہ جلد گلیشیر کو پار کر کے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں کچھ دیر ستایا جا سکتا تھا۔ عمران جو اب تک بہت زیادہ ہمت کا مظاہرہ کرتا رہا تھا، اس مقام پر پہنچ کر بالکل ڈھے گیا اور اپنا سلیپنگ بیگ بچھا کر اس میں گھس گیا۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر ماہ بانو نے چولھا جلایا اور جلدی سے نوڈلز سوپ کا پیکٹ نکال کر سوپ تیار کیا اور پھر چائے کا پانی چڑھایا۔

گرما گرم سوپ نے عمران کے سرد پڑتے جسم کو خاصی توانائی فراہم کی اور وہ اس لائق ہو گیا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ سوپ پینے سے خود ماہ بانو نے بھی خود کو کافی بہتر محسوس کیا تھا۔ چنانچہ چائے نکالنے سے پہلے اس نے پہلے عمران کے زخم کی نئے سرے سے مرہم پٹی کی۔ ٹھنڈک نے زخم پر بُرا اثر ڈالا تھا اور زخم کے اردگرد کی جگہ پر اس کا گوشت کالا پڑتا ہوا محسوس

www.pkdigest.com

ہورہا تھا... لیکن ماہ بانو مجبور تھی۔ وہ زخم کی پٹی تبدیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ پٹی تبدیل کرنے کے بعد اس نے کپوں میں چائے نکالی۔ ساتھ ہی ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی تھے۔ چائے کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کے بعد عمران نے بخار اور درد کم کرنے والی گولیاں کھائیں اور ماہ بانو کو سامان سمیٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''اب آگے چلتے ہیں۔'' وہ سامان سمیٹ چکی تو اس نے اس سے کہا۔

''تم مزید چل سکو گے؟'' ماہ بانو نے اس کی حالت کے پیش نظر تشویش سے پوچھا۔

''چلے بغیر گزارہ بھی تو نہیں ہے۔ یہاں بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک جدوجہد کی جائے۔'' اتنی تکلیف اور مایوس کن صورتِ حال کے باوجود عمران کا عزم اور حوصلہ قابلِ ستائش تھا۔

''ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔'' ماہ بانو نے اپنے سامان کا تھیلا کاندھے پر لٹکا لیا۔ سامان سمیٹ کر رکھنے کے دوران وہ عمران کے تھیلے کا بھی کچھ سامان اپنے تھیلے میں منتقل کرچکی تھی۔ وہ زخمی اور بیمار تھا اس لیے وہ اسے کم سے کم زحمت دینا چاہتی تھی۔ اگر ممکن ہوتا تو وہ پورا ہی سامان خود اٹھا لیتی... لیکن ظاہر ہے اس کا تعلق صنفِ نازک سے تھا اور وہ ایک حد سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہل نہیں تھی۔ اگر اس کی پرورش گاؤں کے سخت ماحول میں ہوئی ہوتی تو پھر بھی اسے سخت کوشی کی عادت ہوتی لیکن بے بے اور ابا نے اسے بڑے ناز و نعم سے پالا تھا اور اس نے زندگی میں کتابوں کے بوجھ کے سوا مشکل سے ہی کوئی دوسرا بوجھ اٹھایا تھا۔ وہ تو اس میں قدرتی طور پر ماحول کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی زبردست صلاحیت موجود تھی اس لیے وہ اپنے سخت حالات سے کسی نہ کسی طرح گزرتی جارہی تھی۔ اس صلاحیت کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ گرم میدانوں کی رہنے والی یہ لڑکی اس برف زار میں اپنی بقا کی جنگ لڑسکتی۔

''میرے خیال میں ہم اپنا رخ بدل کر جنوب کی طرف سفر شروع کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس سمت میں چلنے پر ہمیں آبادی کی طرف جانے والا کوئی راستہ سجھائی دے جائے۔'' کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد عمران نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے پاس اتفاق کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ لوگ برف کے ان سفید اندھیروں میں مسلسل ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے تھے۔ ان کے پاس سفر کے لیے کوئی واضح منصوبہ تو موجود نہیں تھا کہ اختلاف کی گنجائش نکل پاتی۔ بس راستہ چلتے ایک کو اگر کوئی خیال سوجھ جاتا تو دوسرا اس پر عمل درآمد کرنے میں ہی بہتری جانتا۔

اس وقت بھی انہوں نے اپنا رخ بدل کر جنوب کی سمت سفر شروع کردیا۔ زخمی ہونے کے باوجود عمران کی رفتار اس سے زیادہ تھی۔ وہ اپنے حصے کے بوجھ میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ سست رفتار ہوگئی تھی لیکن بہرحال منظر صاف ہونے کی وجہ سے یہ درمیانی فاصلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا اور وہ دور رہ کر بھی ایک دوسرے پر نظر رکھ سکتے تھے۔ اس وقت وہ جس مقام سے گزر رہے تھے، وہ خود تو ہموار تھا لیکن اس پر بہت سی برف پوش چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ان چوٹیوں نے نہ جانے کب سے گرنے والی برف کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھایا ہوا تھا اور دیکھنے کے ساتھ ہی یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اپنا بوجھ اتار پھینکنے کی خواہش مند ہوں۔ کم از کم ماہ بانو کو ان چوٹیوں پر نظر ڈال کر یہی احساس ہوا تھا۔ اب جانے یہ قدرت کا طے شدہ فیصلہ تھا یا اس کے احساس کی شدت کہ یکایک فضا میں ایک زوردار دھماکا گونجا اور دو پہاڑوں کے درمیان سے برف کا تودہ لڑھکتا ہوا نیچے آنے لگا۔

برف کا یہ بھاری تودہ اپنے راستے میں موجود برف کو بھی دھکیلتا ہوا لارہا تھا۔ برسوں سے پہاڑوں پر گری برف سفید سفوف کے آبشار کی شکل میں نیچے کی طرف برق رفتاری سے بہتی چلی آرہی تھی۔ یہ ایوالانچ تھا۔ برف زاروں کا ایک خاص تحفہ جسے ایک جانب کھڑے ہو کر خوش گوار موڈ میں دیکھو تو اس سے بڑھ کر خوب صورت منظر کوئی نہ لگے... اور اگر جو کوئی اس کی زد میں آجائے تو بچ نکلنے کی راہ نہ پائے۔ ماہ بانو نے اپنی زندگی میں پہلی بار کوئی ایوالانچ دیکھا تھا چنانچہ پل بھر کو تو وہ منہ کھولے حیرت کے عالم میں اسے تکتی ہی چلی گئی لیکن پھر یک دم اسے عمران کا خیال آیا۔ وہ اسی طرف تھا جس طرف اس ایوالانچ کا رخ تھا۔ اس نے نظروں کا رخ بدل کر عمران کی پوزیشن کا اندازہ کرنے کی کوشش کی۔ اس نے بھی ایوالانچ کی وجہ سے ابھرنے والی گونج سن لی تھی اور بالکل اسی کی... طرح حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے قطعی ادراک نہیں تھا کہ ایوالانچ اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا ہے۔

''عمران! بھاگو... ہٹ جاؤ وہاں سے۔'' ماہ بانو زور سے چیخی لیکن اس کی آواز برفانی تودے کی گڑگڑاہٹ میں دب گئی۔ پھر عمران نے خود ہی صورتِ حال کو بھانپ لیا اور اپنی جگہ سے بھاگا لیکن اس کی رفتار ایوالانچ کی رفتار کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ ایوالانچ کسی پھنکاریں مارتے سفید اژدہے کی طرح اس کی طرف لپکا چلا جارہا تھا۔

حادثات و سانحات کی شکار۔ پناہ کی تلاش میں سرگرداں
ماہ بانو کی داستانِ حیات کے واقعات اگلے ماہ پڑھیے

'زندہ لاکھ کا تو مُردہ سوا لاکھ کا'
ایک ایسے دولت مند شخص کا فسوں خیز قصہ جس کی دولت نے اس کو مرنے کے بعد بھی آرام سے ابدی مقام پر رہنے نہ دیا

لاش کی چوری

تنویر ریاض

ایک لاش کی چوری کا معما جس نے لواحقین کو پریشانی و استعجاب میں مبتلا کردیا تھا

اس حویلی نما مکان کے عالی شان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ مسز کین فورڈ کی امارت اور شان و شوکت کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا لیکن اس کا نظارہ پہلی بار ہورہا تھا۔ دل ہی دل میں مرعوب ہوتے ہوئے اس نے ہمت کر کے قدم آگے بڑھائے۔ سامنے مسز اگاتھا کین فورڈ بیٹھی تھی اور برابر والے صوفے پر اس کا بیٹا ہیری براجمان تھا۔ اگاتھا نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ''تمہارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے اور اسی لیے تمہیں یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔''

وہ تعظیماً تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولا۔ ''اس عنایت کا شکریہ۔ میں کوشش کروں گا کہ مسز کین فورڈ کو جلد از جلد بازیاب کرواسکوں۔''

’’نہیں، نہیں۔‘‘ وہ تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔ ’’تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میرے شوہر اغوا نہیں ہوئے بلکہ ان کی لاش غائب ہوگئی ہے اور میں نے تمہیں اسی سلسلے میں بلایا ہے۔‘‘

’’لاش؟‘‘ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔

’’ہاں، ہمارے خاندانی مقبرے سے لاش چوری ہو گئی ہے۔ میں اور بیری حیران ہیں کہ یہ کیسے ہوگیا۔ اب وہ لوگ اس کے عوض دو لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔‘‘

’’وہ کون؟‘‘

مسز کین فورڈ کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ منہ بناتے ہوئے ناگواری سے بولی۔ ’’ظاہر ہے کہ ایسا مطالبہ اغوا کنندگان ہی کر سکتے ہیں۔ کیا تم اونچا سنتے ہو؟‘‘

’’نہیں... نہیں تو۔‘‘ وہ بوکھلاتے ہوئے بولا۔

’’تو براہِ مہربانی غور سے میری بات سنو۔‘‘

مسز اگاتھا کین فورڈ تقریباً ستر سال کی عورت تھی لیکن مضبوط قوتِ ارادی، پُرعزم اور اپنے معاملات پر پورا کنٹرول رکھتی تھی۔ وہ کافی دولت مند تھی جس کا اندازہ اس حویلی کی شان و شوکت سے لگایا جا سکتا تھا۔ کوئن کین نے اس کے شوہر روبن کین فورڈ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ بنیادی طور پر سرمایہ کار تھا اور شیئرز کے ساتھ ساتھ بڑی جائیدادوں میں بھی سرمایہ کاری کرتا تھا۔ تاہم وہ اس سے کبھی نہیں ملا تھا اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ کین فورڈ اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے کیونکہ وہ خود گزشتہ ایک ماہ سے باہر گیا ہوا تھا اور صرف تین دن پہلے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

’’لاش چرانا یقیناً ایک قابلِ نفرت جرم ہے۔‘‘ وہ آہستہ سے بولا۔ ’’کیا آپ کسی کو اس کا ذمے دار سمجھتی ہیں؟‘‘

’’مجھے تو یہ کسی آسمانی مخلوق کا کام لگتا ہے۔‘‘ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

کوئن نے اس کے طنز کا برا منائے بغیر کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ پھر بھی آپ کسی کا نام تو لے سکتی ہیں۔‘‘

’’ہم نہیں جانتے کہ کون اس میں ملوث ہو سکتا ہے۔‘‘

اس بار اگاتھا کے بجائے اس کا بیٹا بیری بولا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا گنجا اور قدرے فربہ شخص تھا جس نے نہایت قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا۔ ’’بظاہر یہ کسی جرائم پیشہ شخص یا گروہ کا کام ہو سکتا ہے۔ ان دنوں ویسے بھی باربری کوسٹ کے بدمعاشوں نے دہشت پھیلا رکھی ہے۔‘‘

’’تمہاری باتوں سے ایسا لگ رہا ہے کہ تم ان بدمعاشوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو۔‘‘ مسز فورڈ نے کہا۔

’’کچھ زیادہ نہیں لیکن ان لوگوں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔‘‘

’’جن آوارہ عورتوں اور جواریوں کے ساتھ تمہارا اٹھنا بیٹھنا ہے، ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘

’’مام! تم جانتی ہو کہ یہ سچ نہیں ہے۔‘‘ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔

مسز فورڈ نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کوئن سے کہا۔ ’’میرے بیٹے کا خیال ہے کہ ہمیں تاوان کی رقم ادا کر دینی چاہیے۔‘‘

’’ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ لاش کی واپسی کی یہی ایک صورت ہے۔‘‘ بیری نے کہا۔

’’کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہوئے مسٹر کوئن؟‘‘

’’نہیں... تاوان ادا کرنے کے باوجود بھی خطرہ موجود رہتا ہے۔‘‘

’’کم از کم اس وقت میری بھی یہی پوزیشن ہے۔‘‘ مسز فورڈ نے کہا۔ ’’مجھے اس وقت تک چین نہیں آئے گا جب تک میرے شوہر کی باقیات اپنی جگہ واپس نہیں آ جاتیں یا مجرم بے نقاب نہیں ہو جاتے۔ میں نے اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ایک قابل سراغ رساں ہو۔‘‘

’’مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔‘‘ وہ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ’’آپ کے شوہر کا انتقال کب ہوا تھا؟‘‘

’’دو ہفتے پہلے لیکن ان کی موت اچانک نہیں تھی۔ وہ کچھ عرصے سے بیمار رہنے لگے تھے۔‘‘

’’اور یہ چوری کب ہوئی؟‘‘

’’ٹھیک طرح سے نہیں بتا سکتے۔‘‘ بیری نے کہا۔ ’’پچھلے دو دنوں میں یہ واقعہ پیش آیا ہے۔‘‘

’’کیا آپ نے پولیس کو مطلع کیا؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ مسز فورڈ بولی۔ ’’ہماری پولیس نااہل اور کرپٹ ہے اور اسے اس معاملے میں شامل کرنے سے سنسنی خیز پبلسٹی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔‘‘

’’آپ کو تاوان کا خط کب ملا؟‘‘

’’کل دوپہر میں۔ یہ ایک پیکج کی صورت میں ہے جو ایڈمنڈ کو دروازے کی سیڑھیوں پر ملا تھا۔ تم چاہو تو دیکھ سکتے ہو۔ وہ میز پر رکھا ہے۔‘‘ کوئن کی نظر اس پر پہلے ہی پڑ چکی تھی لیکن اب اس نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ گتے کا بنا ہوا ایک ڈبا تھا۔ اس نے ڈھکنا ہٹایا۔ اس میں ایک خط، سفید ساٹن کا ٹکڑا اور ایک سونے کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ کوئن نے خط پڑھنا شروع کیا۔

’’ہمارے پاس کین فورڈ کی لاش ہے اور ابھی تک ایک ائرٹائٹ کنٹینر میں محفوظ ہے... دو لاکھ ڈالرز کے عوض تم اسے دوبارہ حاصل کر سکتے ہو ورنہ دوبارہ کبھی نہیں دیکھ سکو گے۔ اس بارے میں ہدایات جلد مل جائیں گی۔ پولیس یا کسی اور کو مطلع کرنے کی ضرورت نہیں۔‘‘

’’یہ انگوٹھی آپ کے مرحوم شوہر کی ہے؟‘‘ اس نے مسز فورڈ سے پوچھا۔

’’یقیناً، یہ میں نے ہی اسے کئی سال پہلے دی تھی۔ یہ ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔‘‘

’’اور یہ ساٹن کا ٹکڑا شاید ان کے تابوت کے کنارے سے کاٹا گیا ہے؟‘‘

بیری بولا۔ ’’جیسے ہی یہ خط ملا، ہم تینوں یعنی میں، ایڈمنڈ اور مام۔ سیدھے مقبرے پر گئے۔ ہمیں وہاں کا دروازہ بند ملا جیسے کسی نے اسے ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ اگر اس خط کے ساتھ یہ انگوٹھی اور ساٹن کا ٹکڑا نہ ہوتا تو ہم اسے ایک مذاق ہی سمجھتے۔‘‘

’’پھر تم نے کیا کیا؟‘‘

’’میں اور بیری بینک گئے اور وہاں سے مقبرے کی چابی حاصل کی جو میں نے آخری رسومات کے بعد ایک باکس میں رکھ کر وہاں محفوظ کر دی تھی۔‘‘

’’کیا مقبرے کی ایک ہی چابی ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘

’’اور آپ دونوں کے سوا کسی اور شخص کی اس باکس تک رسائی ممکن نہیں؟‘‘

’’نہیں... میرے سوا کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں تک کہ میرا بیٹا بھی۔ جب تک میں زندہ ہوں۔‘‘

بیری نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ’’تم تصور کر سکتے ہو کہ اس وقت ہم پر کیا گزری ہوگی جب ہم نے تابوت کو خالی دیکھا ہوگا۔‘‘

کوئن نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ ’’میں ایک نظر مقبرے پر ڈالنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے مسٹر بیری؟‘‘

مسز فورڈ نے اپنے لباس کی جیب سے ایک بڑی سی چابی نکالی اور بیٹے کو دینے کے بجائے کوئن کے ہاتھ پر رکھ دی۔ بیری کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ وہ بڑی مشکل سے کرسی سے اٹھا۔ گوکہ جانتا تھا کہ ماں اس کے بارے میں کیسے خیالات رکھتی ہے لیکن کسی تیسرے شخص کے سامنے اسے یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

وہ فرانسیسی دروازے سے گزر کر ایک ٹیرس میں داخل ہوا جس کے چاروں طرف شاندار باغ تھا۔ گوکہ کوئن کو ان مناظر سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن باغ کی خوب صورتی سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سوچا کہ اس پُرشکوہ ماحول میں رہنے کا مزہ ہی کچھ اور ہو گا۔ کیا وہ خود اپنے لیے ایسی جگہ کا تصور کر سکتا ہے؟ اگر اس کی ایجنسی اسی طرح ترقی کرتی رہی تو شاید ایک دن یہ خواب حقیقت میں بدل جائے۔

باغ کے مخالف سرے پر مقبرہ اپنی پوری شان و شوکت

اہلیت

ایک کمپنی کا منیجر ماہر نفسیات بھی تھا۔ کمپنی کے مالک کو ایک سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ منیجر نے کہا کہ آنے والی لڑکیوں کا انٹرویو نفسیاتی طریقے سے وہ خود لے گا اور مالک نے حامی بھرلی۔

منیجر نے تین امیدوار لڑکیوں کو ایک ساتھ کمرے میں بلا لیا اور پہلی لڑکی سے پوچھا۔ ’’دو اور دو۔‘‘

’’چار۔‘‘ لڑکی نے جواب دیا۔

منیجر نے یہی سوال دوسری لڑکی سے کیا۔

’’بائیس۔‘‘ دوسری لڑکی نے بتایا۔

منیجر نے تیسری لڑکی سے بھی یہی پوچھا۔

’’چار بھی ہو سکتے ہیں اور بائیس بھی۔‘‘ تیسری لڑکی کا جواب تھا۔

منیجر نے تینوں لڑکیوں کو باہر بھیج دیا اور مالک سے بولا۔

’’پہلی لڑکی نے وہ جواب دیا جو سبھی دیتے ہیں۔ جبکہ دوسری یہ سمجھی کہ ہم کوئی چال چل رہے ہیں اور اس نے بائیس کہا۔ لیکن تیسری لڑکی کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے دونوں جواب دیے اب آپ کسے پسند کریں گے؟‘‘

’’سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کو رکھ لو۔‘‘ مالک نے جواب دیا۔

www.pkdigest.com

سے جگمگا رہا تھا۔ پتھروں سے بنی اس عمارت کے عقب میں چھکڑے کھڑے کرنے کی جگہ تھی جہاں سے ایک راستہ عقبی سڑک پر نکلتا تھا۔ یہ جگہ بالکل الگ تھلگ تھی اور قرب و جوار میں کوئی مکان نہیں تھا اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ چور اپنی گاڑی لے کر اسی راستے سے آئے ہوں گے اور اسے تہ خانے کے پیچھے کھڑا کیا ہوگا۔ اس طرح رات کی تاریکی میں ان کے دیکھے جانے کا امکان بہت کم تھا۔ مقبرے کی بیرونی دیوار پر کانسی کا منقش دروازہ لگا ہوا تھا۔ کوئن نے جیب سے محدب عدسہ نکالا اور سب سے پہلے اس کے تالے کا معائنہ کیا۔ اسے ایسی کوئی علامت نہیں ملی جس سے ظاہر ہوتا کہ تالا کھولنے کی کوشش کی گئی ہے یا اس پر کوئی اوزار آزمایا گیا ہے... اور نہ ہی دروازے کے قبضوں پر ایسی کوئی نشانی نظر آئی۔ اس طرح کے تالے پر کوئی دوسری چابی بھی استعمال نہیں کی جاسکتی جب تک کہ تالا بنانے والا خود ہی چوروں کے ساتھ نہ مل جائے۔

''مقبرے میں آنے جانے کا یہی ایک راستہ ہے؟'' اس نے ہیری سے پوچھا۔

''ہاں... اس کے سوا یہاں کوئی کھڑکی یا روشن دان تک نہیں ہے۔''

کوئن نے تالے میں چابی گھمائی۔ دروازہ واقعی بہت بھاری تھا اور اسے دھکیلنے میں تھوڑی سی کوشش کرنی پڑی۔ مقبرے کی دیواریں موٹی تھیں۔ اس نے تھتھنے سکیڑے تو اسے گندھک کی بو کا احساس ہوا۔ اس نے لائٹ روشن کی اور اندر داخل ہوگیا جبکہ ہیری نے دروازے پر رک کر ہی اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔

دیواروں کے ساتھ پتھروں سے چار خانے بنے ہوئے تھے جن میں سے دو خانوں میں تابوت رکھے ہوئے تھے اور دونوں کے ڈھکنے بند تھے۔ اس کے پوچھنے پر ہیری نے بتایا کہ چھوٹا تابوت اس کی بہن جینی کا ہے جو چھ سال پہلے انتقال کرگئی تھی۔ دوسرا تابوت قدرے بڑا تھا اور اس میں چاندی کے قبضے اور ہینڈل لگے ہوئے تھے۔ داہنی طرف چاندی کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر کین فورڈ کا نام، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج تھی۔ اس نے تابوت کا ڈھکنا ہٹایا جس کے اسکریو بڑی صفائی سے الگ کرلیے گئے تھے۔ اندرونی دیواروں اور تہ پر ساٹن کا کپڑا بچھا ہوا تھا جس پر کوئی شکن نہیں تھی۔

اس نے ٹارچ کی مدد سے دوسری اور تیسری بار تابوت کی اندرونی دیواروں کا بہ غور جائزہ لیا لیکن اسے وہاں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اسے نہیں چھیڑا اور سب کچھ اپنی اصلی حالت میں ہے۔ وہ مایوسی اور بے یقینی کے عالم میں سر ہلاتا ہوا باہر آیا اور بیرونی دروازے کو تالا لگاتے ہوئے بولا۔

''یہ بتاؤ کہ جب تم اور ایڈمنڈ تہ خانہ میں داخل ہوئے تو تابوت کا ڈھکنا کھلا ہوا تھا یا بند تھا؟''

''بند تھا۔'' ہیری نے ناگواری سے کہا۔ ''کیا تم کچھ اندازہ لگا سکتے ہو کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا ہوگا؟''

کوئن کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے مسکرا کر رہ گیا۔ اگر کوئی اندازہ تھا تو وہ اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

دوسری صبح اپنے دفتر جاتے ہوئے اس نے سان فرانسسکو کال کے دو پرانے شمارے حاصل کیے۔ سینا اپنی میز پر بیٹھی کسی کیس کا مطالعہ کررہی تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں، شاداب چہرہ، گھنے سیاہ بال اور متناسب جسم پر نظر پڑتے ہی کوئن کی نبض تیز ہوجاتی تھی۔ وہ خوب صورت اور جوان بیوہ اس کی پارٹنر تھی جس کی جانب نئی کوئن پیش قدمی کر چکے تھے اور کوئن کو یہ سوال اکثر پریشان کرتا رہتا تھا کہ کیا وہ کسی اجنبی کو اپنے گھر آنے کی اجازت دے سکتی ہے؟ بظاہر وہ اپنی زندگی کے حوالے سے بڑی محتاط نظر آتی تھی اور اس نے بڑی شائستگی سے کئی بار کوئن کی پیش قدمی کو روک دیا تھا۔ کبھی کبھار ایک ساتھ لنچ کرنے کے علاوہ ان کے تعلقات صرف کام تک محدود تھے۔ لیکن وہ بھی بہت ڈھیٹ واقع ہوا تھا اور ہر انکار کے بعد وہ اس کی مزاحمت ختم کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ پرعزم ہوجاتا۔

اس وقت بھی وہ جملہ پھینکنے سے باز نہیں آیا اور اس کی میز کے پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔ ''آج تم بہت زیادہ پیاری لگ رہی ہو۔''

''آتے ہی مکھن لگانا شروع کردیا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''یقین جانو میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں۔ تمہارے سچ اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے عزائم کو۔'' اس بار اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''کیا کروں، تم اتنی پرکشش ہو کہ میں اپنے جذبات کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سچ کہہ رہا ہوں کہ ان تین ہفتوں کی جدائی نے بےکل کرکے رکھ دیا۔''

''یہ بات تم چوتھی بار کہہ رہے ہو۔''

''سچ کتنی ہی بار دہرایا جائے پھر بھی کم لگتا ہے۔''

وہ اس کی باتوں سے اکتاتے ہوئے اپنے کاغذات پر نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے بہت کام کرنا ہے جان۔ اگر تم فارغ ہو تو میری مدد کرسکتے ہو۔''

''نہیں، میں بھی مصروف ہوں۔'' کوئن نے کہا۔ ''ہمیں ایک نئی کلائنٹ ملی ہے جو خاصی دولت مند ہے۔ تم نے اگاتھا کین فورڈ کا نام تو سنا ہوگا؟''

''روبن کین فورڈ کی بیوہ؟''

''اس کے علاوہ کون ہوسکتی ہے۔ اس نے کل سہ پہر ٹیلی فون کیا تھا۔ اس وقت تم دفتر میں نہیں تھیں۔'' کوئن نے وضاحت کرتے ہوئے اسے کیس کی نوعیت سے آگاہ کیا۔

''مجھے تو یہ چور اچکوں کی حرکت لگتی ہے۔'' سینا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو ہمیں ایزرا ملیو فیلڈ سے مدد مل سکتی ہے لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔''

''کیا...؟''

''مجھے لگتا ہے کہ یہ کام کسی موقع پرست کا ہے۔ چور، اچکے اور آوارہ گرد اتنی بڑی رقم کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔''

''فورڈ کو مرے ہوئے دو ہفتے ہوچکے ہیں۔'' سینا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''موقع پرست کسی فائدے کے لیے شاید ہی اتنا انتظار کرتے ہوں۔''

''جب تک ان کے پاس اس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔'' کوئن نے ہنستے ہوئے کہا تو سینا چپ کر رہ گئی۔

کوئن نے کین فورڈ کی موت کی تفصیلات جاننے کے لیے مقامی اخبار کے پرانے شمارے کھنگالنا شروع کیے اور اسے بارہ دن پہلے کے اخبار میں وہ خبر مل گئی لیکن اس میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کے اثاثوں کی مالیت کا اندازہ دس ملین ڈالرز لگایا گیا ہے اور یہ کہ اس کا بیٹا ہیری کین فورڈ، پروموٹر کے طور پر کام کرتا ہے لیکن خبر میں یہ وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ کس چیز کی پروموشن کرتا ہے۔

اس کے دو دن بعد شائع ہونے والے اخبار میں کین فورڈ کی آخری رسومات کی تفصیل درج تھی جس سے کوئن کو سیمٹ گھر کے بارے میں معلوم ہوا۔ یہ جگہ ونیس ایوینیو پر واقع تھی۔ آخری رسومات میں شرکت کرنے والے دوستوں میں تین نام جانے پہچانے تھے اور ان کا شمار بھی کین فورڈ جیسے دولت مندوں میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک غیر معروف نام تھامس بروڈی کا تھا جسے کین فورڈ انویسٹمنٹ

دلیل

ایک دوست کی دوسرے دوست سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنے دوست کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ''ارے سلیم! تم بیساکھی استعمال کررہے ہو، کیا ہوا؟''

سلیم نے جواب دیا۔ ''ایک کار سے ٹکر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دن تک مجھے بیساکھی استعمال کرائی۔ اب اس کا کہنا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوچکا ہوں۔''

پہلے دوست نے کہا۔ ''پھر تم ابھی تک بیساکھی کیوں استعمال کررہے ہو؟''

سلیم نے کہا۔ ''ہاں ڈاکٹر تو کہتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوچکا ہوں مگر میرا وکیل کہتا ہے کہ مجھے ابھی کچھ دنوں اور بیساکھی استعمال کرنی چاہیے۔''

کارپوریشن کا ایم ڈی بتایا گیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ خبر کے ساتھ کین فورڈ کی کوئی تصویر دی گئی تھی اور نہ ہی اس کا کوئی اسکیچ نظر آرہا تھا۔ کوئن کو یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے اس کی تصویر کہیں دیکھی ہو۔ جب اس نے یہی بات سینا سے پوچھی تو وہ بولی۔

''نہیں لیکن ایک سال پہلے پیلس ہوٹل کے استقبالیہ میں اس سے ملنے کا اتفاق ضرور ہوا تھا؟''

''تم وہاں مدعو تھیں یا کسی کے ساتھ گئی تھیں؟'' کوئن نے بےچینی سے پوچھا۔

اس کی جرح پر سینا تلملا کر رہ گئی اور بولی۔ ''ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بتائی جائے لیکن تم اس کی تصویر میں کیوں دلچسپی لے رہے ہو؟''

''صرف یہ جاننے کے لیے کہ وہ دیکھنے میں کیسا لگتا تھا۔ مجھے کین فورڈ مینشن میں بھی اس کی کوئی تصویر نظر نہیں آئی۔''

''اتنا تو میں بھی تمہیں بتا سکتی ہوں۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ''ساڑھے پانچ فٹ قد، دبلا جسم، گرے بال، لمبے کان اور بھوری آنکھیں... اگر میری یادداشت صحیح کام کررہی ہے۔''

''تمہارا مشاہدہ غضب کا ہے۔'' وہ تعریفی انداز میں بولا۔

''اسے میں اپنی تعریف سمجھوں یا اب تم مجھ پر طنز کررہے ہو؟''

www.pkdigest.com

کوئن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس عورت کو سمجھنا واقعی مشکل تھا۔

☆☆☆

کوئن کو شبہ تھا کہ یہ حرکت کسی آوارہ اور بے روزگار ملاحوں کے گروپ کی ہو سکتی ہے جو بے کاری کے دنوں میں اپنی گزر اوقات کے لیے چھوٹے موٹے جرائم کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ اس نے سب سے پہلے ایزرا بلیو فیلڈ سے ملنے کا فیصلہ کیا جو بندرگاہ پر واقع پیسیفک ایونیو پر اپنا سیلون چلاتا تھا۔ یہاں ہر وقت ملاحوں کا جمگھٹا لگا رہتا جو جہاز پر نوکری ملنے کے انتظار میں شراب، جوئے اور لڑکیوں سے دل بہلاتے۔ گو کہ اس جگہ کی شہرت اچھی نہ تھی، اس کے باوجود بلیو فیلڈ کو شریف آدمی سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس نے اپنے آپ کو مجرمانہ سرگرمیوں سے علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ اس تمام تر لاتعلقی کے باوجود اس کی آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے اور بندرگاہ کے علاقے میں ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی واردات بھی اس کے علم میں ہوتی۔

اس نے اپنے مہمان کا استقبال بڑی خوش دلی سے کیا۔ وہ کوئن کی بڑی عزت کرتا تھا کیونکہ ایک مرتبہ اس نے ایک حریف سے اس کی جان بچائی تھی جو اس کا خاتمہ کر دینا چاہتا تھا اور یہ احسان بلیو فیلڈ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جب کوئن نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان لوگوں میں کوئی اتنا ہوشیار اور اسمارٹ ہو سکتا ہے جو اس طرح کا منصوبہ بنا سکے۔ ایسے کاموں کے لیے بہت زیادہ عقل اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ان کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ انہیں لوٹ مار، فریب کاری اور لڑائی جھگڑوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ یہ لوگ اتنا بڑا منصوبہ کیسے بنائیں گے؟“

”پھر بھی تم اس بارے میں معلومات حاصل کرو اور اگر کوئی اشارہ ملے تو مجھے فوراً مطلع کر دینا۔“

”تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد کوئن نے کین فورڈ انویسٹ منٹ فاؤنڈیشن کا رخ کیا جس کا دفتر منٹگمری بلاک میں واقع تھا۔ بروڈی کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ مسز کین فورڈ کے لیے کام کر رہا ہے تو اسے فوراً ہی اندر بلا لیا گیا۔ بروڈی اپنے عالی شان دفتر میں ایم ڈی کی کرسی پر براجمان تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مسز کین فورڈ کو ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟“

”یہ ایک ذاتی مسئلہ ہے جس کے لیے میری خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ تم اگر چاہو تو مسز کین فورڈ کو فون کر کے اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کہہ دینا ہی کافی ہے۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بھی مسٹر کین فورڈ کے جنازے میں شامل تھے؟“

”ہاں... مجھے یہ اعزاز حاصل ہے۔ وہ صرف میرا باس ہی نہیں بلکہ پرانا دوست بھی تھا۔“

”جنازے میں تو کافی لوگ ہوں گے؟“

”کیوں نہیں؟ اس شہر میں مسٹر کین فورڈ کے بہت سے دوست ہیں۔“

”میں نے ایور گرین چیپل نہیں دیکھا۔ یقیناً وہاں کے انتظامات بہت اچھے ہوں گے۔“

”مجھے تو وہ جگہ بہت چھوٹی لگی۔ کم از کم مسٹر کین فورڈ جیسے قد والے کے لیے تو بالکل بھی مناسب نہیں تھی۔ جس کمرے میں آخری دیدار کے لیے لوگ جمع ہوئے، وہاں بھی بہت کم گنجائش تھی۔ اسی طرح پھول چڑھانے کا انتظام بھی افراتفری میں کیا گیا تھا۔“

”بڑے شرم کی بات ہے۔“ کوئن نے گرہ لگائی۔ ”کیا جنازے کا جلوس مناسب طریقے سے ہینڈل کیا گیا؟“

”کسی حد تک کہہ سکتے ہیں۔ البتہ اس کی روانگی میں کچھ تاخیر ہو گئی تھی... کیونکہ تابوت لے جانے والی گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہمیں دس منٹ تک انتظار کرنا پڑا۔ بے چاری مسز کین فورڈ، وہ اس دوران میں مسلسل روتی رہی۔“

”کیا انہوں نے ہی اس جگہ کا انتخاب کیا تھا؟“

”اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔“ بروڈی نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گیا ہے۔ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم سب کے لیے یہ ایک بہت بڑا نقصان ہے۔ بالخصوص ان لوگوں کے لیے جنہیں ان سے فائدہ پہنچا اور مسٹر کین فورڈ کی ہمدردانہ کوششوں کی بدولت وہ آئندہ بھی مستفید ہوتے رہیں گے۔ وہ بہت ہی عمدہ اور دوسروں کا خیال رکھنے والے شخص تھے۔“

”لگتا ہے کہ مسز کین فورڈ بھی ان سے مختلف نہیں ہیں۔“

”یقیناً۔ وہ بہت ہی شان دار خاتون ہیں۔“ بروڈی نے تائید کی۔

”کیا ان کا بیٹا پیری کین فورڈ، کارپوریشن کے معاملات میں شامل ہے؟“ کوئن نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”اسے خود دلچسپی نہیں یا مسٹر کین فورڈ نے اسے ان معاملات سے علیحدہ رکھا ہوا تھا؟“

اس بار بھی بروڈی نے جواب دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا پھر کافی دیر بعد بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اس کی دلچسپی کہیں اور ہے۔“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ پروموٹر ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کیا پروموٹ کرتا ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

کوئن سمجھ گیا کہ بروڈی اس بارے میں کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس نے چند مزید سوالات کیے اور بروڈی کو حیران و پریشان چھوڑ کر وہاں سے چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی بروڈی کافی دیر تک سوچتا رہا کہ وہ کس مقصد کے تحت آیا تھا؟

کوئن نے دن کا بقیہ حصہ گھومنے پھرنے اور معلومات جمع کرنے میں لگایا۔ اس دوران اس نے ایک چکر ایور گرین چیپل کا بھی لگایا اور ایک نظر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ بروڈی نے اس جگہ کے بارے میں بالکل درست رائے قائم کی تھی۔ پھر وہ ایک بار پھر بندرگاہ کی طرف گیا اور بلیو فیلڈ سے مختصر بات چیت کی۔ وہاں سے وہ اپنی پسندیدہ جگہ ہولی ہان سیلون گیا۔ یہاں وہ کافی عرصے سے آ رہا تھا اور اس نے بار مین وغیرہ سے اچھے تعلقات بنا رکھے تھے۔ وہ یہاں پر آنے والے کئی ایسے مستقل گاہکوں کو بھی جانتا تھا جن سے چند سکوں یا مفت ڈرنک کے عوض شہر میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

اس نے وہاں تین گھنٹے گزارے اور کئی گلاس جوس پینے کے ساتھ ساتھ اپنے مطلب کے لوگوں سے باتیں بھی کرتا رہا۔ جب وہ پانچ بجے کے قریب وہاں سے اٹھا تو اسے ایک کے سوا تمام سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر اس ایک سوال کا جواب بھی مل جائے گا۔

اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے بلیو فیلڈ کے ایک آدمی نے اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس نے جو رپورٹ دی، وہ اس کی توقع کے عین مطابق تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ آنے والی صبح وہ کین فورڈ کی لاش بازیاب کرانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

دوسری صبح وہ دفتر پہنچا تو سیپا نے اطلاع دی۔ ”پانچ منٹ پہلے ہی مسز کین فورڈ کا فون آیا تھا۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”ملنا تو مجھے بھی ہے لیکن ابھی نہیں۔“

”ان کے پاس تمہارے لیے ایک حیرت انگیز خبر ہے۔“

”اچھا۔“ کوئن نے بے نیازی سے کہا۔

”ان کے شوہر کی لاش خاندانی قبرستان میں واپس پہنچ گئی ہے۔“

”کیا؟“ اس بار اسے اپنی حیرت پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

”جس پراسرار انداز میں لاش لے جائی گئی تھی، اسی

گھڑی

دفتر کے کام سے طارق بذریعہ ہوائی جہاز کراچی سے لاہور جانے کے لیے گرتے پڑتے ذرا تاخیر سے ائرپورٹ پہنچے تو فلائٹ روانہ ہو رہی تھی۔ سرنگ نما راستے کا گیٹ بند ہو رہا تھا۔ طارق کاؤنٹر پر بیٹھی خاتون سے لڑنے لگے کہ انہیں بورڈنگ کارڈ دیا جائے اور ہوائی جہاز کو رکوایا جائے۔

”فلائٹ کا ٹائم تین بج کر دس منٹ ہے اور میری گھڑی میں ابھی تین بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔“ انہوں نے خاتون کو اپنی گھڑی دکھائی۔

ائرلائن کی ملازم خاتون نہایت تحمل اور شائستگی سے بولیں۔ ”وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن آپ چونکہ یہاں موجود نہیں تھے اس لیے مجبوراً ہمیں اپنی ہی گھڑی دیکھ کر فلائٹ کو روانہ کرنا پڑا۔“

مجبوری

”تمہاری دو بیویاں کار کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔“ جج نے کٹہرے میں کھڑے ہوئے ملزم سے سوال کیا۔ ”دونوں مرتبہ کار کے بریک فیل ہونے کی وجہ سے حادثہ ہوا۔“

”تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔“ جج نے گفتگو آگے بڑھائی۔ ”تمہاری تیسری بیوی کی موت زہر خورانی کی وجہ سے واقع ہوئی... اس کی وجہ کیا ہے؟“

”تیسری بیوی!“ ملزم نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”وہ ڈرائیونگ نہیں جانتی تھی۔“

www.pkdigest.com

طرح گزشتہ رات کچھ لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ لیکن تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟''

''اس لیے کہ اس بدمعاش نے میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا، ورنہ میں آج ہر قیمت پر لاش بازیاب کر لیتا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' سیبا لسے ولا سا دیتے ہوئے بولی۔ ''مسز کین فورڈ چاہتی ہیں کہ تم اس شخص کی تلاش کا کام جاری رکھو جو اس شرمناک حرکت کا ذمے دار ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب وہ میری فیس میں کٹوتی کر دے گی۔''

''اوہ میرے خدا!'' وہ اپنا سر پکڑتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں سوچتے ہو؟''

''بزنس میں سب کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔'' کوئن نے بدمزاجی سے کہا۔ ''بہرحال، تلاش جاری رکھنے کی ضرورت نہیں؟ میں پہلے ہی اس شخص کا پتا لگا چکا ہوں۔''

''کیا میں بھی اس شخص کا نام جان سکتی ہوں؟''

''فی الحال میں جلدی میں ہوں۔ واپس آنے کے بعد سب کچھ بتا دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا کوٹ اور ہیٹ اٹھایا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

مسز فورڈ اور بیری کین فورڈ، ٹیرس پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ مسز فورڈ گزشتہ روز کے مقابلے میں کافی پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کوئن کا خیر مقدم کیا اور بولی۔ ''گویا تمہیں میرا پیغام مل گیا۔ کیا یہ چونکا دینے والی خبر نہیں ہے؟''

کوئن نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً ایسا ہی ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے تاوان کی رقم کیوں ادا کی؟''

مسز فورڈ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ ''بیری نے مجھے قائل کر لیا کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔''

''ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔'' بیری بولا۔ ''گزشتہ سہ پہر ہمیں ایک اور خط ملا جس میں پہلے سے زیادہ سخت اور دھمکی آمیز زبان استعمال کی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ اگر شام پانچ بجے تک رقم ادا نہ کی گئی تو ڈیڈی کی لاش کو ضائع کر دیا جائے گا۔ ہمارے لیے اس دھمکی کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔''

''تم کم از کم مجھے تو اطلاع دے دیتے۔'' کوئن نے احتجاجاً کہا۔

''میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی۔'' مسز کین فورڈ نے کہا۔ ''لیکن جلدی میں خیال نہ رہا۔ بینک سے پیسے نکالنے اور ان لوگوں تک پہنچانے کے لیے ہمارے پاس بہت کم وقت تھا۔''

''خط میں لکھا تھا کہ یہ رقم گولڈن گیٹ پارک کے ایک بینڈ اسٹینڈ کے نزدیک رکھ دی جائے۔ میں بڑی مشکل سے وقت پر وہاں پہنچ سکا۔''

''مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ پیسے لینے کے بعد بھی شاید لاش واپس نہ کریں لیکن آج صبح جب بیری مقبرے کی طرف گیا تو لاش اپنی جگہ محفوظ حالت میں رکھی ہوئی تھی۔''

''حیرت کی بات ہے کہ جس پُراسرار انداز میں لاش چوری ہوئی تھی، اسی طرح واپس بھی آ گئی جبکہ وہ جگہ پہلے کی طرح مقفل تھی۔'' بیری نے ماں کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہرحال، تم اپنی تحقیقات جاری رکھو۔'' مسز فورڈ بولی۔ ''تاوان کی رقم میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گی جب تک اصل مجرم نہیں پکڑے جاتے اور انہیں سزا نہیں ملتی۔''

''ایسا ہی ہو گا۔'' کوئن نے بیری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک بار پھر اس تہ خانے کا جائزہ لینا چاہتا ہوں گا۔ تمہیں میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض تو نہیں...؟''

''نہیں... بالکل نہیں۔'' بیری نے خوش دلی سے کہا اور ماں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''چابی۔''

مسز فورڈ نے اپنی جیب سے چابی نکال کر اس کے حوالے کی اور وہ دونوں مقبرے کی جانب روانہ ہو گئے۔ بیری نے وہاں پہنچ کر بھاری دروازہ کھولا اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میں یہیں انتظار کروں گا جب تک تم اندر جا کر جائزہ لے لو۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' کوئن اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''لیکن تم نے تو کہا تھا کہ...''

''تمہیں یہاں تک لانے کے لیے مجھے یہ بہانہ بنانا پڑا۔'' کوئن اس کے قریب آ گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ تاوان کے طور پر لی گئی رقم کہاں ہے؟''

''کک... کیا...؟''

''تم نے یہ رقم اپنے ساتھیوں اور قرض خواہوں میں تقسیم کر دی یا ابھی تک تمہارے پاس ہے؟''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیسی باتیں کر رہے

ہو؟'' بیری پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

''تم اتنے معصوم نہیں جتنے نظر آتے ہو۔'' کوئن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ یہ سارا منصوبہ تم نے ہی بنایا تھا اور خط لکھنے والے بھی تم خود ہی تھے۔''

بیری تھوڑا سا بوکھلایا پھر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یہ ایک ہتک آمیز الزام ہے۔ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟''

کوئن اس کے اور قریب ہو گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''اب اس کی تردید کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''میں اس کی تردید کرتا ہوں کیونکہ یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں کی چابی میرے پاس نہیں ہوتی اور اس کے بغیر تہ خانے میں جانا ممکن نہیں۔''

''تم نے اسی لیے دو ہفتے انتظار کیا تاکہ تمہاری ماں کو شبہ نہ ہو اور اس کی توجہ دوسرے لوگوں کی جانب چلی جائے۔ اسی لیے میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے باپ کی لاش غائب ہونا یا بازیاب ہونا کوئی معما ہے۔''

بیری بُری طرح پھنس چکا تھا۔ اس نے بے چارگی سے سر ہلایا لیکن کچھ بولا نہیں۔ کوئن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم دونوں اچھی طرح جانتے ہیں کہ لاش اس مقبرے میں لائی ہی نہیں گئی بلکہ آخری رسومات کے بعد اور جنازے کے روانہ ہونے سے پہلے ہی اسے تابوت سے نکال لیا گیا تھا۔ تابوت بھاری ہوتا ہے اور تمہارے والد دبلے پتلے تھے۔ اسی لیے کسی کو بھی وزن کے فرق کا احساس نہ ہو سکا۔ جو ایور گرین نے یہ کارنامہ انجام دیا اور اس کے لیے تابوت لے جانے والی گاڑی میں خرابی کا بہانہ بنایا۔ اس نے ساٹن کا ایک ٹکڑا بھی کاٹا اور انگوٹھی غائب کر دی اور گزشتہ شب تک یہ لاش اس کے پاس ہی تھی۔ اسی طرح لاش کی واپسی میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ مقبرے کی چابی تمہاری ماں کے پاس ہوتی ہے۔ تم نے کسی طرح سوتے میں یہ چابی اس کی جیب سے نکال لی اور پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ایور گرین کو یہاں بلا لیا۔ پھر تم نے لاش کو یہاں منتقل کرنے میں اس کی مدد کی۔ تہ خانے کو مقفل کیا اور چابی واپس وہیں رکھ دی جہاں سے حاصل کی تھی۔ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد آج صبح تم نے لاش کے مل جانے کا اعلان کر دیا۔''

''یہ... یہ سب کچھ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' بیری ہکلاتے ہوئے بولا۔

''مجھے اسی وقت شبہ ہو گیا تھا جب میں نے خالی تابوت دیکھا۔ اگر واقعی کوئی پیشہ ور چور یہ کام کرتا تو تابوت میں لگے ہوئے قیمتی چاندی کے ہینڈل اور دیگر سجاوٹی اشیا پر

دس تمہارے

ایک رئیس نہایت قیمتی لباس پہن کر ایک فلسفی کے پاس گیا۔ فلسفی نے نیچے سے اوپر تک اسے دیکھا۔ رئیس فلسفی کے اس انہماک پر بہت خوش ہوا اور پوچھا۔ ''اگر آج میں خود کو تمہارے ہاتھ بیچوں تو کیا قیمت ادا کرو گے؟''

فلسفی نے جواب دیا۔ ''چار سو دس روپے۔''

رئیس نے پوچھا۔ ''چار سو دس کس حساب سے؟''

فلسفی نے جواب دیا۔ ''چار سو روپے لباس کے اور دس تمہارے۔''

دو گدھے

ایک انگریز سیاح جنوبی فرانس میں بلند پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک سبزی فروش ملا جو گاڑی میں جتے ہوئے گدھے کو ہانک رہا تھا مگر گدھا بہ مشکل قدم اٹھا رہا تھا۔

سیاح نے ایک ہاتھ سے گاڑی کو دھکیلنا شروع کیا اور اس کی مدد سے وہ بہت جلد پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر سبزی فروش نے سیاح کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا۔ ''میں جناب کا بہت ممنون ہوں۔ دراصل صرف ایک گدھے کی مدد سے یہاں تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔''

فنکار

ایک شخص قصبے کے واحد سبزی فروش کے پاس گیا اور بولا: ''میں تمہاری دکان کے تمام ٹماٹر اور انڈے خریدنا چاہتا ہوں۔'' دکان دار نے حیرت سے کہا۔ ''سب...''

''ہاں... جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے؟'' اچانک دکان دار ہنس دیا: ''اچھا... میں سمجھ گیا۔ آپ یہ سب چیزیں اپنے ساتھ میونسپل ہال میں لے جائیں گے اور اس احمق، بے سرے اور بے تکے فنکار کے سر پر ماریں گے جو آج اپنے گانے سنانے والا ہے۔''

وہ شخص بولا۔ ''نہیں ہرگز نہیں۔ تم غلط سمجھے ہو۔ میں تو چاہتا ہوں کہ کوئی بھی فرد اس فنکار پر انڈے اور ٹماٹر نہ پھینک سکے کیونکہ وہ فنکار میں ہی ہوں۔''

www.pkdigest.com

بھی ہاتھ صاف کرتا۔ اسی طرح تابوت میں رکھا تکیہ اور چادر بھی کچھ اور ہی کہانی سنا رہی ہے۔ اگر کوئی لاش دو ہفتے تک اس چادر پر رہے تو ساٹن پر اس کا کوئی نہ کوئی نشان تو ہونا چاہیے لیکن وہ بالکل ہموار تھی۔“

ہیری نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ”اگر تم ایوو کو خطاوار سمجھتے ہو تو یہ کام اس نے اپنے طور پر کیا ہوگا۔ میں ایک دولت مند شخص ہوں اور اس معمولی رقم کی خاطر ایسی گھناؤنی حرکت نہیں کر سکتا۔“

”تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے اور ابھی تک تمام مالی معاملات تمہاری ماں کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ کبھی بھی تمہیں جوا کھیلنے یا آوارہ عورتوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے پیسے نہیں دے گی۔ تمہیں چارلس ریلے کو دس ہزار ڈالرز دینے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تم کئی لوگوں کے مقروض ہو۔ ایوو کا حال بھی تم سے مختلف نہیں۔ تم دونوں کی ملاقات ایک جوئے خانے میں ہوئی تھی اور تم اپنے والد کی زندگی میں ہی اس کے ساتھ مل کر دولت حاصل کرنے کے منصوبے بنایا کرتے تھے۔“

خاموشی کا ایک وقفہ آیا اور گزر گیا۔ ہیری نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور روہانسی آواز میں بولا۔ ”میں مجبور ہو گیا تھا۔ مجھے دھمکیاں مل رہی تھیں کہ اگر فوری طور پر رقم کی ادائیگی نہ کی گئی تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔ اس لیے مجھے یہ سب کرنا پڑا۔“ اس نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

کوین کا دل چاہا کہ اس کے منہ پر ایک زوردار مکا رسید کرے تاہم اس نے بڑی مشکل سے اپنی خواہش پر قابو پایا اور بولا۔ ”میں نے تم سے تاوان کی رقم کے بارے میں پوچھا تھا۔ وہ لوگوں میں بانٹ دی یا ابھی تمہارے پاس ہی ہے؟“

”وہ پیسے میرے دفتر میں رکھے ہیں۔ آج رات میرا ارادہ تھا کہ ایوو اور دوسرے لوگوں کو ان کا حصہ دے دوں مگر اب...“

”اب وہ پیسے تم مجھے دو گے جو میں تمہاری ماں کو لوٹا دوں گا۔“

”اور انہیں بتاؤ گے کہ...“ ہیری کہتے کہتے رک گیا۔ ”نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کر سکیں گی اور ہو سکتا ہے کہ مجھے عاق کر دیں۔“

”تمہیں یہ سب پہلے سوچنا چاہیے تھا۔“ کوین نے جل کر کہا۔

☆☆☆

”وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سینا نے پوری تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ”تم مسز فورڈ کو یہ نہیں بتا سکتے کہ ان کے بیٹے نے کیا حرکت کی ہے۔ اس کا ردعمل بہت شدید ہوگا اور اس خاندان کو مسٹر کین فورڈ کی موت کے بعد ایک اور دھچکا لگ سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں بتا سکتا؟ میرے خیال میں تو وہ بڑی سے بڑی سزا کا مستحق ہے۔“

”ہاں لیکن مسز کین فورڈ مزید کوئی صدمہ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ابھی ان کے شوہر کا غم تازہ ہے اور تمہارا یہ سچ اس کی بقیہ زندگی کو تکلیف دہ بنا دے گا... لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ تاوان کی رقم واپس کرتے وقت اسے کیا بتاؤ گے؟“

”اس کے لیے مجھے کوئی کہانی گھڑنا پڑے گی۔“

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرو اور کسی بھی بہانے یہ رقم مسز کین فورڈ کو واپس کر دو۔“

”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اپنی ماں سے پیسے بٹورنے کے لیے دوبارہ کوئی اسکیم نہیں بنائے گا؟“

”یہ ان دونوں ماں بیٹے کا معاملہ ہے۔ فی الحال تمہیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اس معاملے کو کس طرح حل کیا جائے۔“

”فی الحال میں نے کچھ نہیں سوچا۔“ کوین نے اسے ستانے کے لیے جھوٹ بولا۔

”تمہیں ایسا کرنا ہوگا۔“ سینا قطعی لہجے میں بولی۔ ”کیونکہ تم مجھ سے زیادہ سنگ دل نہیں ہو سکتے۔“

”لیکن تم صرف میرے بارے میں ہی سنگ دل ہو، دوسروں کے ساتھ...“

”شاید نہیں۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”شاید میرا دل تمہارے لیے اس سے کہیں زیادہ نرم ہے جتنا تم سوچتے ہو۔“

کوین کے دل میں امیدوں کے چراغ جل اٹھے اور وہ جذباتی آواز میں بولا۔ ”مائی ڈیئر سینا! کیا اس کا مطلب یہ ہے...“

”تم مسز کین فورڈ کو اس کے بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے۔“

”یقیناً نہیں۔ تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”اب ہمیں تھوڑی سی توجہ اپنے کام پر بھی دینی چاہیے۔“

کوین ٹھنڈی سانس لے کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی سینا کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ بن چکا ہے یا وہ محض اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے ایسا کہہ رہی تھی؟ کاش وہ یہ حقیقت جان سکتا۔

www.pkdigest.com

بعض اوقات معمولی سی خوشی بھی بڑی تگ ودو کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ سچی خوشی کے حصول سے لاعلم شخص کا ماجرا جو دو اور دو جمع کر کے پانچ بنانے کا فارمولا جانتا تھا اور ان میں ہی زندگی کی خوشیاں پالینے کی کوشش کر رہا تھا مگر جب حقیقت کھلی تو پانی پُل کے نیچے سے گزر چکا تھا

خونی مسیحا

آصف ملک

پرائی دولت سے زندگی کے لیے آسائشیں خریدنے والے افراد کی چشم کشا و عبرت انگیز کہانی

ریلس بینک نامی یہ مالیاتی ادارہ ان دنوں نیا نیا ابھرا تھا اور خاص طور سے کنزیومر بینکنگ میں اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے اور دوسرے بینکوں سے باصلاحیت افراد کھنچ کر ریلس بینک کی طرف آ رہے تھے۔ جوزف کو بھی یہاں اچھی تنخواہ پر ملازمت مل گئی تھی۔

خلیج کی جنگ کے بعد بل کلنٹن نے امریکی معیشت کو بہترین خطوط پر چلایا تھا۔ اس کے نتیجے میں ملک میں روزگار اور پیداوار کا سیلاب آ گیا تھا اور امریکی اپنی تاریخ کے سب سے بہترین مالیاتی دور سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جوزف کو ملازمت تو کلرک کی ملی تھی لیکن اس میں ترقی کے امکانات تھے اور تنخواہ دوسرے بینکوں سے اچھی تھی۔ ریلس بینک نے کاروبار کا نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس نے اپنے اکاؤنٹ ہولڈرز کی رقم دوسرے اداروں کو قرض دینے کے بجائے اس سے خود کاروبار کیا۔

امریکا میں عام طور سے صارف کو فراہم کی جانے والی اشیا کمپنیاں مہیا کرتی ہیں۔ جیسے مکان، دکان، گاڑی اور فرنیچر وغیرہ۔ یہ سب اشیا قسطوں پر مہیا کی جاتی ہیں۔ کمپنیاں بینکوں سے قرض لیتی ہیں اور اس پر سود ادا کرتی ہیں۔ بینک اپنا نفع رکھتا ہے اور اشیا بنانے والی کمپنی اپنا نفع رکھتی ہے اور تمام تر نفع اور سود کا بوجھ صارف پر آجاتا ہے۔ بینک نے فیصلہ کیا کہ وہ خدمات مہیا کرنے والی کمپنی کو درمیان سے نکال دے گا اور اس کی جگہ خود صارفین کو خدمت مہیا کرے گا۔ اس طرح اس کا سرمایہ زیادہ محفوظ رہے گا اور صارفین کو کم قیمت پر چیز ملے گی۔

ریس بینک نے سب سے پہلے گاڑیوں کے شعبے میں ہاتھ ڈالا۔ اس نے گاڑیوں کے مینوفیکچررز سے بات کی اور ان کی آنے والی گاڑیوں کی پوری کھیپ خرید لی۔ پیشگی ادائیگی کی وجہ سے بینک کو گاڑی مارکیٹ سے کم قیمت پر مل گئی اور اس نے اشتہار بازی کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ پہلے ہی سیزن میں بینک کی طرف سے بک کرائی جانے والی تمام گاڑیاں فروخت ہو گئیں اور بینک نے کثیر نفع کما لیا۔ مانگ اتنی زیادہ تھی کہ آرڈر پر مزید گاڑیاں تیار کرائی گئیں۔

لوگوں کو گاڑی براہِ راست بینک سے اور کم تر سود کے ساتھ ملنے لگیں تو انہوں نے ڈیلرز کمپنیوں کے بجائے ریس بینک کو ترجیح دی۔ اگلے سیزن میں بینک نے دگنی سے بھی زیادہ گاڑیاں لوگوں کو قسطوں پر فراہم کیں اور ریکوری کی شرح ننانوے فی صد سے زیادہ رہی بلکہ جو گاڑیاں ڈیفالٹر ہو کر واپس آئیں انہوں نے بھی منافع دیا کیونکہ گاڑی بنانے والی کمپنیوں سے کیے گئے معاہدے کی رو سے کمپنی ایسی گاڑیوں کو ریفرنش کرنے کی پابند تھی۔ ایسی گاڑیاں اپنی کم قیمت کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی تھیں۔ گویا بینک کا سر کڑاہی میں اور پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ ریس بینک کی دیکھا دیکھی دوسرے بینک بھی اس میدان میں آگئے اور اپنے گاہکوں کو براہِ راست خدمات دینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ طریقہ دنیا بھر میں مقبول ہوتا چلا گیا۔

جونز دو سال بعد آفیسر بن گیا اور اسے بینک کے سیلز کے شعبے میں بھیج دیا گیا۔ سیلز کا شعبہ ہمیشہ سے مشکل مگر منافع بخش رہا ہے۔ یہاں وہ افراد کامیابی حاصل کرتے ہیں جن میں دوسروں کو متوجہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ جونز بولنے کے معاملے میں شرمیلا تھا لیکن اس کے ذہن میں نت نئے آئیڈیاز آتے رہتے تھے۔ اسے خیال آیا کہ کیوں نا بینک گاڑیوں کی قسطوں پر فراہمی کی طرح مکانات بھی لوگوں کو بنا کر فراہم کرے۔ اس نے یہ خیال تحریری صورت میں اپنے باس کو پیش کر دیا جس نے اسے دیکھتے ہی مسترد کر دیا۔

''مسٹر جونز! یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ بینک ہے کوئی بلڈر کمپنی نہیں ہے جو لوگوں کو مکان بنا کر مہیا کرے۔''

''لیکن سر! ہم کوئی کار مینوفیکچرر بھی نہیں ہیں، اس کے باوجود لوگوں کو گاڑیاں مہیا کر رہے ہیں۔''

''ہم تیار گاڑی لیتے ہیں اور اپنے گاہک کے حوالے کر دیتے ہیں، ہمیں کار بنانی نہیں پڑتی ہے۔''

''تب اسی طرح ہم بلڈر سے مکان تیار کرا کے لوگوں کو فراہم کر سکتے ہیں۔'' جونز نے کہا تو اس کا باس سوچ میں پڑ گیا۔

''او کے! میں یہ تجویز اوپر والوں کے سامنے رکھوں گا۔''

اس وقت تو جونز کو پتا نہیں چلا تھا لیکن چار پانچ مہینے بعد بینک ملازمین کو ایک سرکلر سے آگاہ کیا گیا کہ بینک عنقریب عام لوگوں کے لیے مکانات تیار کرا کے قسطوں پر دینے کی اسکیم شروع کرنے والا ہے۔ ملازمین اس سلسلے میں بینک حکام کو اپنی تجاویز دے سکتے ہیں۔ جونز حیران ہوا کہ اس کا کہیں ذکر بھی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ یہ تجویز اس کی تھی۔ بہر حال، وہ چھوٹے درجے کا ملازم تھا اور احتجاج نہیں کر سکتا تھا اس لیے صبر کر کے بیٹھ گیا۔ اس سیزن میں بینک نے عام لوگوں کے لیے مکانات کی اسکیم بھی متعارف کرا دی۔

اسکیم کے تحت بینک معروف بلڈر کمپنیوں سے مکانات تعمیر کروا کے ان کو قسطوں پر صارفین کو مہیا کرنے لگا۔ بلڈر کمپنیوں کو ان کی ادائیگی کر دی جاتی اور پھر یہ مکانات بینک کی ملکیت بن جاتے۔ اس کے بعد ان کو لوگوں کو قسطوں پر دیا جاتا تھا۔ بینک نے نعرہ لگایا۔ ''ہر امریکی کے لیے مکان۔'' یہ نعرہ دیکھتے ہی دیکھتے مقبول ہو گیا اور دوسرے بینک بھی اس دوڑ میں شامل ہو گئے مگر انہیں ریس بینک جیسی کامیابی نہیں ملی۔ لوگ ریس بینک پر اس طرح اعتماد کرنے لگے جیسے وہ اپنی ذات پر کرتے ہیں۔

جونز کو اس لحاظ سے سہولت تھی کہ وہ بینک کا ملازم تھا اور بینک نے گاڑی دیتے وقت اس سے سود نہیں لیا تھا۔ اسے صرف اصل رقم کے مساوی قیمت قسطوں میں ادا کرنا تھی۔ اگرچہ یہ قسط اچھی خاصی تھی اور اسے ادا کرنے کے بعد اس کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی دوسری خواہش بھی پوری کر سکے۔ وہ کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔

جونز اب مکان لینا چاہتا تھا لیکن فی الحال اس کی تنخواہ میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مکان بھی لے سکتا۔ کار کی قسطیں

اسے پانچ سال تک ادا کرنی تھیں۔ اس کے وہ ساتھی جنہوں نے کار نہیں لی تھی یا سستی کار لی تھی، انہوں نے بینک سے مکان لے لیے اور مزے سے نئے گھروں میں رہنے لگے۔ ان کے قرض پر سود کی شرح صفر تھی۔ کبھی کبھی جونز کو پچھتاوا ہوتا کہ اس نے اتنی مہنگی کار کیوں لے لی۔ ورنہ وہ بھی اس کرائے کے فلیٹ کے بجائے اپنے..... گھر میں رہ رہا ہوتا۔

آفیسر رینک میں آنے کے بعد جونز نے مزید ترقی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ اسے معلوم تھا کہ ترقی کے لیے محنت اور نئے کورس لازمی ہوتے ہیں۔ اس نے شام کو ایک انسٹیٹیوٹ میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے فنانس اور کنزیومر بینکنگ کے بارے میں ایڈوانس کورس کرنے لگا۔ وہ صبح سات بجے گھر سے نکلتا اور شام پانچ بجے بینک سے فارغ ہونے کے بعد آٹھ بجے تک کلاسز لیتا اور رات کا کھانا کہیں باہر کھا کر تو دس بجے تک گھر لوٹ آتا تھا۔ اسے تفریح کرنے یا کہیں جانے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔

جونز کو لڑکیوں سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پہلے کیریئر میں کسی مقام تک پہنچ جائے، تب کسی لڑکی کے بارے میں سوچے گا اور شادی کرے گا۔ فی الحال تو اس کا اپنا گزارہ ذرا کھینچ تان کر ہوتا تھا۔ اسے بے تابی سے انتظار تھا کہ کب کورس ختم ہو اور وہ کوئی بڑا عہدہ حاصل کر سکے۔ ان دنوں بینک کا کاروبار بہت اچھا جا رہا تھا، اسے امید تھی کہ اسے فوری ترقی مل جائے گی۔ اس کے بعد اس کی تنخواہ اتنی ہو جائے گی کہ وہ مکان لے سکے گا۔

خدا خدا کر کے اس کا کورس مکمل ہوا اور اس نے بینک میں ترقی کے لیے درخواست دے دی لیکن اسے بتایا گیا کہ جب تک اسے سرٹیفکیٹ نہیں مل جاتا، اسے ترقی نہیں مل سکتی۔ جونز کے سامنے ہی ایک گروپ ترقی پا کر اوپر کے افسران میں شامل ہو گیا۔ ان میں اس کے کئی ساتھی تھے لیکن اسے ترقی نہیں ملی کیونکہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں ڈگری نہیں آئی تھی۔ مزے کی بات تھی کہ اس کے جن ساتھیوں کو ترقی ملی تھی، انہوں نے سرے سے کوئی کورس ہی نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس دوران میں انہوں نے اپنی تعلیمی قابلیت بڑھائی تھی۔ بس انہوں نے اتنا کیا تھا کہ ترقی کے لیے کئی سال پہلے ہی درخواست دے دی تھی اور لسٹ میں ان کا نام آ گیا تھا۔ جونز بے چارہ اس چکر میں رہ گیا کہ جب وہ کورس مکمل کر لے گا، تب درخواست دے گا۔

اس نے اپنے باس سے احتجاج کیا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ باس نے اس سے اتفاق کیا اور ساتھ ہی کہا کہ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا ہے۔ جونز کو ترقی کے لیے مزید چھ مہینے انتظار کرنا ہوگا۔ جونز صبر کر کے رہ گیا۔ اس نے خود کو تسلی دی کہ بس چھ مہینے کی تو بات ہے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ قدرت کو ابھی اس کا مزید امتحان مقصود ہے۔

عین اس وقت جب چھ مہینے پورے ہونے والے تھے، نائن الیون کا واقعہ پیش آ گیا اور پورے امریکا پر جمود طاری ہو گیا۔ دوسرے ملکوں کے شہروں پر کارپٹ بمباری سے ایٹم بم تک برسانے والوں کے اپنے شہر پر جب طیارے گرے تو ان کے حواس گم ہو گئے۔ تمام کاروباری سرگرمیاں رک گئیں۔ دفتروں میں کام بند کر دیا گیا۔ معمول کے سارے ہی کام روک دیے گئے اور ان میں ایک کام بینک ملازمین کی ترقیاں بھی تھیں۔

جونز کے لیے نائن الیون زیادہ بڑا سانحہ ثابت ہوا تھا اور اس کے خیال میں اس پر آنے والی تمام مصیبتوں کی ذمے داری نائن الیون پر آتی تھی۔ وہ اس سانحے کے ذمے داروں سے شدید نفرت کرنے لگا۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو اسے چھ مہینے کی تاخیر سے سہی لیکن ترقی مل جاتی اور وہ بینک سے لون لے کر اپنی ڈگری نکلوا سکتا تھا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور اس کے بجائے اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ وہ حیران پریشان تھا کہ اب اسے کہاں ملازمت ملے گی۔ حالات بڑی سست روی سے سنبھل رہے تھے۔ خوف کے باعث لوگوں نے گھروں سے نکلنا اور سفر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مستقبل کے خوف سے انہوں نے خریداری ترک کر دی تھی۔ امریکی معیشت کا دار و مدار ہی خریداری پر ہے۔ اگر خریداری نہیں ہے تو پیداوار نہیں ہے۔

کارِ سرکار

وکیل نے کیس لینے سے پہلے مؤکل سے پوچھا۔ ''تمہیں کس سلسلے میں گرفتار کیا گیا ہے؟''

''سرکاری کام میں مداخلت کرنے کے جرم میں۔'' مؤکل نے بتایا۔

''تم نے کس کام میں مداخلت کی تھی؟''

''انسپکٹر صاحب مجھے بلاوجہ گرفتار کرنا چاہتے تھے۔ میں نے مزاحمت کی تھی۔''

''کس طرح مزاحمت کی تھی؟ مار پیٹ کی تھی یا بحث و مباحثہ؟''

''نہ مار پیٹ اور نہ ہی بحث و مباحثہ بس وہ بیس ہزار مانگ رہے تھے۔ میں نے پانچ ہزار دینے کی کوشش کی تھی۔''

www.pkdigest.com

اگر پیداوار نہیں ہے تو ملازمتیں بھی نہیں ہیں۔

صرف جونز ہی نہیں، لاکھوں امریکی ان دنوں... بے روزگار تھے اور ملازمت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کا گزارہ سوشل سیکیورٹی کے وظیفے پر ہو رہا تھا لیکن جونز کی خودداری نے گوارا نہیں کیا کہ وہ حکومت کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ اس نے چھوٹی موٹی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ یہ اور بات تھی کہ چھوٹی ملازمتیں بھی نایاب تھیں۔ ایک طرف اسے کھانے کے لالے پڑے تھے تو دوسری طرف اس کی کار کی قسطیں بھی رکی ہوئی تھیں۔

تیسرے مہینے اسے بینک کی طرف سے نوٹس آ گیا کہ اگر اس نے قسط کی رقم جمع نہیں کرائی تو اس کی کار ضبط کر لی جائے گی۔ جونز حیران تھا کہ وہ کار کی قیمت نوّے فی صد ادا کر چکا ہے اور صرف دس فی صد رقم باقی ہے جس پر اسے کار کی ضبطی کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ اس نے بینک جا کر افسران سے اس سلسلے میں بات کی لیکن اسے بتایا گیا کہ معاہدے کی رو سے بینک کو اس بات کا پورا اختیار حاصل ہے کہ وہ قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں اس کی کار ضبط کر لے۔ اسے کمال مہربانی سے ادائیگی کے لیے مزید پندرہ دن کی مہلت دے دی گئی۔

وہ مقررہ مدت میں رقم ادا نہیں کر سکا جس کے بعد بینک کا عملہ آ کر اس سے کار لے گیا۔ جونز کا صدمے سے بُرا حال تھا۔ جس چیز کو اس نے اتنی چاہ سے لیا تھا اور اپنا پیٹ کاٹ کر اس کی قسطیں ادا کرتا رہا تھا، وہ اس سے کتنی آسانی سے چھن گئی اور ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اسے دو دن بعد ہی ایک کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اگر اسے دو دن کی مہلت اور مل جاتی تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی کار بچا لیتا۔ پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے بینک سے رجوع کیا اور اس سے مزید چند مہینے کی مہلت مانگی کہ وہ اقساط کی رقم جمع کرا دے گا لیکن اسے بتایا گیا کہ ایک بار گاڑی ضبط ہونے کی صورت میں صرف اسی وقت ریلیز کی جاتی ہے جب اس کی باقی رہ جانے والی ساری رقم ادا کر دی جائے۔ یہ سن کر جونز پریشان ہو گیا کیونکہ پوری رقم کا مطلب تھا مزید پانچ ہزار ڈالرز اور اتنی رقم جمع کرنے میں اسے چھ مہینے لگ جاتے۔

وہ بینک سے مایوس لوٹ آیا۔ ان دنوں وہ ٹرین میں دفتر آ جا رہا تھا۔ چھ مہینے کی کوشش کے بعد وہ کار کی بقیہ رقم ادا کرنے کے قابل ہو گیا اور اس نے بینک کو رقم ادا کر دی۔ ضروری کارروائیوں کے بعد اسے کار لینے کی اجازت مل گئی۔ کار بینک کے ایک گودام میں شہر سے کوئی پچاس میل دور تھی۔

جونز کار لینے پہنچا اور جب اس نے اپنی کار کی حالت دیکھی تو خود اس کی اپنی حالت خراب ہو گئی۔ جس کار کو اس نے چار سال تک اس طرح استعمال کیا تھا کہ اس کی باڈی پر ایک خراش تک نہیں آئی تھی، اب وہ پوری خراشوں سے بھری ہوئی تھی۔ کئی جگہ ڈینٹ نظر آ رہے تھے۔ ایک ٹائر کو جا بجا کسی تیز دھار آلے سے کٹ لگائے گئے تھے۔ ایک سائڈ مرر غائب تھا اور چھت پر کسی نے سیاہ پینٹ سے تصویر بنانے کی کوشش کی تھی۔ جونز گودام کے سپروائزر پر پھٹ پڑا۔

”یہ کیا کیا ہے میری کار کے ساتھ...؟“

”ہمیں نہیں معلوم... یہ ہمیں اسی حالت میں ملی تھی۔“ سپروائزر نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

جونز جانتا تھا کہ ان لوگوں کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں، وہ بکتا جھکتا کار لے کر وہاں سے چلا آیا۔ غم و غصے سے اس کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ ان لوگوں نے اس کی کار کا یہ حال کر دیا تھا۔ دو دن بعد اس نے کار فروخت کر دی اور اس کی جگہ ایک چھوٹی اور سستی کار لے لی۔

حالات بہتر ہونے لگے تھے۔ اسے ایک اور بہتر جاب مل گئی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ پہلے گھر لے گا، اس کے بعد گاڑی کے بارے میں سوچے گا۔ ایک سال بعد اس نے ایک نئے علاقے میں تیار مکان لے لیا۔ مکان قسطوں پر تھا اور ایک بینک کے توسط سے لیا تھا۔ اس نے احتیاط بھی کی تھی کہ کسی ریلس بینک سے مکان نہ لے۔ اسے اس بینک سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی ملازمت اچھی تھی اور اب تنخواہ بھی ٹھیک مل رہی تھی اس لیے اس نے دو منزلہ اور تین بیڈ روم والا مکان لیا۔ یہ اسے خاصا مہنگا پڑا تھا اور اس کی ماہانہ قسط تین ہزار ڈالرز بنتی تھی۔ یہ رقم اسے اگلے بیس سالوں میں ادا کرنی تھی۔

اس وقت تین ہزار ڈالرز نکالنا ذرا مشکل لگ رہا تھا لیکن اسے امید تھی کہ کمپنی میں اس کی ترقی ہو گی اور اس کی تنخواہ بڑھے گی تو آسانی ہو جائے گی۔ اس بار قسمت اس پر مہربان تھی۔ نئی ملازمت کے تیسرے سال اسے ترقی مل گئی اور وہ درمیانے درجے کے افسران میں آ گیا۔ اس کی تنخواہ اچھی ہو گئی تھی۔

ایک سال میں وہ مکان کو پوری طرح آراستہ کر چکا تھا۔ اب اس کا ارادہ ایک اچھی سی کار لینے کا تھا۔ لیکن انہی دنوں اس کی ملاقات ایلس سے ہو گئی اور یہ ملاقات آغاز میں اتنی سنسنی خیز ثابت ہوئی کہ جونز اس کے علاوہ سب بھول گیا۔

ایلس وڈ ایک چھوٹے درجے کی ماڈل اور اداکارہ تھی۔ وہ چھوٹے موٹے ٹی وی پروگرامز اور اشتہارات میں کام کرتی تھی۔ اس کی عمر تیس سال تھی، یعنی وہ جونز سے تین

سال چھوٹی تھی۔ جونز کی اس سے ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی جہاں وہ ڈنر کرنے گیا تھا اور نشے میں ایلس سے اس کے لباس پر ڈرنک گر گئی تھی۔ وہ معذرت کرتے کرتے اس پر مہربان ہوئی پھر جونز نے اسے ڈرنک کی آفر کی تو وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اس نے جونز کو اپنا نام بتایا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ کام کیا کرتی ہے۔

اس کی حالت کے پیش نظر جونز نے اسے گھر تک چھوڑنے کا اصرار کیا تو وہ مان گئی۔ اتفاق سے وہ جونز کی رہائش گاہ کے پاس ہی ایک لگژری قسم کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی۔ جونز بائیسویں منزل پر واقع اس کے اپارٹمنٹ تک اسے چھوڑنے گیا تو وہ اندر داخل ہوتے ہی اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ جونز کو پہلی ملاقات میں گلے کا ہار بن جانے والی خواتین سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے اسے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اگلی صبح جب وہ بیدار ہوا تو ایلس بدستور سو رہی تھی۔

جونز نے اس کے اپارٹمنٹ کا معائنہ کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ ایلس ایک ٹی وی اداکارہ ہے۔ یہ جان کر اس کے ہوش اڑ گئے تھے کیونکہ وہ جس کمپنی میں ملازم تھا، اس میں ملازمین کی اخلاقی حیثیت کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اندرونِ خانہ ملازم کچھ بھی کرتے رہیں لیکن اگر ان کی کوئی سرگرمی منظرِ عام پر آ جاتی تو کمپنی بلا تکلف ملازم کو فائر کر دیتی تھی۔ اس لیے جونز سمیت سارے ہی ملازمین بہت محتاط رہتے تھے۔ اگر جونز کو معلوم ہوتا کہ ایلس... شوبز سے تعلق رکھتی ہے تو وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکتا۔ یہ سوچ کر اسے پسینے آنے لگے کہ کہیں یہ بات منظرِ عام پر آ گئی کہ اس نے رات ایلس کے اپارٹمنٹ میں گزاری ہے تو اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا اور دوبارہ اتنی اچھی ملازمت مشکل سے ملے گی۔

اس نے بدحواس ہو کر ایلس کو جگایا۔ ”تم نے رات مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم ٹی وی پر کام کرتی ہو؟“

ایلس نے اپنے سنہری بال سنوارے۔ ”تو کیا ہوا؟“

جونز کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ میں جس کمپنی میں کام کرتا ہوں وہاں ملازمین کو کسی اسکینڈل میں ملوث ہونے پر فوراً فائر کر دیا جاتا ہے۔“

ایلس نے سگریٹ سلگائی۔ ”فکر مت کرو، کسی کو پتا نہیں چلے گا اور میں کوئی اتنی مشہور سلیبرٹی نہیں ہوں کہ لوگ میرے اپارٹمنٹ کے باہر کیمرے لگا کر بیٹھے ہوں۔“

مگر جونز کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپارٹمنٹ کی تمام کھڑکیوں کے پردے درست کر دیے اور دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ پھر اس نے ایلس سے پوچھا۔

”میں یہاں سے کیسے نکلوں کہ کوئی مجھے دیکھ نہ پائے۔“

”تم فکر مت کرو تم یہاں سے نکلو اور لفٹ میں سیدھے پارکنگ میں جاؤ، کوئی تمہیں نہیں دیکھے گا اور اگر کسی نے دیکھا بھی تو اسے کیا معلوم کہ تم میرے اپارٹمنٹ سے آ رہے ہو۔“

”سچ؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں، یہ سچ ہے۔ کوئی تمہیں چیک نہیں کرے گا۔“

ایلس نے یوں تحمل سے کہا جیسے کسی بچے کو سمجھا رہی ہو۔ اس پر جونز کی کچھ تسلی ہوئی۔ پھر بھی اس کا رخصت ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کہیں سے چوری کر کے جا رہا ہو۔ اس نے پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے اپنا چہرہ صاف کرنے کے بہانے رومال سے چھپا لیا تھا۔ جب وہ بلڈنگ سے نکل گیا اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ غلطی سے بھی اس طرف کا رخ نہیں کرے گا اور ایلس سے پھر نہیں ملے گا۔ وہ اپنی چالاکی پر خوش تھا کہ اس نے ایلس کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

لیکن تین دن بعد اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی جب اسے گھر پر ایلس کی کال آئی۔ ”تم کہاں غائب ہو گئے ہو؟“

جونز کا دل رک گیا۔ اس نے انجان بننے کی کوشش کی۔ ”تم کون بات کر رہی ہو؟“

”وہ... جس کے ساتھ تم نے پوری ایک رات گزاری ہے۔“ ایلس کاٹ دار لہجے میں بولی۔

”ایلس!“ اس نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تمہیں میرا فون نمبر کہاں سے ملا؟“

”صرف فون نمبر ہی نہیں، میرے پاس اور بھی بہت کچھ ہے۔“ ایلس غصے میں آ گئی۔ ”کیا تم نے مجھے کال گرل سمجھا ہے جو پلٹ کر پوچھا تک نہیں۔“

”ڈیئر! میرا خیال ہے کہ وہ صرف ایک حادثہ تھا اور ہم دونوں نشے میں تھے۔“

”میں ضرور نشے میں تھی لیکن تم پورے ہوش و حواس میں تھے۔“ ایلس نے اسے یاد دلایا۔ ”اس لیے تمہارے لیے یہ حادثہ نہیں ہے۔“

جونز کھسیا گیا۔ ”ہاں... مجھے اب شرمندگی ہو رہی ہے۔“

”ابھی تم غائب ہو۔“ ایلس بولی۔ ”آج رات کیا پروگرام ہے؟“

”مجھے ایک جگہ جانا ہے۔“ جونز جلدی سے بولا۔

”واپسی کب تک ہو گی؟“

جونز سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کہیں باہر جانے کو

www.pkdigest.com

کھ رہی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ ''شاید بارہ بج جائیں۔''

''ٹھیک ہے، تب تم میرے اپارٹمنٹ آجانا۔''

جونز پھنس گیا۔ اس نے بہانہ بنانے کی کوشش کی اور انکار کرنا چاہا لیکن ایلس نے اس کی ایک نہیں سنی۔ آخر میں اس نے دھمکی دی کہ وہ اس کے اپارٹمنٹ نہیں آیا تو وہ اس کے گھر آجائے گی۔ یہ سن کو جونز کے ہوش اڑ گئے، اس نے گھبرا کر کہا۔ ''اچھا اچھا... میں آجاؤں گا۔''

یوں ایلس تقریباً زبردستی اس کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ شروع میں وہ ذرا بدکا لیکن پھر ایلس اسے اچھی لگنے لگی۔ ایک تو وہ بہت حسین تھی، دوسرے عام سیلبریٹیز کی نسبت اس میں سادگی تھی اور وہ بلا وجہ کی ادائیں بھی نہیں دکھاتی تھی۔ وہ بھی جونز کو پسند کرنے لگی تھی اور اس کا ساتھ چاہتی تھی۔ جونز بھی اسے پسند کرتا تھا لیکن اسے خوف بھی رہتا تھا کہ ایلس سے اس کا تعلق منظرِ عام پر نہ آجائے۔ اس کے خوف پر ایلس ہنستی تھی۔

''یہ ڈر تو مجھے ہونا چاہیے، تم کیوں ڈر رہے ہو؟''

''تمہیں بتایا تو ہے کہ اگر میری کمپنی کو اس معاملے کی بھنک پڑ گئی تو مجھے جاب سے نکال دیا جائے گا۔'' جونز نے چڑ کر کہا۔ ''تمہیں کیا خطرہ ہے، اسکینڈلز تم لوگوں کو مزید شہرت دیتے ہیں۔''

ایلس اس کی بات پر سنجیدہ ہو گئی۔ ''جونز! شوبزنس کبھی میری منزل نہیں رہی ہے۔ میں مجبوری میں یہ کام کر رہی ہوں ورنہ میرا خواب تو ایک گھر ہے جس میں، میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہوں۔''

جونز نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''واقعی... تمہارا یہ خواب ہے؟ تو تم شوبزنس چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

''یہ میری جاب ہے، اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟''

جونز کو خیال آیا کہ ایلس اس کی زندگی میں شامل ہو جائے تو اس کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آجائے گی۔ اسے شادی تو کرنی تھی تو اس کے لیے ایلس کیا بری تھی۔ وہ حسین تھی اور اس کی دیکھی بھالی تھی۔ مزاج میں کوئی تیزی نہیں تھی۔ گھر سنبھالنا بھی جانتی تھی۔ جونز نے اس کا اپارٹمنٹ ہمیشہ صاف ستھرا اور سجا ہوا دیکھا تھا۔ وہ سارے کام خود کرتی تھی اس کی وارڈروب تک سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ وہ کھانا اچھا بناتی تھی۔ اگرچہ اسے زیادہ ڈشیں بنانا نہیں آتی تھیں اور اسے باہر کھانے کا زیادہ شوق تھا اس کے باوجود وہ جو بناتی تھی، بہت اچھا بناتی تھی۔

مہینے میں دو تین بار جونز اسے ڈنر پر کہیں باہر لے جاتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی ایسی جگہ کا رخ کرے جہاں اسے اپنا کوئی جاننے والا نہ ملے۔ اس کی وجہ سے ایلس بھی اپنے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرلیا کرتی تھی۔ ہوٹل یا ریستوران میں وہ عام طور سے کسی دور دراز میز یا کیبن کا انتخاب کرتے۔ جونز اس کے ساتھ نائٹ کلب یا بار میں جانے سے گریز کرتا تھا کیونکہ وہاں لوگوں کے ہجوم میں کسی جاننے والے کے نکل آنے کا پورا امکان ہوتا تھا۔ ایلس اس کی احتیاط پر ہنستی۔

''اگر ہمارے تعلق کو کھلنا ہوگا تو کھل جائے گا۔''

''لیکن ہمیں احتیاط تو کرنی چاہیے۔''

جونز چاہتا تھا کہ وہ ایک کار لے لے اور پھر اس کی تنخواہ اتنی ہو جائے کہ وہ ایلس کا خرچ بھی برداشت کرسکے، تب وہ اسے پروپوز کرے گا۔ کئی بار اس نے سوچا کہ ایلس کو پروپوز کردے لیکن یہی سوچ کر وہ رک جاتا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایلس اس سے شادی کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہے اور وہ اسے پروپوز کرتا تو وہ ہاں کر دیتی۔ ایک بار تو وہ جذباتی ہو کر اسے شادی کی پیش کش کرنے والا تھا لیکن عین اسی لمحے اس کا ایک فون آگیا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

جونز نے جو مکان لیا تھا اس کی مالیت مسلسل بڑھ رہی تھی اور تین سال میں وہ اپنی اصل مالیت سے ڈھائی گنا ہو چکا تھا۔ یعنی جونز اسے فروخت کرتا تو اسے بینک کا قرض ادا کرنے کے بعد بھی ایک ملین ڈالرز سے زیادہ کی رقم بچ جاتی۔ ایلس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مکان بیچ دے۔ اس طرح قرض سے اس کی جان چھوٹ جائے گی اور ایک ملین ڈالرز میں اسے مضافات میں کوئی اچھا مکان مل جائے گا۔ شاید ایلس چاہتی تھی کہ قسط سے اس کی جان چھوٹ جائے تو وہ اس سے شادی کا فیصلہ کرلے لیکن جونز کو اس کے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ ابھی مکان نہ بیچے۔ اس کی مالیت کچھ عرصے میں تین گنا ہو جائے گی۔

اس وقت ساری دنیا میں پراپرٹی کی قیمتیں بڑھنے کا رجحان تھا اور ہر مہینے قیمت بڑھ رہی تھی۔ اس لیے جونز رک گیا۔ اس نے ایلس کا مشورہ نظر انداز کر دیا۔ ایلس نے کئی بار اس سے کہا کہ وہ مکان بیچ دے۔ بے شک چھوٹا لے لے لیکن وہ اس کا اپنا تو ہوگا۔ اسے نہ قسط کی فکر ہوگی اور نہ اس بات کا دھڑکا کہ کوئی اس سے مکان خالی کرا سکتا ہے۔ مگر جونز کے خیال میں ایلس کے خدشات بے بنیاد تھے۔ اس کی وجہ بینکوں کا وہ نیا کردار تھا جس کی وجہ سے پوری دنیا میں بزنس میں تیزی آئی تھی۔ لوگوں کو اپنی ضرورت کی اشیا اتنی آسانی

سے ملنے لگی تھیں کہ اس سے پہلے اس کا تصور بھی مشکل تھا۔ اس نے ایلس سے کہا۔

''تم فکر مت کرو۔ بینک مجھ سے مکان خالی نہیں کرائے گا۔''

ایلس حسبِ معمول سگریٹ نوشی کر رہی تھی۔ اس نے کش لگا کر کہا۔ ''میں معاشیات کی ماہر تو نہیں ہوں لیکن میں ایک بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ بینک ایک ایسی جونک ہے جو صرف انسان کے خون پر زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ کتنی ہی خوش نما کیوں نہ ہو جائے، انسانی خون ہمیشہ اس کی ضرورت رہے گا۔ اس لیے میں کہتی ہوں کہ بینک پر بھروسا مت کرو۔ ابھی مارکیٹ چڑھی ہوئی ہے اور تم اسی وقت کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اگر مارکیٹ گر گئی تو تمہارے ہاتھ میں سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں آئے گا۔''

جونز نے نرمی سے کہا۔ ''تم اس چکر میں مت پڑو۔ تم ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتیں۔''

جونز اپنے مکان کی قیمت تین گنا ہونے کا انتظار کر رہا تھا، اچانک ہی اسٹاک مارکیٹس کریش ہونے لگیں۔ جن حصص کی قیمت ایک دن پہلے آسمان کی طرف جا رہی تھی، ان کی قیمت اچانک ہی زمین پر آگری۔ اس کا اثر سب سے پہلے ان شعبوں پر پڑا جن میں بینک براہِ راست ملوث تھے یعنی پراپرٹی اور آٹو موبائلز پر۔ پراپرٹی کی قیمت گرنے لگی اور آٹو موبائلز کے مینوفیکچررز نے آنے والے بحران کا اندازہ لگاتے ہوئے پیداوار گرانی شروع کر دی۔

اس وقت جونز اور اس جیسے لاکھوں امریکیوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بحران اتنا شدید ہو جائے گا کہ ان سے ان کا سب چھن جائے گا۔ سب اس خوش فہمی میں تھے کہ بحران عارضی ہے اور جلد اس پر قابو پا لیا جائے گا۔ اس لیے شروع میں کسی کو جلدی نہیں ہوئی۔ جونز نے بھی مکان کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا۔

آنے والے چند مہینوں میں پراپرٹی کی قیمت گر کر نصف رہ گئی اور اس کے بعد بھی گراوٹ کا سلسلہ جاری رہا تو جونز کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ اسے یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ بینکوں نے لیز پراپرٹی کے سلسلے میں اپنے قوانین تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور جو لوگ اقساط باقاعدگی سے جمع نہیں کرا رہے تھے، ان سے مکانات واپس لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ جونز نے اپنے مکان کی قیمت معلوم کی تو وہ یہ جان کر ششدر رہ گیا کہ کچھ ہی عرصے میں اس کے مکان کی قیمت گر کر اس کی اصل مالیت کے برابر رہ گئی تھی۔ ریالٹر نے جونز سے کہا۔

''ممکن ہے، یہ قیمت بھی نہ ملے کیونکہ ان دنوں مارکیٹ میں پراپرٹی کا کوئی خریدار نہیں ہے اور بینک کے لیز کیے مکان کے لیے تو بالکل کوئی گاہک نہیں ہے۔''

''مگر کیوں؟'' جونز پریشان ہو گیا۔

''کیا تمہیں بینکوں کا کردار معلوم نہیں ہے؟'' ریالٹر معنی خیز انداز میں بولا۔ ''جبکہ تم خود بینک میں رہ چکے ہو۔ یہ اپنا پیسا وصول کرنا جانتے ہیں۔''

جونز ایک بار پھر حیران ہوا۔ وہ برسوں بینک میں کام کرتا رہا تھا اور وہ بھی عام لوگوں کی طرح اس خوش فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ بینک اب عوامی خدمت کی طرف آگئے ہیں اور انہوں نے مڈل مین کا کردار ختم کرنے اور لوگوں کو ان کی لوٹ کھسوٹ سے بچانے کے لیے کنزیومر بینکنگ شروع کی ہے... مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بینک نے اپنی لوٹ مار کا دائرہ وسیع کیا تھا۔

جیسے جیسے بحران شدید ہوتا جا رہا تھا، ادارے دیوالیہ ہو رہے تھے اور کمپنیاں بینک ڈیفالٹ کر رہی تھیں۔ نتیجے میں بینک خود بھی دیوالیہ ہو رہے تھے۔ جونز کو اس مکان کی قسط دیتے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے اور اسے مزید چودہ سال تک اس کی اقساط ادا کرنا تھیں۔ گویا اس نے ابھی تک صرف تیس فیصد رقم جمع کرائی تھی۔ یہ تیس فی صد بھی کوئی دو لاکھ ڈالرز کے مساوی بنتی تھی۔ اب وہ پچھتا رہا تھا کہ اس نے ایلس کی بات کیوں نہیں مان لی۔

بڑے ادارے عوام اور اپنے ملازموں سے حقائق چھپا رہے تھے اور ان کی مالی پوزیشن اچانک گرنے سے جب وہ دیوالیہ ہو کر بند ہوتے تو ان کے ملازمین اور ان سے کاروبار کرنے والے لوگ حیران رہ جاتے۔ ملازمین جب صبح دفتر جاتے تو ان کو پتا چلتا کہ کمپنی ختم ہو چکی ہے اور ان کی نوکری بھی ختم ہو چکی ہے۔

جونز کو مکان کے ساتھ اپنی نوکری کی فکر بھی تھی۔ ایک دن اس نے جب صبح کا اخبار دیکھا تو ایک خبر نے اسے اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جس بینک سے لیز پر یہ مکان لیا تھا، اس نے اپنے شیئرز ریلس بینک کو فروخت کر دیے تھے اور عملاً ریلس بینک اس بینک کی تمام چیزوں کا مالک بن گیا تھا۔ یعنی جونز کا گھر بھی ریلس بینک کی ملکیت بن گیا تھا اور اب اسے ریلس بینک کو ادائیگی کرنا تھی۔ جونز کا منہ کڑوا ہو گیا۔ اسے ان لوگوں کا تجربہ ہو گیا تھا اور اسے ان سے کوئی اچھی امید نہیں تھی۔ اس خبر کے دو ہفتے بعد اسے ایک ای میل ملی کہ وہ اپنے

www.pkdigest.com

مکان کے سلسلے میں نئے سرے سے معاہدے کے لیے ریلس بینک کے شعبہ پراپرٹی لیز سے رجوع کرے اور اگر اس نے ایک مہینے کے اندر اپنے معاہدے کی تجدید نہیں کرائی تو اس کا مکان اس سے واپس لے لیا جائے گا۔ یہ ای میل پڑھ کر جوزز کا خون کھولنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس نام سے وابستہ اس کا مشکل وقت ایک بار پھر لوٹ کر آرہا ہے۔

اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن اسے جانا ہی تھا۔ اگلے دن ہی وہ بینک کے پراپرٹی لیز کے شعبے میں جا پہنچا اور اتفاق سے اس کا سامنا وہاں اپنے باس سے ہوگیا......

وہ اسے دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''مسٹر جوزز! آج تم واپس بینک آئے ہو؟''

''یہ میری بدقسمتی ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا اور نوٹس اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''میرا بینک سے کوئی معاہدہ نہیں تھا تو کس معاہدے کی تجدید کے لیے مجھے بلایا جا رہا ہے؟''

اس نے نوٹس دیکھا اور بولا۔ ''اوہ... تو تم اس اسکیم میں مکان لے چکے ہو۔ تم جانتے ہو کہ اس بینک کو ہم نے خرید لیا ہے اور اب یہ اسکیم بھی ہماری ملکیت ہے اس لیے ہمیں حق حاصل ہے کہ ہم ان لوگوں سے نئے سرے سے معاہدہ کریں جن کے پاس اسکیم میں مکان ہے۔''

''اگر کوئی معاہدے کی تجدید نہ کرنا چاہے تو کیا ہوگا؟'' جوزز نے اسے غور سے دیکھا۔

''اس صورت میں کسٹمر کو مکان خالی کرنا پڑے گا۔''

''مگر کیوں؟'' جوزز غصے سے چلا اٹھا۔

''آہستہ مسٹر جوزز... تم بینکنگ قوانین سے واقف ہو۔ اگر بینک کسی کو کسی چیز پر قرض دیتا ہے تو وہ اس چیز کا مالک بن جاتا ہے اگر اس کا قرض واپس نہ ملے تو بینک اس چیز کا مستقل مالک بن جاتا ہے۔ یہ اسکیم بھی اب بینک کی ملکیت ہے اور بینک اسے اپنی شرائط پر لوگوں کو دے گا۔''

''اگر میں معاہدہ تسلیم نہ کروں تو کیا بینک مکان مجھ سے واپس لے لے گا... اور میری رقم کا کیا ہوگا؟''

جوزز کا سابق باس خبیثانہ انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے دوسرے بینکوں کا تو نہیں معلوم لیکن ریلس بینک نے اس سلسلے میں جو قوانین بنائے ہیں، وہ تمہارے لیے خاصے دلچسپ ہوں گے۔ اول یہ کہ بینک اس رقم کا دس فی صد پروسیسنگ فیس کے طور پر کاٹ لے گا جو گاہک کو واپس کرنی ہے۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ گاہک نے یہ رقم کتنے عرصے میں جمع کرائی ہے۔ بینک اس سے آدھی مدت میں سہ ماہی قسطوں کی صورت میں رقم واپس کردے گا۔''

''یعنی مجھے میری رقم تین سال میں واپس ملے گی، وہ بھی دس فی صد کم ہوکر؟'' جوزز نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

''بالکل یہی بات ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم چھ سال سے قسطیں بھر رہے ہو؟''

جوزز نے سر ہلایا۔ ''ہاں، میں کوئی دو لاکھ ڈالرز ادا کر چکا ہوں۔''

''تب تمہارے لیے بہتر ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھو اور قسطیں ادا کرتے رہو۔''

''ریلس بینک کی نئی شرائط کے ساتھ؟'' جوزز نے تلخی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''ویسے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ بینک شرائط میں معمولی رد و بدل کرے گا اور اگر تم باقاعدگی سے قسط جمع کراتے رہے تو کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

مجبوراً جوزز کو یہ بات بھی ماننا پڑی لیکن اس کی پریشانی برقرار تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ بینک کی نئی شرائط میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوگی۔ اسے کاروباری معاملے میں اس کا اچھی طرح تجربہ ہوچکا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ بینک کوئی چھپی ہوئی شرط لگا دیتا جس کا پتا اس وقت چلتا ہے جب کوئی قسط نہیں دے پاتا۔

اس کے سابق باس نے اسے بینک کے معاہدے کی ایک کاپی دی تو اسے دیکھ کر جوزز پریشان ہوگیا کیونکہ اس میں کئی مشکل اور پیچیدہ شرائط شامل کردی گئی تھیں اور اب معاہدہ پہلے کی طرح آسان نہیں رہا تھا۔ خاص طور سے ایک شرط بڑی مشکوک لگ رہی تھی۔ اگر کوئی گاہک قسط ادا نہیں کر پاتا تو بینک اس کے مکان کو واپس لے لے گا اور اس کی جمع کرائی جانے والی رقم سے کرائے کی مد میں بھی رقم منہا کی جائے گی۔ اس نے اعتراض کیا۔

''یہ کرایہ کہاں سے آگیا؟''

''کرایہ تو آجاتا ہے۔'' سابق باس نے چالاکی سے کہا۔ ''اگر تم کسی مکان میں رہو جو تمہاری ملکیت نہ ہو تو کیا تم اس کا کرایہ ادا نہیں کرتے؟''

''لیکن میں نے مکان بینک سے کرائے پر نہیں لیا ہے بلکہ خریدا ہے اور اس پر بہت بھاری سود بھی ادا کر رہا ہوں... پھر کرایہ کس خوشی میں ہوگا؟''

''یہ عام حالات میں نہیں ہوگا بلکہ ڈیفالٹ کی صورت میں ہوگا۔ اگر ڈیفالٹ کی صورت میں بینک تمہاری رقم واپس کرتا ہے تو اسے حق ہے کہ تم نے جتنے عرصے اس کا مکان استعمال کیا ہے، مارکیٹ ریٹ کے حساب سے اس کا کرایہ کاٹ لے۔''

جوزز کے ہوش اڑ گئے۔ ''یعنی میں نے دو لاکھ ڈالرز ادا کیے ہیں اور میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

''اتنا بڑا مکان تم کرائے پر لیتے تو چھ سال میں دو لاکھ ڈالرز کرائے میں ادا کر ہی دیتے۔''

جوزز کا دل چاہا کہ معاہدہ سابق باس کے منہ پر مارے اور اپنی رقم واپس مانگ لے لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ اسے معلوم تھا کہ اب ایسا مکان اسے مشکل سے ملے گا۔ اس نے کڑوا گھونٹ سمجھ کر معاہدے پر دستخط کردیے۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ حالات ذرا سے بہتر ہوں اور اسے اچھی قیمت مل سکے تو وہ پہلی فرصت میں اس مکان کو فروخت کردے گا۔ اس بار وہ پہلے کی طرح غلطی نہیں کرے گا۔

اس وقت جوزز کو احساس ہوا کہ وہ ایک غلطی اور کر رہا تھا۔ اس نے اب تک ایلس کو پروپوز نہیں کیا تھا حالانکہ وہ دو سال سے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جان چکے تھے۔ جوزز کو معلوم تھا کہ اسے ایلس سے اچھی بیوی نہیں ملے گی۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ جیسے ہی وہ کسی ویک اینڈ پر ایک ساتھ ہوئے، وہ اسے شادی کی پیش کش کرے گا۔ ان دنوں ایلس ذرا مصروف تھی۔ اسے ایک ٹی وی شو کی میزبانی مل گئی تھی۔ شوٹنگ کے بعد اسے وقت کم ہی ملتا تھا۔ اس نے ایلس کو کال کی۔

''ڈیئر! کیا تم اس ویک اینڈ پر فارغ ہو؟''

''مشکل ہے، کوئی خاص بات ہے؟'' ایلس نے پوچھا۔

''ہاں، بہت خاص بات ہے لیکن جب تم ملوگی میں تب ہی بتاؤں گا۔''

ایلس اس کے لہجے سے سمجھ گئی آخر وہ اتنے عرصے سے اس کی رفیق تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اگر تم ہمارے مستقبل کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو بہتر ہے مت کہو۔''

جوزز کا ماتھا ٹھنکا۔ ''کیا مطلب؟ تمہیں کیا پتا کہ میں کس سلسلے میں بات کرنے والا ہوں؟''

''بس میرا اندازہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''جوزز! اگر تم مجھے پروپوز کرنا چاہتے ہو تو میری طرف سے پیشگی معذرت سمجھ لو۔''

''مگر کیوں؟'' جوزز چلا اٹھا۔

ایلس نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''جوزز! تم ایک سست سوچ رکھنے والے انسان ہو۔ جب تک تم کسی فیصلے پر پہنچتے ہو، تمہیں دیر ہوچکی ہوتی ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا ہے۔''

جوزز کو اس کی بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تمہاری انوالومنٹ اب کسی اور میں ہوگئی ہے؟''

''ایسا ہی سمجھ لو اور اس نے مجھے پروپوز کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگایا ہے۔''

''تم نے اس کا پروپوزل قبول کرلیا ہے؟'' جوزز نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

''ہاں... اور میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ مجھے خوشی ہوئی ہے کہ میں اپنے کیریئر کے عروج پر ہوں اور اس کے بعد زوال ہے۔ وہ وقت آنے سے پہلے مجھے ایک گھر مل گیا ہے۔''

''اور میں...'' جوزز نے کہنا چاہا لیکن ایلس اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''تمہارے لیے مجھے افسوس ہے۔ تم ایک اچھے آدمی ہو لیکن تم نے دیر کردی ہے۔ میں تمہارا انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ اب اور انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ جوزز! ایک بار پھر معذرت کے ساتھ... ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ مجھے امید ہے کہ اب تم میرے راستے میں نہیں آؤ گے۔'' ایلس نے کہا اور فون بند کردیا۔

جوزز کو لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ ایلس پر وہ اپنا اس قدر حق سمجھنے لگا تھا کہ اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اچانک یوں اسے چھوڑ کر کسی اور کی ہوجائے گی۔ اس نے اپنے طور پر ایلس کو بیوی بنا بھی لیا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ یہ صرف اس کی سوچ ہے۔ ایلس کیا سوچ رہی ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں، وہ ان سے بے خبر تھا۔

ابھی تک تو اس کے لیے مکان اور اس کے دوسرے لوازمات اہم تھے۔ اس کے خیال میں شادی کرکے گھر بسانے کے لیے پہلے ایک اچھا سا مکان جو فرنش بھی ہو اور ایک اچھی سی ملازمت لازمی تھی، اس کے بعد ہی آدمی کسی عورت کو تلاش کرکے اس سے شادی کرسکتا ہے۔ وہ بھول گیا تھا کہ شادی کے لیے سب سے اہم بات ایک عورت کی موجودگی ہے جو انسان سے محبت کرتی ہو اور اس سے شادی کرکے اس کا اور اپنا گھر بسانا چاہتی ہو۔ جوزز بچ بچ بدقسمت شخص تھا۔ اسے ایک ایسی عورت مل گئی تھی اور اس نے پورے صبر و سکون سے دو سال اس کا انتظار بھی کیا تھا پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ جوزز نے خود اسے گنوا دیا تھا۔

اب جوزز کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہونے لگا۔ اس نے کیا گنوا دیا تھا اور کن چیزوں کے پیچھے گنوا دیا تھا۔ ان

www.pkdigest.com

کی اس کی نظر میں اب کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ وہ صرف ایلس کو پانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایک بار ایلس سے بات کرکے دیکھے، ممکن ہے وہ مان جائے اور اس کی طرف لوٹ آئے۔ وہ اسی رات اس کے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔ بلڈنگ کا گارڈ اب اسے پہچاننے لگا تھا۔ اس نے پوچھے بغیر جونز کے لیے گیٹ کھول دیا۔ وہ لفٹ سے اوپر آیا اور ایلس کے دروازے کی بیل بجائی۔ اس نے اندر سے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”ایلس! میں ہوں جونز۔“ اس نے بے تابی سے کہا۔

ایلس کچھ دیر خاموش رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دروازہ نہیں کھولے گی مگر کچھ دیر بعد اس نے دروازہ کھول دیا اور سرد لہجے میں بولی۔ ”جب میں تم سے ایک بات کہہ چکی ہوں تو اس طرح آنے کا مقصد؟“

”ایلس! ایسے فیصلے اس طرح نہیں کیے جاتے۔“ جونز نے لجاجت سے کہا۔ ”ہم بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں۔“

ایلس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں کل برنارڈ سے منگنی کرچکی ہوں۔“

”منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے۔“

”ہاں لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔“

”پلیز ایلس... کیا تم سب بھول چکی ہو؟“ جونز شدتِ غم سے چلا اٹھا۔

”ہاں، میں سب بھول چکی ہوں اور مہربانی کرکے اب یہاں مت آنا۔“ ایلس کا صبر بھی جواب دے گیا اور اس نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔ جونز کچھ دیر دروازے پر دستک دیتا اور ایلس کو پکارتا رہا۔ جب اسے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ تھکے ہارے قدموں سے وہاں سے نکل آیا۔ اس نے کار ایک بار کے سامنے روکی اور اندر جاکر اس وقت تک پیتا رہا جب تک بارٹینڈر نے اسے مزید شراب دینے سے انکار نہیں کردیا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ دوسرے شراب خانے میں گیا اور جب وہاں سے نکلا تو اس میں اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ کار ڈرائیو کرسکے۔ وہ کار میں بیٹھے بیٹھے سو گیا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہوچکی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا اور اس کا دفتر جانے والا حال نہیں تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ گھر چلا جائے۔

سارا دن وہ سوتا رہا اور جب رات کو اٹھا تو اسے ایک بار پھر ایلس کی یاد آئی۔ وہ اس کے اپارٹمنٹ پہنچا تو اس بار گارڈ نے اس کے لیے گیٹ نہیں کھولا اور اس کے پاس آکر بتایا۔ ”سر! آپ کے لیے اجازت نہیں ہے، مجھے افسوس ہے کہ میں گیٹ نہیں کھول سکتا۔“

”کیوں نہیں کھول سکتے؟“

”مجھے میڈم ایلس نے منع کیا ہے۔“

جونز کچھ دیر سوچتا رہا پھر سرد آہ بھر کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ اب ایلس اس کی نہیں ہوسکتی لیکن وہ کوشش کے باوجود اس دکھ کو برداشت نہیں کرپا رہا تھا۔ اس کی یہ رات بھی شراب خانوں میں گزری اور پھر یہ اس کا معمول بن گیا۔ دفتر سے نکل کر وہ کسی بار کا رخ کرتا اور رات جب اس کے اعصاب نشے سے بوجھل ہوجاتے تو وہ گھر کا رخ کرتا۔ صبح جلدی آنکھ کھل جاتی تو دفتر چلا جاتا ورنہ چھٹی کرلیتا۔

شروع میں تو اسے اپنے باس کی طرف سے وارننگ ملتی رہیں پھر جب اس کی چھٹیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئیں تو ایک دن اسے دفتر جاتے ہی باس نے طلب کرلیا۔ باس عام حالات میں بڑا شریف آدمی تھا مگر اس وقت غصے میں سخت... برافروختہ ہو رہا تھا۔ ”مسٹر جونز! یہ تمہارے لیے آخری وارننگ ہے۔“ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آئندہ کسی چھٹی کی صورت میں تمہاری مستقل چھٹی ہوجائے گی۔“

”یس سر!“ جونز نے اس دوران میں صرف اتنا کہا اور وہاں سے نکل آیا۔ اس وارننگ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اسے ملازمت یا کسی چیز کی پروا نہیں رہی تھی۔ ایلس اس کی زندگی سے کیا نکلی تھی، اسے لگ رہا تھا کہ اب اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ اس کا پچھتاوا ہر گزرتے دن شدید ہوتا جارہا تھا اور وہ اس پچھتاوے کو جام میں ڈبونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے جب اسے بنا اطلاع چھٹی کرنے اور کام میں دلچسپی نہ لینے کے الزامات کے ساتھ ملازمت سے نکالا گیا تو اس نے اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ وہ سکون سے دفتر سے گھر آگیا۔ ابھی اس کے پاس کچھ رقم تھی اور اسے پروا نہیں تھی کہ جب یہ رقم ختم ہوجائے گی تو وہ کیا کرے گا۔

یہ خیال تو اسے آیا ہی نہیں تھا کہ جب وہ مکان کی قسط ادا نہیں کرے گا تو مکان اس سے چھن جائے گا۔ ایک مہینا قسط نہیں گئی تو چند دن میں بینک کی طرف سے اسے نوٹس آگیا۔ اسے خبردار کیا گیا تھا کہ ایک مہینے کی قسط کی تاخیر کی صورت میں اسے اب قسط لیٹ فیس کے ساتھ ادا کرنی ہوگی اور ہر تاخیر پر مزید دس فی صد لیٹ فیس لگے گی۔ جونز کا اندازہ درست نکلا۔ ریس بینک نے چھپے ہوئے چارجز لگا رکھے تھے۔ بہرحال، اسے نوٹس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے اس کے ٹکڑے کرکے اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور یہی سلوک مزید دو نوٹسز کے ساتھ کیا۔ اس نے ان کو پڑھنے کی

زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس لیے پتا ہی نہیں چلا کہ ان میں ایک فائنل نوٹس بھی تھا۔

اس کے بعد اسے عدالت کی طرف سے نوٹس آگیا۔ اس نے اس کی پروا بھی نہیں کی اور مزید ایک نوٹس بھیجنے کے بعد عدالت نے اس کے خلاف یک طرفہ فیصلہ سنا دیا۔ عدالتی عملے اور پولیس نے اس سے مکان خالی کرا لیا اور اس کا سامان اس وارننگ کے ساتھ فٹ پاتھ پر رکھ دیا کہ اگر اس نے دس گھنٹے کے اندر یہ سامان نہیں اٹھایا تو سامان میونسپل کمیٹی کا ٹرک لے جائے گا۔

جونز نے سامان ایک ڈسپوزیبل سینٹر کو فروخت کردیا اور اس سے حاصل شدہ رقم سے اس نے ایک سلیپنگ بیگ اور کچھ سامان لے لیا جو اس کی کار میں آسکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے نیویارک سے باہر کا رخ کیا اور ایک ویرانے میں ڈیرے ڈال لیے۔ جب تک اس کے پاس رقم رہی، اس نے کچھ نہیں کیا اور جب رقم ختم ہوگئی تو کچھ کام کرکے اس نے اتنا کما لیا کہ اس کا گزارہ ہوجائے۔ اس کے بعد یہ اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ بغیر مکان کے اور بغیر ملازمت کے وہ ایک ویرانے میں رہ رہا تھا۔ نہ جانے کیسے اس کی خبر ایک اخباری رپورٹر کو ملی اور اس نے آکر جونز سے انٹرویو کیا۔ جونز نے اپنی ناکام زندگی کی داستان سناتے ہوئے کہا۔

”میرا یہ طرزِ زندگی اس ملک کے خلاف میرا احتجاج ہے جہاں حکومت نے لوگوں کو خون چوسنے والی جونکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اب میں بھی کسی شہر میں قدم نہیں رکھوں گا۔ ہمیشہ کسی ویرانے میں رہوں گا۔“

جونز کے اس انٹرویو نے بڑی شہرت حاصل کی اور لوگ اسے دیکھنے کے لیے آنے لگے۔ وہ اس کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ بعض نے اسے شہر میں رہائش اختیار کرنے کی پیش کش بھی کی لیکن اس نے جانے سے انکار کردیا۔ ایک ٹی وی چینل نے اسے انٹرویو کے عوض اچھی خاصی رقم دی۔ اس رقم نے اسے بہت دن تک کام سے بے نیاز رکھا۔ رفتہ رفتہ اس کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی اور میڈیا نے اس میں دلچسپی لینا بند کردی۔ بس کبھی کبھی کوئی اس سے ملنے چلا آتا۔ اس کی کار پرانی تھی۔ ایک بار خراب ہوئی تو جونز اسے ٹھیک نہیں کرا سکا اس لیے وہ ایسے ہی رہ گئی۔ پھر جونز نے اس میں سے انجن اور دوسری چیزیں نکال کر بیچ دیں۔ اس کی نشستیں بھی نکال دیں اور اندر ایک چھوٹا سا مکان بنا لیا جس میں وہ سوتا اور رہتا۔ اس میں اس نے ایک گدا بچھا لیا تھا۔

ایک بار ایلس اس سے ملنے آئی۔ اس نے شادی کرلی تھی۔ اپنے شوہر کو وہ جونز کے بارے میں پہلے ہی سب بتا چکی تھی۔ جب اس نے ٹی وی پر جونز کا انٹرویو دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ بڑھی ہوئی ڈاڑھی اور گندے کپڑوں والا شخص جونز ہے۔ لیکن وہ جونز ہی تھا۔ وہ اس سے ملنے آئی تو اس کی حالت اور بھی خراب ہوگئی لیکن وہ ایلس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے ان دونوں کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور اپنے طور پر ان کی خاطر تواضع بھی کی۔ ایلس نے اسے واپس چلنے کو کہا تو اس نے انکار کردیا۔

”میری حالت پر مت جاؤ، میں اس طرح بہت خوش ہوں اور مجھے تم سے بھی کوئی شکوہ نہیں ہے۔ جو ہوا، وہ میرا قصور تھا۔ شاید میرا مقدر ہی اچھا نہیں ہے۔“

ایلس اور اس کا شوہر افسوس کرتے ہوئے اس کے پاس سے رخصت ہوگئے۔ ایلس کو خوشی تھی کہ جونز اس سے ناراض نہیں ہے اور خستہ حالی کے باوجود وہ اپنے طرزِ زندگی سے خوش ہے۔

یہ ایک عام امریکی کی کہانی ہے جو حالیہ معاشی بحران کا شکار ہوا اور کامیابی سے ناکامی کی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کا سفر یہاں ختم ہوگیا کیونکہ اس کی واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ دوسری کہانی جو بینک کی ہے، وہ بھی اس معاشی بحران سے متاثر ہوا یا کم سے کم اس نے ایسا ظاہر کیا کہ معاشی بحران نے اسے دیوالیا ہونے کے قریب پہنچا دیا ہے۔

بڑے بینکوں اور مالیاتی اداروں نے صرف ملک کی معیشت کا بیڑا غرق نہیں کیا بلکہ انہوں نے چھوٹے بینکوں اور مالیاتی اداروں کو بھی تباہ کردیا تھا۔

یہ صرف ایک امریکی کا نہیں، لاکھوں امریکیوں کا المیہ ہے۔ وہ بینکوں اور اسٹاک مارکیٹ کے شعبدہ بازوں کے ہاتھوں اپنی ساری جمع پونجی سے محروم ہوچکے ہیں۔ ان میں سے ہزاروں خودکشی کرکے مرچکے ہیں اور لاکھوں مایوسی اور بے یقینی کی کیفیت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ شاید کبھی بھی دوبارہ اس سسٹم کا حصہ نہ بن سکیں کیونکہ ان کا اعتماد مجروح ہوا ہے۔ ان میں سے بہت سارے کبھی اس سسٹم کا حصہ نہیں بن سکیں گے کیونکہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ ان میں ایک جونز بھی ہے۔ آنے والی سرما کی ایک رات سردی نے اس کی جان لے لی اور دو دن تک اس کی لاش بھی ایسے ہی پڑی رہی۔ اس کی تدفین بھی ایک خیراتی ادارے نے کی اور یہ خیراتی ادارہ بھی نجی تھا کیونکہ حکومت کے پاس ایسے لوگوں کی تدفین کے لیے بھی کوئی پیکیج نہیں ہے۔

www.pkdigest.com

للکار

ان عاشق پروانوں کا ماجرا، خاص جو للکار سنتے اور للکارنے کے دھنی تھے

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خودداری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے...... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی...... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے...... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے...... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے...... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیشِ نظر رکھتا ہے...... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستان۔ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے...... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے...... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر...... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے...... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر...... ایک للکار ہے۔

ساتویں قسط

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے۔ لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کر لیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ میں جدائی کی آگ میں تڑپ تڑپ گیا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ثروت کہاں ہے۔ اسی دوران میں اپنے گھر کے قریب سیٹھ سراج اور اس کے غنڈوں سے میرا سامنا ہو گیا اور انہوں نے درجنوں لوگوں کے سامنے مجھے بری طرح زدوکوب کیا۔ میری حساس طبع کے لیے یہ سب کچھ نہایت جاں گسل تھا۔ میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر

میری ملاقات ایک خوش باش، ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ عمران ایک انوکھا کردار تھا۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لاہور کے گلی کوچوں میں موت کو تلاش کرتا پھرتا تھا۔ اس کی بے خوفی انتہا کو چھوتی تھی۔ اس نے پتا چلایا کہ ثروت کو اغوا کرنے والے وادی کا باپ سیٹھ سراج نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہے۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا... جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک رنگین عورت میڈم منصورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم منصورا کی چھوٹی بہن نادیہ بڑی بے باک لڑکی تھی۔ نت نئے مردوں سے جسمانی تعلقات رکھنا اس کا شوق تھا۔ وہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران سرکس کا ایک مقبول فن کار بھی تھا۔ وہ سرکس میں اپنے شوق کی خاطر کچھ نہایت خطرناک کھیل بھی کھیلتا تھا۔ اس نے یہ جان لیوا کھیل مجھے بھی دکھائے۔ وہ میرے اندر بھی زندگی کی امنگ ترنگ اور جوش پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔ ہر خطرناک کام میں وہ مجھے اپنے ساتھ رکھ رہا تھا۔ میں خود بھی گھر واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی دوران میں عمران اور اس کے دوست اقبال نے ایک مجید مشو نامی غنڈے کا سراغ لگایا۔ مجید مشو کو پکڑنے کے بعد عمران نے اس سے سوال جواب کیے تو پتا چلا کہ وہ بھی میڈم منصورا کے لیے کام کرتا ہے۔ ایک ایڈووکیٹ ابرار صدیقی سے بھی اس کا دوستانہ تھا۔ ابرار صدیقی کے پاس مہاتما بدھ کا کوئی نادر مجسمہ تھا جسے میڈم منصورا ہر صورت خریدنا چاہتی تھی مگر صدیقی بیچنے کو تیار نہیں تھا۔ کچھ اور نامعلوم لوگ بھی اس مجسمے کے پیچھے تھے۔ ان سے بچانے کے لیے صدیقی نے اس مجسمے کو لاہور سے لا کر جہلم میں کہیں چھپا دیا تھا۔ مجید مشو سے اس پوچھ گچھ کے دوران میں مجید مشو کی گاڑی کو آگ لگ گئی اور وہ ہلاک ہو گیا... شک کی بنا پر میڈم منصورا نے عمران کو اغوا کرا لیا۔ میں اور اقبال بھی میڈم کی دسترس میں چلے گئے۔ وہاں عمران نے اپنی خوش بیانی سے منصورا کو قائل کر لیا کہ وہ اس کا مطلوبہ مجسمہ ابرار صدیقی کی تحویل سے نکال لائے گا۔ اس نے واقعی یہ کام اتنی خوش اسلوبی سے کیا کہ میڈم اش اش کر اٹھی۔ تاہم میڈم کی چھوٹی بہن نادیہ بدستور عمران کے پیچھے تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزما رہی تھی۔ عمران کی توجہ اپنی گرل فرینڈ شاہین کی طرف تھی جس کی وجہ سے رقابت پروان چڑھ رہی تھی۔ نادیہ نے عمران کی سرد مہری کا انتقام لینے کے لیے ہمارے ایک دوست سلیم کو بے دردی سے مار دیا مگر ظاہر یہ کیا کہ وہ دوسری منزل سے گرا ہے۔ سلیم کی دردناک موت کا بدلہ عمران نے سرکس کے ایک کھیل کے دوران میں حیران کن طریقے سے لیا۔ اس نے نادیہ کو اس طرح سے گولی ماری کہ درجنوں تماشائیوں میں سے کسی کو شک تک نہیں ہو سکا۔ نادیہ شدید زخمی ہو گئی۔ میری بے وقوفی، کم عقلی کی وجہ سے نادیہ کے زخمی ہونے کا پول کھل گیا۔ شدید بخار کی بے ہوشی میں، میں نے دو جرائم پیشہ افراد کے سامنے یہ انکشاف کر دیا کہ نادیہ کو گولی مارنے والا میرا دوست و محسن عمران ہے۔ میں ان جرائم پیشہ افراد کی حبسِ بے جا میں تھا۔ میں نے کسی طرح ایک فون کال کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے جواب میں میرا جگری یار عمران آندھی طوفان کی طرح آیا اور مجھے ان افراد کی گرفت سے چھڑا کر لے گیا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہو چکی ہے۔ میری وجہ سے میڈم منصورا کو علم ہو چکا ہے کہ اس کی لاڈلی بہن کو موت کے کنارے پہنچانے والے تم ہو۔ میں نے عمران کو پہلی بار تھوڑا پریشان دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میڈم منصورا [illegible] شعلہ جوالا بن جائے گی۔ اور یہی ہوا۔ میڈم کے کارندوں سیٹھ سراج اور شیرے وغیرہ نے میرا اور عمران کا پیچھا کیا۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے پیٹ پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک [illegible] کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میڈم منصورا اب میری ماں، بہن اور بھائی کے لیے خطرہ بنے گی۔ میں انہیں بچانے کے لیے اپنی کوٹھی میں پہنچا۔ کچھ ہی دیر بعد میڈم منصورا کے لوگ دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ میں نے اپنی بہن فرح اور بھائی عاطف کو تو موقع سے بھگا دیا، خود والدہ کے ساتھ وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پکڑا گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگا لیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ماں کے جسدِ خاکی تک پہنچنے کے لیے چلاتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ گر گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ میرے دماغ میں عجیب دھند بھری تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک طویل عرصے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں والدہ کو پکارتا ہوا ایک گھنے جنگل میں بھاگتا رہا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے ہم ایک کھوہ میں چلے گئے... سلطانہ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مخبوط الحواس نہیں۔ سلطانہ کا تعاقب کرتا ہوا ایک ہارون نامی شخص کھوہ میں پہنچا اور سلطانہ کی کلہاڑی سے زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ میں نے سلطانہ کے ساتھ مل کر اس شخص کو باندھ دیا۔ ہم اس کھوہ سے نکل گئے۔ راستے میں باشو نام کا ایک گونگا شخص بھی ایک شیر خوار بچے سمیت ہم سے مل گیا۔ سلطانہ نے مجھے بتایا کہ یہ میرا اور اس کا بچہ ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور آج میں کچھ گھنٹوں یا دنوں کے بعد نہیں، دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔ حیرت کی شدت سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سلطانہ مجھے ایک مسلمان بزرگ عبدالغنی صاحب کے پاس لے آئی۔ ہم ان کے گھر میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھے پتا چلا کہ اس جگہ کو بھاندل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور تل پانی۔ زرگاں میں حکم جی کا اختیار چلتا ہے۔ حکم جی ایک عیاش اور بے انصاف شخص ہے۔ سلطانہ اس کی دستبرد سے بچنے کے لیے اسٹیٹ کی دوسری بڑی آبادی تل پانی میں آئی ہے۔ یہاں حکم جی کا چھوٹا بھائی کا مختار تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کہا جاتا تھا۔ لیکن یہاں مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ میں نے چھوٹے سرکار کے اہل کاروں کے سامنے سلطانہ کو اپنی بیوی ماننے سے انکار کر دیا... سلطانہ کو پناہ ملنے کا امکان معدوم ہو گیا۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار اسے پکڑ کر اپنے ساتھ لے گئے۔ مجھے عبدالغنی کے ایک ساتھی ڈاکٹر چوہان نے بتایا کہ سر کی چوٹ کے سبب میری یادداشت بری طرح متاثر ہے۔ میں پچھلے دو برس کی باتیں بالکل بھولا ہوا ہوں۔ ان دو برسوں میں، میں یہاں بھاندل اسٹیٹ میں رہا ہوں۔ مجھے ایک قیدی کی حیثیت سے یہاں لایا گیا تھا کیونکہ میں بدھا کے ایک خاص مجسمے کی چوری اور قتل و [illegible] حرکت میں ملوث تھا۔ چوہان نے یہ بھی بتایا کہ یہ مسلمان لڑکی سلطانہ بیوی کی حیثیت سے میرے لیے بہت قربانیاں دیتی رہی ہے۔ ابھی میں اور چوہان باتیں کر ہی رہے تھے کہ جنگل کی طرف سے کسی جانور کی آواز آئی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

یہ چلاتی ہوئی آواز چار پانچ سو میٹر کی دوری سے آئی ہوگی۔ یقیناً یہ کوئی جنگلی جانور تھا۔ آواز ایک بار پھر سنائی دی، اس کے ساتھ ہی رائفل کے دو تین فائر ہوئے۔ لوگوں کے واویلا کرنے کی دور افتادہ آوازیں بھی کانوں میں پڑیں۔

''یہ کیا ہے؟'' میں نے چوہان سے پوچھا۔

''یہ ہاتھی ہے۔ میرے خیال میں یہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ہے۔ کنور بابو چھوٹے سرکار جی کا چھوٹا بھائی ہے۔''

یقیناً یہ ہاتھی ہی تھا۔ ایک بار پھر اس کی زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ وہ اب غالباً بستی کی طرف آ رہا تھا۔

چوہان مجھے وہیں چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ شاید یہ پالتو ہاتھی آؤٹ آف کنٹرول ہو گیا تھا۔

میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ راہ گیروں میں کھلبلی نظر آ رہی تھی۔ وہ آواز کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ وہیں کونے کھدروں میں کھڑے ڈری ہوئی نظروں سے ہلچل کے مرکز کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب تین چار سبز وردیوں والے گھڑ سوار تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آواز کی سمت چلے گئے۔ ان میں سفید کپڑوں والا ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا بھی تھا۔ اپنے گھوڑے اور لباس کے اعتبار سے وہ ان میں ممتاز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کندھے سے ایک سنہری [illegible] جھول رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔

دو تین منٹ بعد میں نے کھڑکی میں سے ایک اور چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ پانچ چھ افراد نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی اور ایک طرف بھاگے جا رہے تھے۔ چارپائی پر سانولی رنگت والا ایک غریب صورت نوجوان تھا۔ وہ دھوتی اور بنیان میں تھا۔ اس کی دھوتی خون سے سرخ نظر آئی۔ باقی جسم سے بھی خون رس رہا تھا۔ دو تین مشعل بردار بھی چارپائی کے ساتھ ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

دس پندرہ منٹ بعد سکون ہو گیا۔ ہاتھی کی آواز کافی فاصلے سے سنائی دینے لگی۔ اسی دوران میں چوہان بھی واپس آ گیا۔ اس نے بس اتنا بتایا کہ کنور بابو کا پالتو ہاتھی ''بادل'' اپنے مہاوت کی غلطی سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک ہندو زخمی ہو گیا ہے۔ بہرحال، اب ''بادل'' کو پکڑ لیا گیا ہے۔ جو فائر کیے گئے وہ صرف ہاتھی کو ڈرانے کے لیے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری گفتگو پھر وہیں سے شروع ہو گئی جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔ چوہان نے مجھے بتایا کہ اس کی معلومات اور عینی مشاہدے کے مطابق میں متعدد بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ اس کی ایسی باتوں سے میرا دماغ سنسنا اٹھتا... دل کی دھڑکن بڑھ جاتی... اور میرے اردگرد پھیلی دھند گہری ہوتی چلی جاتی۔ اس کے ساتھ ہی کہیں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے یہ آواز ابھرتی کہ شاید یہ ڈاکٹر چوہان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ ماضی میں کہیں... کچھ ایسا ہو چکا ہے۔

چوہان میرے تاثرات بغور دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تل پانی کے چھوٹے سرکار راجیت رائے حالانکہ حکم جی کے سگے بھائی ہیں لیکن جیسا کہ میں نے بتایا ہے، دونوں بھائیوں کے مزاج میں بہت فرق ہے۔ چھوٹے سرکار عیش وعشرت کے اس طرح دلدادہ نہیں جس طرح حکم جی ہیں۔ چھوٹے سرکار انصاف پسند بھی ہیں، خاص طور سے مسلمانوں کے لیے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے اور ان کے ساتھ اپنی عملداری میں کوئی ناانصافی نہیں ہونے دیتے... بلکہ کئی لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود ہندووانہ رسم و رواج کو خرافات سمجھتے ہیں اور دھرم کے کٹرپن کو برداشت نہیں کرتے۔

''کبھی کبھی کچھ لوگ حکم جی کی عملداری میں ناانصافی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ چھوٹے سرکار کی عملداری کا رخ کرتے ہیں اور تل پانی آ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چھوٹے سرکار بڑی دلیری اور فراخ دلی سے پناہ دیتے ہیں لیکن شرط یہی ہوتی ہے کہ پناہ لینے والا اپرادھی نہ ہو اور اس نے کوئی بڑا جرم نہ کیا ہو۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ میں خود بھی شروع میں زرگاں ہی آیا تھا مگر پھر یہاں تل پانی آ گیا۔ اسی طرح یہ لڑکی سلطانہ بھی اپنے بچے کو اور تمہیں لے کر یہاں پناہ لینے آئی ہے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ جارج اور حکم جی کی دستبرد سے بچنا چاہ رہی ہے۔ اسے یہاں بہ آسانی پناہ مل جاتی تھی مگر...'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اب بے چاری سلطانہ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔ حکم جی کی طرف سے تو اس پر پہلے ہی الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ آوارہ ہے اور اس کی گود میں جو بچہ ہے وہ بھی تمہارا نہیں ہے۔ اب جبکہ تم نے اہل کاروں کے سامنے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے تو اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔ جو لوگ اس کا پیچھا کر رہے ہیں وہ یہاں تل پانی پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں لگائیں گے۔ عین ممکن ہے کہ چھوٹے سرکار اسے اور تمہیں گونگے باشو سمیت فوراً ہی حکم جی کے اہل کاروں کے حوالے کر دیں۔''

چوہان جو کچھ بھی بتا رہا تھا، وہ سب کافی حیرت ناک تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس سے پہلے بھی یہاں سے بھاگنے

www.pkdigest.com

کی کوشش کر چکا ہوں اور ناکام رہا ہوں۔ تو کیا یہ سارا علاقہ کسی سخت حفاظتی حصار میں تھا جہاں سے میں نکل نہیں پایا تھا؟ اتنے وسیع و عریض علاقے کو کسی سخت حصار میں رکھا جانا کیسے ممکن تھا؟ کیا وہ مجھے صرف ڈرانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا تھا تا کہ میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کروں؟

وہ کہہ رہا تھا کہ سلطانہ نامی یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی ہے اور میری خاطر بہت تکلیفیں سہہ چکی ہے۔ ممکن تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ سلطانہ کے رویّے کی کچھ جھلکیاں تو میں پچھلے دو تین روز میں دیکھ چکا تھا... لیکن جو کچھ بھی تھا ماضی کا وہ حصہ جس میں بقول چوہان یہ لڑکی میری محسنہ کی حیثیت رکھتی تھی، میرے حافظے میں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وقت کے اس گمشدہ ٹکڑے میں جو کچھ ہوا تھا... میں کسی بھی طرح اس کا ذمے دار نہیں تھا۔ اپنے جسم کے مندمل زخم دیکھنے کے بعد میں اس حیرت ناک نتیجے پر تو بہرحال پہنچ گیا تھا کہ میرے ساتھ کچھ انوکھا ہو چکا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں چوہان کی باتوں کو مکمل طور پر رد نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کچھ بھی تھا، سلطانہ کے ساتھ میری شناسائی صرف دو دن پرانی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی طرح کی وابستگی محسوس نہیں کر سکتا تھا... اور یہی سبب تھا کہ اس کی مصیبت سے مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میرے ذہن میں تو صرف ثروت کا نام گونج رہا تھا اور دل میں اس کے غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا۔ میں جلد سے جلد اپنوں تک پہنچنا چاہتا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میرے زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی بچا ہے یا نہیں...

وہ رات بڑی مشکل سے کٹی تھی۔ میں رات آخری پہر تک جاگتا رہا۔ غنودگی کی سی کیفیت تھی۔ ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یہ بات اب میری سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی کہ لاہور ڈیفنس کی کوٹھی میں سیڑھیوں سے گر کر میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوا تھا۔ اب میں اپنے ہوش حواس میں واپس آیا ہوں۔ لیکن اس دوران میں ناقابلِ یقین طور پر ڈیڑھ دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے... اور اب وہ عرصہ میری یادداشت میں موجود نہیں ہے۔

آخری پہر مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نیلی جھیل کے کنارے اس وسیع و عریض بستی میں زندگی رواں دواں تھی۔ جھیل میں کشتیاں ڈول رہی تھیں... ایک بڑا بجرا جو یقیناً بستی کے کسی متمول شخص کا رہا ہو گا، بادبانوں کی مدد سے ہولے ہولے جنگل کی سمت بہہ رہا تھا۔ اس میں دو تین پالکیاں دھری تھیں جن میں یقیناً پردہ پوش خواتین تھیں۔ کہیں کہیں جھیل کے کنارے سبز وردیوں والے گھڑسوار بھی

گھوڑے دوڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ دور فاصلے پر ایک عظیم الشان حویلی کے کلس اور گنبد سنہری دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان سے اوپر نیلگوں فلک پر پرندوں کی اڑانیں تھیں۔ بقول چوہان اس عمارت کو دیوان کہا جاتا تھا۔

یہ میں کس داستانی بستی میں آ گیا تھا۔ اسی دوران میں غنی صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کے بیوی بچے تاحال لوٹے نہیں تھے۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر بے دلی سے ناشتا کیا۔ وہ افسردہ نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ سلطانہ واپس نہیں آ سکی۔ اس کا بچہ اور باشو بھی وہیں ہیں۔ میرے سر سے مسلسل ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پٹی بدلے جانے کی ضرورت تھی لیکن فی الوقت ڈاکٹر چوہان یہاں تھا اور نہ سلطانہ موجود تھی۔

ابھی بمشکل ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ وردیوں والے گھڑسوار غنی صاحب کے دروازے پر نظر آئے۔ ان کی آمد متوقع تھی۔ غنی صاحب نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ ہم کو لینے آئے ہیں۔ شاید آج سلطانہ کا مقدمہ چھوٹے سرکار کے سامنے پیش ہو رہا ہو گا۔“

غنی صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک مقامی طرز کی گھوڑا گاڑی پر سوار چھوٹے سرکار کی عظیم الشان حویلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ دو گھوڑوں والی گاڑی تھی اور اس کے دونوں پائدانوں پر دو مسلح باوردی اہل کار کھڑے تھے۔ چھوٹے سرکار کے اہل کار سلطانہ کے دونوں تھیلے نما جھولے کل ہی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ آج انہوں نے گونگے باشو کا مختصر سامان بھی گھوڑا گاڑی میں دھر لیا تھا۔

راستے میں مجھے حیران کن مناظر دیکھنے کو ملے۔ کاروبارِ زندگی جاری تھا۔ ہم ایک سبزی منڈی کے پاس سے گزرے پھر ایک زیرِ تعمیر مسجد میں بہت سے لوگوں کو مچانوں کے اوپر کام کرتے دیکھا۔ گھوڑا گاڑیوں کے علاوہ یہاں بیل گاڑیاں اور کہیں کہیں اونٹ گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ پختہ سڑک کہیں نہیں تھی، ہاں نیم پختہ راستے موجود تھے جن کے کنارے کثرت سے درخت لگائے گئے تھے۔ ایک جگہ درختوں تلے دو خستہ حال جیپیں کھڑی دکھائی دیں۔ یہ جیپیں شاید استعمال کے قابل نہیں تھیں۔ مقامی لوگوں کا لباس زیادہ تر پاجامے اور لنگی پر مشتمل تھا۔ کہیں کہیں انگرکھے بھی نظر آتے تھے۔ عورتوں میں سے کچھ نے گھاگرے چولیاں پہن رکھی تھیں۔ عورتوں کے جسم پر چاندی کے زیور عام دکھائی دیتے تھے، خاص طور سے چوڑیاں۔ ہندو مسلم دونوں طرح کے

لوگ یہاں نظر آ رہے تھے بلکہ مسلمان شاید کچھ زیادہ ہی تھے۔ جلد ہی ہم جھیل کے کنارے اس عظیم الشان عمارت کے سامنے پہنچ گئے جو دور سے تو شان دار نظر آتی ہی تھی، قریب سے اور بھی پُرشکوہ تھی۔ ایک دیوہیکل چمکیلے گیٹ کے اندر سے گزر کر ہم ایک طویل روش پر آ گئے۔ یہ دیوان کا بیرونی حصہ تھا۔ بڑی خوب صورت جگہ تھی۔ دونوں طرف سبز گراسی میدان نظر آتے تھے اور پھول پودے کثرت سے تھے۔ جگہ جگہ مستعد گھڑسوار بالکل ساکت کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں پر کہنیوں تک سفید دستانے تھے اور ان کی نگاہیں اپنے سامنے غیر مرئی نکتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یہاں ہمیں چند شان دار گاڑیاں اور جیپیں بھی نظر آئیں جن میں ایک قیمتی رولز رائس بھی تھی۔

سفید ہاتھی کے بارے میں، میں نے اس سے پہلے فقط سنا تھا یہاں دیکھا بھی۔ وہ بڑے اچھے طریقے سے سجا ہوا تھا۔ اس کے اوپر ہودہ رکھا تھا اور چوکس مہاوت، ہاتھی کے اوپر ہی تھا... غالباً یہ کسی ایسے رئیس یا امیر کی سواری تھی جو یہاں چھوٹے سرکار سے ملنے آیا ہوا تھا۔

باوردی افراد نے مجھے اور غنی صاحب کو گاڑی سے اتارا اور ایک جگہ عام لوگوں کے درمیان بٹھا دیا۔ یہاں مجھے دو چار ایسے افراد بھی نظر آئے جن کی مشکیں خاص قسم کی رسیوں سے کسی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ مختلف مقدمات میں پیش ہونے کے لیے یہاں پہنچے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد اس ہجوم میں سے چھ افراد کی ایک ٹولی کو اٹھنے کا حکم دیا گیا اور دیوان کے اندرونی حصے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ٹولی میں میرے اور غنی صاحب کے علاوہ ایک جواں سال عورت بھی شامل تھی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ اس کی گود میں اسی کی طرح کا ایک سانولا سلونا شیرخوار بچہ تھا۔ ہم مختلف راہداریوں سے گزر کر ایک شان دار ہال میں پہنچے۔ یہاں مخمل و زربفت کے طویل پردے تھے۔ فانوس... غالیچے، خوب صورت نقش و نگار والے جھروکے جن میں زرنگار کرسیوں پر اس راجواڑے کے معزز افراد قیمتی پوشاکیں پہنے براجمان تھے۔ ان میں ہندو اور مسلم دونوں طرح کے لوگ شامل تھے۔ یہ جگہ پرانے زمانے کے کسی دربار سے مشابہ نظر آتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں انگریزی لباس والے افراد بھی دکھائی دیتے تھے۔ اس مقام پر دکھائی دینے والا اہم ترین شخص وہ جواں سال شخص تھا جو ایک دو ڈھائی فٹ اونچے چبوترے پر موجود تھا۔ اس نے بند

گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ گلے میں قیمتی مالائیں اور سر پر ایک زرنگار پگڑی تھی۔ وہ وکٹورین طرز کی شان دار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے اردگرد درجنوں محافظ پتھروں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ چبوترے سے نیچے چھوٹی کرسیوں پر اس عدالت کے اہل کار یعنی کاتب، محرر، وکیل وغیرہ موجود تھے۔

مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ زرنگار وکٹورین کرسی پر بیٹھا ہوا بارعب شخص کون ہے۔ یقیناً یہی ”چھوٹے سرکار“ تھا جو اس تل پانی نامی جگہ کا کرتا دھرتا مختار کہلاتا تھا۔ غالباً کسی مقدمے کی سماعت اختتام پذیر ہوئی تھی۔ درمیانی عمر کے دو افراد جو اپنی صورتوں اور حلیے سے تاجر پیشہ نظر آتے تھے، جھک کر سلام کرتے ہوئے الٹے قدموں پیچھے ہٹتے گئے اور پھر ایک بغلی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ایک اٹھائیس تیس سالہ شخص جس کا آدھا سر، آدھی داڑھی، آدھی مونچھ اور ایک بھوں مونڈ دی گئی تھی، رو رو گڑگڑا رہا تھا۔ وہ چھوٹے سرکار سے اپنی سزا میں کمی کی درخواست کر رہا تھا۔ باوردی افراد نے اسے دبوچ لیا اور دھکیلتے ہوئے باہر لے گئے۔

اس کے بعد چھوٹے سرکار کی عدالت میں جو معاملہ پیش ہوا، وہ اسی روتی دھوتی عورت کا تھا جو ہمارے ساتھ اندر آئی تھی۔ اہل کاروں نے اسے چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ وہ اپنی فریاد پیش کرنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھ جوڑ رکھے تھے اور گڑگڑا رہی تھی۔ ”چھوٹے سرکار! ہمرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے جی۔ ہم کیا کریں۔ ہمرے بچے بھوکے مر جاویں گے جی، وہی تو کمانے والا تھا۔ وہ مہینوں کے لیے بستر پر پڑ گیا ہے۔ پتا نا ہیں کہ اٹھتا بھی ہے یا نا ہیں۔ ہمری کھیتی اجڑ جاوے گی۔ جو کچھ بویا ہے وہ بھی برباد ہو جاوے گا...“

”حوصلہ رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف ہو گا۔“ چھوٹے سرکار کی بارعب آواز ہال میں گونجی۔ پھر وہ سرگوشیوں میں اپنے اردگرد کھڑے افراد سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے بلند آواز سے اپنے اہل کاروں کو مخاطب کیا اور بولا۔ ”کنور بابو کو یہاں لایا جاوے۔“

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ وہی ہاتھی والا معاملہ ہے جس کی کچھ جھلکیاں میں نے کل کمرے کے اندر سے دیکھی تھیں۔ یہ فریاد کناں عورت اس کھیت مزدور کی بیوی تھی جو بپھرے ہوئے ہاتھی کی زد میں آ کر زخمی ہوا تھا۔ وہ ہاتھی چھوٹے سرکار راجیت رائے کے چھوٹے بھائی کنور بابو کا

www.pkdigest.com

پائنتو تھا۔

چند منٹ بعد ایک اور چونکا دینے والا منظر میری نگاہوں کے سامنے آیا۔ ایک چندرہ سولہ سالہ لڑکے کو ہال کمرے میں لایا گیا۔ اس نے بھی بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ تاہم اس کے بال بکھرے بکھرے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کی ناک کا بانسہ بھی چھوٹے سرکار کی طرح کافی اونچا تھا۔ چہرے کے باقی خدوخال بھی گواہی دے رہے تھے کہ وہ چھوٹے سرکار کا چھوٹا بھائی کنور بابو ہے۔ اس کی ایک کلائی میں ایک ریشمی رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہ کوئی بہت مضبوط بندش نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ بس علامتی طور پر اسے یہ رسی باندھی گئی ہے۔

چھوٹے سرکار نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''اس عورت کو پہچانو۔ یہ اس بندے کی گھر والی ہے جس کو تمہارے بادل نے روندا ہے۔ یہ ہم سے اور تم سے اپنے پتی کا قصور پوچھت ہے۔ کیا تم اسے بتا سکتے ہو کہ کھیت میں کام کرتا ہوا اس کا پتی جو پورے پریوار کی روٹی چلاوت تھا، کیوں مہینوں کے لیے بستر پر جا گرا ہے؟''

کنور کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

چھوٹے سرکار کی آواز دوبارہ گونجی۔ ''تم ناہیں بتا سکتے لیکن ہم بتاتے ہیں۔ اس کا پتی اس لیے زخمی اور اپاہج ہوا ہے کہ ایک صاحب بہادر اپنے بدمست جانور کو سنبھال نہیں سکے۔ انہوں نے اپنے لاڈلے ہاتھی کو ہواخوری کے لیے باغ میں نکالا۔ پھر اس کی طرف سے غافل ہو کر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کی بازی لگانے میں مصروف ہو گئے اور تو اور مہاوت کو بھی کسی کام سے بھیج دیا۔ اور... صاحب بہادر نے اس طرح کی حرکت پہلی دفعہ ناہیں کی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کی وجہ سے اسی انداز میں عام لوگن کا نقصان ہو چکا ہے۔ صاحب بہادر کا یہ ہاتھی ایک چھوٹے بچے کی جان لے چکا ہے۔ ایک بوڑھی عورت کی ٹانگ توڑ چکا ہے۔ گلاب محلے کی کئی جھونپڑیاں بھی اس کے کارن مسمار ہوئی تھیں۔ ہوئی تھیں یا ناہیں؟'' چھوٹے سرکار کی بارعب آواز گونجی۔

کنور بدستور سر جھکائے کھڑا تھا۔ ایک فربہ اندام شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کنور بابو! آپ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہت ہیں؟''

''ناہیں۔'' کنور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم سے غلطی ہوئی ہے۔ ہم مانتے ہیں۔''

''آپ بہت عقل مند ہیں۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی سزا بھی خود ہی تجویز کر لیں۔'' چھوٹے سرکار نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''آپ جو سزا دیں گے، مجھے قبول ہے۔''

چھوٹے سرکار اور مصاحبین کے درمیان دھیمے لہجے میں کچھ گفتگو ہوئی پھر چھوٹے سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ ''گھائل ہونے والے کسان کی پتنی کو اپرادھی کی طرف سے دس ہزار روپیا اور بیلوں کی جوڑی دی جائے گی۔ گھائل کے علاج معالجے کا سارا خرچہ بھی اپرادھی ہی برداشت کرے گا۔ اس کے علاوہ اپرادھی کو تین مہینے جیل کے اندر قید تنہائی میں کاٹنا ہوں گے۔ بالکل عام قیدی کی حیثیت سے۔''

کنور کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا فربہ اندام وکیل بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں معافی چاہت ہوں۔ ایک عام اپرادھی کے لیے تو شاید یہ سزا مناسب ہو مگر کنور بابو آسائش میں رہن سہن کے عادی ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ سزا بہت کڑی ثابت ہووے گی۔ آپ جانت ہیں، وہ کافی دیر بعد میعادی بخار سے صحت یاب ہوتے ہیں۔ ان کے دوبارہ بیمار پڑنے کا خدشہ ہوگا۔''

چھوٹے سرکار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری یہ دلیل بالکل بے کار ہے۔ اپنے رہن سہن کی وجہ سے کنور کو یہ سزا زیادہ کڑی محسوس ہووے گی تو ہونی بھی چاہیے... کیونکہ اسی رہن سہن اور مرتبے کی وجہ سے کنور پر زیادہ ذمے داری بھی لاگو ہوتی تھی۔ ایک عام بندہ چوری کرتا ہے تو اس کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے لیکن ایک پنڈت، پادری یا امام مسجد کے اپرادھ کی حیثیت اور ہے۔''

اس موقع پر کسان کی اشک بار بیوی دو قدم آگے آئی۔ اس کے مفلس چہرے پر اب قدرے اطمینان دکھائی دیتا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''ہم آپ کے چاکر ہیں۔ آپ کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں... ہمری ہر شے پر آپ کا ادھکار ہے۔ کنور بابو نے جان بوجھ کر تو کچھ نہیں کیا۔ جو ہوا وہی اللہ کو منظور تھا۔ میں آپ کے انصاف سے بہت خوس (خوش) ہوں جی۔ اس کے ساتھ ہی آپ سے بنتی کرتی ہوں کہ کنور بابو کی جیل والی سجا معاف کر دی جاوے۔ میں اور عبداللہ آپ کو دعائیں دیں گے جی۔''

عبداللہ اس عورت کے گھر والے کا نام تھا۔ عورت کی بات سن کر چھوٹے سرکار کے سرخی مائل چہرے پر ناگواری کا سایہ لہرا گیا۔ بہر حال، جب وہ بولا تو اس کی آواز نارمل ہی تھی۔ اس نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم یہ سمجھت ہو کہ دس ہزار روپیا اور بیلوں کی جوڑی دینا کنور بہادر

www.pkdigest.com

کے لیے ایک بڑی سزا ہے تو تم غلطی پر ہو۔ اس سے پانچ دس گنا کا خسارہ بھی وہ آسانی سے برداشت کر سکت ہے۔ اس کی اصل سزا وہی ہے جسے تم معاف کرنے کا کہہ رہی ہو۔ یہ سزا اس کو ہر صورت جھیلنا پڑے گی۔''

عورت نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اظہار خیال کی جرأت نہ کر سکی۔

بہر طور سائلہ عورت کا دل رکھنے کے لیے چھوٹے سرکار نے کنور کی سزا میں دو ہفتے کی تخفیف کر دی۔ کنور کو باوردی اہل کار باہر لے گئے۔ عورت بھی اپنے بچے سمیت باہر چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے سلطانہ کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے عقب میں گونگا ہاشو تھا۔ دونوں کے رنگ اڑے ہوئے تھے۔ جلد ہی سلطانہ کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں میں التجا کا رنگ ابھرا۔ وہ جیسے بزبانِ خاموشی مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اس کے حوالے سے اپنا بیان بدل لوں۔ سلطانہ کے ساتھ ہی تین افراد مزید اندر داخل ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ حکم جی کے لوگ تھے اور زرگاں سے سلطانہ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ان میں سے ایک شخص کی ٹھوڑی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور وہ کافی غصے میں بھی نظر آتا تھا۔ جب اس کی نظر مجھ سے ملی تو اس نے مجھے گھورا اور بڑبڑانے والے انداز میں کچھ کہا۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا ہے۔ باقی دونوں افراد کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے۔ لیکن میرے حافظے میں ان تینوں کے لیے کوئی شناخت موجود نہیں تھی۔

اہل کار میری طرف بڑھے اور انہوں نے مجھے بھی چھوٹے سرکار کے عین سامنے چبوترے کے پاس کھڑا کر دیا۔ مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو موقع پر موجود لوگوں نے زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ چھوٹے سرکار کی گہری سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ اس نے بڑے غور سے پہلے میری طرف اور پھر سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اپنے سامنے تپائی پر رکھے ہوئے کچھ کاغذات کا مطالعہ کیا۔ یقیناً یہ کاغذات ہمارے اس مقدمے کے حوالے سے ہی تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے کاغذات سے سر اٹھایا اور چوڑی ٹھوڑی والے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''موہن کمار! تم اس معاملے کے بارے میں کیا کہنا چاہت ہو؟''

موہن کمار نے کہا۔ ''چھوٹے سرکار! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا ناہیں چاہت ہوں۔ یہ بالکل صاف سیدھا معاملہ ہے۔ سلطانہ نام کی یہ لڑکی اپرادھن ہے۔ اس نے آپ کے بڑے بھائی حکم جی کی پتنی اور آپ کی بھاوج رتنا دیوی کو گھائل کیا ہے۔ اس نے ان سے سخت بدتمیزی کی پھر جھگڑا کیا اور ہاتھ چلا کر ان کا جبڑا توڑ دیا۔ اب وہ کچھ بول سکت ہیں، نہ کھا پی سکت ہیں۔ شاید یہ ان کو جان سے ہی مار ڈالتی مگر رتنا دیوی کی سکھیوں نے اسے روک لیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد یہ غائب ہو گئی۔ دو دن تک پتا ناہیں کہاں اور کس کے پاس رہی۔ پھر اپنے اس جھوٹے پتی کو لے کر یہاں تل پانی آ گئی ہے۔ اور بات صرف اتنی ہی ناہیں ہے چھوٹے سرکار! وہاں زرگاں میں ہر کوئی جانت ہے کہ سلطانہ کا چال چلن ٹھیک ناہیں ہے۔ یہ مہروز کو اپنا پتی کہتی ہے لیکن سب جانت ہیں کہ مہروز ایک مخبوط الحواس بندہ ہے۔ سلطانہ کے لیے بس یہ نام کا پتی ہے۔ اس نے یارانے پالے ہوئے ہیں۔ اس کے بچے کا پتا بھی نہ جانے کون ہے اور اگر...''

''چھوٹے سرکار! یہ مجھ پر جھوٹے الجام لگا رہے ہیں جی۔'' سلطانہ دلیری سے بات کاٹ کر بولی۔ اس کی سرخ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا۔ ''یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ جارج گورا صاحب مجھ پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس کی نیت میرے بارے میں ٹھیک ناہیں ہے۔ شروع سے ٹھیک ناہیں ہے۔ اور حکم جی صاحب، گورا صاحب کی ہر بات مانتا ہے۔ پنڈت مہاراج بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان لوگاں نے ہماری جندگی حرام کی ہوئی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جی کہ میں کل گورا صاحب کی بات مان لوں تو کل! اج سب کچھ ٹھیک ہو جائیں گا۔ مجھ پر ہر الجام ختم ہو جائیں گا۔ ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گا۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کی آہ و بکا کا کچھ زیادہ اثر نہیں لیا۔ وہ دھیان سے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چوڑے جبڑے والے موہن کمار نامی شخص سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''موہن کمار! ہم جانت ہیں کہ چندرہ سولہ برس پہلے اس لڑکی کی ماتا نے بڑی دلیری دکھاتے ہوئے، جنگل میں بڑے بھائی جی کی جیون رکھشا کی تھی۔ اس طرح سے اس پریوار کا ہمارے اوپر ایک احسان بھی ہے۔ ہمیں بہت نراشا ہو رہی ہے کہ اسی پریوار کی ایک لڑکی کے اوپر اتنے کٹھور الزامات لگ رہے ہیں۔''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! آپ بالکل ٹھیک کہوت ہیں لیکن یہ چھوری اپنی ماتا پر ناہیں گئی، اس کے بالکل الٹ گئی ہے۔ اس کو بہت برداشت کیا گیا، پر اب پانی سر سے گزر گیا ہے۔ یہ اسٹیٹ کی باغی بن چکی ہے۔ خود قانون توڑت ہے اور چاہت ہے کہ دوسرے بھی ایسا کریں۔ اس کو

جو ڈھیل دی جاتی رہی، اس کا اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ حکم جی کی پتنی رتنا دیوی سے بھی وروودھ کرنے لگی بلکہ ان سے یُدھ چھیڑ دیا۔''

چھوٹے سرکار اچانک میری طرف گھوما... اور بارعب آواز میں بولا..... ''تمہارے بارے میں کہا جاوت ہے کہ تم سلطانہ کے چچا ہو؟ کیا تم یہ بات مانت ہو؟''

میرا سر چکرا گیا۔ ایک بار پھر آنکھوں کے سامنے لال پیلی چنگاریاں اڑنے لگیں۔ میں سیڑھیوں پر سے اڑتا ہوا سیاہی مائل فرش کی طرف جا رہا تھا۔ اس سے آگے کچھ یاد نہیں تھا۔ چند ہی لمحوں میں میرے ماتھے پر پسینا چمکنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس عدالت میں موجود ہر فرد میری طرف دیکھ رہا ہے۔ ان میں سلطانہ اور غنی صاحب بھی شامل تھے۔ غنی صاحب کی آنکھوں میں بھی وہی ڈری ڈری التجا تھی جو کچھ دیر پہلے سلطانہ کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی اور اس کے بچے کو اپنا بچہ مان لوں۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور زبان کو تالا سا لگ گیا۔ میں نے بے بسی سے چھوٹے سرکار کے بارعب چہرے کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں مجھے پھر عمران یاد آ گیا۔ کاش وہ اس وقت یہاں موجود ہوتا۔ وہ میری طرف سے بولتا۔ اس کے پاس تو ہر سوال کا بے مثال جواب موجود رہتا تھا۔ اس کے پاس تو ہر دلیل کا توڑ ہوتا تھا۔ وہ سچ بول کر تو قائل کرتا ہی تھا، جھوٹ بول کر بھی لاجواب کر دیتا تھا۔

موہن کمار نے بلند آواز سے کہا۔ ''یہ کچھ ناہیں بولے گا چھوٹے سرکار! یہ کچھ بولنے کے قابل ہوتا تو سلطانہ اس کو چچا ہی کیوں بناتی؟''

کچھ لوگ مسکرائے اور سرگوشیاں ابھریں۔ چھوٹے سرکار نے ایک کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میڈم صفورا کون ہے؟ جسے بعدازاں یہاں اسٹیٹ میں کورلی کا نام دیا گیا؟''

''جناب! اس کا جواب میرے یہ ساتھی گروراکیش اور حافظ خدا بخش صاحب زیادہ اچھے طریقے سے دے سکت ہیں۔'' موہن نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

گیروا لباس والے گروراکیش نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مؤدب انداز میں بولا۔ ''چھوٹے سرکار! یہ صفورا نام کی ناری بھی اسی اپرادھ میں ملوث تھی جس میں یہ مہروز تھا۔ اس کے علاوہ ان کا ایک تیسرا ساتھی ابرار احمد بھی تھا۔ میرا خیال ہے کہ آپ تھوڑا بہت تو جانت ہی ہوں گے۔ یہ... مہاتما بدھ کی مقدس مورتی کی چوری کا معاملہ تھا۔ کچھ لوگن نے بڑی بے دردی سے مورتی کو پرانے پگوڈا کے تہ خانے سے اکھاڑا اور یہاں سے نکال کر جھانسی پہنچایا۔ جھانسی سے یہ مورتی الٰہ آباد پہنچی اور پھر وہاں سے حیرت انگیز طور پر پاکستان پہنچا دی گئی۔ اس مورتی کو واپس لانے کے لیے ہمارے لوگن کو جو جو کچھ کرنا پڑا، وہ ایک لمبی کتھا ہے۔ اس میں ہمارے کئی لوگن کا جیون گیا... ورودھیوں میں سے بھی کئی مارے گئے۔ بڑے گرو کے حکم کے مطابق کچھ اپرادھیوں کو بندی بنا کر یہاں اسٹیٹ میں لایا جانا ضروری تھا۔ سو ہمارے لوگن نے سرتوڑ کوشش کی اور پانچ چھ کو لے آئے۔ یہ صفورا، ابرار احمد اور مہروز بھی ان میں شامل ہیں۔''

''مگر اس لڑکی سلطانہ اور تمہارے اس اپرادھی مہروز کا ملاپ کیسے ہوا؟'' چھوٹے سرکار کی طرف سے پوچھا گیا۔

''جناب! دستور کے مطابق مہروز کو بھی دوسرے قیدیوں کی طرح بڑے پگوڈا میں قید کی سزا کاٹنی تھی۔ یہ وہاں سزا کاٹ رہا تھا۔ اس لڑکی سلطانہ کے چوبارے سے پگوڈا کا صحن نظر آوت تھا۔ یہ وہاں سے مہروز کو پگوڈا کا کام کاج کرتے دیکھتی رہوت تھی۔ پھر ایک روز پگوڈا کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی۔ یہ مہروز اور دو تین اور بندے اس آگ میں پھنس گئے۔ سلطانہ نے مہروز کو آگ سے نکالا تھا اور بعد میں اس کی مرہم پٹی بھی کر لی رہی تھی۔ پھر ایک دن بالکل اچانک زرگاں کے لوگن کو پتا چلا کہ مختار کی بچی سلطانہ نے پگوڈا کے چاچا کر مہروز سے بیاہ کر لیا ہے اور خود کو اس کی پتنی کہہ رہی ہے۔ میں نے سرکار کو بتایا ہے نا کہ اس چھوری نے ہمیشہ وہ کام کیا ہے جس کی وجہ سے کھلبلی مچی ہے اور لوگن نے دانتوں میں انگلیاں داب لی ہیں۔ دراصل یہ اپنی اس حیثیت کا فائدہ اٹھاتی رہی ہے جو سورگ باشی راجے پرتاپ بہادر جی نے اسے اور اس کے خاندان کو دی تھی۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی، اس کو بھی ناہیں آئی ہے چھوٹے سرکار۔''

اس موقع پر سلطانہ نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر چھوٹے سرکار نے انگلی اٹھا کر اسے فی الحال خاموش رہنے کا حکم دیا۔ وہ موہن کمار اور گروراکیش سے ایک ساتھ مخاطب ہو کر بولا..... ''لیکن ہماری بدھی میں یہ بات ناہیں آئی کہ پگوڈا کے اپرادھی کی شادی کو بڑے بھائی صاحب اور دوسرے لوگن نے مان کیسے لیا؟''

موہن کمار بولا۔ ''چھوٹے سرکار! بھگوان ہزاروں ورش آپ کی رکھشا کرے۔ گروراکیش نے آپ کو بتایا ہے نا

کہ اس چھوری نے ہمیشہ اس حیثیت کا فائدہ اٹھایا ہے جو آپ کے بزرگھوں نے اس پریوار کو دی تھی۔ اس بیاہ کے موقع پر بھی اس چھوری نے ایسا ہی کیا۔ یہ جانت تھی کہ اس کے پاس ایک ٹرپ کا پتا موجود ہے۔ اس نے وہ پتا پھینکا اور بازی اپنے نام کر لی۔''

''موہن کمار! کھل کر بات کرو۔'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''چھوٹے سرکار! سب لوگ جانت ہیں کہ پندرہ سولہ سال پہلے ترائی کے جنگل میں سلطانہ کی ماتا نے حکم جی کا جیون بچایا تھا اور اس کے لیے اپنا بلیدان دے دیا تھا۔ ہمارے سورگ باشی مہاراج پرتاپ بہادر نے اس کے بدلے اس پریوار کو بہت کچھ دیا تھا پھر بھی شاید ان کے من میں تھا کہ ان کی طرف سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ان جیسا دیالو کسی کے احسان کا بوجھ اپنے سر پر کاہے کو اور کیسے رکھ سکتا تھا۔ شاید آپ بھی جانت ہوں کہ اس سمے مہاراج نے سلطانہ کے پتا مختار کو اپنی خاص مہر دی تھی اور کہا تھا کہ کبھی ضرورت پڑے تو یہ مہر دکھا کر جو چاہے لے لینا۔''

چھوٹے سرکار نے قدرے چونک کر کہا۔ ''ہاں، یہ بات ہم نے بھی سنی ہے۔''

موہن کمار تاسف سے بولا۔ ''اس چھوری سلطانہ نے مہاراج کی اسی مہر کا استعمال کیا اور حکم جی سے اپنی اور مہروز کی جان بخشی کروانے میں کامیاب رہی۔ اس کے لیے حکم جی کو بہت کٹھنائی بھی اٹھانا پڑی۔ بدھ مت کے ماننے والے بہت سے لوگن حکم جی کے خلاف ہو گئے۔ وہ ہرگز ناہیں چاہت تھے کہ ان کے اپرادھی کو اس طرح معاف کر دیا جاوے اور ایک مسلم لڑکی ڈنکے کی چوٹ پر اس کو اپنا پتی بنا لے۔ ایسے لوگن کو رام کرنے کے لیے حکم جی کو بہت کوشش کرنا پڑی۔ بہرحال، انہوں نے کسی نہ کسی طرح اپنے پتا کا دیا ہوا وچن نبھا دیا...''

اس موقع پر سلطانہ نے پھر بولنا چاہا مگر چھوٹے سرکار کی طرف سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ میں ہکا بکا کھڑا تھا۔ میرے بارے میں جو تفصیلی بات چیت ہو رہی تھی، اس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ بس کبھی کسی وقت ذہن میں جھماکا سا ہوتا تھا اور لگتا تھا کہ کوئی ٹوٹا پھوٹا منظر یا بکھری ہوئی سی کوئی آواز یاد آ رہی ہے۔ صفورا کے نام نے بھی میرے دماغ میں کھلبلی مچائی تھی اور میرا یہ شک درست ثابت ہوا تھا کہ جس قیدی عورت کا نام کورلی لیا جا رہا ہے، وہ میڈم صفورا ہو سکتی ہے۔

چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی بات جاری رکھو۔''

موہن کمار کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ بولا۔ ''چھوٹے سرکار! میں پھر وہی بات کہوں گا۔ کچھ لوگن کو عزت راس ناہیں آتی۔ حکم جی اور ہم سب نے بہت کوشش کی کہ یہ لڑکی کسی طرح سنبھل جاوے۔ مگر یہ سنبھلنے کے بجائے اور بھی بگڑتی چلی گئی ہے۔ رتنا دیوی سے اس نے اپنا وروودھ اتنا بڑھا لیا ہے کہ ان کی ہوا پر بھی تلواریں چلاتی ہے۔ حکم جی کے سامنے اب اس کے سوا کوئی چارہ ناہیں کہ وہ اسے قانون کے مطابق سزا دیں۔ ہم آپ سے درخواست کرت ہیں کہ اسے ہمارے حوالے کیا جاوے اور اس کے تماشائی چچا کو بھی تاکہ ہم انہیں حکم جی کے سامنے پیش کر سکیں۔''

میں نے دیکھا کہ سلطانہ کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ تاہم وہ چھوٹے سرکار کے حکم کی وجہ سے چپ تھی۔

چھوٹے سرکار اور ان کے ایک مصاحب نے ایک بار پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ تب چھوٹے سرکار نے گہری سانس لیتے ہوئے سلطانہ کو مخاطب کیا۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ تم اپنے گھر کے چوبارے سے پگوڈا کے صحن میں تاکا جھانکی کرتی رہتی تھیں... اور تم نے وہاں سزا کاٹتے ہوئے مہروز سے آنکھ لڑا رکھی تھی؟''

''یہ بالکل غلط ہے چھوٹے سرکار... ان لوگاں نے جو کچھ کہا ہے وہ سب جھوٹ کا پلندا ہے۔ اس میں کچھ بھی سچ ناہیں...'' وہ بے حد جوش سے بولی۔

چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔ ''ہم جو کچھ تم سے پوچھ رہے ہیں بس اس کا جواب دو... کیا بیاہ سے پہلے مہروز سے تمہارا کوئی ناتا تھا؟''

''ناہیں سرکار! میں بالکل سچ کہتی ہوں۔ میں اس کو اپنے گھر کی چھت پر سے دیکھتی جرور تھی... اور میں کوئی اکیلی اِج ناہیں دیکھتی تھی اور بھی اڑوس پڑوس کے لوگاں دیکھتے تھے۔ اس کی اور دوسرے دو قیدیوں کی حالت بہت پتلی تھی۔ ان کے پاؤں میں رسّی کی بیڑیاں رہتی تھیں۔ یہ سارا دن پگوڈا کے کام کرتے تھے۔ جھاڑ پونچھ کرتے تھے، فرش دھوتے تھے، نالیاں صاف کرتے تھے۔ بڑے بھکشوؤں کی مٹھی چاپی اور خدمت بھی ان کا اِج کام تھا۔ ان کو بس دوپہر کے وخت کھانا ملتا تھا اور وہ بھی یہ مانگ کر لاتے تھے۔ شام سے ذرا پہلے ان کو پگوڈا کی سیڑھیوں کے سامنے جہاں لوگاں کی کھڑاؤں اور جوتیاں پڑی رہتی تھیں، اوندھا لٹایا جاتا اور بید مارے جاتے تھے۔ دونوں مردوں کو دس دس، عورت کو چھ۔ چھوٹے سرکار! دوسروں کی طرح مجھے بھی ان تین لوگاں

پر ترس آتا تھا۔ اس وقت وہ مجھے اپنے ایک مسلمان بھائی کی طرح لگتا تھا۔ ایک ایسا بھائی جو اپنے وطن سے دور ایک سخت مصیبت میں پھنسا ہوا تھا۔''

''لیکن پھر ایک دن تم نے اچانک اس سے شادی کر لی اور اس شادی کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگایا؟'' چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ''چھوٹے سرکار! مجھے آپ کے انصاف پر پورا اعتبار ہے... لیکن سرکار! ابھی تک آپ کے سامنے اس تصویر کا بس ایک اِچ رخ ہے اور یہ بالکل غلط رخ ہے۔ زرگاں میں جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے والد نے اچانک میری شادی مہروز سے کیوں کی؟ اس کے پیچھے کیا وجہ تھی؟ اس کے پیچھے بس ایک اِچ وجہ تھی چھوٹے سرکار... میرے گھر والے میری عجت بچانا چاہتے تھے...''

موہن کمار بھڑک کر بولا۔ ''یہ معاملے کو الجھانے کی کوشش کرت ہے چھوٹے سرکار...''

''دیکھو موہن کمار! تمہاری پوری بات سنی گئی ہے۔ اب مجھے اس سے اپنے سوالوں کا جواب لینے دو۔'' چھوٹے سرکار نے موہن کمار کو ٹوکا۔ پھر اس نے اشک بار سلطانہ کو بات جاری رکھنے کا کہا۔

سلطانہ بولی۔ ''یہ بات کوئی ڈھکی چھپی ناہیں ہے جی... جارج گورا اس راجواڑے کی عورتوں پر گندی نجر ڈالتا ہے۔ اس نے تین چار برس پہلے مجھ پر بھی گندی نجر ڈالی اور اس کی یہ نجر اب بھی جوں کی توں ہے۔ آپ جانتے ہیں، وہ ہندی بول لیتا ہے۔ ایک بار اس نے مجھ سے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر میں اس کی وِتّی بننے پر راجی ہو جاؤں تو وہ ہر طرح کے غلط کام ایک دم چھوڑ دے گا۔ میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس طرح کی بات اس نے اس سے پہلے بھی کئی عورتوں سے کہی ہوئے گی۔ اور وہ عورتیں میری طرح عام نہیں ہوئیں گی، بڑی بڑی خوب صورت ہوئیں گی۔ یہ عورت باج (عورت باز) بندے تو ایسے اِچ ہوتے ہیں...''

''یہ ہز میجسٹی کی شان میں گستاخی کر رہی ہے چھوٹے سرکار!'' حافظ خدا بخش نے بھڑک کر کہا۔ ''یہ ثبوت کے بغیر الزام لگاوت ہے۔''

چھوٹے سرکار نے سلطانہ کو تنبیہ کی۔ ''تم غلط لفظ استعمال ناہیں کرو... اور اپنے جواب کو صرف اس تک رکھو کہ تمہارا بیاہ اچانک مہروز سے کیوں ہوا؟''

سلطانہ نے اوڑھنی سے آنسو پونچھے اور بچے کو کندھے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''چھوٹے سرکار! میں نے گورا صاحب کو صاف انکار کر دیا تھا، پر اس نے کبھی بھی میرا پیچھا ناہیں چھوڑا۔ وہ حکم جی کو میرے خلاف بھڑکاتا رہا اور مجھے پانے کی تدبیریں سوچتا رہا۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکم جی بھی اس کی باتوں میں آ گئے... بلکہ... پوری طرح اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ ساتویں کا جشن آنے والا تھا۔ آپ جانتے اِچ ہیں، ساتویں کے جشن میں راج بھون کے اندر خاص انتجام کیے جاتے ہیں۔ پرانے رواج کے مطابق سات رنگوں کے لیے سات لڑکیاں چنی جاتی ہیں۔ ان کو فیریوں یا پریوں کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ایک وقت تھا جی کہ جب کسی بھی لڑکی کے لیے پری بننا اور راج بھون میں جگہ حاصل کرنا بڑی عجت کی بات ہوتی تھی۔ اس کا جیون سنور جاتا تھا مگر اب وہ پہلے والی بات کہاں رہی ہے جی۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہونے لگا ہے۔ پھر بھی بے شمار لڑکیاں ہیں جو ''پری'' بن کر راج بھون میں جانے کے سپنے دیکھتی ہیں۔''

''تم اپنی بات کو صرف اپنے جواب کی حد تک رکھو۔'' چھوٹے سرکار نے اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتی ہوں سرکار! میں ساتویں کے جشن کی بات کر رہی تھی۔ راج بھون کی کچھ عورتیں مجھے یہ خوش خبری سنانے آ گئیں کہ میرا نام اس سال چنی جانے والی سات لڑکیوں میں لیا جا رہا ہے۔ بہت آشا ہے کہ میں چن لی جاؤں گی۔ چھوٹے سرکار! میں جان گئی کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں دکھ کے سمندر میں ڈوب گئی۔ مجھے پتا تھا کہ مجھے صرف اور صرف گورا صاحب کے لیے راج بھون میں لے جایا جا رہا ہے۔ میں وہاں صرف گورا صاحب کی رکھیل بن کر رہ جاؤں گی۔ میں نے اور میرے گھر والوں نے فیصلہ کیا کہ ہم ایسا ناہیں ہونے دیں گے۔ مجھے سات لڑکیوں میں چن لیا گیا۔ میرا رنگ ''اوّل'' تھا مگر جس رات حکم جی کے آدمیوں نے میرے ماتا پتا سے چناؤ کی رسمی اجاجت لینے کے لیے آنا تھا، دوپہر کے وقت میرے پتا نے مہروز سے میرا بیاہ کر دیا۔ یہ پہلے سے پتاجی کا منصوبہ ناہیں تھا، اس وقت کوئی بھی مسلمان لڑکا مل جاتا اور راجی ہو جاتا تو میرے پتا نے اس سے میرا نکاح پڑھوا دینا تھا۔ آپ جانتے اِچ ہیں کہ بیاہتا لڑکی راج بھون کی پری ناہیں بن سکتی۔ میں بھی پری بننے سے بچ گئی لیکن اس کے بدلے میں حکم جی کا غصہ جھیلنا کوئی آسان کام ناہیں تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارے ساتھ بہت مشکل ہوئیں گی۔ تب پتاجی نے فیصلہ کیا کہ وہ اس

مشکل وقت سے گجرنے کے لیے مہاراج پرتاپ بہادر جی کی دی ہوئی مہر سے کام لیں گے۔''

موہن کمار نے بے حد بے چینی سے اپنی چوڑی ٹھوڑی کو کھجایا اور بولا۔ ''گستاخی معاف چھوٹے سرکار! یہ چھوری اپنی چرب زبانی سے معاملے کو الجھانا چاہت ہے۔ یہ ہماری توجہ اصل صورت حال سے ہٹا رہی ہے۔ کوّے کو سفید کہنے سے وہ سفید ناہیں ہو جاتا۔ سارا زرگاں جانت ہے کہ یہ ٹھیک عورت ناہیں ہے۔ اپنے کالے کرتوت چھپانے کے لیے یہ دوسروں پر گھناؤنے الزام لگاتی ہے اور جب اس کا جواب دیا جاوت ہے تو مرنے مارنے پر اتر آتی ہے۔ رتنا دیوی جی کے ساتھ بھی اس کا جھگڑا ایسے ہی شروع ہوا تھا۔ اس نے ان کے رتبے کا خیال کیے بغیر پہلے منہ ماری کی پھر ہاتھا پائی پر اتر آئی...''

''یہ بھی بالکل جھوٹ ہے سرکار! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے رتنا دیوی سے کچھ ناہیں کہا۔ میرا اور ان کا بھلا کیا جوڑ؟ میں ایک نصیبوں ماری بے سہارا لڑکی، وہ راج بھون کی رانی۔ میں تو ان سے اپنی جان بچاتی پھرتی تھی۔ پر وہ کسی صورت مجھے شما کرنے کو تیار ناہیں تھیں۔ میں پنگھٹ پر پانی بھر رہی تھی۔ وہ وہاں اپنی سکھیوں کے ساتھ سیر کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی گندی بات کی جو ان کی جبان کو ہرگج جیب ناہیں دیتی تھی۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ آپ بڑے منہ سے اتنی چھوٹی بات مت کہیں۔ بس وہ اسی بات پر بھڑک گئیں اور پالکی چھوڑ مجھ پر کود پڑیں۔ انہوں نے مجھ سے ہاتھا پائی کی اور پھر اپنے جور میں خود ہی پھسل کر پنگھٹ کی سیڑھیوں سے گریں۔ ان کو جو چوٹ آئی، وہ اپنی وجہ سے آئی۔ وہاں بہت سوں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ اب کسی میں اتنی ہمت ناہیں ہوگی کہ وہ اس بات کی گواہی دے۔ آپ جانتے ہیں، یہاں کم جور کا ساتھ کوئی ناہیں دیتا چھوٹے سرکار! وہ سچ بول کر بھی ہارتا ہے۔ جور والا جھوٹ بول کر بھی جیت جاتا ہے...'' آخری الفاظ کہتے کہتے سلطانہ کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنے بچے کو کندھے سے لگا کر سسکنے لگی۔ اس کے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اس کی اوڑھنی سے نکل کر اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

حافظ خدا بخش نے کہا۔ ''یہ اپنے گناہوں پر پردہ ڈال رہی ہے جی۔ اصل میں اس نے مہروز جیسے دیوانے سے بیاہ کیا ہی اس لیے تھا کہ یہ اپنے کرتوتوں کو چھپانا چاہت تھی۔ ہم سب جانت ہیں کہ یہ ہرجائی ہے۔ اس کے کئی... یارانے ہیں۔ باپ بوڑھا ہو چکا ہے۔ بھائی بہت عرصے سے بیمار پڑا ہے۔ اس کو کسی کا ڈر خوف ناہیں ہے...''

''یہ جھوٹ ہے... الجام ہے۔'' سلطانہ چلائی۔ ''میں ان سب لوگوں کو جانتی ہوں۔ یہ حکم جی کے خاص بندے ہیں۔ ان کے منہ میں حکم جی کی جبان ہے...''

اس دوران میں غنی صاحب نے بھی دبے لہجے میں سلطانہ کی حمایت میں چند فقرے بولے۔ انہوں نے کہا کہ ایک ایسی لڑکی پر جو ماں بھی ہے، کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ایسے سنگین الزام نہیں لگائے جانے چاہئیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھرانے کو کسی حد تک جانتے ہیں۔ وہ عزت دار، سچے اور نڈر لوگ ہیں۔ اگر ان کی لڑکی واقعی بدچلن ہوتی تو وہ کبھی چپکے نہ بیٹھے رہتے۔

چھوٹے سرکار نے دونوں طرف کا موقف وضاحت سے سنا اور چند مزید سوالات کیے۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا۔ جب چھوٹے سرکار نے مجھ سے پوچھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی تسلیم کرتا ہوں یا نہیں تو میں نے اس کا جواب اثبات میں دیا اور کہا۔ ''میں اپنی غلط بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ کل میں پوری طرح اپنے حواس میں نہیں تھا۔ سلطانہ کے ساتھ میرا بیاہ ہو چکا ہے۔ اس کی گود میں جو بچہ ہے، وہ میرا ہی ہے...''

''اس بات کا پتا کیسے چلے گا کہ تم کل اپنے حواس میں ناہیں تھے یا آج حواس میں ناہیں ہو؟'' چھوٹے سرکار نے کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں، درست ہے چھوٹے سرکار! یہ میری بیوی ہے، یہ میرا بچہ ہے۔ میری رب... بیوی پر جھوٹے الزام لگائے جا رہے ہیں۔ یہ گھر گرہستن ہے۔ یہ پوری طرح میری وفادار ہے۔ یہ حکم جی اور ان کے دوست کی بدنیتی ہے۔ وہ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے ہم نے زرگاں چھوڑا ہے۔ لیکن یہ لوگ یہاں بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ اگر... اگر آپ نے ہمیں ان کے حوالے کر دیا تو ہمیں بے عزت کر کے مار دیا جائے گا چھوٹے سرکار...'' میں بولتا چلا گیا۔ حالانکہ میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ زرگاں کہاں ہے؟ حکم جی کون ہے... میری شادی کب ہوئی تھی؟ لیکن میں خود کو ذہنی طور پر باور کرا چکا تھا کہ زرگاں موجود ہے۔ حکم جی، گورا صاحب اور ان کی بدنیتی بھی موجود ہے اور سلطانہ سے میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ میری یادداشت کے پردے پر موجود نہیں تھا لیکن اس کے بارے میں اب اتنے ثبوت موجود تھے کہ میں

www.pkdigest.com

اسے جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں نے اب اپنی یادداشت کے بجائے ان ثبوتوں پر بھروسا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"یہ فاتر الدماغ بندہ نہیں ہے سرکار! اس کی کسی بات پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" موہن کمار نے احتجاج کیا۔

چھوٹے سرکار نے اسے خاموش رہنے کا حکم دیا اور مجھے اپنا بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میرے بیان کے مثبت اثرات چھوٹے سرکار کے چہرے پر نظر آنے لگے تھے۔ انہیں کم از کم اتنا یقین تو ہو رہا تھا کہ میں سلطانہ کو اپنی بیوی مان رہا ہوں اور میرے نزدیک وہ وفادار ہے۔ اب تک کی سماعت کے دوران میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ چھوٹے سرکار کے دل میں سلطانہ اور اس کے بچے کے لیے نرم گوشہ موجود ہے اور وہ انہیں پناہ دینا چاہتا ہے۔ تاہم اس کے لیے وہ قانونی تقاضے بھی پورے کرنا چاہتا تھا۔ میرا بیان سننے کے بعد اس نے بڑی ذہانت سے موہن کمار اور گروراکیش سے چند ایسے سوال کیے جن سے ان کے بیانوں میں تضاد پیدا ہوا۔ جارج گورا کی ناپسندیدہ مصروفیات کے بارے میں بھی چھوٹے سرکار نے موہن کمار سے چند چبھتے ہوئے سوالات کیے۔ اس موقع پر ایسا نظر آنے لگا کہ اس مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہوگا اور ہمیں گونگے باشو سمیت تل پانی میں پناہ دے دی جائے گی۔ کم از کم عارضی پناہ تو ضرور مل جائے گی جسے بعدازاں مستقل کیا جاسکے گا۔

لیکن پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایک فربہ اندام شخص جو اپنے حلیے سے چوب دار نظر آتا تھا، اندر داخل ہوا۔ اس نے چھوٹے سرکار کے قریب جھک کر سرگوشیوں میں کوئی بات کی۔ چھوٹے سرکار کا چہرہ متغیر نظر آیا۔ انہوں نے گہری نظروں سے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ دھیمی آواز میں اپنے مصاحبین کے ساتھ چھوٹے سرکار کا مختصر مکالمہ ہوا۔ اس کے بعد چھوٹے سرکار نے ایک باوردی اہل کار کو کچھ ہدایات دیں۔ وہ باہر چلا گیا۔ وہ کوئی سینئر اہل کار تھا۔ اس کے ساتھ دو تین معزز افراد بھی باہر گئے۔ حاضرین مدھم آوازوں میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ چار پانچ منٹ بعد سینئر اہل کار واپس آیا۔ اس کے عقب میں دو اور افراد بھی تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھا تھا، دوسرا نوجوان... یہ دونوں رو رہے تھے۔ ان کی پگڑیاں گلے میں پڑی تھیں۔ سینئر اہل کار نے چھوٹے سرکار کے روبرو تعظیم پیش کرنے کے بعد کہا۔ "جناب! میں نے خود ملاحظہ کیا ہے۔ لاش قریباً دو دن پرانی ہے۔ سر کے پچھلے حصے میں کلہاڑی کا گہرا گھاؤ آیا ہے۔ مقتول کے ہاتھ پیچھے کی طرف موڑ کر ایک پرانے ازار بند سے باندھے گئے ہیں۔"

"لاش کہاں سے ملی ہے؟" چھوٹے سرکار نے سوال کیا۔

"ٹیکرے کی دوسری طرف... جہاں پچھلے سال جنگل میں آگ لگی تھی۔ وہاں ایک کھوہ سے نکلی ہے۔ مرنے والے کا نام ہارون بتایا جا رہا ہے۔ یہ حکم جی کے ان سپاہیوں میں شامل تھا جو سلطانہ کی تلاش میں اس کے پیچھے آئے تھے۔"

میرے سر میں دھماکا سا ہوا۔ کھوہ میں ہونے والی لڑائی کے مناظر میری نگاہوں میں گھوم گئے۔ میں نے سلطانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔

جب ہم کھوہ میں ہارون نامی اس رائفل بردار کو باندھ رہے تھے تو وہ بے ہوش تھا۔ لیکن اس کی بے ہوشی ایسی گہری نہیں تھی اور نہ ہی اس کا زخم اتنا سنگین تھا کہ فوری طور پر اس کی موت واقع ہو جاتی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا اور اب ہارون کے ساتھی اس کی لاش لے کر دہائی دیتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔

ایک باوردی اہل کار نے سلطانہ کے جھولے میں سے وہ رنگین دستے والی کلہاڑی نکال لی جس سے ہارون کے سر پر وار کیا گیا تھا۔ صفاچٹ چہرے والے سینئر اہل کار نے اس کلہاڑی کو بہ غور دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "جی چھوٹے سرکار! میرے خیال میں یہی وہ کلہاڑی ہے جس سے مقتول کو چوٹ لگائی گئی ہے۔"

پھر اس سینئر اہل کار نے جھولے میں سے وہ رائفل بھی نکال لی جو لڑائی سے پہلے مقتول ہارون کے ہاتھ میں تھی۔ رائفل کو دیکھتے ہی بوڑھا شخص پکار اٹھا۔ "جی ہاں سرکار! یہ میرے بیٹے کی ہی بندوق ہے۔ میں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ قاتلہ ہے۔ یہ ڈائن ہے۔ یہ میرے بیٹے کو کھا گئی ہے۔" بوڑھا آہ و بکا کرنے لگا۔

سلطانہ نے کہا۔ "چھوٹے سرکار! میں نے کسی کو نہیں مارا۔ میں نے تو صرف خود کو اور اپنے شوہر کو بچانا چاہا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی سرکار۔ اگر میں اس کو کلہاڑی سے چوٹ نہ لگاتی تو وہ مجھے اور میرے شوہر کو بھون کر رکھ دیتا..."

چھوٹے سرکار نے اس مرتبہ سلطانہ کی سنی ان سنی کر دی۔ انہوں نے صفاچٹ سر والے اہل کار سے پوچھا۔ "منوج! اس رائفل کے بارے میں سلطانہ نے اس سے پہلے کیا بیان دیا تھا؟"

اہل کار بولا۔ "سرکار! یہ کہتی تھی کہ یہ اس کے پتا جی کی رائفل ہے۔ یہ اپنی رکھشا کے لیے ساتھ لائی ہے۔"

موہن کمار پکار کر بولا۔ "میں نے کہا تھا نا سرکار کہ یہ بڑے درجے کی جھوٹی اور مکار ہے۔ یہ اپنی ڈگر پر اتنا آگے چلی گئی ہے کہ اس کے لیے واپس آنا ممکن نہیں ہے۔ یہ بہت خطرناک ہو چکی ہے سرکار۔" موہن کمار کے لہجے میں نئی توانائی آگئی تھی اور بات صرف موہن کمار ہی کی نہیں تھی... ان سب لوگوں کے چہرے دمکنے لگے تھے جو سلطانہ کے پیچھے یہاں آئے تھے۔

اس واقعے کے بعد صرف پانچ دس منٹ کے اندر اندر اس کیس کا فیصلہ ہو گیا۔ چھوٹے سرکار نے سلطانہ اور اس کے بچے کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا جو اسے لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ سلطانہ کے ساتھ ساتھ مجھے اور باشو کو بھی ان لوگوں کی تحویل میں دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ سناتے ہوئے چھوٹے سرکار اجیت رائے کے لہجے میں افسردگی کی جھلک موجود تھی۔ اس جگہ موجود بیشتر مقامی لوگ بھی اس صورت حال سے مایوس تھے۔ اس فیصلے میں غنی صاحب اور ڈاکٹر چوہان کو سرزنش بھی کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ باہر سے آنے والے کسی بھی شخص کو پناہ دینے سے پہلے اس کے بارے میں چھان بین کریں۔

اب ہم واپس جا رہے تھے۔ انہی راستوں پر سفر کرتے ہوئے جن پر سفر کرتے ہوئے یہاں پہنچے تھے۔ ہمارا قافلہ قریباً بارہ افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں موہن کمار، گروراکیش، مودان اور حافظ خدا بخش بھی شامل تھے۔ سب لوگ گھوڑوں پر سوار تھے۔ میں، سلطانہ اور باشو بھی گھوڑوں پر تھے۔ ہم تینوں کے گھوڑوں کی لگامیں آپس میں باندھ دی گئی تھیں اور پھر انہیں ایک چوتھے گھوڑے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ یہ موہن کمار کا گھوڑا تھا۔

ہارون کی لاش لکڑی کے ایک سیل بند تابوت میں رکھی گئی تھی۔ اس تابوت کو ایک توانا خچر کے پہلو سے باندھا گیا تھا۔ وزن برابر رکھنے کے لیے خچر کے دوسرے پہلو سے کچھ سامان وغیرہ باندھ دیا گیا تھا۔ ایک اور خچر پر بھی سامان لدا ہوا تھا۔ یہ کینوس کی تین چار چھولداریاں اور ان کے بانس وغیرہ تھے۔ گھنے درختوں میں ہمارا قافلہ سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمارے ہاتھ وغیرہ نہیں باندھے گئے تھے مگر ہم پر کڑی نظر رکھی جا رہی تھی، خاص طور سے سلطانہ پر۔ ایک رائفل بردار گھڑ سوار مسلسل اس کے پہلو میں چل رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اسے خوں خوار نظروں سے گھور بھی لیتا تھا۔ یہ ہلاک ہونے والے ہارون کا بھائی صادق لاکھی تھا۔

موسم خوش گوار تھا۔ نہ زیادہ گرمی نہ سردی مگر سفر تو پھر سفر ہوتا ہے۔ ہم تھک کر شام تک چور ہو گئے۔ خاص طور سے میرا برا حال تھا۔ میں نے کبھی گھوڑے پر سفر نہیں کیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جسم پھوڑا ہو گیا ہے۔ رکابوں میں پاؤں سوج گئے تھے۔ شام سے ذرا پہلے گھنے جنگل میں ایک ہموار جگہ دیکھ کر پڑاؤ ڈالا گیا۔ چار چھولداریاں لگا دی گئیں۔ ان میں ایک کافی بڑی تھی۔ اس میں موہن کمار، گروراکیش اور خدا بخش نے قیام کرنا تھا۔ ہارون کی لاش والا تابوت بھی اسی چھولداری میں رکھ دیا گیا۔

ابھی چھولداریاں پوری طرح لگی نہیں تھیں، سلطانہ کا بچہ بالو مسلسل رو رہا تھا۔ وہ اسے دودھ پلانا چاہ رہی تھی۔ شاید اتنے مردوں کے سامنے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ چند جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئی مگر اس کا یوں جھاڑیوں کی طرف جانا موہن کمار وغیرہ کو پسند نہیں آیا۔ متوفی ہارون کا بھائی صادق بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور زور سے بولا۔

"ادھر کہاں جا رہی ہو؟"

"بچے کو دودھ پلانا ہے۔"

"تو ہم تیری 'دودھ پلائی' کی وڈیو فلم بنا لیویں گے؟ حرام زادی نخرے باز۔ چل واپس آ ادھر۔"

"دیکھو تم فضول میں گالی نکال رہے ہو۔ میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔"

وہ ایک دم شعلہ جوالا بن گیا۔ "کتیا... بدمعاش عورت... ابھی تو نے کچھ کہا ہی نہیں۔ میرے بھائی کی جان لے لی۔ اسے قتل کر دیا اور کچھ کہا ہی نہیں تو نے۔ میں تو بے مار ڈالوں گا۔ مار کے یہیں گاڑ دوں گا۔"

وہ دیوانہ وار سلطانہ پر جھپٹا۔ اس نے رائفل کا کندہ اس کے سینے پر مارا۔ وہ بالو سمیت اچھل کر کئی فٹ پیچھے گری۔ وہ اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔ وہ لوٹ پوٹ ہونے لگی مگر اپنے بچے کو اس نے اس طرح بانہوں میں چھپایا کہ اپنے جسم کو ڈھال بنا لیا۔

میں نے بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا مگر ایک رائفل بردار میرے سر پر کھڑا تھا۔ "خبردار! اپنی جگہ پر بیٹھا رہ... ورنہ بھیجا اڑ جاوے گا۔" وہ پھنکارا۔

اسی دوران میں حافظ خدا بخش آگے بڑھا اور اس نے بپھرے ہوئے صادق لاکھی سے سلطانہ کی جان چھڑائی۔ وہ مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون رسنے لگا تھا۔ دو تین دن پہلے کھوہ کے اندر مقتول ہارون سے ہونے والی لڑائی میں سلطانہ کی قمیص پھٹ گئی تھی اور اس نے کندھے پر گرہ لگا رکھی تھی۔ موجودہ مار پیٹ میں یہ قمیص پھر پھٹ گئی۔

سلطانہ بمشکل اپنی برہنگی چھپانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ انگارہ تھا۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی نظر آتی تھی مگر یہ شیرنی فی الوقت مسلح افراد کے گھیرے میں تھی اور دھاڑنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے صادق کو بے نقط سنائیں۔ اسے شرابی، بدمعاش قرار دیا اور کہا کہ اسے کسی پتھر نے جنم دیا ہے۔ اگر اسے جنم دینے والی گوشت پوست کی ماں ہوتی تو آج وہ ایسی کمینگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔

صادق جواب میں گرجا۔ ''کتیا! میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا ہوں۔ ورنہ ابھی تجھے چیر کر چیل کوؤں کے لیے پھینک دیتا۔''

چھولداریاں لگ چکی تھیں۔ موہن کمار اور مسلح افراد نے سلطانہ کو دھکیل دھکال کر ایک چھولداری میں داخل کر دیا۔ بالو رو رو کر آسمان سر پر اٹھا رہا تھا۔ چھولداری کے اندر سے بھی ایک دو منٹ تک اس کی پکار سنائی دیتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں اور اس کی آہ و بکا کے درمیان اس کی ماں کا جسم حائل ہونے لگا۔ اس کی روتی بلکتی آواز مدھم پڑنے لگی اور پھر معدوم ہوگئی۔

اندھیرا ہوا تو مجھے اور ہاشو کو بھی سلطانہ والے خیمے میں پہنچا دیا گیا اور خیمے کے گرد چار افراد کا کڑا پہرا لگا دیا گیا۔ یہ ایک خالص جنگلی علاقہ تھا۔ جانوروں کا خطرہ بھی ہوسکتا تھا۔ موہن کمار اور اس کے ساتھیوں نے چھولداریوں کے گرد چار پانچ چھوٹے الاؤ روشن کیے۔ یہ ایک طرح سے اس پڑاؤ کا حفاظتی دائرہ تھا۔

چھولداریوں کے اندر موم بتیوں کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں سلطانہ کے چہرے پر دو گہرے نیل نظر آرہے تھے۔ اس کے جسم پر بھی یقیناً ایسے ہی نیل ہوں گے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بری طرح پھنس چکی ہے۔ زرگاں پہنچنے کے بعد وہ بدترین حالات کا شکار ہوسکتی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی یا عورت ہوتی تو اس کی حالت پتلی ہوجاتی تھی۔ مگر وہ اب بھی حوصلے میں تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا لیکن یہ طیش آمیز خوف تھا۔

اسے خود چوٹیں لگی ہوئی تھیں لیکن اسے خود سے زیادہ میرے سر کی چوٹ کی فکر تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی اوڑھنی سے ایک طویل پٹی پھاڑی۔ پانی سے میرے سر کے زخم کو دھویا اور روئی رکھ کر تازہ پٹی باندھ دی۔

ہم گا ہے بہ گا ہے، چھولداری کے چھوٹے چھوٹے روشن دانوں سے باہر جھانک لیتے تھے۔ درختوں پر مشعلیں روشن تھیں اور پہرے دار گشت لگا رہے تھے۔ مشعلوں کا روغن جلنے کی بُو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہماری چھولداری میں بھی آجاتی تھی۔ وہ لوگ گوشت بھون رہے تھے۔ راستے میں تین بڑے جل مرغ اور چند خرگوش شکار کیے گئے تھے۔ یقیناً یہی شکار پکایا جارہا تھا۔ ایک چھوٹی نسل کا ہرن زندہ پکڑا گیا تھا۔ وہ بھی ایک الاؤ کے قریب بندھا ہوا تھا۔ غالباً اسے کل کسی وقت استعمال کیا جانا تھا۔ یعنی ہماری طرح وہ ہرن بھی بتدریج راحت سے دور اور اذیت سے قریب ہورہا تھا۔ اب یہ اذیت کیسی ہوگی، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ فی الوقت تو ایسا لگتا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی سلطانہ کے ساتھ برابر کا شریک جرم سمجھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہارون کے بھائی صادق نے سلطانہ سے کہا تھا کہ میں تیری موت کو آسان بنانا نہیں چاہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے آسانی سے مارا نہیں جائے گا۔ شاید اسے جارج گورا نامی شخص کے حوالے کردیا جائے یا پھر اسٹیٹ کی جیل میں ڈال دیا جائے۔

ہمیں کھانا دیا گیا لیکن ہم تینوں نے کُل ملا کر دس بارہ نوالے ہی لیے ہوں گے۔ سلطانہ نے خود پر جبر کرکے تھوڑا سا زیادہ کھایا۔ اس کے ساتھ اس کے شیرخوار کی خوراک بھی وابستہ تھی۔ چاند درختوں کی اوٹ سے جھلک دکھا رہا تھا۔ گونگا ہاشو کچھ دیر تک گم صم لیٹا رہا پھر سوگیا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مدھم ہوا چھولداری کی دیواروں کو ہولے ہولے ہلاتی تھی اور پاس ہی کہیں چکور کی آواز سنائی دیتی تھی۔ سلطانہ نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا اور ہولے سے بولی۔ ''تم پریشان ناہیں ہونا مہروج! ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کسی کا حق ناہیں مارا۔ اللہ ہمارے ساتھ ضرور نرمی والا معاملہ کریں گا۔ تم دیکھنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئیں گا... اور... اگر اللہ کی مرضی نہ ہوئی اور راستہ نہ بھی نکلا تو تم دل چھوٹا نہ کرنا۔ ہم صبر سے اچھے وخت کا انتجار کریں گے۔''

میں خاموش رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ شمع کی روشنی میں سلطانہ کی جلد شفاف اور چمکیلی نظر آتی تھی۔ اس کے بالوں کی طویل لٹیں اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ وہ ایک سخت ماحول میں پروان چڑھی تھی۔ اگر یہی لڑکی کسی بڑے شہر میں ہوتی اور اسے زندگی کی آسائشیں حاصل ہوتیں تو وہ ''اچھی صورت'' کی قرار دی جاسکتی تھی۔ اب بھی دھیان سے دیکھنے پر اس میں ایک خاص طرح کی کشش محسوس کی جاسکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور حیران ہورہا تھا کہ میں ''بے خبری کے دور میں'' اس لڑکی کے

قریب رہا ہوں اور اس کی گود میں میرا بچہ ہے۔ کسی وقت میں سلطانہ کی طرف عجیب طرح کا کھنچاؤ محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ وابستگی اسی قربت کا نتیجہ تھی جس کے بارے میں لوگ مجھے بتا رہے تھے اور خود سلطانہ بتا رہی تھی؟

سلطانہ نے ہولے سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی ہیں مہروج۔ اور ماں جی نے بھی۔ مجھے یقین ہے تمہیں کچھ ناہیں ہوئیں گا۔ تم جندہ رہو گے اور خوش رہو گے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''مہروج! اگر مجھے کچھ ہوگیا تو مجھے بھول تو نہ جاؤ گے... مجھے یاد رکھو گے نا؟''

''ایسی باتیں مت کرو۔ تم خود ہی تو کہتی ہو کہ قدرت ہمارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکال دے گی۔''

''ہاں، امید پر دنیا قائم ہے... لیکن... یہ گورا صاحب بہت کمینہ بندہ ہے۔ پتا ناہیں کیوں اکثر میرا دل کہتا ہے کہ یہ میرے ہاتھوں مرے گا یا میں اس کے ہاتھوں مروں گی۔''

میں نے پوچھنا چاہا کہ گورا صاحب کی عمر کیا ہوگی مگر پھر ایک دم خاموش ہوگیا۔

اب تک صرف ڈاکٹر چوہان کو معلوم تھا کہ میری یادداشت کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ اس نے میری تکلیف کو AMNESIA کا نام دیا تھا اور اسے یقین تھا کہ میری یادداشت، لاہور میں حادثے کا شکار ہونے کے بعد قریباً دو سال بعد واپس آئی ہے۔ مگر اب میں درمیانی دو سال کے واقعات یاد کرنے میں ناکام ہورہا ہوں۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ شاید عام شخص اس پر یقین نہ کرتا اور ممکن تھا کہ سلطانہ بھی نہ کرتی۔

سلطانہ نے ٹانگیں سمیٹ کر اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ لی تھی اور مبہوت سی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے گڑبڑا کر کہا۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

''ایک بات پوچھوں... سچ بتاؤ گے؟''

''پوچھو۔''

''سوال تو وہی پرانا ہے لیکن موقع نیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''ہوسکتا ہے کہ ہم بچھڑ جائیں۔ پتا ناہیں کتنی دیر بچھڑے رہیں۔ اور کیا پتا مہروج! پھر ملیں بھی یا ناہیں۔ اس لیے ہوسکتا ہے کہ آج تم اس سوال کا صحیح جواب دے دو۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''کوئی ہے نا؟''

''کون؟''

''وہی... جسے میں جانتی ناہیں۔ جو یہاں سے بہت دور ہے۔ جس کو تم یاد کرتے ہو... جس کی طرف کھنچتے ہو۔ بولو، ہے نا؟''

''پتا نہیں تم کس کی بات کررہی ہو؟''

''وہی مہروج وہی۔'' وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''میرے بہت خریب ہوتے ہوئے بھی تم جس کے پاس رہتے ہو۔ جس تک پہنچنے کے لیے... تمہارے... پرچھی کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ تم بار بار اڑتے ہو اور اس راجواڑے کی حدوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہو۔ پکڑے جاتے ہو... پھر بھاگتے ہو... بتاؤ کوئی ہے نا؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ ناک سرخ تھی۔ وہ عجیب جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو... لیکن... اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو پھر تم کیا کرسکتی ہو؟''

''ہاں، میں کیا کرسکتی ہوں۔ میں تو خود خیدی (قیدی) ہوں۔ لیکن مہروج! تم ایک بار مان تو لو کہ ہاں کوئی ہے۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

''ہوسکتا ہے کوئی ہو۔ ہوسکتا ہے نہ ہو۔ مجھے ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔''

وہ بدستور میری طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''تمہیں یاد ہے جب تم پہلی بار بھاگے تھے، تم راجواڑے کی آخری حد تک جا پہنچے تھے۔ تمہیں ڈیوڈ وغیرہ نے پکڑا تھا۔ وہ تمہیں واپس زرگاں لائے تھے۔ تم نے کہا تھا... مجھے چھوڑ دو۔ بڑی سخت آندھی ہے۔ وہ آندھی میں اڑ جائے گی۔ وہ گم ہوجائے گی۔ ڈاکٹر چوہان اور ریحان تم سے بار بار پوچھتے رہے تھے، کون آندھی میں اڑ جائے گی... کون گم ہوجائے گی۔ تم کوئی جواب ناہیں دے سکے تھے۔ بس اپنا نا تھا مسلتے رہے تھے۔ تب ایک بار پھر بے تاب ہوکر اٹھ گئے تھے اور بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں پکڑ کر گھوڑا کے چھوٹے کمرے میں بند کردیا گیا تھا۔''

سلطانہ نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تمہیں دو سال کی مدت میں کبھی بھی یاد ناہیں آیا کہ وہ کون تھی؟ تمہارا اس کے ساتھ کیا سمبندھ تھا۔ وہ کیسے بچھڑی تھی تم سے؟''

میں سلطانہ کو اس بات کا بڑا واضح جواب دے سکتا تھا۔ دو سال قبل کی ہر بات اب میرے حافظے میں روشن تھی۔

www.pkdigest.com

اس روشنی میں روشن ترین چہرہ ثروت کا تھا۔ وہ جو میری رگِ جاں سے بھی قریب تھی۔ وہ جو میری دلہن بنتے بنتے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ ایک خبیث باپ کے خبیث بیٹے کی شیطانیت نے ایک بنتے بستے گھر کو اجاڑا تھا اور ملاپ کے انتظار میں ایک ایک گھڑی گننے والے دو بے تاب دل قرنوں کے فاصلے پر چلے گئے تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں اس لڑکی کو جو میری بیوی ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے، بتا دوں کہ میں کسی کی لازوال محبت کا اسیر ہوں۔ اسے بتا دوں کہ وہ کون ہے جو لڑکپن سے میری سانسوں میں چلتی ہے، میرے لہو میں دوڑتی ہے اور میرے دل میں دھڑکتی ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ بتانے سے کوئی فائدہ تھا؟ شاید نہیں۔

اسی دوران میں اچانک چھولداری کے دروازے پر کھڑے ہو کر کوئی زور سے بولا۔ ”پردہ ہٹاؤ۔“

میں نے لرزاں ہاتھوں سے ڈوری کھول کر پردہ ہٹایا۔ ایک کرخت چہرے والے شخص نے اندر جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ تھا۔ پتا نہیں، اس نے کہاں سے حاصل کیا تھا یا شاید وہ کسی چھاگل وغیرہ میں اس کے پاس ہی تھا۔ ”یہ تمہارے بچے کے لیے۔ اور موہن جی کا حکم ہے، جرا جلدی سو جاؤ۔ سویرے جلدی نکلنا ہووے گا۔ اور فالتو خرچہ مت کرو۔ یہ موم بتیاں بجھا دو۔“

سلطانہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم نے موم بتیاں بجھا دیں اور ایک دوسرے کے قریب لیٹ گئے۔ ہمارے رخ ایک دوسرے کی طرف تھے اور درمیان میں بمشکل چند انچ کا فاصلہ ہوگا۔ بچہ ایک طرف سو رہا تھا۔ سلطانہ کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ اس میں جنگلی پھولوں کی سی باس تھی۔ ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے کہا۔

”سلطانہ! کیا ہم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے؟“

”بھاگنے کے لیے کل کا دن بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ مگر بھاگ کر بچ نکلنے کا امکان اتنا ہی ہے جتنا سوئی کے ناکے میں سے ہاتھی کے گزرنے کا۔“ وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ کل بھاگنے کا اچھا موقع ہوگا؟“

”ہم اس وقت اسٹیٹ کے بائیں کنارے کی طرف ہیں۔ کل جہاں ہمارا پڑاؤ ہوئیں گا، وہ جگہ کنارے کے اور بھی قریب ہے۔ مشکل سے سات آٹھ میل کا فاصلہ ہوئیں گا۔ ایک بار کوئی اسٹیٹ کی حد سے نکل جائے تو پھر اس کے لیے چھپنا آسان ہو سکتا ہے۔ وہاں جنگل میں کئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں جن کو ”آدیاں“ کہتے ہیں... لیکن مسئلہ تو یہی ہے کہ ہم اسٹیٹ کی حد سے ناہیں نکل سکتے اور تم تو بالکل ناہیں نکل سکتے۔“

میں چونک گیا۔ یہ بات اس سے پہلے چوہان نے بھی کہی تھی کہ میں اسٹیٹ کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ میں نے سلطانہ سے پوچھا کہ وہ میرے بارے میں ایسا کیوں کہہ رہی ہے؟

وہ بولی۔ ”اتنی بار ناکام ہو کر بھی اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات ناہیں آئی تو پھر کب آئے گی؟ اب تم کو بھی یہ بات مان لینی چاہیے کہ تم بے بس ہو۔ تم کو کیل دیا گیا ہے۔“

”کیل دیا گیا ہے؟ اس کا کیا مطلب؟“

”تم پر جادو ہے مہروج۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے بولی۔ ”تم اس کے اثر سے باہر ناہیں نکل سکتے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”یہاں یہ ہوتا ہے مہروج! جن لوگاں کے بارے میں یہاں خطرہ ہوتا ہے کہ وہ راجواڑے سے بھاگ جائیں گے، انہیں یہاں کیل دیا جاتا ہے۔ پھر چاہے وہ آجاد بھی پھر رہے ہوں، وہ راجواڑے سے باہر ناہیں جا سکتے۔ وہ پکڑے جاتے ہیں اور ایسا کوئی ایک بار ناہیں ہوا، بے شمار مرتبہ ہوا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دو چار بندے اور پکڑ کر یہاں لائے گئے تھے۔ ان میں سے دو کی موت بھی ایسے اچ ہوئی تھی۔ وہ پچھے کی طرف بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ان کی دوسری کوشش تھی۔ جب وہ پکڑے جانے لگے تو ایک کھوہ میں گھس گئے۔ یہاں تیندوے کا ایک جوڑا تھا۔ یہ تیندوے ان دونوں پر پل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تکا بوٹی کر ڈالی۔“

میرے ساتھ پکڑے جانے والے لوگ اور کون ہو سکتے تھے؟ میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس سے پہلے میں چوہان کی زبان سے میڈم صفورا کا نام سن چکا تھا۔ اس نام نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تو کیا صفورا کے علاوہ کوئی اور بھی میرے ساتھ پکڑ کر یہاں لایا گیا تھا؟ کہیں وہ سیٹھ سراج یا عارف خان وغیرہ تو نہیں تھے یا پھر میرے اور عمران کے دوستوں میں سے کوئی؟ مثلاً اقبال یا جیلانی وغیرہ۔ سوال بے شمار تھے اور جواب نہیں مل رہے تھے۔ اگر کوئی جواب ملتا بھی تھا تو اس کی جگہ دس سوال اور پیدا ہو جاتے تھے۔

میں نے سلطانہ سے پوچھا۔ ”یہ ”کچا“ کیا ہے؟ اس سے پہلے بھی میں دو تین دفعہ یہ لفظ سن چکا ہوں۔ کیا یہ کوئی خاص علاقہ ہے؟“

”تم بھول رہے ہو مہروج! میں تمہیں ایک بار پہلے بھی تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ ہمارا یہ راجواڑا تین طرف سے تو ایک بڑی ندی نے گھیر رکھا ہے۔ خشکی کی طرف سے باہر جانے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ اسے ہم کچا کہتے ہیں۔ اس رستے پر کئی جگہ چھوٹی چھوٹی چوکیاں بنی ہوئی ہیں جہاں پہرے دار موجود ہوتے ہیں۔ کوئی اسٹیٹ سے باہر جا سکتا ہے، نہ باہر سے اسٹیٹ میں آ سکتا ہے۔ پہلے پہل کبھی کبھار پولیس یا فوج کے لوگ یہاں آتے تھے مگر ان کا یہاں کوئی جور ناہیں چلتا تھا۔ ویسے بھی یہ جنگل اتنے گھنے ہیں کہ یہاں گورنمنٹ کے لوگاں کا آنا اور اپنے کسی اپرادھی وغیرہ کو ڈھونڈنا ناممکن ہے۔ اب بہت عرصہ ہو گیا، باہر کے لوگاں اس علاقے کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں۔“

ہم سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے، پھر بھی باہر کھڑے پہرے دار خبردار ہو گئے۔ ایک پہرے دار نے چھولداری کے پاس آ کر زور سے کہا۔ ”اوئے! یہ کیا کھسر پھسر لگا رکھی ہے۔ آرام سے سوتے ہو یا پھر تمہارا کوئی اور علاج کیا جاوے۔“

ہم چپ ہو گئے۔

وہ پھر گرجا۔ ”اب تمہاری آواج ناہیں آنی چاہیے۔ صبح سویرے اٹھ کر نکلنا ہے۔“

سلطانہ غصے میں بڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر اس نے میرا بازو پکڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھا اور بڑی محبت سے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ اس کے پاؤں میرے پاؤں سے چھو رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں پازیب نہیں تھی۔ حالانکہ یہاں کی تمام عورتوں کے پاؤں میں، میں نے پازیبیں وغیرہ دیکھی تھیں۔ اور بات صرف پازیب ہی کی نہیں تھی، یہاں کی معمولی سے معمولی عورت کے جسم پر بھی مختلف طرح کے زیورات نظر آتے تھے۔ سلطانہ شاید واحد عورت تھی جس کے جسم پر کسی طرح کی کوئی آرائش نہیں تھی۔ شاید وہ یہ سب پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ لیٹی ہوئی تھی اور اس کی قربت میں ایک عجیب سی یاسیت تھی۔ دور کہیں جنگل میں گیدڑ چلا رہے تھے۔ جلد ہی میں سو گیا۔

اگلے روز سفر پھر شروع ہوا۔ صادق لاکھی مسلسل سلطانہ کو گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ شاید وہ اسے کچا چبا جاتا۔ کل والے واقعے کو مدنظر رکھتے ہوئے قافلہ سالار موہن کمار نے صادق کو سلطانہ سے دور ہٹا دیا تھا۔ اب صادق کا چتکبرا گھوڑا سب سے پیچھے تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے ساتھ ساتھ چلتے ہم نے سارا دن سفر کیا۔ میں نے سرگوشی میں سلطانہ سے پوچھا کہ کیا یہی وہ ندی ہے جس کا اس نے رات کو ذکر کیا تھا؟ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ تو بہت بڑی ہے۔ تیج بہاؤ ہے اس کا۔ تم دیکھو گے تو حیران اچ رہ جاؤ گے۔“ اس نے سرگوشی کی۔

رات کو ہمارا پڑاؤ ایک بار پھر گھنے درختوں میں ہوا۔ ہاشو یکسر خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر جیسے موت کی زردی نے مستقل ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ سلطانہ نے ہاشو کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ان کا پرانا گھریلو ملازم ہے۔ پہلے یہ ٹھیک تھا لیکن پھر بیمار ہوا اور ایک روز اچانک اس کی زبان بند ہو گئی۔ وید نے بتایا ہے کہ اس کے سر کی کوئی نس پھٹ گئی ہے جس کی وجہ سے یہ بولنے سننے سے معذور ہو گیا ہے۔ شروع میں سلطانہ کے والد مختار صاحب کی مالی حالت اچھی تھی مگر جب حالت پتلی ہو گئی تو ہاشو نے کسی اور مسلم گھرانے کی ملازمت کر لی۔ بہرحال، سلطانہ اور اس کے گھرانے کے ساتھ اس کی اٹوٹ وفاداری اب بھی برقرار تھی۔ اب یہ شخص سلطانہ ہی کی وجہ سے ایک بدترین مشکل کا شکار ہو گیا تھا۔

رات کو ہاشو پھر جلدی سو گیا۔ میں اور سلطانہ بالکل قریب قریب لیٹے سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ندی پار سے جنگلی جانوروں کی آوازیں آتی رہیں۔ سلطانہ نے آج بچے کو اپنے اور میرے درمیان لٹایا تھا۔ وہ بار بار میرا ہاتھ بچے کے سینے پر رکھتی تھی... جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے کہہ رہی ہو کہ تم اس بچے کے باپ ہو۔ اگر میں نہ ہوں گی تو تمہیں اس کا دھیان رکھنا ہوگا، اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔

ہماری گفتگو کا رخ ایک بار پھر ندی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کی طرف ہو گیا۔ سلطانہ نے بتایا کہ یہاں سے بائیں رخ پر بس سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کر لیا جائے تو راجواڑے کی حدود سے نکلا جا سکتا ہے۔ میں نے اس سے دو چار باتیں اور بھی پوچھیں۔

میرے دل کی گہرائی میں کہیں یہ خیال ابھر رہا تھا کہ میں یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش کروں... شاید سلطانہ ٹھیک ہی کہتی ہو کہ میں نے پہلے بھی یہاں سے نکلنے کی دو چار کوششیں کی ہوں لیکن مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ اب میں اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا... میرے سینے میں ایک آگ تھی اور یہ آگ میری کمزوریوں کو دبا کر مجھے توانا اور قدرے دلیر بنا رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ کیا میں کبھی ثروت کو دوبارہ دیکھ سکوں گا؟ کیا

www.pkdigest.com

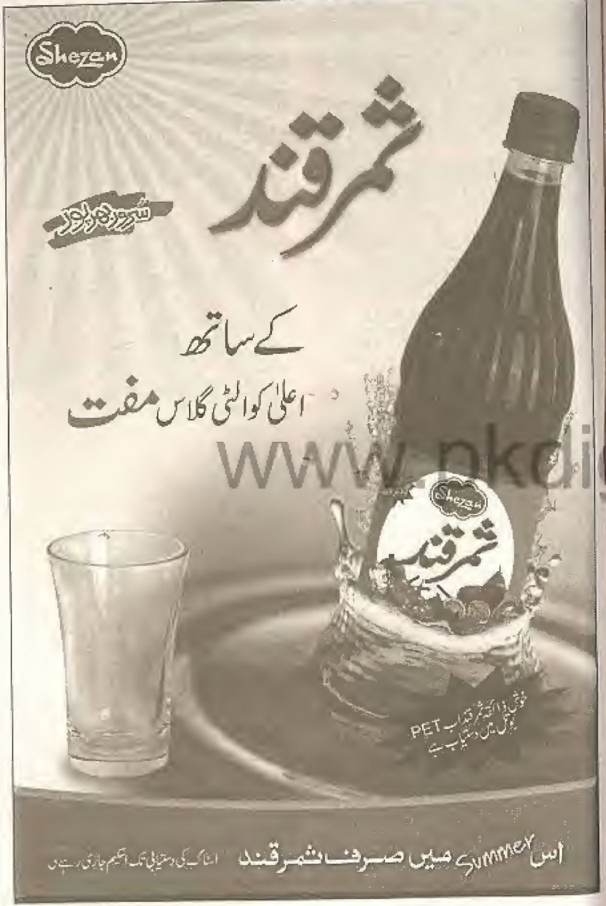

میں کبھی سیٹھ سراج کی منحوس گردن پکڑ سکوں گا؟ بس یہ دو سوال تھے جو پچھلے چار پانچ دن میں سیکڑوں بار میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ اگر مجھے ان دو سوالوں کے جواب مل جائیں اور میں یہ دونوں کام کر سکوں تو پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی دکھ نہ ہوگا۔ بس دو جواب... بس دو خواہشیں۔ ثروت سے ملنا اور اپنی ماں کے قاتل سراج کو گردن سے پکڑنا۔

رات کسی وقت اچانک میری آنکھ کھلی۔ چھولداری کی دیواریں بے طرح ہل رہی تھیں۔ میں نے چھولداری کے روزن میں سے دیکھا۔ چاندنی غائب ہو چکی تھی اور جنگل گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ نہایت تیز ہوا میں درخت دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ سلطانہ دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتی تھی۔ ننھا بالو اس کے پہلو میں تھا۔ ہاشو ہمارے پاؤں کی طرف سویا ہوا تھا۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے بارش شروع ہو گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چھولداری کے گرد موجود پہرے دار پناہ کے لیے کسی پاس کی چھولداری میں چلے گئے ہیں۔ درختوں پر لگی مشعلیں بھی بجھ چکی تھیں، صرف ایک روشن تھی اور وہ بھی بے طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ بھی بجھ گئی۔

اچانک میرے دل میں یہاں سے بھاگنے کی دبی دبی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ جاگ گئی۔ میں نے فقط چند سیکنڈ کے لیے سوچا پھر قسمت آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے تاریکی میں بیٹھے بیٹھے چھولداری کی اندرونی ڈوری کھولی۔ بیرونی پردہ واٹر پروف تھا۔ اس کی ڈوری کو بھی گرہ لگی ہوئی تھی۔ یہ دوسری ڈوری کھولنے کے بعد میں باہر نکلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ میرے کرتے کا دامن کسی شے سے اٹکا ہوا ہے۔ میں نے ہاتھوں سے آنکھوں کا کام لیا اور ٹٹول کر دیکھا۔ مجھے پتا چلا کہ سلطانہ نے میرے کرتے کا دامن اپنی اوڑھنی سے باندھ رکھا ہے۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ اندیشہ موجود تھا کہ میں اپنی ذہنی کیفیت کے زیر اثر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ اس کا اندیشہ درست تھا۔ میں نے بڑی آہستگی سے گرہ کھولی اور اس کی اوڑھنی کو اپنے کرتے سے جدا کیا، تب ہولے ہولے سرکتا دروازے سے باہر آ گیا۔ مجھے لگا کہ قدرت میری مدد پر آمادہ ہے۔ تیز بارش شروع ہو گئی تھی اور چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ مجھے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں جھک کر چلتا تیزی سے خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھا اور آگے نکل آیا... میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہاں سے نکلنا میرے لیے اتنا آسان ثابت ہوگا۔ میں نکل آیا تھا مگر اب بھی اس صورت حال پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ میرے پاؤں میں مقامی طرز کے سینڈل تھے۔ جسم پر وہی پاجامہ کرتہ تھا جو پچھلے چار پانچ روز سے میرے ساتھ دربدر ہو رہا تھا۔ واسکٹ کا حال دیگر لباس سے ابتر تھا۔

یہ جنگل کی بارش تھی۔ ہر طرف ایک شور برپا تھا۔ دیوہیکل درخت جھوم رہے تھے۔ پانی سے پتوں کے ٹکرانے کی آواز ایک مہیب گونج کی طرح تھی۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ حفاظت کی غرض سے سامنے کی طرف پھیلا رکھے تھے اور حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں کئی جگہ گرا اور سنبھلا۔ مجھے چوٹیں اور خراشیں آئیں لیکن میں بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کل رات جنگل میں پکارتا ہوا چکور یاد آیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے خود میں اور اس چکور میں مشابہت محسوس ہوئی۔ وہ بھی تو کہیں پہنچنا چاہتا تھا، ان گنت زمانوں سے سفر کر رہا تھا۔ اس کے پر پھڑپھڑاتے تھے اور اس کا بے قرار دل اسے محو پرواز رکھتا تھا۔ مجھے بھی کہیں پہنچنا تھا۔ کسی کے پاس جانا تھا۔ کچھ آنکھیں تھیں جن کا انتظار مجھے ختم کرتا تھا۔ وہ میرے پیاروں کی آنکھیں تھیں۔ وہ، پتا نہیں کب سے میری راہوں میں بچھی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں نے مجھے کہاں کہاں ڈھونڈا تھا۔ میرے لیے کس کس طرح روئی تھیں... اور یہ کوئی دو چار دن کا واقعہ نہیں تھا، نہ ہی دو چار ہفتوں یا مہینوں کا۔ اسے دو سال گزر چکے تھے۔ پتا نہیں کہ پلوں کے نیچے سے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ خبر نہیں کہ اس بے کراں جنگل سے باہر کیا کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ میں بھاگ رہا تھا۔ میرے دل میں بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں جلد سے جلد ان تاریک درختوں کی حد سے گزر جاؤں۔ کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں مجھے جانے پہچانے منظر نظر آئیں۔ سڑکیں، گاڑیاں، لوگ، بازار...

بھاگتے ہوئے میں عقب سے آنے والی آوازوں پر بھی دھیان رکھے ہوئے تھا۔ عقب میں کوئی آواز نہیں تھی، کوئی روشنی نہیں تھی۔ بس شور مچاتے پانی کی نادیدہ چادر تھی جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی تھی اور جنگل دہاڑ رہا تھا۔ تاریک پانیوں میں میرے پاؤں چھپا چھپ چلتے تھے اور بھیگی ہوئی بیلیں میرے جسم سے الجھتی تھیں۔ میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی روشنی دینے والی

www.pkdigest.com

چیز۔ سلطانہ کی صرف اتنی بات مجھے یاد تھی کہ ندی سے بائیں طرف سفر کیا جائے تو سات آٹھ میل کی دوری پر "کچا" ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسٹیٹ کی حد بھی۔ لیکن کیا اس سے آگے بھی ویرانی ہوگی یا کوئی ایسی آبادی نظر آئے گی جہاں مجھے کوئی مددگار مل سکے؟ مجھے لگ رہا تھا کہ آج کی رات شاید میرے فرار کے لیے ہی اس قطعۂ زمین پر اتری ہے۔ کسی حصار سے نکلنے کے لیے اس سے بہتر تاریکی اور کون سی ہو سکتی تھی۔ مجھے بس اپنا رخ درست رکھنا تھا اور رخ درست رکھنے کے لیے میں صرف اپنے وجدان پر بھروسا کر رہا تھا۔

میرا وجدان کہہ رہا تھا کہ تم ٹھیک رخ پر جا رہے ہو۔ بارش کی بوچھاڑیں اور ہوا اب بھی تمہارے عقب میں ہے اور اس کا عین عقب میں ہونا ہی تمہارے رخ کو درست قرار دے رہا ہے۔ ایک جگہ میں گرا تو میرے ہاتھ میں ایک لٹھ نما لکڑی آگئی۔ میں نے یہ لکڑی اٹھالی۔ ہاتھ میں کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ تیز بارش میں جنگلی جانوروں سے آمنا سامنا ہوتا ہے یا نہیں۔ ہاں، یہ احساس ضرور تھا کہ میں عام رات کی نسبت اس طوفانی رات میں زیادہ محفوظ ہوں۔

میں بے دم ہو جاتا تو تھوڑی دیر کے لیے رک جاتا۔ سانس ذرا بحال ہوتی تو پھر دوڑتا یا تیز تیز چلنا شروع کر دیتا۔ جنگل گنجان تھا اور دوڑنے کا موقع بس کہیں کہیں دو چار سیکنڈ کے لیے ملتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری قمیص پھٹ چکی ہے۔ میرا چہرہ شاخوں کے لگنے سے لہولہان ہو چکا ہے اور پاؤں اور پنڈلیوں میں بہت سے کانٹے چبھے ہوئے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں، اذیت کا احساس کہیں نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں اب اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ تاریکی، گھنا جنگل، طوفانی بارش۔ یہاں کون کسی کو ڈھونڈ سکتا تھا... کون میرے پیچھے آسکتا تھا؟ میں تاریکی کے سمندر میں ایک تاریک نکتے کی طرح تھا۔ ناقابلِ شناخت، ناقابلِ گرفت۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے اچانک اپنے سامنے ایک شخص کو دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی ہے اور آسمان لاکھوں ٹن پانی سمیت ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ یہی وقت تھا جب زور سے بجلی چمکی۔ چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح نمایاں ہوئے۔ میری رگوں میں خون منجمد ہو گیا۔ بے شک وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک... پھر تاریکی چھا گئی۔ بادل زور سے گرجے۔ وہ دوبارہ ہیولا بن گیا۔ پھر اس کے دائیں بائیں سے دو اور ہیولے نمودار ہوئے۔ ٹارچیں روشن ہوئیں۔ ان کی دودھیا روشنی پانی کی چادر کو چیرتی ہوئی میرے چہرے پر پڑی۔ تب رائفل کاک ہونے کی آواز آئی۔ ایک پھنکارتی ہوئی آواز میرے بائیں جانب سے ابھری۔ "ہاتھ اوپر اٹھاؤ... اور زمین پر بیٹھ جاؤ۔"

میری ٹانگوں سے دم تو پہلے ہی نکل چکا تھا۔ میں جھکا اور دوزانو بیٹھ گیا۔ بارش کا پانی میری ٹانگوں کے اوپر سے چل رہا تھا۔

"اس کی تلاشی لو۔ پاکٹ چیک کرو۔" ایک اور آواز ابھری۔ یوں لگا جیسے کوئی انگریز گلابی اردو بول رہا ہے۔

ایک کرخت ہاتھ نے میرے بال مٹھی میں جکڑے اور میری واسکٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ ان میں پانی اور مٹی کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

"اس کے ہاتھ پیچھے باندھو۔" گلابی اردو والے نے پھر کہا۔

میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ سلطانہ نے کہا تھا یہ "سحر کاری" ہے۔ مجھے جادو کے زور سے پابند کیا گیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے... صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا تاریکی کے اس سمندر میں مجھے یوں اچانک ڈھونڈ لیا جانا کسی سحر کاری کا نتیجہ ہے؟ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ میں کسی ایسے خیال کو قبول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ میرے بس میں ہی نہیں تھا۔

جب ایک شخص نے مجھے اوندھا گرا کر میرے ہاتھ پشت پر موڑنے چاہے تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی اور مجھے اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ پتا نہیں کہ میری کمزوری اتنی شدید سختی اور حدت میں کیسے بدل گئی؟ میں نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور ایک بار پھر اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ میں اسے جرأت نہیں کہوں گا، اسے میری غفلت کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ کم از کم دو رائفلیں میری طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ کوئی گولی میرے جسم میں سوراخ کر سکتی ہے۔ میں نے بمشکل دو تین قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک گرانڈیل شخص نے مجھے چھاپ لیا۔ میں اس کے نیچے اوندھے منہ گرا اور خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش کرنے لگا۔ میں مچھلی کی طرح پھسل کر اس کی گرفت سے نکلا لیکن اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسرے شخص نے

زیادہ سختی سے دبوچ لیا۔ میں آتشیں لہجے میں چلّانے لگا۔ "چھوڑ دو... مجھے چھوڑ دو کتو... مجھے جانے دو... مجھے میرے گھر والوں کے پاس جانے دو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے مار دو ظالمو... یا مجھے جانے دو۔"

میں جسم و جاں کی پوری قوت سے تڑپ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی سعی کر رہا تھا۔ ان لمحوں میں... ہاں، ان لمحوں میں مجھے لگا کہ شاید سلطانہ اور چوہان وغیرہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ میں اس سے پہلے بھی اسی طرح یہاں سے نکلنے کی متعدد کوششیں کر چکا ہوں۔ کچھ دھندلے دھندلے سے ہیولے میرے ذہن میں بن رہے تھے۔ یہی تڑپ... یہی بے قراری... یہی پھڑپھڑا کر پنجرہ توڑ دینے کی خواہش۔ کوئی اور وقت تھا... کوئی اور لوگ تھے لیکن شاید یہی جنگل تھا... اور اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔

مجھے ایک بار پھر زمین پر گرایا گیا اور باندھ دیا گیا۔ میرے پاؤں میں ایک زنجیر ڈالی گئی تھی جس میں عجیب وضع کا تالا لگا ہوا تھا... اس تاریک گرجتے برستے اور دہاڑتے جنگل میں، میں نے پھر ایک طویل سفر کیا۔ لیکن اس مرتبہ یہ سفر گھوڑے پر تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر مجھے کسی بوری کی طرح گھوڑے کی پشت پر اوندھا لٹایا گیا تھا۔ چار گھڑ سوار میرے ارد گرد تھے۔ ان میں سے ایک کا نام تیواری لال تھا۔ اسے اس کے ساتھی تیواری بھائی یا تیواری جی کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ ایک دوسرے بندے کا نام ڈیوڈ تھا۔ یہ ایک سفید فام تھا اور گلابی اردو بولتا تھا۔ اس نے انگریزی لباس پہنا ہوا تھا اور برساتی اوڑھ رکھی تھی۔ اس کی رائفل بھی برساتی کے اندر ہی تھی۔ اس کی عمر کوئی تیس پینتیس سال ہوگی۔

مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے پکڑ کر واپس اسی پڑاؤ میں لے جایا جا رہا ہے جہاں سے میں بھاگا تھا۔ میرے دل و دماغ میں اودھم سا مچا ہوا تھا۔ تیواری لال اور ڈیوڈ کے نام میں نے پہلے بھی سنے تھے۔ چوہان نے بتایا تھا کہ پہلے بھی ایک دفعہ جب میں بھاگا تھا تو مجھے تیواری اور ڈیوڈ پکڑ کر واپس لائے تھے۔ سزا کے طور پر مجھے ایک گھوڑے کے پیچھے باندھا گیا تھا اور طویل فاصلے تک ننگے پاؤں چلایا گیا تھا۔ آج بھی میں یہی دو نام تواتر سے سن رہا تھا۔ تو کیا مجھے پکڑنے کے لیے خاص طور سے یہی دونوں افراد مامور تھے؟ ڈیوڈ کے علاوہ باقی تینوں افراد مقامی لب و لہجے میں بات کر رہے تھے۔ ان کی زیادہ تر گفتگو راستے اور موسم کے بارے میں تھی۔ میرا بھاگنا اور پھر انتہائی حیران کن انداز میں پکڑا جانا، ان کے لیے جیسے کوئی غیر معمولی بات ہی نہیں تھی۔

قریباً دو گھنٹے بعد ہم واپس پڑاؤ میں پہنچ گئے۔ بارش اب ہلکی ہو چکی تھی مگر بہت تیز ہوا چل رہی تھی۔ تاریک جنگل ہوا کے شور سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مجھے گھوڑے سے اتارا گیا۔ موہن کمار مجھے دیکھ کر مشتعل ہو گیا۔ اس نے میرے منہ پر دو تھپڑ مارے اور پھنکارا۔

"میں حکم جی سے ضرور تیری سفارش کروں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تیری دونوں ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دی جاویں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

موہن کمار کی شہ پر مشتعل صادق بھی آگے بڑھا۔ اس نے مجھ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی اور ٹھوکریں رسید کرنے لگا۔ سلطانہ فریاد کرتی ہوئی چھولداری سے نکل آئی۔ "اس کا کوئی قصور نا ہیں۔ یہ اپنے ہوش میں نا ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ تقریباً میرے اوپر گر گئی۔

موہن کمار زہریلے لہجے میں بولا۔ "بہت پریم ہے تجھے اپنے پتی سے۔ بڑی گھر گرہستن ہے تو۔ تیرے جیسی دو چار اور جنم لے لیں تو سارا سنسار سورگ بن جائے۔"

اس نے سلطانہ کو اس کے لمبے بالوں سے کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ ایک گھڑ سوار پھبتی نکال کر بولا۔ "حسن حاجر ہے محبت کا بچاپانے کو۔ کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو۔"

سلطانہ کو گھسیٹ کر چھولداری میں پہنچایا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی وہاں پھینک دیا گیا۔ میرے ہاتھ پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے موم بتی کی مدھم روشنی میں دیکھا، ہاشو سہما ہوا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں کیچڑ میں لت پت تھا، پورے جسم پر خراشیں تھیں۔ سلطانہ نے خود کو سنبھالا اور اپنی اوڑھنی سے میرے چہرے کا لہو پونچھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اسی دوران میں ایک شخص لوہے کا ایک چھوٹا سا ڈبا چھولداری میں پھینک گیا۔ اس میں مرہم پٹی کا مختصر سامان تھا۔ میرے سر کا زخم پھر تازہ ہو گیا تھا۔ سلطانہ نے بڑی احتیاط سے میری پٹی کھولی۔ دوا ملے پانی سے میرے زخم کو صاف کیا اور بڑی ہمت سے مرہم وغیرہ لگا کر پھر پٹی باندھ دی۔ تب ہاشو کے ساتھ مل کر اس نے میرے پاؤں اور پنڈلیوں سے کانٹے نکالے۔ کچھ پورے نکل آئے۔ دو چار ایسے بھی تھے جو اندر ہی ٹوٹ گئے۔ میری قمیص کی دھجیاں سلطانہ نے میرے جسم سے علیحدہ کیں۔ ان سے میرے لت پت جسم کو صاف کیا اور مجھے ایک صاف چادر میں لپیٹ دیا۔ اس نے مجھے جنگلی شہد اور ستو پانی میں گھول کر پلایا۔ میں نیم جان تھا۔ تکلیف اور دکھ کی شدت سے کراہ رہا

www.pkdigest.com

تھا۔ اس نے بڑی محبت سے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور میرے سر کے بالوں کو سہلانے لگی۔ اپنے دوسرے ہاتھ سے وہ بالو کو تھپک رہی تھی۔ شاید سردی کے سبب وہ گاہے بہ گاہے کسمسانے لگتا تھا۔

میں نے نیم وا آنکھوں سے سلطانہ کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں اس کے قندھاری رخسار زرد نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں وہی دکھ تھا جو کسی لڑکی کی آنکھوں میں اس وقت نظر آتا ہے جب وہ اپنے محبوب یا شوہر سے بہت عرصے کے لیے بچھڑ رہی ہو۔

☆☆☆

اگلے روز دوپہر سے ذرا پہلے ہی ہم زرگاں پہنچ گئے۔ چاروں طرف سے نہایت گھنے درختوں میں گھری ہوئی یہ ایک وسیع بستی تھی۔ یہ ایک ڈھلوان پر واقع تھی۔ اس کے دامن سے مٹیالے پانی والی وہی چھوٹی ندی گزر رہی تھی جو ہم نے راستے میں بھی دیکھی تھی۔ یہاں ہریالی اتنی گہری تھی کہ سیاہی مائل محسوس ہوتی تھی۔ زرگاں کا پھیلاؤ کسی طرح بھی تل پانی سے کم نہیں تھا۔ یہاں بھی بلند کلسوں اور برجیوں والی کئی ایک شان دار عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے ایک پرانی طرز کی پُرشکوہ عمارت راج بھون کہلاتی تھی اور وہ ندی کے عین کنارے پر تھی۔ زرگاں میں مجھے مندروں اور بدھ مندروں کی کثرت نظر آئی۔ مسجدیں شاید دو تین ہی تھیں۔ بارش کے بعد ہلکی دھوپ نکل آئی تھی اور زرگاں میں زندگی رواں دواں تھی۔ بھیڑ، بکریاں اور گائے بھینسیں سرسبز ڈھلوانوں پر منہ مار رہی تھیں۔ ان کے پیچھے رنگ برنگی پگڑیوں والے لڑکے تھے۔ مال برداری والے جانور اپنے راستوں پر گامزن تھے۔ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں پھل، سبزی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی دکانیں تھیں۔ گلیوں میں مرغیاں اور بطخیں دوڑتی تھیں اور سانولے بچے شور مچاتے تھے۔

زرگاں پہنچتے ہی مجھے سلطانہ اور ہاشو سے جدا کر دیا گیا۔ وقتِ رخصت سلطانہ کی بے تابی دیدنی تھی۔ وہ جیسے ساری زنجیریں توڑ کر مجھے اپنی بانہوں میں چھپا لینا چاہتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان سنگین ترین لمحوں میں بھی اسے خود سے زیادہ میری فکر ہے۔ وہ مجھے تو نہیں چوم سکتی تھی لیکن میری طرف دیکھ کر اپنے بچے کو چوم رہی تھی۔ آنسو موتیوں کی طرح اس کی شفاف آنکھوں سے گر رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں ڈال کر وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

نیم پختہ سڑک پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونجتی رہیں اور قریباً دس منٹ بعد میں زرگاں کے سب سے بڑے پگوڈا میں تھا۔ میرے ہاتھ کھول دیے گئے تھے لیکن پاؤں بدستور بندھے ہوئے تھے۔ مجھے سہارا دے کر اتارا گیا۔ یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔ یہاں سنگِ مرمر کثرت سے استعمال ہوا تھا۔ سرخ لباسوں والے بھکشو ننگے پاؤں گھومتے نظر آتے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور گلے میں مالائیں تھیں۔ احاطے کی ایک جانب مخروطی چھت والی ایک دوسری عمارت تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ مٹھ کی عمارت تھی۔ مٹھ میں بدھ مت کی تعلیم دی جاتی تھی اور نوعمر طالب علموں کو عبادات کا طریقہ بتایا جاتا تھا۔ احاطے میں موجود اکثر لوگ مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ان کے انداز ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مجھے پہلے سے جانتے ہیں۔ تاہم میں ان میں سے کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔

ایک سوجی سوجی آنکھوں والے بھکشو نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”ہم جانتے تھے کہ تم ایک نہ ایک دن واپس ضرور آؤ گے۔ تھس آمدید (خوش آمدید)۔“

ایک دوسرا شخص بولا۔ ”تم کو بچت راس آ ہی نہیں سکتی تھی۔ تم بدھا کے اپرادھی ہو۔ تم پر نحوست کی چھایا ہے۔“

مختلف طنزیہ فقروں کے درمیان چلتا میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں پہنچ گیا۔ یہاں ایک گھڑے، ایک پیالے اور مٹی کے دو برتنوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کچے فرش پر ایک چٹائی بچھی تھی اور تکیے کی جگہ ملائم لکڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی میرا بسیرا ہے۔ دو فربہ اندام افراد کوٹھڑی میں آئے۔ یہ اس عبادت گاہ کے ملازم معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے لوہے کا ایک چپٹا کڑا میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایک کھٹکے کے ذریعے یہ کڑا لاک ہو گیا۔

وہ رات میں نے اس کوٹھڑی میں تکلیف سے کراہتے ہوئے گزاری۔ اگلی صبح صفاچٹ سر اور چہرے والا ایک جواں سال بھکشو میرے پاس آیا۔ اس کا انداز قدرے دوستانہ تھا۔ اس نے رسمی کلمات ادا کیے... ”کیسے ہو مہروز! یار حوصلہ رکھو۔ جیون میں اونچ نیچ آتی رہتی ہے۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ سلطانہ کے ہاتھوں ایک بندہ مارا گیا ہے۔ ویسے اسے یہاں سے بھاگنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہاں رہ کر حالات کا سامنا کرتی۔“

میں اسے نہیں پہچان پا رہا تھا تاہم میں نے یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ وہ میری چوٹوں پر اظہارِ افسوس کرتا رہا۔ میں نے مناسب الفاظ میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔

جلد ہی مجھے اس کا نام بھی معلوم ہو گیا۔ وہ ہیمش تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہاں پگوڈا میں میرے ساتھ کافی وقت گزار چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ”تمہاری شکل سے لگتا ہے کہ تم بہت بھوکے ہو۔ ابھی کھانے میں بہت دیر ہے۔ یہ تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول ہیں، کھا لو۔“ اس نے اپنی گیروا چادر کے پلو میں سے مٹھی بھر چاول نکالے اور چھلکے سے میری طرف بڑھا دیے۔ ساتھ ساتھ وہ دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ بھکشو، دوپہر سے پہلے کچھ نہیں کھاتے اور ابھی دوپہر ہونے میں کافی دیر تھی۔ میں نے بھی نظر بچا کر تھوڑے سے چاول کھائے۔ گلا بند سا ہونے لگا۔ میں نے گھڑے میں سے پانی انڈیل کر پیا۔

ہیمش نے حیرانی سے کہا۔ ”کیا کرتے ہو؟ پیالے پر کپڑا کیوں نہیں رکھا؟“

ایک دم مجھے یاد آیا۔ چوہان نے بتایا تھا کہ بھکشو پانی کو باریک کپڑے سے چھان کر پیتے ہیں۔

”اوہو، بھول گیا۔“ میں نے بات بنائی۔

”لگتا ہے کہ تم بہت کچھ بھول رہے ہو۔ تمہاری دماغی صحت ٹھیک نہیں لگتی۔“

وہ میرے زخموں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس شخص سے میرے تعلقات کس طرح کے ہیں۔ مجھے کیا بتانا چاہیے اور کیا اس سے چھپانا چاہیے۔ میں گول مول باتیں کرتا رہا۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا ہے جو یہاں انڈیا آنے سے پہلے مجھ پر بیتا ہے تو شاید وہ یقین کر لیتا... لیکن اگر میں یہ بتاتا کہ اس نئی صورتِ حال میں پچھلے دو سال کی باتیں بھول گیا ہوں تو شاید وہ اسے ایک مذاق سمجھتا یا میرا مضحکہ اڑانا شروع کر دیتا۔ اپنی اس کیفیت پر میں خود بھی ششدر تھا۔ مجھے یقین یہی لگ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ایک بند دروازہ کھل گیا ہے اور اس دروازے کے کھلنے سے ایک دوسرا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔

اچانک ہیمش چونکا۔ وہ دروازے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ ”اوہ، وہ آ رہی ہے۔ کہیں پھر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔“ اس نے کہا۔

میں نے دیکھا۔ سامنے مٹھ کی طرف سے ایک عورت پگوڈا کے صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ وہ میلا کچیلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ پتا نہیں کہ وہ کون تھی؟ اور مجھے اس سے کیا ڈر تھا؟

ہیمش تیز سرگوشی میں بولا۔ ”میں جاتا ہوں۔ اگر وہ تم سے کوئی بدتمیزی کرے تو خود جواب نہ دینا۔ چھوٹے گرو جی کے استھان کی طرف چلے جانا۔“

اب مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چھوٹا گرو کون ہے اور اس کا استھان کیا ہے؟

میں نامعلوم حالات میں جکڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف شناسا لوگ تھے لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ ان کے مزاج، ان کے رویے اور میرے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت... سب کچھ میری نگاہوں سے اوجھل تھا۔ یہ عجیب صورتِ حال تھی۔

عورت تیزی سے چلتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک لٹھ تھی۔ وہ غالباً میری یہاں موجودگی سے آگاہ تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے میرے ساتھ کوئی مار پیٹ کر چکی تھی اور ہیمش کو اندیشہ تھا کہ آج پھر اس طرح کا واقعہ ہو گا۔ میرے قریب پہنچ کر اس کی رفتار کچھ سست ہو گئی۔ وہ مجھے بغور دیکھنے لگی۔ اس کی گردن میں مالا کی جگہ لوہے کا ایک کڑا تھا۔ یہ ویسا ہی کڑا تھا جو کل مجھے پہنایا گیا تھا۔ وہ جواں سال عورت تھی اور مقامی بھی نہیں لگتی تھی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگی۔ اچانک میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سکتہ زدہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اگر میری نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں تو وہ صفورا تھی... میڈم صفورا۔ وہی جواں سال دبنگ عورت جو لاہور ائرپورٹ کے قریب واقع لال کوٹھیوں میں مختارِ کل کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے بوائے کٹ بال اپنی مثال آپ تھے۔ وہ نہایت قیمتی پینٹ شرٹ پہنتی تھی اور اس کی چال میں ایک شاہانہ دبدبہ تھا۔ لیکن آج یہاں پگوڈا کی اس عجیب و غریب عمارت میں وہ ایک بالکل مختلف روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میں دنگ رہ گیا۔

مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں طیش کی ہلکی ہلکی سرخی ابھر آئی تھی۔ میں نے سوچا شاید ہیمش کا اندیشہ ٹھیک ہے۔ یہ مجھ پر حملہ کرنے جا رہی ہے۔ چند سیکنڈ تک صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ پھر بتدریج صفورا کی آنکھوں کی سرخی ماند پڑ گئی۔ اس کی جگہ ایک طرح کی نمی نے لے لی۔

وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”تو آخر تم واپس آ ہی گئے۔“

میں خاموش رہا۔

وہ اندر کوٹھڑی میں چلی آئی اور چٹائی پر بیٹھ کر کھردری دیوار سے ٹیک لگالی۔ میں کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا پھر میں بھی چٹائی کے ایک کنارے پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھ پر نگاہیں جمائے

www.pkdigest.com

ہوئے بولی۔ ''تمھیں دیکھتی ہوں تو سینہ جل اٹھتا ہے، خود پر بس نہیں رہتا... حالانکہ... جانتی ہوں تم... نادیہ کی موت کے براہِ راست قصوروار نہیں ہو۔ اس کا اصل مجرم تو وہی خبیث بازی گر تھا...''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں، تاہم بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ میرا اندیشہ بالآخر درست ثابت ہوا تھا کہ نادیہ جاں بر نہیں ہو سکی۔ وہ اس رات مرگئی تھی اور اس کی موت اسی گولی سے ہوئی تھی جس نے سیٹھ سراج، شیرے اور دیگر لوگوں کو شعلہ جوالا بنا کر ہمارے پیچھے لگا دیا تھا۔ اس خوفناک تعاقب کا انجام بالآخر ڈیک نالے پر ہوا تھا جہاں عمران کو راکفل کا برسٹ لگا تھا اور وہ اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ کتنی بھیانک تھی وہ رات...

... ہاں نادیہ مرگئی تھی اور اس کی بہن جو اسے بے پناہ پیار کرتی تھی... آج یہاں اس پگوڈے کی کوٹھڑی میں گیروا لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں گئے دنوں کا بے پناہ غم کروٹیں لے رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟'' میڈم صفورا نے پوچھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نگاہیں جھکالیں۔ وہ بولی۔ ''تمہارے یہاں پگوڈا سے جانے کے بعد کافی کچھ تبدیل ہوا ہے اور سچ پوچھتے ہو تو میں بھی اس ایک ڈیڑھ برس میں بہت بدل گئی ہوں۔ میرے اندر تبدیلیاں آئی ہیں۔ میں نے اپنے غم اور غصے سے نباہ کرنا سیکھ لیا ہے۔ پہروں اکیلی بیٹھی گزرے واقعات پر غور کرتی رہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ مجھ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئی ہیں۔ نادیہ کی موت کے حوالے سے میری بڑی غلطی شاید یہی تھی کہ میں نے سلیم کو نادیہ کے پاس رہنے دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نادیہ خطرناک حد تک ضدی ہے اور سلیم کی جان بھی لے سکتی ہے۔ سلیم کی موت کے بدلے میں نادیہ کو اپنی جان دینا پڑی اور نادیہ کے بدلے میں کچھ اور جانیں گئیں۔ ان میں سے مجھے تمہاری والدہ کی موت کا واقعی افسوس ہے۔ یہ سراسر سراج کا ذاتی فعل تھا۔ مجھے سراج کی طرف سے اندیشہ تھا۔ میں نے اسے خاص طور سے ہدایت کی تھی کہ تمہاری بیمار والدہ کے ساتھ کسی طرح کی سختی نہ کی جائے لیکن سراج اکثر اپنی من مانی کرتا تھا۔ کئی دفعہ وہ نادیہ کو بہکانے کا بھی سبب بنتا تھا۔ اس نے وہاں ڈیفنس کی کوٹھی میں بھی اپنی مرضی چلائی... بہرحال، اب اپنے واقعات کو دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔'' صفورا نے آہ بھر کر چہرہ دروازے کی طرف پھیر لیا۔

کچھ دیر تک ہم دونوں کے درمیان بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پگوڈا کے اندر لوبان سا لگایا جا رہا تھا۔ اس کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہم تک پہنچنے لگی۔ صفورا نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''اس شام میں نے تم سے بہت زیادتی کی۔ مجھے شاید ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں لگنے والی ان چوٹوں کے لیے مجھے رنج ہے۔''

میں کیا جواب دیتا۔ اس بارے میں میرے ذہن کی سلیٹ بالکل صاف تھی۔ وہ کچھ دیر میرے بولنے کا انتظار کرتی رہی، تب اس کی آواز ابھری۔ ''تم خاموش کیوں ہو؟ کچھ کہو۔ شاید میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ تم جانتے ہو، ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہمارے دکھ سانجھے ہیں۔''

''میڈم! آپ کو یہاں اس حالت میں دیکھ کر میرا دماغ سن ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اُس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے پچھلے دو سال میں پہلی بار میرا نام لیا ہے... کیا... تم مجھے... ٹھیک سے پہچان رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں میڈم! میں آپ کو پہچان رہا ہوں اور ان سارے حالات کو بھی جو یہاں پہنچنے سے پہلے پیش آئے تھے۔''

میڈم صفورا کے چہرے پر خوشی کی مدھم چمک نمودار ہوئی۔ اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بہ غور میرے سر پر بندھی پٹی کو دیکھنے لگی۔ ''کیا تم کہیں سے گرے ہو؟ مم... میرا مطلب ہے تمہارے سر پر پھر چوٹ لگی ہے؟''

''ہاں، کچھ دن پہلے ایسا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ تفہیمی انداز میں سر ہلانے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ پچھلے چند روز میں کچھ عجیب صورتِ حال ہوئی ہے۔ دو سال پہلے کے سارے حالات مجھے بتدریج یاد آرہے ہیں... میں اب پورے وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ میں کن حالات میں یہاں پہنچا...

میڈم نے تصدیق کے لیے مجھ سے کئی ایک سوالات کیے اور اس کی حیرانی میں اضافہ ہو گیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ اس نئی صورتِ حال میں ماضی قریب کی باتیں میرے ذہن سے یکسر نکل گئی ہیں تو وہ مزید حیران ہوئی اور تعجب سے میرا چہرہ تکنے لگی۔ میں نے مناسب الفاظ میں اسے آگاہ کیا کہ مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میں پچھلے قریباً دو برس سے

یہاں ہوں لیکن اب یوں لگتا ہے کہ ان دو برسوں پر ایک کالے رنگ کا پردہ پڑ گیا ہے۔ اس پردے کی دوسری طرف مجھے ایک دھندلی حرکت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میرا خیال تھا کہ وہ یقین نہیں کرے گی لیکن وہ بڑے دھیان سے میری باتیں سنتی رہی اور میری عجیب ذہنی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرے خیال میں تمہیں چند دن آرام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد تم خود کو بہتر محسوس کرو گے۔''

''میں اب بھی خود کو بہتر محسوس کرتا ہوں۔ بس کسی وقت سر میں شدید درد ہوتا ہے اور آنکھوں کے سامنے دھندی چھانے لگتی ہے۔''

میڈم صفورا کو دیکھ کر میرے ذہن میں بے شمار سوالات کلبلانے لگے تھے۔ ان سوالات میں سے کچھ کا تعلق پاکستان میں پیش آنے والے واقعات سے تھا اور کچھ کا یہاں کے حالات سے۔ مجھے ابھی تک صرف یہ معلوم ہوا تھا کہ ہمیں کچھ نامعلوم لوگوں نے بدھا کے مجسمے کی چوری کی پاداش میں پکڑا تھا اور یہاں پہنچایا تھا اور یہ سب کچھ بطور سزا کیا گیا تھا مگر اس بارے میں تفصیلاً کچھ بھی میرے علم میں نہیں تھا۔ میں میڈم صفورا سے یہ سب کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ خاص طور سے پاکستان اور لاہور کے حالات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہاں میری بے ہوشی کے فوراً بعد کیا کچھ رونما ہوا تھا۔ میرا بھائی اور بہن کہاں تھے... اقبال اور عارف پر کیا گزری تھی اور میرا دوست عمران، وہ یاروں کا یار، وہ جاں نثار... وہ غم خوار کیا ہوا تھا... کس تاریکی میں چھپ گیا تھا؟ پتا نہیں کیوں میں جب بھی عمران کے بارے میں سوچتا، میرے دل کے اندر کہیں گہرائی میں یہ انہونی آس ضرور جاگتی تھی کہ وہ ہر مشکل کو شکست دینے والا، شاید اس رات موت کو بھی شکست دینے میں کامیاب رہا ہو۔

چھ بھکشو ایک جتھے کی صورت میں پگوڈا سے نکلے۔ ان کے آگے ایک تنومند گرو تھا۔ انہیں دیکھ کر میڈم صفورا ٹھٹکی اور اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہیں آرام کی شدید ضرورت ہے۔ میں چھوٹے گرو سے کہوں گی کہ تمہیں کچھ دن تک خدمت سے چھٹی دی جائے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ میرے پاس بھی تمہارے اور سلطانہ کے لیے بہت سے سوال ہیں لیکن اس بات چیت کے لیے ہمیں تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا... اچھا، میں چلتی ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے محتاط نظروں سے بھکشوؤں کے جتھے کی طرف دیکھا پھر پگوڈا کے مرمریں احاطے میں بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی مٹھ کی عمارت کی طرف نکل گئی۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہ گیا۔ نادیہ کی صورت نگاہوں میں گھومنے لگی۔ میں کل جب اس کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں چند گھنٹے بعد میڈم صفورا سے میری ملاقات ہو گی اور اس کی زبانی مجھے نادیہ کی موت کی خبر ملے گی۔ حالات بڑی تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔

نادیہ کو میں نے آخری بار اسپتال کے آئی سی یو میں دیکھا تھا۔ اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی۔ وہ سفید بستر پر سیدھی لیٹی تھی۔ اس وقت وہ کروڑپتی میڈم صفورا کی لاڈلی بہن نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے جسم میں بجلیاں کوندتی تھیں، نہ ہی اس کی آنکھوں میں دعوت کے لشکارے تھے۔ وہ صرف ایک مریضہ تھی۔ دھیرے دھیرے موت کی طرف سرکتی ہوئی، اپنے انجام کی طرف بڑھتی ہوئی... اور آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے انجام تک پہنچ گئی ہے۔ وہ مردوں کا شکار کرتی تھی لیکن اس نے جس آخری مرد کو شکار کرنا چاہا تھا، وہ اپنی فطرت میں انوکھا تھا۔ وہ اس کی حریص آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے بجھا گیا تھا اور شاید... خود بھی بجھ گیا تھا۔

☆☆☆

بھکشو اور ان کا گرو ننگے پاؤں چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ گرو نے اپنی سوچتی آنکھوں سے مجھے سرتاپا گھورا پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔ ''سیڑھیوں پر چلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں اپنی جگہ متحیر کھڑا رہا۔ ایک چیلا کرخت لہجے میں بولا۔ ''سنتے ناہیں، گرو جی کیا کہوت ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے ایک طرف دھکیلا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے اس خاص سمت میں جانے کو کہا جا رہا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے تیور دیکھے اور چل پڑا۔ پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی۔ مجھے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ میں بمشکل ڈیڑھ دو فٹ کا قدم ہی اٹھا پا رہا تھا... وہ سب میرے پیچھے پیچھے چلتے گئے۔ جلد ہی ہم پگوڈا کی سفید سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ یہ قریباً چالیس سیڑھیاں تھیں جو پگوڈا کے صحن سے نیچے اترتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر کئی بھک منگے بیٹھے تھے اور آتے جاتے زائرین سے خیرات وصول کر رہے تھے۔ مالائیں، پھول اور تبرکات بیچنے والے دیگر افراد بھی یہاں موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے چہروں پر دلچسپی کے

www.pkdigest.com

آثار نمودار ہوئے۔ مجھے لگا جیسے میرے ساتھ کوئی تماشا ہونے والا ہے۔ پھر ایک دم مجھے چوہان کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ مجھے اور چوری کے دیگر مجرموں کو سزا کے طور پر بلاناغہ پگوڈا کی سیڑھیوں پر لٹایا جاتا ہے اور انہیں بید مارے جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے گناہوں کو دھونے کا عمل ہے۔ بدھا کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ اس عمل سے چوری کا ارتکاب کرنے والوں کو جو جسمانی تکلیف پہنچے گی وہ انہیں پوتر ہونے میں مدد دے گی۔

مجھے پگوڈا کی سیڑھیوں پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ میری پشت سے قمیص اٹھا دی گئی۔ درجنوں نگاہیں دیکھ رہی تھیں۔ بے عزتی کے احساس سے مجھے پسینا آگیا۔ ایک شخص جو بھکشو نہیں تھا، ایک لکڑی تھامے برآمد ہوا۔ یہ بید کی لکڑی نہیں تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ برگد کی شاخ تھی جسے مقدس تیل میں بھگویا جاتا تھا۔

اس لکڑی سے میری کمر پر یکساں وقفوں سے دس ضربیں لگائی گئیں۔ یہ ہلکی ضربیں تھیں اور نہ شدید تھیں۔ ان ضربوں نے مجھے جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی اذیت دی۔ مجھے اٹھا کر پھر سے خستہ حال کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا۔ میری کمر پر جلن تھی اور زخمی پنڈلیوں اور پیروں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ سر کے زخم سے بھی لہو کا تھوڑا تھوڑا رساؤ جاری تھا۔ اپنی حالت پر مجھے خود ترس آنے لگا۔ ایک بھکشو نے مجھے مرہم پٹی کا کچھ سامان دیا اور بے اعتنائی سے منہ موڑ کر واپس چلا گیا۔

کچھ دیر بعد نمیش آگیا۔ اس شخص کا رویہ قدرے دوستانہ تھا۔ وہ میرے لیے بھی گیروا لباس لے کر آیا تھا۔ یہ دو چادروں پر مشتمل تھا۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی اور لباس بدلنے میں بھی میری مدد کی۔ اس نے بتایا کہ بدھ کی دوپہر کو میرا سر بھی مونڈ دیا جائے گا۔

میرا حلیہ عجیب و غریب ہو گیا تھا... لیکن پتا نہیں کہ وہ مجھے زیادہ عجیب نہیں لگ رہا تھا۔ شاید میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند آہستہ آہستہ صاف ہو رہی تھی اور مجھے یہاں کے حالات اور واقعات دھیرے دھیرے یاد آنے شروع ہو گئے تھے۔ بہرحال، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ دوپہر کو کھانا کھلایا گیا۔ پھر پگوڈا کے وسیع صحن میں مختلف عبادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شام کو بڑے بڑے نقارے بجائے گئے اور سوتر پڑھے گئے۔ وہ رات بھی جیسے تیسے گزر گئی۔ رات کی تاریکی میں پگوڈا کا اندرونی منظر بڑا عجیب تھا۔ مخروطی دروازوں میں سے شمعوں کی روشنی چھلک چھلک کر باہر آتی تھی اور بھکشو پُراسرار سایوں کی طرح حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ پگوڈا کے اندرونی دروازے کے سامنے میں نے ایک ننگ دھڑنگ سادھو کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھا۔ وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے آگ جل رہی تھی اور وہ گاہے بگاہے اس میں کچھ پھینکتا تھا جس سے آگ میں سے بہت سی چنگاریاں نکلتی تھیں۔ گیروا لباس والی ایک لڑکی ہولے ہولے اس آگ کے گرد چکر کاٹتی تھی۔ شاید یہ کوئی سحر کاری تھی۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر پرسوں رات کے تہلکہ خیز مناظر تازہ ہو گئے۔ نہایت گھنا اور تاریک جنگل، نہایت تیز بارش اور پھر کچھ لوگوں کا اچانک میرے سامنے آجانا۔ مجھے ڈھونڈ لینا۔ جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کرلی جائے۔ کیا واقعی وہ کوئی جادو تھا؟ میرا ذہن یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔

اگلی صبح پھر صفورا سے ملاقات ہوئی۔ اس دور دراز مقام پر ان اجنبی در و دیوار میں میڈم صفورا کا مجھ سے ملنا جتنا حیرت ناک تھا، اتنا ہی ناقابلِ فہم بھی تھا۔ وہ کیا تھی اور کیا بن کر یہاں پہنچ گئی تھی۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے اس جیسی دبنگ عورت کو اٹھا کر یہاں پٹخا تھا۔ ابرار صدیقی کو یہاں پٹخا تھا اور مجھے بھی؟ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اور شاید اس کی کیفیت بھی یہی تھی۔

www.pkdigest.com

صبح کی اولین گھڑیوں میں جب بھکشو اور ان کے گرد حضرات صبح کی مناجات کے بعد پھر سے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے تھے، ہمیں وہ تنہائی میسر آگئی جس کی ضرورت تھی۔ میں اور میڈم صفورا کوٹھڑی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میڈم صفورا کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے گہرے نشان جیسے نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ زندگی میں کبھی مسکرائی ہی نہیں ہے۔ وہ ایک دم اپنی اصل عمر سے دو تین سال بڑی لگنے لگی تھی۔ جب میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا، وہ قریباً پچیس کی لگتی تھی۔ اگر یہ انہونی ہو چکی تھی کہ ہمیں یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ دو سال ہو چکے تھے تو پھر صفورا کی عمر چھبیس ستائیس لگنی چاہیے تھی مگر وہ ایک دم تیس کی لگ رہی تھی۔ تاہم اس کا جسمانی دم خم اسی طرح موجود تھا اور گہرے سرخ ہونٹوں کی شادابی بھی مکمل اوجھل نہیں ہوئی تھی۔

وہ گمبھیر آواز میں بولی۔ ”تابش! میں نے تم سے جو رویہ روا رکھا ہے اس کے لیے میں ایک بار پھر تم سے معذرت چاہتی ہوں۔ میرا صدمہ بہت گہرا تھا، مجھے اپنے جذبات پر اختیار نہیں تھا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم! اگر

میں یہ کہوں کہ مجھے آپ کے رویے کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تو آپ یقین نہیں کریں گی۔ لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ میں آپ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”ہاں، کل تم نے جو کچھ اپنے بارے میں بتایا ہے اس سے مجھے کافی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔ میں کوئی ڈاکٹر تو نہیں ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اگر تمہاری یادداشت واپس آئی ہے تو بہت جلد مکمل طور پر واپس آجائے گی۔ تم اپنے اردگرد کی چیزوں اور چہروں پر غور کرو۔ انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے رہو، بہت جلد تمہیں باتیں یاد آنے لگیں گی۔“

میں نے اپنی پیشانی کو مسلا۔ میں ذہن پر زور دیتا تھا تو کنپٹیوں میں ٹیسیں سی اٹھنے لگتی تھیں۔

میڈم صفورا نے مجھ سے پوچھا۔ ”تمہیں پتا ہے، تم یہاں کیسے پہنچے تھے؟“

”نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ کچھ معلوم نہیں... پلیز میڈم... مجھے... شروع سے بتائیں... میرے ساتھ کیا ہوا؟ میں لاہور سے یہاں انڈیا کے اس دور دراز علاقے میں کیسے پہنچا؟ کن لوگوں نے پہنچایا؟ اور... اور آپ کیسے پہنچیں یہاں؟ اور ابرار صدیقی؟ آخر یہ واقعہ کیسے ہوا میڈم؟“

وہ ساکت بیٹھی رہی۔ اس کی مخروطی انگلیاں بے خیالی میں اپنے گلے کے آہنی کڑے کو سہلا رہی تھیں۔ اس کڑے پر سنسکرت یا اس سے ملتی جلتی زبان کے کچھ لفظ لکھے تھے۔

وہ گہری دکھ بھری سانس لے کر بولی۔ ”نادیہ اپنے دوسرے آپریشن کے دوران میں ہی دم توڑ گئی تھی۔ گولی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو بری طرح زخمی کیا تھا۔ تم جانتے ہی ہو، اس کا نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ تمہارے اس قاتل دوست نے میری زندگی کو جس طرح برباد کیا ہے، میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔ وہ خبیث بہت زیادہ سازشی دماغ کا مالک تھا۔ اس نے گہری سازش کی۔ سرکس کے اسپیشل شو میں میری بہن کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری اور ظاہر یہ کیا کہ وہ خود اپنی گولی کا شکار ہوئی ہے۔ قدرت نے اس کا بھانڈا پھوڑا اور اس کے لیے تم ذریعہ بن گئے۔ تم نے رشید اور تابندہ وغیرہ کے گھر میں بخار کی حالت میں جو کچھ کہا، اس نے پول کھول دیا۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کے آگے ڈال سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا۔“

میڈم صفورا کی آنکھوں سے جیسے لہو ٹپکنے لگا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔ یوں لگا کہ ان لمحوں میں وہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہ رہی۔ اس نے میری طرف سے بھی نگاہیں پھیر لیں اور گہرے سانس لینے لگی۔ چند سیکنڈ بعد وہ قدرے نارمل ہوئی تو بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہر بُرے سے بُرے کام میں کوئی پہلو اچھائی کا بھی ہوتا ہے۔ میں کچھ لوگوں کے جبر کا شکار ہو کر لاہور سے یہاں پہنچ گئی۔ یہ بہت بُرا ہوا لیکن اس میں شاید ایک نکتہ اچھائی کا بھی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اگر میں نادیہ کی موت کے بعد وہاں لاہور میں رہتی تو پتا نہیں، کیا کچھ کر گزرتی۔ عین ممکن تھا کہ اس خونی (عمران) کے بعد اس کے گھر والے، اس کے بہن بھائی بھی اس آگ کی لپیٹ میں آجاتے۔ میری ذہنی کیفیت ان دنوں کچھ ایسی ہی تھی۔ میں ان کو بالکل نہیں چھوڑتی...“ میڈم صفورا کی سرخ آنکھوں میں اشکوں کی نمی چمکنے لگی۔

اس کا طیش دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس عبادت گاہ میں میڈم صفورا کا رویہ مجھ سے بہت سخت رہا ہو گا اور عین ممکن ہے کہ شروع شروع میں اس نے میری جان لینے کی کوشش بھی کی ہو۔

وہ چادر کے پلو میں چہرہ چھپا کر خاموش آنسو بہانے لگی۔ میں چپکا بیٹھا رہا۔ سورج دھیرے دھیرے مٹھ (مدرسے) کی مخروطی چھت کے عقب سے نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی سنہری کرنوں میں پگوڈا کے سنہری کلس اور کام دار دروازے چمک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد میڈم صفورا کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے گیروا چادر کا پلو چہرے سے ہٹا لیا۔ میں نے اسے مٹی کے پیالے میں پینے کے لیے پانی دیا۔ اس نے پانی پیا اور ایک بار پھر کھردری سفید دیوار سے ٹیک لگا لی۔ اس کے چہرے پر کرب آمیز تردد کی پرچھائیاں موجود تھیں۔

اس نے ہولے ہولے کہنا شروع کیا۔ ”...دراصل ہم ٹھیک سے اندازہ نہیں لگا سکے کہ بدھا کا وہ مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا اہم ہے اور وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہ اندازے کی بہت بڑی غلطی تھی، بہت بڑی غلطی...“

اس نے پھر ایک آہ بھری اور جیسے کسی سوچ میں کھو گئی۔ میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بولی۔ ”وہ مجسمہ جو ابرار صدیقی کے پاس تھا اور جسے بعد میں، میں نے تمہارے اس قاتل دوست کے ذریعے صدیقی کے فلیٹ سے نکلوایا تھا... کوئی عام مجسمہ نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تفصیل میں جاؤں گی تو بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ کہ یہ شان دار مجسمہ برما سے یہاں پہنچا تھا۔ یہ کئی سو سال سے برما کے ایک شاہی خاندان کے پاس تھا۔ اس مجسمے کی شہرت یہ تھی کہ یہ اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ ماضی میں کئی طرح کے حادثات اس پر گزرے لیکن یہ ہمیشہ محفوظ ہی رہا۔ نہ صرف خود محفوظ رہا بلکہ اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کو بھی محفوظ

رکھا۔ اس کی آخری مثال دوسری جنگِ عظیم میں سامنے آئی۔ برما کا وہ پہاڑی قصبہ بھی شدید جنگ کی زد میں تھا جہاں ایک بدھ مندر کے اندر یہ مجسمہ موجود تھا۔ علاقے کے لوگوں کو اس مجسمے کی کرامات پر اتنا یقین تھا کہ جاپانیوں کے کئی شدید حملوں کے باوجود لوگ قصبہ چھوڑ کر نہیں گئے اور بدھ مندر کے اردگرد پناہ گزیں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے جب بھی قصبے پر ہلا بولنے کی کوشش کی، شدید طوفانی بارش یا خراب موسم کی وجہ سے یہ کام مکمل نہ کر سکے اور یہ کام واپس لوٹ گئے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ عین حملے کے موقع پر ان پر برطانوی فوجیوں نے کسی اور طرف سے حملہ کر دیا اور قصبے کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا۔ بعدازاں قصبے کے لوگ خود بھی قصبہ چھوڑ کر کسی محفوظ جگہ چلے گئے۔ جاپانی فوجیوں نے گولہ باری سے پورا قصبہ کھنڈر کر دیا۔ بدھ مندر بھی تہس نہس ہو گیا۔ اس کے اندر چھوٹی سے چھوٹی شے بھی تباہی سے نہیں بچ سکی لیکن یہ مجسمہ جوں کا توں رہا۔ اسے خراش تک نہیں آئی۔ بعد میں اس قصبے پر برطانوی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ایک انگریز میجر اسٹیفن اس نادرِ روزگار مجسمے کو بڑی احتیاط سے انڈیا لے آیا۔ حکم جی کے دادا رائے سوم آنند بہادر سے مسٹر اسٹیفن کی گہری دوستی تھی۔ لہٰذا اس انوکھے مجسمے کو یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کے سب سے بڑے پگوڈا کی زینت بنا دیا گیا۔''

میڈم صفورا نے محتاط نظروں سے کوٹھڑی سے باہر جھانکا کہ کوئی اردگرد تو موجود نہیں پھر اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج سے تین سال پہلے یہ مجسمہ یہاں زرگاں کے پگوڈا سے چوری ہوا۔ اس چوری نے بدھ مت کے پیروکاروں میں تہلکہ مچا دیا۔ انہوں نے تہیہ کیا کہ وہ مجسمے کو بہرصورت ڈھونڈیں گے اور واپس لائیں گے۔ انہیں یقین تھا کہ مجسمہ جہاں بھی ہوگا، محفوظ ہوگا کیونکہ وہ برمی زبان کے مطابق ''آرا کوئے'' ہے۔ یعنی اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔ بدھ مت کے ماننے والوں نے سات ایسے افراد چنے جو اس مجسمے کو واپس لانے کے لیے اپنی جان لٹانے کو تیار تھے۔ ان کے ساتھ بھانڈیل اسٹیٹ کے پانچ نہایت خطرناک اور تربیت یافتہ کمانڈوز بھی شامل ہوئے۔ ان کمانڈوز کا سربراہ انڈین اسپیشل فورسز کا ایک سابقہ افسر رنجیت پانڈے تھا۔ رنجیت پانڈے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے لیے عزرائیل کا دوسرا نام ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس پانڈے کی مطلوبہ رقم موجود ہے تو وہ پانڈے سے دنیا کے کسی بھی محفوظ ترین اور وی وی آئی پی شخص کو قتل کرا سکتا ہے۔ اسے ایک بلا کہا جاتا ہے۔ ایسی بلا جو بہت جلد خود ختم ہو جائے گی یا پھر اس کے ہاتھوں کئی اہم ترین لوگ ختم ہو جائیں گے۔ پانڈے کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ صرف بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔

''ہماری بدقسمتی کہ جو لوگ گندھارا آرٹ کے اس مجسمے کو پاکستان سے واپس لانے کے لیے انڈیا سے پاکستان میں داخل ہوئے، ان کا لیڈر رہی رنجیت پانڈے تھا۔ پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے تیزی سے تفتیش کی اور صرف تین چار ہفتے کے اندر مجسمے کے آس پاس پہنچ گئے۔ یہ مجسمہ کم از کم چھ سات ہاتھوں سے ہو کر ابرار صدیقی تک آیا تھا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ان سات آٹھ افراد میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ پیس یعنی مجسمہ کچھ لوگوں کے لیے کتنا قیمتی ہے اور اسے ڈھونڈنے کے لیے کتنے بڑے پیمانے پر کوششیں کی جارہی ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا، ابرار صدیقی نے پہلے یہ ''پیس'' لاہور میں رکھا ہوا تھا۔ وہاں اسے شک ہوا کہ کچھ مشکوک لوگ اس کے اردگرد موجود ہیں۔ وہ پیس کو لاہور سے اٹھا کر جہلم لے گیا اور بڑی رازداری سے اسے اپنے فردوس پلازا والے فلیٹ میں چھپا دیا۔ اس فلیٹ سے یہ ''پیس'' تمہارے اس قاتل دوست عمران نے حاصل کر لیا اور میرے پاس لال کوٹھی میں لے آیا۔ ہم اپنی کامیابی پر خوش تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ اس کامیابی کے ساتھ ساتھ کتنی بڑی مصیبت ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ بھانڈیل اسٹیٹ کے کمانڈوز نے ابرار صدیقی کے فلیٹ تک رسائی حاصل کی۔ انہوں نے ابرار کے ایک محافظ کو قتل اور دوسرے کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ ابرار صدیقی لاپتا ہو گیا تھا۔ دراصل وہ پانڈے کے خوفناک شکنجے میں تھا۔

''نادیہ کی موت کا پانچواں روز تھا... جب رات کے وقت پانڈے اور بھانڈیل اسٹیٹ کے نہایت خطرناک کمانڈوز لال کوٹھی میں گھس آئے۔ ان کے ساتھ بدھ مت کے وہ چند جنونی پیروکار بھی تھے جنہوں نے مقدس مجسمے کے حصول کے لیے اپنی جان واقعی ہتھیلی پر رکھی ہوئی تھی۔ آگے کے حالات کا تم اندازہ لگا سکتے ہو۔ ان لوگوں نے نہ صرف وہ پیس حاصل کیا بلکہ مجھ پر بھی رائفلیں تان لیں۔ اس رات کی شدید خونی کشمکش میں میرے تین باڈی گارڈز میری آنکھوں کے سامنے اپنی جان ہارے۔ عارف خان کو گولی لگی اور تین چار افراد شدید زخمی ہوئے۔ میری چلائی ہوئی ایک گولی ایک کمانڈو کی گردن سے پار ہو گئی لیکن وہ حیران کن طور پر زندہ رہا۔ وہ لوگ مجھے مجسمے سمیت لاہور ہی کی ایک نامعلوم چار دیواری میں لے گئے۔ یہ غالباً ماڈل ٹاؤن کی کوئی بہت پرانی کوٹھی تھی۔ اس میں کسی انگریز میاں بیوی کی قبریں بھی تھیں۔ مجھے ایک تہ خانے میں رکھا گیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ وہاں ایڈووکیٹ ابرار صدیقی پہلے سے موجود تھا۔ اس کے جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کے جسم پر ابھی تک کالا کوٹ اور سفید پتلون تھی۔ وہ کوئی معمولی بندہ نہیں لیکن اس وقت بے بسی کی تصویر نظر آتا تھا۔

''مجھ پر بھی جسمانی تشدد کیا گیا۔ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا جنہوں نے مقدس مجسمہ جہلم کے فلیٹ سے چرا کر میرے پاس پہنچایا تھا۔ میں نے انہیں سچ بتانے میں ہی بہتری سمجھی۔ نہ بھی بتاتی تو انہیں معلوم ہو ہی جاتا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا، اقبال اور عمران وغیرہ کا نام بتا دیا...'' میڈم بُری طرح کھانسنے لگی۔ مسلسل بولنے سے اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔

''میں ان لوگوں کے ہاتھ کیسے آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''دراصل تم، سراج اور شیرے وغیرہ کے پاس تھے۔ تمہیں مجید مٹھو والے خالی مکان میں رکھا گیا تھا۔ چوٹ لگنے کے بعد تم اپنے حواس میں نہیں تھے۔ نہ کسی کو پہچانتے تھے، نہ بات کرتے تھے۔ پانڈے کے لوگ اسی حالت میں تمہیں مجید مٹھو کے مکان سے پکڑ لائے اور ہمارے ساتھ ماڈل ٹاؤن کے تہ خانے میں بند کر دیا...''

میں نے ذہن پر زور دیا لیکن ایک دبیز دھند کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کوئی ہلکا سا خیال بھی ذہن میں نہیں ابھرتا۔''

''ہاں، تمہاری چوٹ کافی شدید تھی۔ پورے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوج کر نیلی ہو چکی تھیں۔ دیکھ کر خوف آتا تھا۔''

میں نے میڈم صفورا کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں نمی آگئی۔ میں نے التجائی لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ نے کہا ہے کہ ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ کیا میں آپ سے امید رکھوں کہ آپ مجھے شدید ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میرے ایک سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک دیں گی؟''

''ہاں پوچھو۔''

''میڈم! میری بہن اور بھائی کا کیا ہوا؟''

''میں جانتی تھی، تم یہی پوچھو گے۔ ان دونوں کے بارے میں میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تو بُری بھی نہیں... بلکہ تم اسے تھوڑی سی رعایت کے ساتھ اچھی خبر بھی کہہ سکتے ہو۔ تمہاری والدہ والے واقعے کے چار پانچ روز بعد تک وہ دونوں سراج کے ہتھے نہیں چڑھے تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لاہور میں تھے ہی نہیں۔ شاید کراچی کی طرف نکل گئے تھے۔ پانچویں روز میں خود پانڈے وغیرہ کے ہاتھوں بے بس ہو گئی۔ اس کے بعد مجھے کسی کے حالات کا کچھ پتا نہیں... کچھ بھی نہیں۔''

''اور میری والدہ... میرا مطلب ہے ان کی میت؟'' میں نے آنسو بہاتے ہوئے پوچھا۔

''انہیں کوٹھی کے احاطے میں ہی دفنایا گیا تھا۔''

''دفنایا گیا تھا یا دبایا گیا تھا؟'' میں نے کرب ناک لہجے میں پوچھا۔

''مجھے اس بارے میں تفصیل معلوم نہیں۔'' میڈم نے نظریں چرائیں۔

میرا دل دکھ سے لبریز ہو گیا۔ تو کیا میری ماں کو کفن بھی نہیں مل سکا تھا... کیا واقعی ایسا ہوا تھا؟

میں کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ میڈم بھی خاموش رہی۔ گئے وقت کا کرب ایک مہیب لہر کی طرح ہم دونوں کے درمیان موجزن رہا۔ آخر میڈم صفورا نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہوگا کہ پانڈے جیسے سفاک شخص نے ہمیں قتل کیوں نہ کیا... یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر ویں کیوں نہ پھینک آیا؟ ہمیں اپنے ساتھ یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لایا؟''

یہ سوال واقعی بڑی شدت سے ذہن میں ابھر رہا تھا۔ میں نے بھیگی ہوئی سوالیہ نظروں سے میڈم کو دیکھا۔ اس نے بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر ایک دم چپ رہ گئی۔ پگوڈا کے مین دروازے سے تین افراد اندر داخل ہو رہے تھے۔ ان میں جگشو کوئی نہیں تھا۔ دو مقامی تھے۔ ایک انگریز تھا۔ وہ درمیانی عمر اور اچھے مضبوط جسم کا مالک تھا۔ حیرانی کی بات تھی کہ اس نے بھی مقامی لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ پاجامے کرتے اور انگرکھے پر مشتمل تھا۔ پگوڈا کے احترام میں وہ اور اس کے ساتھی ننگے پاؤں چلتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ قریب پہنچے تو مجھے سفید فام شخص کے چہرے پر نقش خباثت اور سفاکی دکھائی دی۔ اس کی بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں یقیناً ایک جاہ طلب اور حریص شخص کی آنکھیں تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جارج گورا ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔

جارج نے مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا اور بولا۔ ''کورتی کے ساتھ کیا کھسر پھسر ہو رہی تھی یہاں... کیا ایک بار پھر تم یہاں سے بھاگنا مانگتا ہے؟''

وہ حیران کن طور پر صاف اردو بول رہا تھا۔ بس لہجے کا

www.pkdigest.com

فرق تھا۔

میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جارج کا ساتھی، مقامی شخص بولا۔ ''صاحب! موہن کمار جی نے شاید ٹھیک ہی مشورہ دیا ہے۔ اس کی ٹانگیں گھٹنوں پر سے کاٹ دینی چاہئیں۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

دوسرا شخص جو سانولی رنگت کا تھا، کرخت آواز میں بولا۔ ''اوئے! دیکھتے نا ہیں ہو کہ صاحب بہادر آئے ہیں۔ کیسے گنواروں کی طرح چھسکڑا مارے بیٹھے ہو۔ کھڑے ہو جاؤ۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔

میں کھڑا ہو گیا۔ سانولا شخص پھر گرجا۔ ''دیدے کیوں پھاڑت ہو؟ نیچے دیکھو۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ بہت زوردار تو نہیں تھا لیکن شاید ہاتھ بھاری تھا یا کیا وجہ تھی۔ میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور تیزی سے خون کے قطرے گرنے لگے۔ جارج اور اس کے دونوں ساتھی مجھے مسلسل خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

پہلا شخص جارج کو بھڑکانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ اس حرافہ کے کرتوتوں میں برابر کا شریک ہے جی۔ اوپر سے گھنا بنا رہتا ہے۔ اندر سے سب کچھ جانت ہے۔''

جارج نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں مجھے اپنے لیے رقابت کی جھلک نظر آئی۔ غالباً اس رقابت کا سرچشمہ سلطانہ ہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق جارج، سلطانہ کے پیچھے تھا اور سلطانہ نے جارج کی جارحیت سے بچنے کے لیے آناً فاناً مجھے اپنا شوہر بنا لیا تھا۔ اب وہ میری بیوی تھی اور میں اس کے بچے کا باپ تھا۔ کہنے والے تو یہی کہہ رہے تھے... اور یہی صورتِ حال تھی جس نے جارج کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ رقابت بھر دی تھی۔

یکایک جارج اور اس کے ساتھی چونکے۔ ایک فربہ اندام گرو اچانک ہی کوٹھڑی کے دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کے صفاچٹ چہرے پر جھریاں اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے گلے میں موٹے دانوں والی بڑی مالا میں اس کے اونچے رتبے کو ظاہر کرتی تھیں۔ وہ ہاتھ میں عصا لیے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں دو بھکشو ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔

جارج نے گرو کو مقامی انداز میں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا۔ گرو نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ تاہم گرو کے چہرے پر برہمی کے آثار موجود تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' اس نے ضعیف آواز میں دریافت کیا۔

''کچھ نا ہیں گرو جی! یہ بدتمیزی کر رہا تھا۔'' گہرے سانولے رنگ والے شخص نے کہا۔

''تم نے اسے کیا مارا ہے؟'' گرو کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

''کچھ نا ہیں گرو جی!'' اس مرتبہ جارج نے جواب دیا۔ ''یہ فضول بول رہا تھا۔ تیواری نے تھپڑ مارا ہے۔''

آج میں دن کی روشنی میں پہلی بار دھیان سے تیواری کی شکل دیکھ رہا تھا۔ گہری رنگت والا یہ شخص کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا اور خبردار تھا۔ شاید اس کا کام ہی یہاں سے بھاگنے والوں کو پکڑنا تھا۔

گرو کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ جارج کے جواب سے بالکل مطمئن نہیں ہوا۔ وہ ناراض لہجے میں بولا۔ ''میں ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہوں کہ یہ بدھ مندر ہے۔ یہ پریم اور آشتی کا دوارا ہے۔ یہاں پر خون خرابا ہماری سکھشا کے خلاف ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم ہاتھ میں ہتھوڑا لے کر بدھ مندر کی دیواریں گرانا شروع کر دیں۔ چھی چھی... کتنے افسوس کی بات ہے۔ ایک جیتے جاگتے بندے کا خون مندر کے فرش پر گرتا ہے اور ہم کھڑے دیکھت ہیں۔''

گرو نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے۔ ان میں سے ایک نے ایک کپڑے سے فرش پر گرا خون صاف کرنا شروع کیا۔ دوسرے نے اپنا گیروا رومال میرے ہونٹوں پر رکھ دیا تاکہ مزید خون گر کر فرش کو داغ دار نہ کرے۔

گرو نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں آپ لوگوں سے بنتی کرتا ہوں... کہ بدھ مندر کی مندرتا کو اس طرح داغ دار نہ کریں۔ اگر یہاں آپ کا کوئی اپرادھی ہے تو پھر اسے یہاں سے لے جائیں۔ اس کے ساتھ جو بھی خون خرابا کرنا چاہت ہیں، باہر جا کر کریں۔''

جارج ذرا ترش انداز میں بولا۔ ''بڑے گرو جی! آپ بار بار خون خرابے کا ورڈ کیوں استعمال کر رہا ہے۔ یہاں کسی نے کسی پر تلوار نا ہیں چلایا۔ ایک تھپڑ کو آپ خون خرابا کیوں کہہ رہا ہے؟''

''کیا یہ پہلی بار ہے کہ یہاں ایسا ہوا ہے؟'' بڑے گرو کی آواز میں دبی دبی آگ تھی۔ ''میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب مجھ سے برداشت نا ہیں ہوتا۔ ہم یہاں اس دوارے میں پریم، آشتی اور بلیدان کی سکھشا دیوت ہیں۔ اگر ہمارے کہنے اور کرنے میں اتنا فرق ہووے گا تو پھر سب کچھ برباد ہو جاوے گا۔''

''بڑے گرو! آپ خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہا ہے۔ اٹ از ناٹ فیئر۔'' جارج بولا۔

''میں بات نا ہیں بڑھا رہا۔ میں صرف یہ کہنا چاہت ہوں کہ اگر کوئی اپرادھی ہے اور آپ اسے سزا دینا چاہت ہیں تو پھر اسے یہاں سے لے جاویں... بس۔''

جارج کا چہرہ سرخ انگارہ ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں جیسے نیلا زہر بھر گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ ویسا ہی ہو گا جیسا بڑے گرو چاہیں گے۔''

اس کے بعد وہ مڑا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

بڑے گرو نے مجھے قدرے ترحم کی نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے ساتھی بھکشوؤں سے کہا کہ وہ میرے ہونٹ کا خون بند کرنے کے لیے ٹھنڈے پانی اور راکھ کا استعمال کریں۔ کچھ اور بھکشو بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ بڑے گرو کے سامنے ان کے سر تعظیم سے جھکے ہوئے تھے۔ بڑا گرو ان کے جلو میں چلتا ہوا پگوڈے کے اندرونی حصے کی طرف واپس چلا گیا۔

سہ پہر ہوتے ہی ایک بار پھر مجھے عجیب طرح کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ڈاکٹر چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ ہم ''مجسمہ چوری'' کے لیے پگوڈا میں سزا بھگت رہے ہیں۔ ہماری سزاؤں میں فاقہ کشی کے علاوہ مار پیٹ کی سزا بھی شامل ہے۔ ہمیں یعنی مجھے، میڈم صفورا اور ابرار صدیقی کو ہر شام پگوڈا سے باہر نکالا جاتا ہے اور سنگِ مرمر کی سفید سیڑھیوں پر اوندھا لٹایا جاتا ہے۔ پھر ہمیں زائرین کے سامنے مقررہ تعداد میں بید مارے جاتے ہیں۔ دو دن پہلے یہ سزا میں ایک بار تو بھگت چکا تھا، تاہم اس کے بعد ابھی تک کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ بہرحال، میرے ذہن میں اندیشہ موجود تھا اور سہ پہر کے وقت یہ اندیشہ ایک دم بہت بڑھ جاتا تھا۔ میڈم صفورا سے میری ملاقات دو بار ہو چکی تھی لیکن اس سزا کے بارے میں، میں اس سے کچھ پوچھ نہیں سکا تھا۔ بہرحال یہ شام بھی خیریت سے گزر گئی۔ میرے پاؤں میں زنجیر بدستور موجود تھی اور مجھے بہت تنگ کر رہی تھی۔ میرے پاؤں آزادی چاہتے تھے۔ میں اپنی مرضی سے اپنے جسم کو حرکت دینا چاہتا تھا اور یہ خواہش کسی وقت اتنی شدید ہو جاتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔ نیند کی حالت میں بھی جیسے یہ احساس ذہن کی گہرائی میں موجود رہتا کہ میرے پاؤں کے ساتھ ایک نہایت ناپسندیدہ بوجھ موجود ہے۔

سلطانہ کے حوالے سے بھی میرے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ وقتِ رخصت اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں میرے تصور میں گھومتی رہتی تھیں۔ اس کا بچے کو چومنا پھر الوداعی انداز سے مجھے دیکھنا۔ غنی صاحب، چوہان اور دیگر لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ میری بیوی کی حیثیت سے سلطانہ نے میرے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ وہ ان گنت موقعوں پر میرے لیے ڈھال بنی ہے اور اپنی زندگی خطرے میں ڈالی ہے۔ پتا نہیں کہ میں اس کا محبوب تھا یا نہیں لیکن اس کا شوہر ضرور تھا اور وہ ہر طرح سے شوہر پرست عورت لگتی تھی۔ وہ اپنا سرخ عروسی جوڑا اپنے جھولے میں ساتھ لیے پھرتی تھی۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے والی تھی کہ بقول چوہان، سلطانہ نے مجھے تحفظ دینے کے لیے اپنا وہ قیمتی اثاثہ یعنی مہاراج بہادر کی دی ہوئی مہر بھی استعمال کر ڈالی تھی۔ حالانکہ وہ مہر سلطانہ اور اس کے گھرانے کو بڑے سے بڑا فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

اب سلطانہ خود خطرے میں تھی۔ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا تھا۔ جارج گورا کو تو میں دیکھ ہی چکا تھا۔ میں نے اس کے کردار کے بارے میں جو سنا تھا، وہ اس کے عین مطابق تھا۔ چہرے پر خباثت اور عورت کی بھوک اس کی آنکھوں میں نقش تھی... پھر میں بالو کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا وہ واقعی میرا بچہ تھا... میرا خون؟

اچانک کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور صفورا اندر آ گئی۔ پچھلے دو دنوں میں وہ کافی کمزور ہو چکی تھی اور شاید یہی حال میرا تھا۔ یہ اس مسلسل فاقہ کشی کا نتیجہ تھا جو یہاں ہم سے زبردستی کرائی جاتی تھی۔ اب بھی کل دوپہر سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بھکشو ہمیش آیا تھا اور اس نے خاموشی سے تھوڑے سے بھنے ہوئے چاول مجھے دیے تھے، یہ چاول وہ حسبِ سابق اپنی چادر کے پلو میں باندھ کر لایا تھا۔

اندر آتے ہی میڈم صفورا نے پوچھا۔ ''کل جارج اور بڑے گرو جی میں کوئی جھگڑا ہوا تھا؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور صفورا کو اپنا زخمی ہونٹ دکھایا۔

وہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ بہت برا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب جارج تمہیں پگوڈا سے نکالنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں جیل میں لے جایا جائے۔ ابھی حکم جی زرگاں سے باہر ہے۔ ایک دو روز میں وہ آ جائے گا۔ پھر تمہارا یہاں پگوڈا میں رہنا مشکل ہو گا۔''

''تو یہ جگہ بھی جیل سے کون سی کم ہے۔ جیل میں شاید کھانا تو ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں... ایسی بات نہیں... جو کچھ بھی ہے لیکن یہ ایک عبادت گاہ ہے۔ یہاں کچھ اصول اور قاعدے ہیں۔''

www.pkdigest.com

"سیڑھیوں پر لٹا کر لوگوں کے سامنے پیٹھ پر بید مارنا کون سا سنہری اصول ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بید ہی مارے جاتے ہیں نا... الٹا لٹکا کر چمڑی تو نہیں ادھیڑی جاتی۔ عورتوں کو بے عزت تو نہیں کیا جاتا... اور اب یہ بید مارنے والی سزا بھی تو ختم ہو چکی ہے۔ سات آٹھ مہینے پہلے ہی میرے اور ابرار کے ساتھ یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اب کم از کم ہمیں تو بید نہیں مارے جاتے۔"

"لیکن مجھے تو منگل کو بھی بید مارے گئے ہیں۔" میں نے کہا اور وہ ساری تکلیف و توہین ذہن میں تازہ ہو گئی جو مجھے جھیلنا پڑی تھی۔

"لیکن منگل کے بعد تو ایسا کچھ نہیں ہوا نا۔ اور میرا خیال ہے کہ آئندہ بھی نہیں ہوگا لیکن... اب یہ جو جارج اور بڑے گرو کی تکرار والا معاملہ ہے، یہ تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ صدیقی کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔"

"ہاں، مجھے صدیقی کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"اسے بھی بڑے گرو اور موہن کمار کی تکرار کے بعد جیل جانا پڑا تھا۔ سات آٹھ مہینے تک اسے جیل میں بہت "ٹف ٹائم" گزارنا پڑا ہے۔ بہرحال، اب وہ دوسرے پگوڈا میں ہے اور کسی حد تک سکون میں ہے۔"

کچھ بھکشو لڑکیاں کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی ٹوکریاں لے کر اندر جا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ نوجوان بھکشو چاندی کے گول طشت اٹھائے ہوئے جا رہے تھے۔ میری کوٹھڑی کے ارد گرد مکمل سکوت تھا۔ میں نے میڈم صفورا سے کہا۔ "کل ہماری گفتگو کا سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا تھا۔ آپ مجھے یہ بتانے لگی تھیں کہ پانڈے جیسے بے رحم شخص نے ہمیں لاہور ہی میں قتل کیوں نہ کر دیا یا ہڈیاں وغیرہ توڑ کر دریا میں کیوں نہ پھینک دیا... چوری کے جرم میں ہمیں یہاں بھانڈیل اسٹیٹ کیوں لے آیا؟"

میڈم صفورا نے کوٹھڑی کی کھردری دیوار سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور بولی۔ "یہ صرف چوری کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک "خاص" مجسمہ چوری ہوا تھا جو "مت" کو ماننے والوں کے لیے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔ مت کی تعلیمات کے مطابق اپرادھیوں کے لیے ایک کڑی سزا مقرر تھی۔ اگر اپرادھی یعنی ہم اس سزا سے بچ جاتے تو اس کا وبال گرو حضرات پر اور پورے مٹھ پر آتا۔ لہٰذا ہمیں سزا کے لیے یہاں زندہ لایا جانا ضروری تھا۔ کم از کم دو چار افراد کو تو یہاں ضرور پہنچنا چاہیے تھا اور اگر زیادہ لوگ پہنچ جاتے تو یہ پانڈے اور اس کے ساتھیوں کی "ایکسٹرا پرفارمنس" تھی۔ اب ہم اسے اپنی خوش قسمتی کہہ لیں یا بدقسمتی... کہ ہم پاکستان میں پانڈے کی یورش سے تو بچ گئے لیکن عمر قید بھگتنے کے لیے یہاں پہنچ گئے۔ ہم کل پانچ افراد یہاں آئے تھے۔ تم، میں، ابرار صدیقی، عنایت علی اور کرامت سندھو۔ عنایت اور کرامت سندھو کو تم نہیں جانتے بلکہ میں بھی نہیں جانتی۔ بہرحال، یہ بھی اس سلسلے میں شامل تھے اور مجسمہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو کر صدیقی تک پہنچا تھا۔ ان دونوں بندوں کو پانڈے اور اس کے ساتھیوں نے بہاولپور سے پکڑا تھا۔ بہرحال، یہ لوگ بعد میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش میں مارے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جنگل میں انہیں تیندووں نے مار دیا تھا... اب ہم تین یہاں باقی ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ہمارا "اینڈ" کیا ہوتا ہے۔"

میرے اور صفورا کے درمیان تادیر گفتگو ہوتی رہی۔ میڈم صفورا نے تصدیق کی کہ میں نے سات آٹھ ماہ یہاں پگوڈا میں سزا کاٹی ہے۔ ہم سے جبری فاقے کرائے گئے ہیں، ہم نے ماریں کھائی ہیں، صفائیاں کی ہیں، غلاظت خانے دھوئے ہیں اور پتا نہیں کیا کچھ... میڈم جب یہ باتیں کر رہی تھی، میرے ذہن میں دھندلے سے نقش بنتے اور بگڑتے تھے مگر کچھ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ میڈم نے اس بات کی تصدیق بھی کی کہ میں یہاں سے فرار ہونے کی کئی کوششیں کر چکا ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! مجھے یہ بات غنی صاحب اور چوہان نے بھی بتائی تھی مگر مجھے اس پر یقین نہیں ہوا تھا لیکن اب ہوش میں آنے کے بعد میں خود اس تجربے سے گزرا ہوں۔ یہاں زرگاں پہنچنے سے ایک رات پہلے میں پڑاؤ سے بھاگ گیا تھا..."

میں نے طوفانی بارش میں اپنے ناکام فرار کی ساری روداد میڈم صفورا کے گوش گزار کی اور یہ بھی بتایا کہ آخر میں مجھے کس طرح بالکل غیر متوقع طور پر پکڑ لیا گیا۔ بالکل جیسے تاریک زمین نے تیواری اور ڈیوڈ وغیرہ کو اگل دیا ہو اور وہ اچانک میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں۔

میں نے کہا۔ "میڈم! میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ یہ لوگ وہاں اچانک کیسے نمودار ہو گئے۔ یہ تحت حیران کرنے والی بات ہے... میری جگہ کوئی اور بندہ ہوتا جسے جادو ٹونے اور عملیات وغیرہ پر یقین ہوتا تو فوراً اس کا دھیان ان چیزوں کی طرف چلا جاتا۔ مگر یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔"

صفورا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں... کچھ ایسی باتیں تو میں نے بھی سنی ہیں کہ پنڈت مہاراج کی آشیر باد سے حکم جی کو روحانی طاقت حاصل ہے اور اس طاقت کی وجہ سے حکم جی کا کوئی قیدی ان کی مرضی کے بغیر اس راجواڑے کی حد سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوشش کرے تو پکڑا جاتا ہے یا مارا جاتا ہے... اور پچھلے کئی برس سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ کو اس بات پر یقین ہے؟"

"نہیں، یقین تو نہیں... لیکن... جب بہت سے لوگ ایک ہی بات کہیں اور بار بار کہیں تو دماغ الجھ ضرور جاتا ہے۔ اب تم بھی ایک تجربہ بیان کر رہے ہو اور یہ تمہارا ذاتی تجربہ ہے۔ ایسی باتوں سے لگتا ہے کہ اس معاملے میں کوئی نہ کوئی بھید ضرور ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ روحانی طاقت والی بات صرف قیدیوں کی حد تک ہی نہیں ہے، مقامی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "حکم جی" کئی ایسے کام کر سکتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے ممکن نہیں۔"

بات کرتے کرتے اچانک صفورا کا ماتھا ٹھٹکا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ سب سے پہلے میری نظر تیواری لال کے گہرے سانولے چہرے پر ہی پڑی۔ وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا پگوڈا کے صحن میں داخل ہوا تھا اور اب میری کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ سبز وردیوں والے تین چار مسلح اہلکار بھی تھے۔ ان کی رائفلیں کپڑوں کے غلافوں میں بند تھیں اور وہ پگوڈا کے احترام میں ننگے پاؤں تھے۔

صفورا نے ٹھٹکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے لیے ہی آئے ہیں..."

دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ سر پر پہنچ گئے۔ ان کے پیچھے ایک بوڑھا بھکشو لاٹھی ٹیکتا چلا آ رہا تھا۔ تیواری کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے صاف طور پر طیش اور حسد دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے بھکشو کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا تھا۔ اس نے صفورا کو مخاطب کر کے کہا۔ "کورتی! تم مٹھ میں واپس جاؤ۔ یہاں کیا کرت ہو؟ یہاں تمہارا کوئی کام نا ہیں۔"

صفورا اٹھی اور مایوس نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کوٹھڑی سے نکل گئی۔ بوڑھے بھکشو نے ایک چھوٹی چابی کی مدد سے میرے گلے کا آہنی کڑا کھول دیا۔ ایک دوسرا بھکشو آگے بڑھا اور اس نے پاؤں سے زنجیر علیحدہ کر دی۔

"چلو۔" تیواری لال نے تحکم سے کہا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" اس کے ساتھ ہی ایک باوردی شخص نے مجھے دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے دیکھا، بوڑھے بھکشو کی آنکھوں میں میرے لیے ترحم تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے بسی بھی تھی۔ وہ میرے لیے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

باوردی اہل کار مجھے پگوڈا سے باہر لے کر آئے۔ یہاں سیڑھیوں پر ایک کوڑھی شخص کو بیدوں کی سزا دی جا رہی تھی۔ ارد گرد کئی افراد کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ مجھے ایک بند گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ جونہی گاڑی کا دروازہ بند ہوا، تیواری لال نے مجھے سر کے بالوں سے پکڑ کر کئی زوردار جھٹکے دیے... اور گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ باوردی افراد بھی مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہے تھے۔ دس پندرہ منٹ بعد گاڑی ایک بہت بڑی پختہ عمارت میں داخل ہوئی۔ لگتا تھا کہ یہ انگریزی دور حکومت کا کوئی بہت بڑا دفتر ہے لیکن کچھ دیر بعد پتا چلا کہ یہ قدیم عمارت زرگاں کی جیل ہے... میں نے قیدیوں کو خاکی وردی میں ملبوس ادھر سے ادھر جاتے اور مشقت وغیرہ کرتے دیکھا۔ ان کی قمیصوں پر ہندی میں کچھ لکھا تھا اور نمبر لگے ہوئے تھے۔

مجھے گاڑی سے اتار کر ایک دفتر میں پہنچایا گیا۔ یہاں نہایت کرخت شکل والا ایک ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میرے کوائف لکھے پھر ایک رجسٹر پر دو تین جگہ میرا انگوٹھا لگوایا۔ مجھے نمبر الاٹ کیا گیا 412۔ اس کے بعد مجھے پاجامے کرتے پر مشتمل خاکی وردی دی گئی۔ مجھے ایک غلیظ کمرے میں دھکیل دیا گیا تاکہ میں وردی پہن سکوں۔ میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ان احکامات پر عمل کروں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مجھے کسی بیرک میں دھکیل دیا جائے گا جہاں نہایت واہیات قسم کے بدبودار لوگ بند ہوں گے لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ مجھے ایک چھوٹے احاطے میں لے جا کر ایک دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھایا گیا۔ اس گاڑی میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ باوردی افراد بدستور میرے ساتھ موجود تھے لیکن اب "سیاہ چہرہ" تیواری لال نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھوڑا گاڑی ایک چھوٹے دروازے سے باہر نکلی۔ غالباً یہ جیل کا کوئی عقبی دروازہ تھا۔ دس پندرہ منٹ تک سفر کرنے کے بعد ہم ایک اور عمارت میں داخل ہوئے۔ میں گھوڑا گاڑی سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ راج بھون کی پرشکوہ عمارت یہاں سے بس نصف فرلانگ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی۔ میں جس عمارت میں کھڑا تھا، یہ بھی کافی شان دار تھی۔ اس کے ادھ کھلے مین گیٹ میں سے ندی کا شفاف پانی جھلک دکھا رہا تھا۔ عمارت کے سرسبز لانوں

www.pkdigest.com

میں سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں اور کچھ لوگ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

...تب ہی میری نظر جارج گورا پر پڑی۔ وہ عمارت کے اندرونی دروازے سے نکل کر آیا تھا۔ اس کی بغل میں ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں گلاس تھا۔ ایک باوردی اہل کار نے سلیوٹ مارنے کے بعد کہا۔ ''بندہ حاضر ہے سر!''

جارج گورا نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ ابھی اسے سرونٹ کوارٹر میں لے جاؤ۔ ہاتھ دغیرہ کرواؤ۔ دوسرے کپڑے دو۔ پھر ہم اس کے بارے میں بتائیں گا۔''

مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہوں۔ مجھے دھکیل کر سرونٹ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں دیگر ملازمین بھی موجود تھے۔ وہ میرے ابتر حلیے اور زخم زخم جسم کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دو نے مجھ پر فقرے بھی کسے۔ مجھے ایک کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں منجے کٹے جسم اور عقابی آنکھوں والا ایک ملہوترا نامی ملازم میرا روم میٹ تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، ملہوترا یہاں گھوڑوں کا ٹرینر تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سرکش سے سرکش گھوڑا بھی جب پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہے تو اس کی آدھی سرکشی ختم ہو جاتی ہے۔

رات کو سونے سے پہلے ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''سنا ہے کہ تمہیں بھاگنے کی بیماری ہے۔ یہاں اس بیماری سے دور ہی رہو گے تو اچھا ہووے گا۔ رات کو احاطے میں تین کتے کھلے چھوڑے جاوت ہیں اور ان میں سے ہر کتا تیندوے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ بندے کو پھاڑتے پہلے ہیں، اس کا نام بعد میں پوچھتے ہیں...''

رات کو واقعی کوٹھی کے احاطے کی طرف سے دیو ہیکل کتوں کی دبی دبی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ یقیناً یہاں کافی تعداد میں پہرے دار بھی موجود تھے۔ کوٹھی کے اندر کہیں مدھم آواز میں پیانو بج رہا تھا اور رقص کی دھن فضا میں بکھر رہی تھی۔ میں جب تک سو نہیں گیا، ملہوترا بھی جاگتا رہا اور بیڑی کے کش لیتا رہا۔ یقیناً وہ میرا روم میٹ ہونے کے ساتھ ساتھ میرا نگراں بھی تھا۔

صبح جاگنے کے ساتھ ہی میرے ذہن میں پھر ان گنت اندیشے سر اٹھانے لگے۔ مجھے پکوڑا سے جیل لے جایا گیا تھا مگر وہاں بھی ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھا گیا تھا۔ اب یہاں میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک ہونے والا تھا۔ ناشتے کے فوراً بعد ملہوترا مجھے لے کر عمارت کے عقب میں گیا۔ یہاں ایک بہت بڑا اصطبل تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سو چھوٹے بڑے گھوڑے تو یہاں ہوں گے۔ خچروں کے لیے ایک بہت بڑا واڑا علیحدہ سے بنایا گیا تھا۔

ملہوترا نے مجھ سے کہا۔ ''تمہیں یہیں پہ کام کرنا ہے۔ کچھ کام تو تمہیں آتے ہوں گے، کچھ کام تھوڑے سے تجربے کے بعد سیکھ جاؤ گے۔ گھوڑوں کی لید وغیرہ ڈھونے کے لیے کسی خاص ٹریننگ کی ضرورت ناہیں ہووے ہے۔ ہاں، ان کا کھریرا کرنا، ان کو دوا وغیرہ کھلانا یہ کام ذرا مشکل ہوویں ہیں۔ یہ آٹھ دس دن میں سیکھ جاؤ گے۔ ناہیں سیکھو گے تو پھر میں سکھا دوں گا۔'' آخر میں اس کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔

بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔''

''دیکھو، یہاں اس سے گندے گندے کام بھی موجود ہیں۔ اسے گورا صاحب کی مہربانی جانو کہ تمہیں اصطبل تک رکھا ہے۔ وہ دیکھو، وہاں کتوں کا واڑا ہے۔ اس سے آگے پالتو سور ہیں۔ سوروں کے گند میں رہ لو گے؟'' اس نے آخری الفاظ بڑی ''محبت'' سے کہے۔

اگلے تین چار دن میری مصروفیت بے حد کڑی اور ناپسندیدہ رہی۔ مجھے علی الصباح منہ اندھیرے اٹھنا پڑتا تھا۔ اس کے لیے ایک الارم تھوڑے تھوڑے وقفے سے تین بار بجایا جاتا تھا۔ ایک رات میں نے ایک بہت تیز اور کریہہ آواز والا سائرن بھی سنا۔ پتا چلا کہ یہ خطرے کا سائرن ہے اور عموماً عمارت کے قریب کسی جنگلی جانور کی موجودگی کے وقت بجایا جاتا ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی اصطبل میں میرا کام شروع ہو جاتا تھا۔ اصطبل کے دروازے ساری رات بند رہتے تھے لہٰذا علی الصباح جانوروں کی جو بُو اندر سے اٹھتی تھی وہ ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ اصطبل میں کم و بیش تیس ملازم تھے۔ ملہوترا ان کا سیکنڈ انچارج تھا۔ وہ سارا دن اصطبل کے طول و عرض میں دندناتا اور ملازموں کو ڈانٹتا ڈپٹتا رہتا۔ مجھ پر وہ خاص شفقت فرماتا تھا۔ کسی چھوٹی سی غلطی کے لیے بالوں سے پکڑ کر بُری طرح جھنجوڑ دیتا تھا اور مقامی لہجے میں گالیاں دیتا تھا۔ وہ مجھے کسی ایک کام پر ٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ کبھی ماشیوں میں شامل کر دیتا تھا، کبھی گھوڑوں کو کھریاں لگانے والوں میں۔ کبھی چارے کا انتظام کرنے والوں میں۔ گاہے بگاہے وہ مجھے سخت طنز کا نشانہ بھی بناتا تھا۔

ایک دن میرے قریب سے گزرا تو ایک سینئر ملازم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اوئے نادر! لید کی ٹوکری اس کے

کندھے پر کیوں رکھوائی ہوئی ہے۔ تمہیں پتا ناہیں یہ سلطانہ راجپوت کا شوہر نامدار ہے۔ آخر کوئی عزت ہووے ہے شوہر نامدار کی۔''

سینئر ملازم نے فوراً ٹوکری میرے کندھے سے اٹھائی۔ ملہوترا بڑی محبت سے بولا۔ ''مہروز جی! آپ ان چار سفید گھوڑیوں کا کھریرا کر لیں۔ دوپہر کے بھوجن تک کے لیے یہ کام کافی ہے۔''

کھر کھرا یعنی کھریرا میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میں اس میں صرف پندرہ بیس فیصد مہارت ہی حاصل کر پایا تھا۔ ایک ملازم نے کھریرے والا برش مجھے پکڑا دیا۔ میں ڈرتے ڈرتے پہلی گھوڑی کے پاس گیا۔ وہ اچھل کر ایک طرف ہو گئی۔ میں نے دوسری کوشش کی تو اس نے ایک دم گھوم کر لات چلائی۔ میں الرٹ تھا اس لیے سنگین ضرب سے بچ گیا۔ اس کے باوجود لات میرے کندھے پر لگی اور میں الٹ کر گیلی زمین پر جا گرا۔ یہ جگہ پیشاب اور لید سے لتھڑی ہوئی تھی۔ میرا ایک پہلو اور چہرے کی سائڈ بُری طرح لتھڑ گئی۔ اردگرد موجود افراد ہنسنے لگے۔ جی چاہا کہ ان میں سے کسی ایک پر جھپٹ پڑوں اور دو چار گھونسے تو ضرور جڑ دوں لیکن پھر اس کے بعد کی صورتِ حال ذہن میں آئی اور دل مسوس کر رہ گیا۔

ملہوترا کے اشارے پر سینئر ملازم نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا اور بولا۔ ''تم نے پرسوں بھی کہا تھا۔ پیچھے سے ناہیں سائڈ کی طرف سے آوت ہیں۔''

''اصل میں مہروز صاحب کے ساتھ یادداشت کا مسئلہ ہے بھئی۔'' ملہوترا نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ ''ان کی یادداشت کے ساتھ عجیب گڑبڑ گھوٹالا ہے۔ ان کو دس دن کی باتیں یاد آتی ہیں تو پچھلے دس دن کی بھول جاوت ہیں۔ اور جب وہ یاد آتی ہیں تو اگلے دس دن کا دروازہ بند ہو جاوت ہے۔ یہ اپنے ٹائپ کے بڑے انوکھے مریض ہیں... ان کو تو کسی میوزیم میں ہونا چاہیے جہاں لوگ ان کو دیکھنے آویں اور بھگوان کے چمتکار کا نظارہ کریں۔'' اس قسم کے مذاق میرے ساتھ اکثر کیے جاتے تھے۔

ایک دوپہر عجیب تماشا ہوا۔ میرے علاوہ چھ سات ملازمین اصطبل میں موجود تھے۔ ہم گھوڑوں کے لیے چارا بنا رہے تھے۔ خشک اور تر چارے کو علیحدہ علیحدہ کاٹنا اور پھر اسے مکس کر کے کھرلیوں میں ڈالنا ایک نہایت مشقت طلب کام تھا۔ ہم پسینے سے شرابور ہو رہے تھے... اچانک ایک خوب صورت لڑکی بھاگتی ہوئی آئی۔ غالباً وہ یہ سمجھی تھی کہ اصطبل کے اس حصے میں کوئی موجود نہیں۔ اس نے اندر آ کر دروازہ تیزی سے بند کرنا چاہا مگر ایک شخص دروازے کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔

لڑکی ہنستی اور بل کھاتی ہوئی اصطبل کے اندرونی حصے کی طرف بھاگی۔ اس کے پیچھے آنے والا مرد اسے پکڑنے کے لیے دوڑا۔ ہم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ کوئی اور نہیں، یہاں کا کرتا دھرتا جارج گورا تھا۔ وہ نشے میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر بس ایک پتلون تھی۔ وہ بڑے رومانی موڈ میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جلد ہی لڑکی کو پکڑ لیا اور گھاس کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا لیا۔ لڑکی کے جسم سے ہنسی فوارے کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہونے لگے۔

ملہوترا تیز سرگوشی میں بولا۔ ''چلو چلو... باہر چلو۔'' وہ ملازمین سے مخاطب تھا۔

ملازمین نے شوخ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے باہر کھسک گئے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ جارج گورا اور لڑکی گھاس کی حرکت میں گم ہو چکے تھے...

میں دنگ رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ عمارت جارج کی شکارگاہ ہے۔ وہ جہاں اور جب چاہتا ہے، شکار کرتا ہے۔ اپنی طلب کی شدت میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کے اردگرد کا ماحول کیا ہے۔ یہاں کے لوگ غالباً اس کے مزاج کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ موقع کے لحاظ سے اپنا ردِعمل ظاہر کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے اب کیا تھا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل آئے تھے۔ ابھی تو مالک نشے میں تھا۔ کل وہ ہوش میں ہوتا تو جواب طلبی کرتا کہ جب وہ اتنے شدید رومانی موڈ میں تھا تو وہ لوگ موقع سے دفعان کیوں نہیں ہوئے تھے۔

ابھی تک میرے ساتھ سختی کا سلوک نہیں ہوا تھا۔ مطلب جسمانی تشدد سے ہے۔ ہاں، اگر بارہ گھنٹے کی شدید مشقت کو دیکھا جائے تو اسے جسمانی تشدد بھی کہا جا سکتا تھا۔ ذہنی تشدد اس کے علاوہ تھا۔ یعنی طنزیہ انداز اور بعض اوقات گالم گلوچ۔ ذہن میں وہ جو ایک اندیشہ سا تھا کہ شاید مجھے الٹا لٹکایا جائے گا یا اس نوع کی کوئی اور کارروائی ہو گی، ابھی تک غلط نکلا تھا۔ لیکن پھر ایک روز ایسا کچھ ہوا جس نے ساری کسر نکال دی۔ وہ میری زندگی کا ایک ایسا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے کہ جسے اپنے خونی آنسوؤں سے تحریر کروں تو بھی حق ادا نہ ہو۔ اور یہ ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے بدلا، میری سوچ کو بدلا اور شاید زندگی کا رخ ہی بدل دیا۔ میں وہ نہ رہا جو تھا اور وہ ہو گیا جو نہیں تھا... جو ہزار کوشش کے باوجود نہیں بن سکتا تھا۔

www.pkdigest.com

ہاں، وہ ایسے ہی کایا پلٹ لیے تھے۔

شام کے بعد کا وقت تھا۔ میں اصطبل کے کام سے تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ لگتا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو جاؤں گا۔ میں نے سارے دن کی بدبو اور پسینے کی چپچپاہٹ کو صاف کرنے کے لیے غسل خانے کا رخ کیا۔ شیو کئی دن سے بڑھی ہوئی تھی لیکن شیو کرنے کا سامان نہیں تھا۔ میں نے نیم ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد کپڑے بدلے اور کھانا کھایا۔ ابھی بستر پر لیٹنے ہی لگا تھا کہ ایک شخص کوارٹر میں داخل ہوا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ ”تمہیں بڑے صاحب بہادر نے بلایا ہے۔“

”کیوں خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خیریت کا پتا تو تمہیں وہاں جا کر ہی لگے گا۔ ویسے ڈرنے کی بات ناہیں۔ صاحب بہادر کا ذاتی ملازم اچانک چھٹی پر چلا گیا ہے۔ تمہیں ایک دن کے لیے اس کی جگہ لینی ہے۔“

”ابھی جانا ہوگا؟“

”ناہیں۔ جانا تو دو تین روز بعد ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ کو پہلے ہی بتا دوں تاکہ آپ اپنے مصروف وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال سکیں۔“ سخت طنزیہ لہجے میں کہا گیا۔

میں اٹھ کر اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ مجھے وسیع گراسی لان میں سے گزار کر عمارت کے رہائشی حصے میں لے گیا۔ یہ قدیم طرز کی عمارت شاہانہ ٹھاٹ باٹ رکھتی تھی۔ بلند چھتیں، محرابی دروازے، پتھر کے چکنے فرش، دبیز پردے، غالیچے اور نادر قالین۔ غرض وہ ہر شے یہاں دکھائی دیتی تھی جس کا تصور کسی بہترین رہائشی عمارت میں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں جنریٹرز کے ذریعے بجلی مہیا کی گئی تھی اور وہ ساری آسائشیں بھی موجود تھیں جن کے لیے بجلی ضروری ہوتی ہے۔ باوردی ملازمین بے آواز چلتے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان میں مرد و زن دونوں شامل تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ملازموں کی اس فوج ظفر موج کے ہوتے ہوئے میری خدمت کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ اس میں کوئی چکر لگتا تھا۔ میں ایک طویل راہداری سے گزر کر ایک شاندار بیڈروم میں پہنچا۔ یہاں خوشبوؤں کا بسیرا تھا۔ کھڑکیوں پر مخملی پردے تھے۔ سجاوٹ کی امپورٹڈ اشیا اور دیواروں پر سجی ہوئی ان جانوروں کی ٹرافیاں جو جارج گورا کے دستِ ستم کا شکار ہوئے تھے۔ بنگال رائفلوں کے ایک نہایت قیمتی جوڑے کے نیچے دیوار پر ایک رائل بنگال ٹائیگر کی کھال آویزاں تھی۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے بیڈروم کی جھاڑ پونچھ کا حکم دیا۔ کھڑکیوں کے پردے تبدیل کیے جانے تھے اور پھر بیڈ شیٹ بدلنی تھی۔ ایک طرف بہت سے تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔ ان پھولوں کو گل دانوں میں سجانا تھا اور واش روم پر بھی ایک نظر ڈالنی تھی۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں، میں نے یہ کام کر دیے اور ایک طرف قالین پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہاں لانے والا شخص اندر آیا۔ اس نے ناقدانہ نظروں سے بیڈروم کا جائزہ لیا۔ ایک دو نقص نکالے، میں نے دو نقص دور کیے۔ وہ مجھے لے کر ایک اور کمرے میں آ گیا۔ یہ کمرا عجیب وضع کا تھا... بالکل جیسے کوئی لفٹ ہو۔ لگتا تھا کہ یہ چھوٹا سا چوکور کمرا سارے کا سارا دھات کا بنا ہوا ہے۔ اس کی پیمائش آٹھ فٹ ضرب دس فٹ ہوگی... یا شاید اس سے تھوڑی سی زیادہ۔ یہاں ایک طرف کی دیوار میں آہنی سلاخیں تھیں لیکن سلاخوں کی دوسری طرف بھی کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سلاخوں سے آگے قریباً چار فٹ کے فاصلے پر ایک بلائنڈ شیشہ تھا۔

ملازم نے مجھے اس کمرے میں دھکیل دیا۔ ”مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”قوالی۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور دروازہ لاک کر کے باہر چلا گیا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سلطانہ اس وقت میرے آس پاس موجود ہے اور جلد ہی میری اس سے ملاقات ہونے والی ہے۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ طبیعت میں عجیب کل بے چینی تھی۔ مجھے یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ کیا جارج مجھ سے کسی طرح کی پوچھ گچھ کرنے والا تھا یا اس کی رقابت مجھے کسی اذیت سے دوچار کرنے والی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا کہ میرے دونوں پاؤں پر کسی نے بڑے زور سے لٹھ رسید کی ہو۔ ٹانگیں جھنجنا اٹھیں بلکہ پورا جسم جھنجھنا گیا۔ میں تڑپ کر کرسی سے نیچے گرا اور لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ میرے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑے برس گئے تھے اور پھر ایک دم سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے کرنٹ لگایا گیا ہے۔ میرے جسم میں غالباً صرف تین چار سیکنڈ کے لیے برقی لہر دوڑی تھی لیکن اس نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں کچھ دیر تک سکتہ زدہ وہیں پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گیا... پھر دوسرا حملہ ہوا اور یہ پہلے سے کچھ شدید تھا۔ میرا پورا جسم پھر برقی رو کی زد میں آیا۔ اس دفعہ میں اوندھے منہ آہنی فرش پر گرا اور ایک بار پھر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اس مرتبہ میرے منہ سے بے ساختہ دردناک آوازیں نکلیں۔ میں

چلّا رہا تھا اور چلّاتا جا رہا تھا۔ مجھے لگا کہ آخری وقت آ گیا ہے... بس وہ ایک قیامت تھی جس کی شدت کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا اور تب ایک بار پھر اچانک سب کچھ ختم گیا۔ جیسے کسی عفریت نے مجھے نگلنے کے بعد دوبارہ اگل دیا ہو۔ میں کراہنے لگا۔ میرا سارا جسم لرز رہا تھا اور درد کی ٹیسیں بے حال کر رہی تھیں۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟ میرا جرم کیا ہے؟“ میں خوف زدہ ہو کر چلّایا۔

یہ خوف بے پناہ شدت کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا کہ ابھی اس دھاتی کمرے میں پھر کرنٹ چھوڑا جائے گا اور میں موت اور زندگی کے درمیان جھول جاؤں گا۔ سزا دینے والا سامنے ہو تو اور بات ہوتی ہے۔ یہاں سزا دینے والے کا پتا تھا، نہ سزا کی وجہ معلوم تھی۔ نہ یہ پتا تھا کہ اس سزا سے بچنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا۔ یہ زیادہ خطرناک صورتِ حال تھی۔ مجھے لگا کہ دہشت سے میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں اس چوکور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسٹیل کا یہ سلائیڈنگ ڈور لاک تھا۔ میں نے اس پر بے دریغ مکے برسائے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ نہ ہی کسی نے میری آواز سنی۔ میں ننگے پاؤں تھا اور برقی رو کسی بھی وقت دوبارہ فرش میں اور دیواروں میں دوڑ سکتی تھی۔ ایک اضطراری حرکت کے تحت میں کرسی پر چڑھ گیا۔ اپنے دونوں پاؤں سمیٹ کر اوپر رکھ لیے لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ بظاہر عام نظر آنے والی یہ کرسی بھی دھات کی ہے۔ اس مرتبہ کرنٹ لگا تو میں جیسے کرسی کے ساتھ ہی چپکا رہ گیا۔ پورا جسم شدید ارتعاش کی زد میں آیا اور میرے حواس مختل ہونے لگے۔ مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو رہا ہوں، پھر شاید کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے۔ میری نگاہوں میں اپنے پیاروں کی شکلیں گھومیں۔ فرح، عاطف اور ثروت... کیا انہیں کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں کہاں اور کس حال میں شکار ہوا؟

میں مر رہا تھا... جب اچانک ایک بار پھر سب کچھ تھم گیا۔ مجھے لگا کہ میرے منہ سے رال گر رہی ہے اور ناک سے پانی بہہ رہا ہے۔ پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے اپنی ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو لگا کہ وہ منوں وزنی ہو گیا ہے۔ ان آخری برقی جھٹکوں کے دوران بھی میں بُری طرح چلّایا تھا اور میرے گلے کے اندر خراشوں کی جلن تھی۔

میں نے بولنا چاہا تو بولا نہیں گیا۔ میری یہ حالت بس آٹھ دس منٹ کے اندر ہوئی تھی۔

کیوں ہو رہا تھا میرے ساتھ یہ سب کچھ؟ کیا یہ صرف رقابت کی کارستانی تھی؟ مجھے جسمانی اذیت دے کر لطف لیا گیا تھا؟ لیکن یہاں تو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں تھا تو کیا کسی ویڈیو کیمرے وغیرہ کے ذریعے مجھے دیکھا جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہی منحوس شخص مسکراتے چہرے کے ساتھ اندر آیا جو مجھے اس عقوبت خانے تک پہنچا کر گیا تھا۔ اس نے مجھے ایک تولیا دیا جس سے میں نے اپنا پسینا پسینا چہرہ پونچھا۔ اس کے ہاتھ میں ملک شیک کا گلاس تھا۔ اس نے مجھے ملک شیک پلایا۔ اس کے بعد مجھے تسلی دی کہ اب کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہاں آرام کر سکتا ہوں۔ میں ایک سیکنڈ سے پہلے یہاں سے نکلنے کا آرزومند تھا لیکن وہ مجھے یہاں رکھنے پر مصر تھا۔ اس نے ایک کرسی کو اسٹریچ کر دیا۔ وہ آرام دہ کرسی بن گئی۔ وہ خود باہر چلا گیا۔

اگلے قریباً دو گھنٹے میں نے اسی لفٹ نما کمرے میں گزارے۔ میری حالت اب بہتر تھی لیکن وہ جو برقی رو کا خوف سا دل میں جاگزیں ہو گیا تھا، وہ کسی طور نکل نہیں رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اچانک آہنی کمرے کا دروازہ پھر کھلا اور ملازم نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ ہم ایک خم کھاتے ہوئے کوریڈور سے گزر کر پھر اسی بیڈروم میں آ گئے جسے ڈھائی تین گھنٹے پہلے میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔ مگر اب یہ بیڈروم خالی نہیں تھا۔ یہاں جارج گورا کے علاوہ جو چہرہ مجھے نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ یہ سلطانہ تھی جسے میری بیوی بتایا جاتا تھا۔ سلطانہ کی نظر مجھ سے ملی اور ایک دم جھک گئی۔ مجھے اس میں وہ دم خم نظر نہیں آیا جو اب تک آ تا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں روئی روئی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی اور خاموشی سے ایک ٹی ٹرالی پر جھکی، چائے بنا رہی تھی... اس کا لباس بھی آج مختلف تھا۔ اس نے بروکیڈ کا چمکیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ آدھی آستینوں میں سے اس کے سڈول بازو جھلک دکھا رہے تھے۔ اس کے لمبے بال ایک موٹی چوٹی کی صورت اس کی گود تک پہنچ رہے تھے۔ ہاں، زیور نام کی کوئی شے آج بھی اس کے جسم پر نہیں تھی۔

”تم بھی چائے پیئیں گا؟“ جارج نے گلابی اردو میں پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”شاید تم بھی ان لوگوں میں سے ہے جن کو دوسروں کی وائف کا بنایا ہوا چائے اچھا لگتا ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ اگر تم کسی دوسرے کی وائف کے ہاتھ کا چائے پینا مانگتا ہے تو اس کا انتظام بھی ہو جائیں گا آج کی

www.pkdigest.com

رات۔ ویسے ہم تو آج کی رات تمہاری وائف کے ہاتھ کا چائے ہی پئیں گا۔''

میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جارج کی ذو معنی گفتگو اس کے خطرناک ارادوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ چوہان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ جیل کا انچارج بھی ہے۔ اس کے لیے سلطانہ کو جیل سے نکال کر یہاں اپنے عشرت کدے میں لے آنا کون سا مشکل کام تھا؟ لیکن مجھے حیرانی سلطانہ کا غیر مزاحمتی رویّہ دیکھ کر ہو رہی تھی۔ اس نے جارج کی ذو معنی گفتگو ان سنی کر دی تھی اور خاموشی سے چائے بنا رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اس کی سمجھ بھی آ گئی۔ میں سناٹے میں رہ گیا۔ میری نگاہ واش روم کے دروازے کے ساتھ ہی ایک سنہری چوکور شیشے پر پڑی۔ اس سے پہلے جب میں نے اس کمرے کی صفائی کی تھی تو اس شیشے پر مخملی پردہ پڑا ہوا تھا۔ یہ وہی بلائنڈ شیشہ تھا جسے میں نے اپنے آہنی عقوبت خانے میں سے دیکھا تھا۔ بیڈ روم کی طرف سے یہ بلائنڈ نہیں تھا۔ یہاں سے عقوبت خانے کی آہنی سلاخیں اور سلاخوں کے پیچھے کا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دونوں کرسیاں جن پر میں بیٹھا تھا اور وہ خالی گلاس بھی جس میں سے میں نے ملک شیک پیا تھا۔

میں چکرا گیا۔ تو کیا اس بیڈ روم کے اندر سے کوئی میری اذیت کا تماشا دیکھتا رہا ہے... وہ کون ہو سکتا تھا؟

جارج اور... سلطانہ ہی ہو سکتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سلطانہ کی آنکھوں کی غم زدہ سرخی بھی سمجھ میں آ گئی۔ ''او گاڈ...'' تو یہاں یہ تماشا ہوا تھا۔ عقوبت خانے کا آہنی کمرا ساؤنڈ پروف تھا، لہٰذا باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ ممکن تھا کہ میرے تڑپنے پھڑکنے کا منظر دیکھ کر سلطانہ نے واویلا مچایا ہو۔ داد فریاد کی ہو لیکن باہر کی کوئی آواز مجھ تک نہیں پہنچی تھی۔ اندھے شیشے کی وجہ سے میں باہر کا منظر دیکھنے سے بھی قاصر رہا تھا۔

میرا جی چاہا کہ نتائج سے بے پروا ہو کر اس سفید سور پر جھپٹ پڑوں۔ وہ سب کچھ کر گزروں جو کر سکتا ہوں لیکن دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرا چہرہ سفید ہوتا جا رہا ہے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' جارج نے میری آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' میں گڑبڑا گیا۔

''میں بتاتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ سلطانہ تمہارا وائف ہے اور تم اپنی وائف کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہو۔ شاید تمہارا دل چاہ رہا ہے کہ مجھ پر جھپٹ پڑو۔ میرے ساتھ فائٹ کرو۔ ایک زبردست فائٹ جسے دیکھ کر تمہاری وائف کا ہارٹ خوش ہو جائے۔ پھر تم میرے ہی پسٹل سے مجھ کو شوٹ کر دو اور اپنی وائف کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتے ہوئے یہاں سے نکل جاؤ۔''

میں خاموش رہا۔ وہ بڑے زہریلے انداز میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سب جانتا ہوں تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ تم مجھے ایک بہت بڑا ولن سمجھ رہے ہو جس نے اپنے گارڈز کے زور سے تمہیں بے بس کیا ہے اور اب ایک کمزور عورت کو اپنی طاقت دکھانا چاہ رہا ہو۔ ایسا نہیں ہے مائی ڈیئر... بالکل بھی نہیں ہے۔ مجھے ولن بننا بھی اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی مجھے ولن سمجھے... چلو، میں تمہیں ایک HEROIC چانس پیش کرتا ہوں۔ تم سمجھو کہ تم قید نہیں، آزاد ہو۔ تمہارے اردگرد کوئی گارڈ نہیں۔ بس میں اور تم اکیلے ہیں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور مجھے سرتاپا دیکھ کر بولا۔ ''اور دیکھا جائے تو تم مجھ سے کمزور نہیں ہو۔ قد بھی مجھ سے تھوڑا سا زیادہ ہی ہو گیں گا۔ تم اپنی وائف کو یہاں سے لے جانے کے لیے مجھ سے دوبدو مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ اور میں پرامس کرتا ہوں کہ اگر تم نے مجھے زیر کر لیا تو تم سے کوئی بازپرس نہیں ہوگی۔ تم پوری آزادی کے ساتھ اپنی وائف کو لے کر یہاں سے جا سکے گا۔ آئی پرامس یو۔''

میں سکتہ زدہ کھڑا تھا۔ اس نے گلاس میں سے شراب کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا اور اپنی قمیص کے نیچے سے کولٹ پسٹل نکال کر سامنے قالین پر پھینک دیا۔ پسٹل کا فاصلہ جارج سے قریباً پندرہ فٹ اور مجھ سے صرف سات آٹھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ کھلنڈرے انداز میں بولا۔ ''پسٹل اٹھاؤ اور کوشش کرو میری باڈی میں ایک ہول کرنے کی۔ چلو شاباش۔''

میرے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ وہ دعوت دے رہا تھا۔ پستول کا فاصلہ مجھ سے بہت کم تھا۔ اگر میں تیزی سے لپکتا تو پستول اٹھا سکتا تھا۔

لیکن پھر وہی تذبذب... وہی کم ہمتی... وہی ناتوانی۔ مجھے اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ میں جانتا تھا کہ جونہی میں پستول کی طرف جھپٹوں گا، جارج بھی جھپٹے گا۔ وہ ایک گھاگ شکاری تھا۔ اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس اعتماد نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ سلطانہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ اسے شاید اس ڈرامائی صورتِ حال کی توقع نہیں تھی۔

قریباً ایک منٹ گزر گیا۔ میری پیشانی سے پسینا ٹپکنے لگا۔ میں پستول کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ جارج کی آنکھوں میں استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے پاؤں کی حرکت سے پسٹل کو کچھ اور بھی میری طرف کھسکا دیا۔ تب وہ دوبارہ پہلے والی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب کیا خیال ہے شوہر صاحب؟'' اس نے پوچھا۔

پسٹل اب مجھ سے فقط چار پانچ فٹ کی دوری پر تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ لوڈڈ ہے۔ اس کا سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوا تھا۔ بس اس تک ہاتھ پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ میں اب بھی ہمت نہیں کر پایا۔ میرے ہونٹ بالکل خشک ہو چکے تھے۔ میں یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر میں پسٹل پکڑ کر گولی نہ چلا پایا تو کیا ہوگا۔ کیا جارج مجھے گولی مار دے گا؟ تب جارج آگے بڑھا اور اس نے پسٹل تقریباً میرے پاؤں میں رکھ دیا۔ ''شیر بنو یار! تھوڑی سی تو ہمت کرو۔'' وہ بولا اور مجھ سے دس پندرہ فٹ کی دوری پر جا کھڑا ہوا۔

میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ پسٹل میرے پاؤں میں تھا۔ ایک دم میرے دماغ میں دھند سی بھر گئی۔ میں جھکا۔ میں نے کولٹ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی لمحے تھے جب میں نے کسرتی جسم والے جارج کو بجلی کی طرح اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی۔ شاید اس پھرتی کے پیچھے وہ گہرا اعتماد بھی تھا جو مجھ میں نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں پسٹل پکڑ کر پوری طرح سیدھا ہو پاتا، وہ مجھ پر آن پڑا۔

اس کا طوفانی مکا میرے جبڑے پر لگا، میں الٹ کر پیچھے گرا۔ جارج کا دوسرا ہاتھ میرے دائیں ہاتھ پر آیا تھا۔ اس ہاتھ میں پسٹل تھا۔ اس نے میری اس کلائی کو اتنی زور سے مروڑا کہ پسٹل، پکے ہوئے پھل کی طرح میرے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ اس نے میری ٹھوڑی پر اپنا گھٹنا رسید کیا۔ میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گرانا چاہا لیکن وہ خاصا زور آور تھا۔ پُرتعیش زندگی گزارنے والے عام لوگوں کے برعکس اس کا جسم سڈول اور کافی حد تک پھرتیلا تھا۔ وہ گرنے سے بچ گیا اور میری گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے کر مجھے بے بس کر دیا۔

سلطانہ اس دوران میں سکتہ زدہ بیٹھی رہی تھی۔ اس کا رنگ جو قندھاری اناروں کی طرح دہکتا تھا، زرد ہو چکا تھا۔ جارج نے میری گردن چھوڑی اور دو قدم پیچھے ہٹ کر بڑے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا اور میں اس کا نمکین ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مجھے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے پسٹل اٹھایا اور اس مرتبہ اسے میرے نیفے میں اڑس دیا۔ تب وہ ایک بار پھر دس بارہ فٹ دور جا کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا زہر تھا اور چہرے پر اعتماد کی بے پناہ چمک۔ ہم دونوں آمنے سامنے اس کشادہ بیڈ روم میں کھڑے تھے جس میں دنیا کی بہترین آرائشی چیزیں موجود تھیں اور یہ جارج کی شکارگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ شاید آج وہ یہاں پھر ایک شکار کھیلنے والا تھا اور اس کے نشانے پر وہ راجپوت مسلم لڑکی تھی جسے میری بیوی کہا جاتا تھا۔ اپنے عالی شان بیڈ روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا جارج گورا بڑے خباثت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ یقیناً یہ بات اس کی انا کی تسکین کا باعث تھی کہ میں نے ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے آج اس کمرے کی صفائی اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ اسے چمکایا ہے اور پھولوں سے سجایا ہے۔ یہ بھی اذیت رسانی کی ایک قسم ہی تھی۔

وہ دونوں بازو اپنی دونوں جانب لٹکائے میرے سامنے کھڑا تھا۔ کاٹرائے کی پتلون اور ''ڈینم'' کی ہاف سلیو شرٹ میں سے اس کا ٹھوس جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''چلو برادر! ایک اور کوشش کرو۔ اب تو یہ اور بھی ایزی ہے۔ پسٹل تمہارے پاس ہے۔ چلو شاباش! مجھے وشواس ہے کہ تم کامیاب ہو جائیں گا۔''

میں ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اس کی عقابی آنکھیں میری ہر حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ اپنے پچھلے پاؤں پر جھکے ہوئے کسی خطرناک تیندوے کی طرح ہی وہ مجھ پر جست لگانے کو بالکل تیار تھا۔ کہتے ہیں، خطرناک درندوں کی نظر ان کے شکار کو ہپناٹائز کر دیتی ہے۔ وہ حرکت نہیں کر سکتے۔ اپنا دفاع نہیں کر سکتے... بھاگ بھی نہیں پاتے۔ میں بھی شاید ہپناٹائز ہو چکا تھا۔ جارج کے بے پناہ اعتماد نے مجھے مبہوت کر دیا تھا... میں نے ایک اضطراری نگاہ سلطانہ پر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں بے چارگی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ جیسے بڑی اچھی طرح جان چکی تھی کہ جارج کا سامنا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

میں نے ایک بار پھر اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی۔ اپنے دل و دماغ پر لعنت ملامت کے تازیانے رسید کیے۔ خود کو سمجھایا کہ پسٹل تمہارے پاس ہے، تمہارے ہاتھ سے بمشکل ایک فٹ کی دوری پر ہے۔ تم اسے پلک جھپکتے نکال سکتے ہو۔ جارج کے جست لگانے سے پہلے بآسانی اس پر فائر کر سکتے ہو۔

میرے جسم کے مساموں سے پسینا بہہ نکلا۔ سینے کے

www.pkdigest.com

اندر جیسے ایک مشعل زور سے پھڑ پھڑانے کے بعد ایک دم بجھ گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ”تم یہ نہیں کر سکتے تابی... یہ تمہارے بس میں نہیں۔“

یہ کچھ ویسی ہی کیفیت تھی جو لاہور کے نواح میں ڈیک نالے کے کنارے تاریکی میں لہلہاتے سرکنڈوں کے پاس، مجھ پر اس وقت طاری ہوئی تھی جب عمران نے نالا پار کرنے کے لیے مجھے اپنی طرف بلایا تھا اور میں صد کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکا تھا۔ اور یہ کوئی ایک موقع تو نہیں تھا۔ ایسے نہ جانے کتنے مواقع میری زندگی میں آ چکے تھے۔

میں اپنی جگہ کھڑا رہا۔ جارج کے سرخ ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ زیادہ گہری اور زہریلی ہو گئی۔ وہ نپے تلے قدموں سے میری طرف آیا۔ اس نے میری قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا پسٹل واپس لے لیا اور گمبھیر انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے کہ تم انڈین فلمیں نہیں دیکھتے۔ ان فلموں میں تو ایسے موقعوں پر ہیرو ایک دم شیر ببر بن جاتا ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ سلطانہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”سلطانہ ڈیئر! یہ شاید ہیرو ہے ہی نہیں۔ تم نے اسے خواہ مخواہ ہیرو بنایا ہوا تھا۔ اس کا جگہ تو تمہارے پاؤں میں بھی نہیں بنتا اور تم نے پتا نہیں اسے کہاں تک اجازت دے رکھا تھا۔“

سلطانہ بھی خاموش رہی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کے جسم سے پھوٹنے والی جنگلی پھولوں کی خوشبو نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔

جارج نے وسکی کا ایک گھونٹ لیا اور میری طرف گھوم کر بولا۔ ”چلو باسٹرڈ! اب نکلو یہاں سے۔ اب یہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔“

باسٹرڈ کی گالی میرے سینے پر گھونسے کی طرح لگی۔ لیکن پچھلے تین چار گھنٹوں میں ایسے نہ جانے کتنے گھونسے میں سہہ چکا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ”سلطانہ کا اگر کوئی قصور ہے تو اسے قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے... تم... اسے جیل سے یہاں کیوں لائے ہو؟“

”یہاں اسے سزا دینے کے لیے نہیں محبت کرنے کے لیے لائے ہیں... مائی ڈیئر چوہے!“ جارج نے دانت پیس کر گلابی اردو میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے گریبان سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکا دیا۔

میں چاندی کے ایک قیمتی گل دان پر گرا۔ گل دان نیچے لڑھک گیا۔ میں نے مزاحمتی نظروں سے جارج کو دیکھا۔ وہ ایک دم پھر آگ بگولا ہو گیا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو باسٹرڈ! ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

اس نے زنّاٹے کا تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا۔ پھر مجھے سر کے بالوں سے پکڑا اور دیوار پر دے مارا۔ وہ ایک بار پھر مجھ پر پل پڑا تھا۔ سلطانہ چلّاتی ہوئی ہم دونوں کے درمیان آ گئی۔ اس نے میرا گریبان جارج کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ پھر مجھے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”تم چلے جاؤ یہاں سے۔ میری جسمت (قسمت) میں یہی ہے۔ تم جاؤ۔“

اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس نے مجھے دروازے سے باہر دھکیلا۔ پھر دروازے کو ہولے سے بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کے چہرے کی بے چارگی کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میں بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ میرا پورا جسم خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ہٹا کٹا ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ایک گارڈ بھی تھا۔ عقب میں دو باوردی گارڈز مزید کھڑے تھے۔ ہٹے کٹے ملازم کی آنکھوں میں چھپا چھپا تمسخر تھا۔ ”چلو جی پتی دیو صاحب۔“ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے چلا۔

جلد ہی مجھے واپس میرے کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ کوارٹر میں آج اتفاقاً میں اکیلا تھا۔ اصطبل کا سیکنڈ انچارج اور میرا روم میٹ ملہوترا آج اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا اور چارپائی پر چت لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب تھا۔ سینے میں انگارے دہک رہے تھے۔ میں تصور کی نگاہ سے کچھ دل دوز منظر دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ، جارج کے پنجۂ ستم میں تھی۔ اسی چار دیواری میں... اسی چھت کے نیچے۔ پھر مجھے بالو کا خیال آیا، وہ پتا نہیں کہاں تھا؟ وہ بھی تو اپنی ماں کے ساتھ ہی جیل گیا تھا۔ شاید وہ بھی اسی چار دیواری میں کہیں تھا۔

مجھے لگا کہ میرے سر کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہچکیوں سے رونے لگا۔ میں اتنا رویا کہ میرا بازو آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ مجھے اپنے آپ پر طیش آ رہا تھا۔ خود کو مار لینے کو دل چاہتا تھا... میں نے بلک کر فریاد کی... ”اے خدا! میری اس بے کار زندگی کو ختم کر دے۔ میں اور جینا نہیں چاہتا اور دکھ سہنے کی ہمت نہیں۔ میں وہی رہوں گا جو ہوں۔ ایک بے کار، بزدل، کمزور اور نحوستوں کا مارا انسان... میرے بخت میں تاریکیوں اور ذلتوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ میں ہار گیا ہوں یارب...“

آج میں اس قدر ٹوٹا ہوا تھا کہ خدائے بزرگ و برتر کو پکارتے ہوئے بھی میرے لہجے میں تپش تھی۔ شاید یہ دعا نہیں تھی، شکوہ تھا۔ ایک ایک کر کے مجھے اپنے سارے کرتوت یاد آ رہے تھے۔ میں نے ثروت کو اپنی آنکھوں سے بربادی کی طرف جاتے دیکھا اور کچھ نہ کر سکا۔ میری ماں میرے سامنے اذیتیں سہہ کر مر گئی۔ میرا یار، میرا غم گسار سراسر میری بزدلی کا شکار ہو کر تاریکیوں کا رزق ہو گیا۔ اور آج... ایک غیر ملکی بدکار نے میری محبوبہ بیوی کی آنکھوں کے سامنے میری بے مثال ذلت کا انتظام کیا۔ اس نے مجھے مزاحمت کرنے کے دلیرانہ موقع دیے اور بار بار مجھے شرمناک پسپائی سے دوچار کیا...

میں روتا رہا۔ میری آنکھوں سے آتشیں آنسو بہہ کر میرے رخساروں پر چلتے رہے اور میری بے بسی کا نوحہ پڑھتے رہے۔

نہ جانے کتنی ہی دیر اسی طرح گزر گئی۔ پھر کمرے میں روشن موم بتی پگھل پگھل کر ختم ہو گئی اور کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ کمرے سے باہر دیوہیکل کتے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے اور گاہے بہ گاہے مسلح پہرے داروں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان پہرے داروں میں دو گھڑ سوار بھی شامل تھے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے عمارت کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چکر مکمل کرتے تھے۔

میں اس رات بہت رویا لیکن جتنا رویا، آنکھوں کی آگ اتنی ہی بھڑکتی گئی۔ میں نے بڑی سنجیدگی سے سوچا کہ خود کو ختم کر لوں۔ کوارٹر کے باورچی خانے میں سبزی اور گوشت کاٹنے والی تیز چھری موجود تھی۔ میں اس سے اپنی کلائی کی رگیں کاٹ سکتا تھا اور موت کی آغوش میں پہنچنے کے لیے چارپائی پر چت لیٹ سکتا تھا... یا پھر الماری میں سے شراب کی وہ بوتلیں نکالتا جو ملہوترا نے اپنے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ اتنی زیادہ شراب اپنے معدے میں انڈیل لیتا کہ میری موت واقع ہو جاتی۔ اس طرح کے کچھ مزید جان لیوا خیال بھی ذہن میں آئے لیکن ان سب میں سے، چھری سے رگیں کاٹنے والا خیال غالب رہا۔

اس رات دل و دماغ کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ شاید یہ وہی کیفیت تھی جو دو ڈھائی سال پہلے مجھ پر لاہور میں طاری ہوئی تھی۔ میں گندم کی گولیاں نگلنے کے لیے سو فیصد تیار ہو گیا تھا۔ اس وقت تو عمران کی صورت میں ایک ”روشن چہرہ“ فرشتہ آیا تھا اور مجھے میرے ارادے سے روکنے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن آج یہاں کس نے آنا تھا؟ آج کسی نے نہیں آنا تھا۔

میں نہایت گہری تاریکی میں ٹٹولتا ہوا اٹھا اور باورچی خانے میں سے نہایت تیز پھل والی چھری لے آیا۔ اندوہ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ مجھے یہ سب کچھ آسان لگنے لگا تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ گہری تاریکی میں آنکھیں بند کر لیں۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنے قریب سے کہیں عمران کی آواز سنائی دی۔ ”کیا کر رہے ہو تابی؟“

میں چونک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ وہاں کوئی نہیں تھا مگر آواز اتنی صاف اور واضح تھی کہ میں ششدر رہ گیا۔ یہ صرف میرے تصور کا کرشمہ تھا۔

میں نے آنکھیں پھر بند کر لیں، عمران کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا۔ ”جگر! بھول گئے جو میں نے کہا تھا؟“

”کیا کہا تھا؟“ میں نے اشک بار لہجے میں بہ زبانِ خاموشی پوچھا۔

اس کے تصوراتی ہاتھ نے آگے بڑھ کر میری ناک کو چٹکی میں پکڑا اور بولا۔ ”لکڑی کے باندر! تیرا بھیجا بھی ایک دم فائیو اسٹار ہے۔ میں نے ایک مرتبہ خودکشی کے بارے میں کچھ بتایا تھا اور کہا تھا کہ اسے یاد رکھنا...“

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس جھماکے کے ساتھ ہی عمران کا تصور اوجھل ہو گیا۔ تاہم یہ تصور اوجھل ہوتے ہوتے ایک ایسا جملہ میرے دماغ کو تھما گیا جس نے مجھے سرتاپا ہلا دیا اور میرے مُردہ جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

مجھے ان نہایت سنگین گھڑیوں میں عمران کا وہ بے مثال چمکیلا فقرہ یاد آیا جو اس نے مجھ سے ملنے کے بعد لاہور میں کہا تھا۔ اس نے کہا تھا... ”اگر تمہیں خودکشی کرنی ہی ہے تو پھر اس کی ذمے داری خود پر نہ لو... بس اپنے آپ کو جان لیوا حالات کے دھارے پر چھوڑ دو۔ جو قدرت کو منظور ہو گا، وہ ہو جائے گا۔“

اس کا یہ بھولا بسرا فقرہ اتنی شدت سے میرے دماغ میں آیا کہ سوچ کے بے شمار بند کواڑوں کو ایک دھماکے سے کھول گیا۔ شاید کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں اور کچھ لفظ ایسا ہی ”کایا پلٹ“ اثر رکھتے ہیں۔ میں مبہوت رہ گیا۔ وہ منوں وزنی بوجھ جو میرے سینے کو کچل رہا تھا، اچانک میرے سینے سے ہٹ گیا۔ مجھے لگا کہ مجھے اپنی نجات کی راہ نظر آ گئی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا؟ یکا یک تبدیلی کی یہ کیسی ہوا چلی تھی میرے اندر؟ شاید یہ سب اس گریہ زاری کا صلہ تھا جو آج شب میں نے اپنے خدا کے حضور کی تھی اور ان بے شمار آنسوؤں کا اجر جو آج اس کمرے کی تیرگی میں، میں نے بہائے تھے۔ تو کیا قدرت نے بالآخر میری سن لی تھی؟ میں مرنا چاہتا تھا لیکن حرام موت مرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے راستہ نظر آ رہا تھا۔ وہی راستہ جو میرے یار نے مجھے ایک روز دکھایا

www.pkdigest.com

تھا۔ آگے بڑھنے کا... سنگین ترین خطرات سے ٹکرانے کا۔ موت کے پیچھے بھاگنے کا... اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے پورے جسم پر لرزہ طاری تھا لیکن یہ خوف کا لرزہ نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ باہر عمارت کے وسیع احاطے میں گیس لیمپس کی مدھم روشنی موجود تھی۔ اندرونی کمروں میں برقی روشنی تھی جو جنریٹرز سے مہیا ہوتی تھی۔ میرے کوارٹر سے چند گز کے فاصلے پر وہی ہٹا کٹا مسلح ملازم کھڑا تھا جو پانچ چھ گھنٹے پہلے مجھے کسی گائے بکری کی طرح ہانک کر عمارت کے اندرونی حصے میں لے گیا تھا اور ''عقوبت خانے'' کے حوالے کیا تھا۔ چھوٹی نال کی ایک رائفل اس کے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ وہ ٹہلنے کے ساتھ ساتھ ٹرانزسٹر ریڈیو پر کچھ سن رہا تھا۔

وہ قطعی بے پروا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں عجیب ذہنی کیفیت میں کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ میں نے جوتی بھی پہنی ہوئی ہے یا نہیں۔ مجھے اردگرد موجود کوئی اور شخص دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ رکھوالی کے خوفناک کتے کہاں ہیں؟ چھت پر موجود مسلح پہرے دار کی پوزیشن کیا ہے؟ اور میں ان باتوں کے بارے میں سوچتا بھی کیوں؟ میں تو موت کا راہی تھا۔ مجھے مرنا تھا یا مار دینا تھا اور جتنی جلدی یہ مرحلے طے ہو جاتے، اتنا ہی بہتر تھا۔ میں اپنی دلی کیفیت بالکل کھول کر بیان کر رہا ہوں اور حقیقت یہی ہے کہ ان لمحوں میں مجھے اپنے اردگرد موجود تمام رکاوٹیں اور دیواریں یکسر حقیر نظر آ گئیں۔

میں اندھا دھند مسلح شخص کی طرف بھاگا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ میری طرف مڑا اور اس وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کوئی چیز دبی ہوئی ہے... اور یہ وہی تیز پھل والی چھری تھی۔ مجھے یوں اپنی طرف آتے دیکھ کر گوبندر نامی یہ ملازم گھبرایا۔

''اوئے... اوئے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ میں اس پر جا پڑا۔ میں نے بایاں ہاتھ اس کے گریبان پر ڈالا۔ میرے دائیں ہاتھ کی ''مہلک حرکت'' میں میری عمر رفتہ کی ساری بے بسی، بے چارگی اور اذیت ایک عجیب لہر بن کر دوڑ رہی تھی۔ تیز دھار چھری قریباً آٹھ انچ تک گوبندر کے چربی دار پیٹ میں گھسی۔ گوشت اور لوہے کا تصادم... گوشت کٹنے کی آواز، گوبندر کی کربناک آہ... اور اپنے ہاتھ پر گرم خون کے چند چھینٹے... یہ سب کچھ میں نے پورے ہوش و حواس کے ساتھ محسوس کیا۔

میں نے چھری کھینچی لیکن وہ نہیں نکلی۔ مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ کسی کو چھری ماری جائے تو وہ اس طرح پھنس بھی جاتی ہے۔ گوبندر پشت کے بل گرا۔ اس کی رائفل اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی۔ میں نے رائفل اٹھائی۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے گوبندر کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی... اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ مجھے ایک دفعہ عمران نے بتایا تھا کہ سیفٹی کیچ کہاں ہوتا ہے اور کیسے ہٹایا جاتا ہے۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا... اور مین گیٹ کی طرف دوڑا۔ ابھی مین گیٹ سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ دو دیوہیکل کتے میری طرف جھپٹے۔ یہ خوفناک منظر تھا لیکن موت سے بڑھ کر خوف اور کس چیز کا ہو سکتا ہے... اور میں ان لمحوں میں اس خوف پر غلبہ پا چکا تھا۔ میں نے ٹریگر دبایا۔ دھماکوں کے ساتھ رائفل نے شعلے اگلے۔ میں نے کم و بیش چھ فائر کیے۔ عمارت کے سناٹے تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اٹھے۔ دونوں کتے مجھ سے دس پندرہ قدم کی دوری پر گر گئے اور لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

اب میرا رخ گیٹ کی طرف تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عمارت کے بیرونی گیٹ سے نکلنا میرے لیے اس قدر آسان ثابت ہوگا۔ یہاں تو خوفناک سرخ آنکھوں والے زخم... کے چکر لگاتے تھے اور ان کی رائفلوں پر چمکتی ہوئی سنگینیں لشکارے مارتی تھیں۔ رات کے اس پہر گیٹ پر صرف دو افراد موجود تھے۔ وہ سگریٹ پھونک رہے تھے اور ان کی رائفلیں چوبی کیبن کی دیوار کے ساتھ رکھی تھیں۔ انہوں نے دو تین سیکنڈ تو صورتِ حال کو سمجھنے میں لگا دیے۔ پھر وہ رائفلوں کی طرف لپکے۔ ایک پہرے دار ٹانگ پر گولی کھا کر راستے میں ہی گرا، دوسرا رخ بدل کر باہر کی طرف بھاگا۔

میں دندناتا ہوا مین گیٹ سے باہر تھا۔ میرے دونوں ہاتھ بڑی مضبوطی سے رائفل پر جمے ہوئے تھے۔ میری آنکھوں میں لہو تھا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مجھے دور درختوں میں ایک گھوڑا گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں اس کی طرف دوڑا۔ ''رک جاؤ... رک جاؤ... گولی مار دوں گا...'' عقب سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز آئی۔ میں نہیں رکا... اب مجھے نہیں رکنا تھا... مجھے اندازہ ہوا کہ عمارت میں بے شمار روشنیاں جل اٹھی ہیں۔ ہر طرف خطرے کے مخصوص الارم بجنا شروع ہو گئے تھے۔

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

محبت کی آگ سرد تو پڑسکتی ہے لیکن اس میں پوشیدہ رقابت کی چنگاری کو ذرا سی ہوا ملے تو بھڑک کر شعلہ بننے میں اسے دیر نہیں لگتی

بے وفائی کے پردے میں پنہاں ایک عورت کی رقابت کا چونکا دینے والا قصہ

نفیس بزمی

رقیب

پانچ سال قبل مارشا ایک ایسے بحران کا شکار ہو گئی تھی کہ اگر وہ اپنی حکمتِ عملی سے حالات کا مقابلہ نہ کرتی تو اس کی ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ میاں بیوی کے درمیان اگر ازدواجی شکر رنجیاں اس حد تک بڑھ جائیں کہ معاملہ طلاق تک جا پہنچے تو حالات کو سنبھالنا ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور ہوتا ہے۔ مارشا کو اس سلسلے میں اپنے اندر بہت ساری تبدیلیاں کرنی پڑی تھیں۔ دوسری طرف ہنری نے بھی حلفیہ کہا تھا کہ وہ آئندہ کسی دوسری عورت میں دلچسپی نہیں لے گا اور ایک مثالی شوہر کی حیثیت سے سامنے آئے گا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنی تمام بری عادتوں کو ختم کر دے گا اور

www.pkdigest.com

اسے حد درجہ خوش رکھنے کی کوشش کرے گا۔

مارشا نے ہنری کو کئی موقعوں پر اجنبی عورتوں کے ساتھ عشق کا ڈھونگ رچاتے دیکھا تھا۔ اس کی اس حرکت پر مارشا کی قریبی سہیلیاں اسے کئی مرتبہ اپنے شوہر سے علیحدگی اور طلاق کے مطالبے کا مشورہ دے چکی تھیں مگر وہ اپنی ازدواجی زندگی کا اختتام کم از کم طلاق کی صورت میں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لفظ 'طلاق' سے شدید نفرت تھی۔ وہ جب بھی کسی کے منہ سے یہ لفظ سنتی، اس کی کنپٹیاں سلگنے لگتیں۔

اب وہ بے حد خوش تھی۔ اسے اپنے شوہر پر فخر ہوتا تھا کہ اس نے اپنی بات پوری کر کے اسے اپنی سہیلیوں میں سربلند ہونے کا موقع دیا ہے۔ وہ حسب وعدہ ہر روز دفتر سے چھٹی کر کے شام کو ہی گھر واپس آجاتا۔ زیادہ تر وقت گھر پر گزارتا یا پھر کبھی کبھار اسے ساتھ لے کر سیر کے لیے نکل جاتا۔

شروع کا ایک سال تو مارشا کے لیے انتہائی کڑا گزرا۔ اسے ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں ہنری اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچا بیٹھے۔ اگر اتفاق سے کسی روز وہ دیر سے گھر لوٹتا تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگتے۔ اسی طرح دن، ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ مارشا کے لیے آنے والا ہر دن ایک امتحان ہوتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ میں فرق آتا گیا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ ہنری راہ راست پر آچکا ہے اور آئندہ کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ دو سال بعد اس نے بڑے فخر سے اپنی سہیلیوں کو بتانا شروع کر دیا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اس نے کئی دوسرے جوڑوں کی طرح زندگی کو جہنم بننے سے بچا لیا ہے اور اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ وہ جب بھی اپنی کسی دوست کے ساتھ بیٹھتی، اپنے شوہر کے گن گانے لگتی... حتی کہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی کئی قریبی سہیلیاں اس کی ان باتوں سے تنگ آکر اسے چھوڑ گئیں مگر اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس ہنری تھا۔ زندگی تھی اور زندگی کی خوشیاں تھیں۔

اور پھر ہنری نے کبھی کبھار اتوار کی شامیں باہر گزارنی شروع کر دیں۔ اس کے مطابق وہ فلمیں دیکھتا تھا۔ مارشا کو کبھی بھی فلموں سے دلچسپی نہیں رہی تھی کیونکہ وہ جب بھی بھولے بھٹکے کوئی فلم دیکھتی، اس کے سر میں درد شروع ہو جاتا۔ اسے ان نئی فلموں کا تو بالکل ہی شوق نہیں تھا۔ اس کے خیال میں تو انہیں فلم کہنا ہی سراسر زیادتی کے مترادف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہنری کو اکیلے ہی فلم دیکھنے جانا پڑتا۔ مارشا کو اس کے اکیلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو کیوں؟ وہ اگر اکیلے جانے پر روکتی تو ہنری اسے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ پھر یہ کہ ایک تو اس طرح ہنری سارا ہفتہ کام کرنے کے بعد تھوڑی سی تفریح کر لیتا تھا، دوسرا اسے کسی دوسری لڑکی کی طرف مائل ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ لیکن اب تو ایسا بھی کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس نے اس پہلو پر سوچنا تک ترک کر دیا تھا کہ ہنری پھر...

ایک رات ہنری دیر سے گھر واپس آیا۔ مارشا سو چکی تھی۔ اس نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور اطمینان سے سو گیا۔ اگلی صبح جب وہ بڑی عجلت میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو مارشا نے فلم کے بارے میں پوچھا کہ کیسی تھی؟ اس نے 'ہوں ہاں' کر کے بات ٹالی اور دفتر روانہ ہو گیا۔ مارشا نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کہ اس نے اس کی بازپرس پر کس قسم کا جواب دیا تھا۔

اسی شام مارشا ایک شاپنگ سینٹر میں شاپنگ کی غرض سے گئی۔ شاپنگ کے دوران ٹرالی دھکیلتے ہوئے وہ ایک ایسے حصے میں نکل آئی جہاں مختلف اقسام کی غذائیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے ہنری کے لیے کچھ خریدنا چاہا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا خریدے اور کیا نہ خریدے۔ وہ ہنری سے اس کی پسند معلوم کرنا چاہتی تھی۔ اسی خیال کے تحت وہ شاپنگ سینٹر کے اس ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گئی جو گاہکوں کی سہولت کے لیے وہاں لگایا گیا تھا۔ اس نے پرس میں سے ایک سکہ نکالا اور مخصوص خلا میں ڈالتے ہوئے ریسیور اٹھایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ پانچویں گھنٹی پر ہنری کی سیکریٹری نے کال ریسیو کی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی شناخت کرواتی، سیکریٹری نے مترنم لہجے میں اسے چند سیکنڈ ہولڈ کرنے کا کہا کیونکہ باس دوسری لائن پر کسی سے محو گفتگو تھے۔

ہنری کی سیکریٹری غالباً اس سے رابطہ کرنے کے دوران مارشا کی لائن آف کرنا بھول گئی تھی کیونکہ مارشا اچانک ہی ہنری کی آواز کانوں میں پڑنے پر چونک گئی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ "بھئی، بنٹی تو کمال کی لڑکی ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے..."

مارشا کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ اسے اپنی حالت غیر ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسی لمحے اسے ہنری کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "تم ایک منٹ ٹھہرو... کسی کا فون ہے، اسے سن لوں ذرا..."

پھر ایک لمحہ توقف کے بعد آواز آئی۔ "ہیلو... ہیلو!"

مگر اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ جواب میں کچھ کہتی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے ریسیور کریڈل کر دیا۔

غصے کی شدت سے اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے سامان کی بھری ہوئی ٹرالی وہیں چھوڑی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی شاپنگ سینٹر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسی انداز میں جب وہ چلتی ہوئی سیلز کاؤنٹر کی طرف بڑھی تو وہاں بیٹھا ہوا سیلز منیجر تن کر بیٹھ گیا۔ وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ اس عورت کو کسی ملازم کے رویے سے غصہ آگیا ہے جو وہ اس انداز سے اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ عورت پیر پٹختی اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے خارجی دروازے سے باہر نکل گئی۔ منیجر نے کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکائے اور اپنے حساب کتاب میں مصروف ہو گیا۔

مارشا بغیر سوچے سمجھے چلتی جا رہی تھی۔ اسے اس وقت کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ پروا ہوتی بھی تو کیسے؟ اس کے تو تن بدن میں آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اسی طرح چلتے چلتے تین چار بلاک کا فاصلہ طے کر گئی۔ بالآخر اس کی رفتار میں قدرے کمی آگئی۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے ایک آہ بھری اور داہنے ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے آنکھوں کو اس طرح مسلنے لگی جیسے ان میں تیرنے والے آنسو خشک کرنا چاہ رہی ہو۔ وہ ایک جگہ رک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اسی لمحے اس کی نگاہ سامنے ایک جنرل اسٹور پر پڑی۔ کاؤنٹر پر موجود شخص اس کی طرف تجسس آمیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گئی۔

'مارشا! تم کہاں جا رہی ہو؟' اس کے ذہن نے سوال کیا مگر اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ چلتی رہی حتیٰ کہ ایک پارک کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ جھولوں پر کھیلنے والے ننھے منے بچوں کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں تو وہ مشینی انداز میں ایک بنچ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے ذہن سے ہنری کا خیال نکل گیا۔ وہ کھیلتے کودتے بچوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ بچے کھیلتے ہوئے کتنے اچھے لگتے تھے۔ خوشی سے تمتماتے اور ہر فکر سے عاری چہرے!

دوپہر ہو چلی تھی اور وہ سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ اسے اپنی سہیلیوں کے طعنوں اور فقرے بازی کا خیال ستا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس کا ہر طرح سے تمسخر اڑانے کی کوشش کریں گی۔

'مارشا کے شوہر نے پھر عاشق معشوقی شروع کر دی۔'

'ارے... وہ تو شروع ہی سے چوری چھپے یہ حرکتیں کرتا آیا ہے۔'

'بے چاری مارشا کے پاس طلاق کے سوا کوئی حل نہیں۔'

بوجھ

لفٹ میں ایک ساتھ بہت سے لوگ سوار ہو گئے۔ آپریٹر نے بٹن دبایا لیکن لفٹ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ اس نے درخواست کی۔ "کم از کم ایک آدمی ضرور لفٹ سے اتر جائے۔"

ایک نہایت موٹی خاتون نے ایثار کا مظاہرہ کیا اور لفٹ سے اتر گئیں۔ کئی دوسرے لوگ اب بھی باہر اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے۔ آپریٹر نے بٹن دبایا تو لفٹ واقعی اوپر روانہ ہو گئی۔

موٹی خاتون قدرے شرمندگی سے بولیں۔ "میرا وزن تو اتنا زیادہ نہیں کہ میری وجہ سے لفٹ رک جاتی۔ دراصل آج میرے ذہن پر بہت زیادہ بوجھ ہے۔"

اس نے بے بسی سے دونوں ہتھیلیاں کانوں پر رکھ دیں اور سسکیاں لینے لگی۔ اس کی قوت برداشت اب جواب دینے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جونہی انہیں اس کی ناکامی کی خبر ہوگی، وہ اپنا کام شروع کر دیں گی۔ لوگ تو ویسے بھی دوسروں کی ناکامیوں پر دیوانہ وار قہقہے لگاتے ہیں، دوسروں کو پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔

اسے یقین ہو گیا کہ ان کے درمیان ایک مرتبہ پھر ایک ان دیکھی خلیج قائم ہو جائے گی۔ بے اعتمادی کی دیوار اب کبھی نہیں گر سکے گی اور وہ پہلے کی طرح پھر سے بلی چوہے کا کھیل کھیلنے لگیں گے۔ وہ اس پر یہی ظاہر کرے گی کہ اسے اس کی حرکتوں کا علم نہیں جبکہ وہ آزادانہ طور پر یہ سب کرتا رہے گا۔ اسے علم تھا کہ وہ جب بھی کسی رات 'فلم' دیکھنے جائے گا، اس کے سینے میں لاوا ابلے گا۔ وہ اسے فلموں کی فرضی کہانیاں سنا سنا کر یہی ظاہر کرتا رہے گا کہ وہ فلمیں دیکھتا ہے کیونکہ اسے علم ہے کہ مارشا فلمیں نہیں دیکھتی۔ پھر یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک وہ پاگل پن کی انتہا کو پہنچ کر کچھ کر نہیں گزرے گی۔ مگر اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ اسے اس ناانصافی کی عبرت ناک سزا دے گی۔

'بنٹی' نام اس کے حلق میں ببول کی طرح چبھنے لگا۔ اس کے لیے تعریفی فقرے اس کا خون جلانے لگے۔ اسے خیال آیا کہ ہنری کسی سے اس لڑکی کے بارے میں بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنی کارستانیوں کے بارے میں دوسروں کو بھی مطلع کرتا رہتا تھا۔ اسے فکر ہونے لگی کہ ہنری کی ان حرکات سے کتنے لوگ واقف ہوں گے۔ کیا ہنری کو اپنی یا اپنی بیوی کی عزت کا ذرہ بھر بھی خیال نہیں رہا؟ کیا وہ

www.pkdigest.com

بلاخوف وخطر ان ہتھکنڈوں پر اتر آیا تھا کہ... کہیں اس کا مقصد یہ تو نہیں تھا کہ اس طرح اسے خبر ہو جائے اور وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے اسے اس کے حال پر چھوڑ دے گی... کیا وہ اس کو طلاق کے مطالبے پر مجبور کرنا چاہتا ہے؟

''نہیں!'' وہ دانت پیستے ہوئے مٹھیاں بھینچ کر زیرِلب غرائی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔''

اسے فکر ہونے لگی کہ اس دل خراش موڑ پر اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ ہنری اجنبی لڑکیوں سے رسم و راہ بڑھائے اور وہ اس سے چشم پوشی کرے۔ اس طرح تو اس کی سہیلیاں اسے زندہ درگور کر دیں گی کہ وہ اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام ہو گئی ہے!

آخرکار اس کے ذہن نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کپکپا کر رہ گئی۔ جانے کتنی بیویاں حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ قدم اٹھاتی تھیں اور ان میں سے کتنی ثابت قدمی سے اس پر عمل کر گزرتی تھیں۔

اسے ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک شخص ہر روز رات کو شراب کے نشے میں دھت چوری چھپے گھر میں داخل ہوتا اور کچن کی ٹیبل پر سر رکھ کر سو جاتا۔ اس کی بیوی اس کی شراب نوشی سے اس قدر عاجز آ چکی تھی کہ ایک رات اس نے گیس اسٹوو کا لیور تھوڑا سا کھول دیا۔ صبح ہونے تک گیس نے شرابی کی جان لے لی اور اسے محض ایک حادثہ قرار دیتے ہوئے اس کی بیوی کو امدادی طور پر کچھ رقم دے دی گئی۔ وہ بھی اس طرح کی کوئی چال چل سکتی تھی... مگر اس جیسی نہیں کیونکہ ہنری کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اس سلسلے میں اسے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ کام کئی طریقوں سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

آنے والی اتوار کی شام ہنری نے اعلانیہ انداز میں کہا کہ وہ فلم دیکھنے جا رہا ہے۔ سنیما پر ایک بہت ہی زبردست قسم کی فلم دکھائی جا رہی تھی۔

''کیا واقعی؟'' مارشا نے قدرے سرد لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا۔

''میرے دوستوں نے یہی بتایا ہے کہ فلم بڑی زبردست ہے۔ اس میں...''

''ٹھیک ہے۔ تم ضرور جاؤ فلم دیکھنے مگر بہتر یہ ہوگا کہ جلدی گھر آ جانا۔'' اس نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''رات دیر تک اکیلے ہونے کے احساس سے مجھے خوف آتا ہے کیونکہ گزشتہ ہفتے نشست گاہ میں مجھے کسی کھٹ پٹ کی آواز آئی تھی، وہ ضرور کوئی چور تھا۔ میں نے اس کمرے میں دھمک پیدا کی تو وہ فرار ہو گیا۔''

''مگر تم نے مجھے اس بارے میں کیوں نہیں بتایا؟'' وہ حیرت زدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں فوراً پولیس کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔''

''دراصل میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اسی لیے پولیس کو بھی اطلاع نہیں دی۔ البتہ کل صبح میں اس موضوع پر مسز کونیل سے بات کر رہی تھی تو اس نے بھی اپنے گھر میں کسی کے داخل ہونے کا بتایا تھا۔'' مارشا نے اپنی پڑوسن کا حوالہ دے کر کہا۔ اس کی پڑوسن کا حافظہ حد درجے کمزور تھا۔ وہ ہر ایسے معاملے پر بحث کرنے کے لیے بھی تیار ہو جاتی تھی جو اسے فکر مند کر دے... لہٰذا مارشا نے ایک دو مرتبہ باتوں ہی باتوں میں اسے فرضی چور کی کہانی سنائی تو وہ بھی فکر مند ہو گئی۔ خبطی الدماغ ہونے کے ناتے اس نے ایک دن اپنے گھر میں بھی چور کے آنے کی تصدیق کر دی۔ اب مارشا کو کسی قسم کی فکر نہیں تھی کیونکہ اگر ہنری اس سے پوچھتا تو وہ قسم کھا کر بھی یہ بات دہرا سکتی تھی۔

''تو پھر میں ایسا کرتا ہوں اپنا پستول یہاں رکھ جاتا ہوں۔ کیا خیال ہے؟'' ہنری نے کچھ سوچ کر کہا۔ فوج کی نوکری کے دوران اس نے اعشاریہ چار پانچ کا پستول خرید کر ایسے ہی موقعوں کے لیے اپنے پاس رکھا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنی دراز میں لاک رکھتا تھا۔ مارشا نے ایک مرتبہ اسے ہنری کی خواہش پر چلایا بھی تھا۔

''مم... مگر مجھے ہتھیاروں سے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے کہا۔

''ارے جانِ من! یہ تو دنیا کی سادہ ترین چیزوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کی موجودگی میں تو بزدل سے بزدل شخص بھی خود کو شیر ببر تصور کرنے لگتا ہے۔'' اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہاری خواہش پر اس کا سہارا لے لیتی ہوں مگر تم کوشش کر کے جلدی آ جانا۔'' اس نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''اچھا... میں ایسا ہی کروں گا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور خواب گاہ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''آخر ایک شوہر کو اپنی بیوی کا خیال تو رکھنا ہی ہوتا ہے نا!''

مارشا کو اس کا آخری فقرہ زہریلے سانپ کے ڈنک کی طرح دل میں لگا۔

ایک منٹ بعد جب ہنری واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا خوفناک پستول چمک رہا تھا۔ ''یہ لو... انسان کا بہترین دوست بلکہ قابلِ اعتماد بھی!''

''ہاں، ایک اور بات۔'' اس نے پستول ہاتھ میں لیتے ہوئے چونک کر کہا۔ ''آج مجھے کچن کے فرش پر پالش کرنی ہے اس لیے تم عقبی دروازے سے اندر آ جانا۔''

''اوہ... یہ تو اچھا ہوا تم نے بتا دیا ورنہ اس پر سے پھسل کر ہڈی پسلی ایک کروا لیتا۔'' اس نے بے ساختہ ہنس کر جواب دیا۔ ''اور فی الحال میں اپنی ہڈیاں تڑوانا نہیں چاہتا۔''

مارشا نے پستول کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو وہ متفکر لہجے میں بولا۔ ''ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چور کو اس گھر میں ایسی کون سی چیز نظر آ گئی ہے جسے اس نے اڑانے کی کوشش کی... حالانکہ گھر کی حالت دیکھ کر تو کوئی اس میں چوری ڈاکے کا خیال بھی لانا گوارا نہیں کر سکتا۔ خیر... پستول تمہارے پاس ہے اور یہ بھرا ہوا ہے۔ مجھے امید تو نہیں پھر بھی احتیاطاً تمہیں دے دیا ہے۔ بس جونہی کوئی اجنبی غیر قانونی طریقے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے، فوراً شوٹ کر دینا... باقی میں سنبھال لوں گا۔''

''تم فکر نہ کرو مجھے بھی امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔'' اس نے پستول ٹیبل لیمپ کے قریب رکھ دیا۔

چھ بجے ہنری فلم دیکھنے کے لیے گھر سے نکل گیا۔

دو گھنٹے تک وہ مختلف خیالات میں کھوئی رہی۔ اس کی نظریں اس دوران ایک منٹ کے لیے بھی پستول سے نہیں ہٹی تھیں۔ اس کے ذہن میں 'بنٹی' بچھو کے ڈنک لگا رہی تھی۔ اسے ایسی لڑکیوں سے شروع ہی سے نفرت تھی جو اپنے وقتی مفاد کی خاطر بستے کھیلتے گھر اجاڑ دیتی تھیں۔ 'یہ بنٹی بھی اسی قماش کی لڑکی ہو گی۔' اس نے سوچا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے یہ نام کہیں سن رکھا ہے۔ ایک مبہم سا اندازہ تھا کہ وہ یقیناً کسی قریبی بلاک میں رہتی ہو گی۔ مارشا کو یقین تھا کہ وہ یہ نام اس سے پہلے بھی سن چکی ہے۔ وہ چاہتی تو براہِ راست بنٹی کو اپنے انتقام کا نشانہ بنا سکتی تھی مگر یہاں قصوروار خود اس کا اپنا شوہر تھا۔

آٹھ بجے کے قریب وہ مسز کونیل سے اتوار کا اخبار لینے کے لیے چلی گئی۔

''ہنری ابھی تھوڑی دیر پہلے فلم دیکھنے گیا ہے۔'' اس نے مسز کونیل کو بتایا۔

''پھر تو تم نصف شب تک اکیلی رہو گی۔'' مسز کونیل کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئیں۔

''ہاں... ہنری تو دیر سے ہی گھر واپس آئے گا۔'' اس

ہر شمارہ خاص شمارہ
ماہنامہ سرگزشت
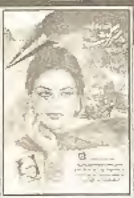
اگست 2010ء کا شمارہ ہر بک اسٹال پر موجود ہے
گل پاش
اس نامور شخصیت کی جیون کتھا جس نے نظم و نثر پر راج کیا
جلاوطن حکمران
اسے پاکستان میں دفن ہونے کے لیے زمین نہ ملی
ٹوپی والا چیتا
اس آدم خور چیتے کا تذکرہ جس کے سر پر ٹوپی کُمر پڑا تھا
آفتِ ارضی
پاکستان کی چھت، عطا آباد میں تاریخ نے ایک ہی حادثے کو دوسری بار دہرایا ہے
اور اس کے علاوہ
فلمی دنیا کے چٹ پٹے قصے، دلچسپ سفرنامہ، آزادی کے وقت رونما سانحات کا تذکرہ اور بہت سی سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں۔
بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں، آپ یقیناً گرویدہ ہو جائیں گے۔
آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے حاصل کریں

نے جواب دیا۔

ساڑھے نو بجے اس نے تمام بتیاں بجھائیں، خواب گاہ میں آکر نائٹ گاؤن پہنا اور اس کے اوپر اوورکوٹ پہن کر خواب گاہ سے باہر آگئی۔ پستول سنبھال کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوگئی اور اندھیرے میں گھور گھور کر اپنی آنکھوں کو اندھیرے سے مانوس کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے پردۂ تصور پر ایک منظر ابھرا۔ وہ ہنری کو بنٹی کے ساتھ خوش گپیوں اور خوش فعلیوں میں مگن دیکھنے لگی۔ ہنری اس سے کہہ رہا تھا کہ اسے جلدی گھر جانا ہے کیونکہ اس کی بیوی اکیلی ہے۔ اس کے جواب میں ضرور وہ یہی کہہ رہی ہوگی کہ تمہاری بیوی تم پر اتنی برتری رکھتی ہے کہ تم اپنی مرضی سے کچھ وقت کسی کے ساتھ نہیں گزار سکتے... ہنری اس کی بات سن کر ہنستے ہوئے اسے بتاتا کہ اس کی ڈرپوک بیوی چوروں سے خوف زدہ ہے تو بنٹی منہ بسورتے ہوئے کہتی کہ تم بھی تو ایک چور ہو... میرے من کے چور... اور وہ دونوں بے حیاؤں کی طرح قہقہے مار کر ہنس دیتے۔ مارشا جانتی تھی کہ بنٹی جیسی آوارہ لڑکیاں اسی قسم کی گفتگو کرتی تھیں... اس کے ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے۔ انتقام کی آگ اس کے سینے میں سلگتے سلگتے شعلوں میں بدل گئی تھی۔

اندھیرے میں کہیں ایک مدھم سا کھٹکا ہوا... وہ آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چابیاں کھنک رہی تھیں جو مارشا کی راہنمائی کے لیے کافی تھیں۔ اس کا جسم تن گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اس نے گود میں رکھے پستول کو احتیاط سے گرفت میں لیا اور بے آواز انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا پستول والا ہاتھ چابیوں کی آواز کی طرف اٹھ گیا۔ پستول کے ٹریگر پر اس کی انگلی دباؤ ڈالنے کے لیے بے چین ہونے لگی۔

پھر قدموں کی چاپ کمرے کے دروازے کے باہر رکی۔ تالے میں چابی گھومی، دروازہ کھلا اور ایک ہیولا سا کمرے میں داخل ہوا۔ دروازہ پھر بند ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی چٹ کی آواز سے پورا کمرا روشنی میں نہا گیا۔ مارشا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھوں کے سامنے چھجا سا بنا لیا۔

''مارشا... یہ... کیا ہے؟'' اسی لمحے ہنری کی حیرت اور خوف میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ یقیناً اس نے مارشا کے ہاتھ میں پستول دیکھ لیا تھا۔

مگر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے ٹریگر پر دباؤ بڑھا دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا اور ہنری الٹ کر قریبی میز پر جا گرا۔ گولی اس کے دل کے مقام پر لگی تھی۔ خون ابل ابل کر اس کی شرٹ پر دھبے کی صورت میں نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ تڑپ رہا تھا، بُری طرح سے... اس کے حلق سے عجیب سی خرخراہٹ خارج ہو رہی تھی۔

مارشا تڑپتے ہوئے ہنری کو چند لمحے سرد نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پستول ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخیں مارنی شروع کردیں۔

☆☆☆

نشست گاہ میں پولیس ضابطے کی کارروائی کر رہی تھی۔ کمرے میں ایک سوگوار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک طرف مارشا کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر کبھی کبھار اس سے کوئی ضروری سوال کرتا اور پھر اپنے کام میں لگ جاتا۔ مارشا کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے ذہن میں بار بار بنٹی کا خیال آتا تو وہ سوچتی کہ کاش تم مل جاؤ بنٹی تو پھر دیکھو میں تمہیں کیسا سبق سکھاتی ہوں۔ میں تم جیسی کمین ذاتوں سے اچھی طرح سے نمٹنے کی اہلیت رکھتی ہوں... میں تمہیں ایسی سزا دوں گی کہ تم جیسی تمام عورتیں تم سے عبرت حاصل کریں گی۔

دو دن بعد وہ شام کے وقت ذرا چہل قدمی کے لیے باہر نکلی۔ موسم خوش گوار تھا۔ مارشا ابھی تک اس تلخ تجربے کے اثرات سے نہیں نکل سکی تھی۔ اس کے دل میں بار بار ایک ہی خواہش ابھرتی تھی کہ کسی طرح اس کی ملاقات اس دوسری عورت بنٹی سے ہوجائے تاکہ اس کو بتا سکے کہ ہنری کے ساتھ کیا ہوا ہے اور یہ اس کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔

اور پھر اچانک وہ چلتے چلتے اس طرح رک گئی جیسے اسے کوئی بھوت نظر آگیا ہو۔ اسے اپنا پورا جسم سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں شدتِ خوف سے حلقوں سے باہر کو ابلنے لگیں۔ اس کے سامنے چند قدم پر سڑک کے کنارے لکڑی کے ایک بورڈ پر بڑا سا پوسٹر لگا ہوا تھا۔ اس پر سرخ جلی حروف میں لکھا تھا۔

''اب آپ کے شہر میں بنٹی سرکس۔ نوجوان حسینہ بنٹی کے حیرت انگیز کمالات دیکھیے...''

اس سے آگے وہ کچھ نہ پڑھ سکی۔ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ لہرائی اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح وہیں گر گئی۔ مدد کے لیے کئی افراد اس کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔

باضمیر

مریم کے خان

کہتے ہیں جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے ... مگر جنگ و جدل انسان کی فطرت میں ہے ... کبھی ذاتی انتقام جنگ کا روپ دھار لیتا ہے ... تو کبھی آزادی کی جدوجہد جنگ پر آمادہ کرتی ہے ... ایک ایسے ہی حریت پسند کا عزم و استقلال جو وطن کی محبت سے سرشار تھا

جنگ گزیدہ نوجوان کی مشکلات جو اس کے لیے جینے کی راہیں مسدود کر رہی تھیں

ڈیل رچرڈ لنانے تھکے ہوئے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کا فلیٹ پانچویں منزل پر تھا اور اسے کوئی سو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچنا تھا۔ وہ آج بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔

اس عمارت میں رہنے والے اسے ایک شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والے شخص کے طور پر جانتے تھے اور سب اس کی عزت کرتے تھے۔ کسی کو اس کا اصل نام نہیں معلوم تھا اور یہاں وہ جون ایبل کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس کے پاس اس نام کے کاغذات اور پاسپورٹ بھی تھا لیکن اس کا اصل نام ڈیل رچرڈ تھا اور وہ آئی آر اے کا سابق سپاہی تھا۔ گزشتہ دس سال سے اس کا آئی آر اے سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ جب اس نے دس سال پہلے ڈبلن چھوڑا تو اس کے دوست اور ساتھی اس کی تلاش میں تھے۔ اس وقت وہ مل جاتا تو وہ یقیناً اسے قتل کر دیتے۔

آئرلینڈ سے محبت اور اس کی آزادی کی خواہش اسے وراثت میں ملی تھی۔ اس کا باپ ایک حریت پسند تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب آئرش ری پبلکن آرمی کی بنیاد رکھی جا رہی تھی تو ڈیل کا باپ ایڈرے اس میں شامل تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس تنظیم کا دسواں رکن ہے۔ ڈیل کو نہیں معلوم کہ اس کے باپ کا دعویٰ درست تھا یا نہیں لیکن اس کا باپ وطن کی آزادی کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس جنگ

www.pkdigest.com

میں اس کے دو بھائی اور ایک بہن ماری گئی۔ اس نے زبان سے اُف تک نہیں کی۔ ایڈرے زیادہ تر گھر سے دور رہتا۔ ڈیل اور اس کی دو بہنوں کی ذمے داری اس کی ماں نے سنبھال رکھی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی بیکری چلاتی تھی۔ ایڈرے مہینوں بعد کسی تاریک رات میں چوروں کی طرح گھر آتا اور بیوی بچوں سے مل کر رات کی تاریکی میں رخصت ہو جاتا۔ برطانوی فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو اس کی شدت سے تلاش تھی۔

ایک رات جب ایڈرے گھر آیا تو کسی کی مخبری پر برطانوی ایجنٹوں نے ان کا مکان گھیر لیا اور ایڈرے کو وارننگ دی کہ وہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجائے ورنہ اس کے گھر کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ ڈیل اس وقت دس سال کا تھا اور حالات نے اسے وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیا تھا۔ ایڈرے کئی بار اس کے سامنے اپنی بیوی موروِن سے کہہ چکا تھا کہ اگر اس کی گرفتاری کا وقت آیا بھی تو وہ زندہ گرفتاری نہیں دے گا۔ وہ مارا جائے گا یا خودکشی کر لے گا۔

جیسے ہی باہر سے میگا فون پر اعلان کیا گیا، ڈیل نے جان لیا کہ اس کے باپ کا آخری وقت آگیا ہے۔ ایڈرے کا رنگ سفید ہو گیا اور ڈیل کی ماں نے رونا شروع کر دیا۔ محاصرہ کرنے والوں نے دھمکی دی کہ ایڈرے ایک منٹ میں باہر نہیں آیا تو وہ گھر پر بم پھینک دیں گے۔ موروِن نے روتے ہوئے شوہر سے کہا۔

"تم باہر نہیں جاؤ گے۔"

ایڈرے نے ایک نظر اپنے بچوں کو دیکھا اور بولا۔ "مجھے جانا ہوگا ورنہ یہ سچ مچ بم پھینک دیں گے۔"

ایڈرے نے اپنا پستول نکالا اور بیوی سے کہا۔ "بچوں کو لے کر پیچھے والے کمرے میں چلی جاؤ۔"

"تم نہیں جاؤ گے۔" موروِن پر ہسٹریائی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"اندر جاؤ۔" ایڈرے چیخ کر بولا تو موروِن سہم کر ہوش میں آگئی اور ڈیل اور اس کی بہنوں کو لے کر عقبی کمرے میں آگئی۔ ڈیل، باپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ماں سے نظر بچائی اور کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت ایڈرے دروازہ کھول کر باہر جا چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ محاصرہ کرنے والے چلا چلا کر اسے پستول پھینکنے کو کہنے لگے مگر ایڈرے نے اس کے بجائے پستول سیدھا کیا اور فائرنگ کرنے لگا۔ ڈیل کھلے دروازے سے دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی کئی خودکار رائفلیں گرجیں اور اس کا باپ پلٹ کر کمرے میں آگرا۔ وہ گرنے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔

ڈیل اپنی جان کی پروا کیے بغیر باپ کی طرف دوڑا اور مرتے مرتے بچا کیونکہ اندر آنے والے ایک کمانڈو نے خود کو بروقت فائر کرنے سے روکا کیونکہ اس کے سامنے ایک بچہ تھا۔ ایک منٹ سے کم وقت میں ان کا گھر برطانوی ایجنٹوں سے بھر گیا۔ انہوں نے اس کی ماں کو گرفتار کر لیا۔ ڈیل نفرت سے ان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا باپ مر گیا تھا لیکن اس کی موت نے ایک اور حریت پسند کو جنم دیا تھا۔ برطانوی ایجنٹس اس کی ماں کو گرفتار کر کے لے گئے اور کئی مہینے تک کسی خفیہ عقوبت خانے میں اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے اور انہوں نے اس کے ساتھ ہر ممکن برا سلوک روا رکھا اور جب وہ واپس آئی تو ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ اس کے بعد وہ صرف دو مہینے زندہ رہی۔

ڈیل کے دل میں لگی آگ مزید تیز ہو گئی۔ اسے اور اس کی بہنوں کو اس کی ایک دور کی خالہ ساتھ لے گئیں اور اسی نے ان کی پرورش کی۔ وہ اسکول ٹیچر تھی اور اس نے ڈیل کو بتایا کہ آئرلینڈ ایک آزاد ملک تھا جس پر انگریز قابض ہو گئے ہیں۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ڈیل نے اسکول پاس کر لیا۔ وہ ڈبلن کے ایک کالج میں تھا جب اس نے نوجوانوں کے ایک گروپ میں شمولیت اختیار کی جو آئرلینڈ کی آزادی کا حامی تھا اور اسی گروپ کے توسط سے وہ آئی آر اے تک پہنچا۔

یہ مرحلہ اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ غداروں کی کمی نہیں تھی اور آئی آر اے کو اتنا نقصان برطانوی فوج نے نہیں پہنچایا تھا، جتنا ان غداروں نے پہنچایا تھا۔ اس لیے اب کسی نئے آدمی کو بہت چھان پھٹک کر اور اچھی طرح چھان بین کرنے کے بعد لیا جاتا۔ ڈیل کا ایک پس منظر تھا اس کے باوجود اسے آئی آر اے میں شامل ہونے میں بہت وقت لگا۔ شروع میں وہ ایک چھوٹے سے گروپ کے ساتھ تھا جس سے معمولی درجے کے کام لیے جاتے اور ان سے رابطہ بھی محدود ہوتا۔ عام طور سے کسی ایسے طریقے سے ان تک حکم آتا کہ وہ جان ہی نہیں پاتے کہ حکم آیا کس طرح۔ ان کی باقاعدہ نگرانی کی جاتی اور کئی بار ان کو بلاوجہ گھمایا پھرایا گیا۔ یا ایسے کام لیے گئے جن کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جیسے ایک بار ڈیل کو حکم ملا کہ وہ ایک بنڈل ایک خاص کچرے دان سے اٹھا کر اسے ڈبلن میں ایک پولیس اسٹیشن کے سامنے موجود کچرے دان میں ڈال دے۔ ڈیل نے ایسا ہی کیا۔ اس وقت اس کا خیال تھا کہ بنڈل میں کوئی بم ہوگا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ یہ اس کی آزمائش تھی۔ اگر وہ حکومت کا مخبر ہوتا تو اس کی اطلاع کر دیتا اور بعد میں پولیس کے ری ایکشن سے آئی آر اے کو پتا چل جاتا۔

دو سال تک ڈیل اسی قسم کے کام کرتا رہا۔ ان سے چھوٹے موٹے کام لیے جاتے رہے جیسے دیواروں وغیرہ پر

چاکنگ اور کسی سامان کو کہیں پہنچانا۔ ان کے گروپ کا کوئی خاص ٹھکانا نہیں تھا اور نہ ہی وہ تنظیم کے کسی ٹھکانے سے واقف تھے۔ دو سال کی آزمائش کے بعد ان کے گروپ کو قابل اعتماد قرار دے دیا گیا اور پھر ان کو آئی آر اے کے ایک ٹریننگ سینٹر بھیجا گیا۔ ڈیل اور اس کے ساتھی اس جگہ سے بالکل ناواقف تھے انہیں ایک بند وین میں وہاں لے جایا گیا جس میں باہر جھانکنے کے لیے ایک معمولی سا سوراخ تک نہیں تھا۔

اس بلند دیواروں والے سینٹر میں ڈیل اور اس کے پانچ ساتھیوں کو آتشیں ہتھیاروں اور دھماکا خیز مواد استعمال کرنے کی تربیت دی گئی۔ وہ روز پندرہ سے اٹھارہ گھنٹے ٹریننگ لیتے اور چار مہینے بعد جب ان کی تربیت مکمل ہو گئی تو انہیں اسی طرح بند وین میں واپس ڈبلن بھیج دیا گیا۔ ان کو اپنے گھر جانے سے منع کیا گیا تھا کیونکہ پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کو ان کی گمشدگی کا پتا چل گیا تھا اور وہ واپس جاتے تو ان کی کڑی نگرانی شروع ہو جاتی۔ ان کو شہر سے باہر ایک عمارت میں دو کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ دے دیا گیا۔ وہ یہیں رہتے۔

اب ان سے بڑے کام لیے جانے لگے یعنی ایسے کام جن میں جان لینے اور جان جانے دونوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ پہلے ان تک کسی منصوبے کا خاکہ آتا۔ انہیں اسی کے مطابق تیاری کا حکم ملتا اور جب وہ تیاری کر لیتے تو انہیں کسی جگہ سے کام کے لیے مطلوبہ ہتھیار مل جاتے۔ مشن کی کامیابی کے بعد وہ اسلحہ اسی جگہ چھوڑ آتے۔ فلیٹ میں ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک بار وہ گھیرے میں آجاتے تو توپ اور ٹینک بھی ان کو نہیں بچا سکتے تھے۔ ان کا واحد ہتھیار وہ ننھے کیپسول تھے جس میں مہلک زہر بھرا ہوا تھا اور اس کو کھاتے ہی موت واقع ہو جاتی۔

ڈیل کے گروپ کو پہلا بڑا کام ڈبلن کے ایک پولیس افسر کے خاتمے کا سونپا گیا۔ مارین فلیچر نامی یہ شخص آئرش تھا لیکن اپنے ہم وطنوں پر ظلم کرنے میں انگریزوں سے بھی بڑھ کر تھا۔ کم سے کم ایک درجن حریت پسندوں کا خون اس کی گردن پر تھا۔ اس کی خدمات کے صلے میں برطانوی حکومت نے اسے اعزازات سے بھی نوازا تھا۔ پولیس کو بھی معلوم تھا کہ حریت پسند اس کے خون کے پیاسے ہیں اس لیے اس کی خصوصی حفاظت کی جاتی اور اس کی گاڑی کے ساتھ ایک پولیس کار خاص طور سے چلتی۔ دو بار اس پر قاتلانہ حملے ہو چکے تھے اور ان حملوں میں چار حریت پسند مارے گئے تھے اور تین زخمی ہو کر گرفتار ہو گئے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا لیکن اس سے آئی آر اے کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔

ڈیل اور اس کے ساتھی بھی مارین سے شدید نفرت کرتے تھے اس لیے جب انہیں اس کے خاتمے کا مشن سونپا گیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مارین پر پولیس اسٹیشن میں حملہ ناممکن تھا اور اسی طرح اس کے گھر پر حملہ کرنا بھی مشکل تھا کیونکہ دونوں جگہوں پر حفاظتی انتظامات بہت سخت تھے۔ اب ایک ہی طریقہ تھا کہ اس پر راستے میں حملہ کیا جاتا۔ اگرچہ اس دوران میں بھی اس کے ساتھ کم سے کم نصف درجن محافظ ہوتے مگر حملہ کرنا پھر بھی ممکن تھا۔ اس لیے ڈیل اور اس کے ساتھیوں نے اس پر راستے میں حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

پولیس اسٹیشن سے گھر تک کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ یہ راستہ آبادی سے بھی گزرتا تھا اور ویرانے سے بھی۔ ڈیل نے اس راستے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہاں حملہ کرنے کے لیے کئی موزوں مقامات تھے لیکن ایک مسئلہ تھا کہ مارین کے ساتھ موجود حفاظتی دستہ بہت مستعد اور تربیت یافتہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ اس سے پہلے مارین پر ہونے والے دو قاتلانہ حملوں کو ناکام بنانے میں ان کا کردار بنیادی تھا۔ ڈیل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"ہمیں سب سے پہلے مارین کو اس کے حفاظتی دستے

تمباکو نوشی

سگریٹ نوش ایک سگریٹ ساز ادارے کی اشتہاری کمپنی کو جب یہ معلوم ہوا کہ وادی گلگت میں ایک ایسا سگریٹ نوش بوڑھا رہتا ہے جس کی عمر عنقریب سو سال ہونے والی ہے تو اس سے ملنے کے لیے اپنے ادارے کے ایک سینئر آفیسر کو روانہ کر دیا۔

افسر نے گلگت پہنچ کر اس بوڑھے کو تلاش کیا اور اس سے ملتے ہی اس سے کہا۔ "دیکھیے بڑے صاحب! کل ہم ہوائی جہاز سے اسلام آباد چلیں گے اور وہاں سے کراچی۔ کراچی میں ہم آپ کی سوویں سالگرہ منائیں گے۔ ہم آپ کو پچاس ہزار روپے نقد بھی پیش کریں گے۔ آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

بوڑھے شخص نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "تجویز تو بہت اچھی ہے مگر ٹی وی پروگرام صبح کے اوقات پر مت رکھیے گا۔"

افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"کیوں کہ دوپہر تک میری کھانسی کسی طرح نہیں رکتی۔" بوڑھے نے بتایا۔

www.pkdigest.com

سے دور کرنا ہوگا۔''

''وہ کیسے؟'' ایش نامی نوجوان نے پوچھا۔

''یہ سوچنا ہوگا۔''

ڈیل نے ایک بار پھر راستے کا جائزہ لیا۔ ایک جگہ اسے مناسب لگی۔ یہاں سڑک وی کے انداز میں موڑ لے رہی تھی۔ پھر ڈیل نے ایک بلند مقام سے دوربین کی مدد سے مارین کو دفتر آتے جاتے دیکھا۔ اس کی محافظ گاڑی اس کی گاڑی سے کوئی دس گز کی دوری پر ہوتی تھی۔ ڈیل نے منصوبہ بنایا کہ دونوں گاڑیوں کو الگ الگ نشانہ بنایا جائے اور محافظ گاڑی کے ٹائرز ناکارہ کردیے جائیں اور اس کے بعد مارین کی گاڑی پر حملہ کیا جائے۔ مارین اپنی گاڑی خود چلاتا تھا اس لیے کسی اور کے مارے جانے کا امکان کم تھا۔

انہوں نے منصوبہ تیار کرلیا۔ منصوبے کے تحت ان کو دو الگ الگ پارٹیوں میں بٹ کر کام کرنا تھا۔ پہلی پارٹی کو وی موڑ پر مڑنے سے پہلے محافظ گاڑی کو روک کر ناکارہ بنانا تھا اور دوسری پارٹی آگے گھات لگا کر مارین پر حملہ کرتی۔ کام کرنے کے بعد دونوں ایک ہی گاڑی میں جائے وقوع سے فرار ہوجاتے۔ یہ گاڑی چوری کی ہوتی اور پہلے ہی حملے کے مقام پر موجود ہوتی۔ ڈیل کے گروپ نے اوپر والوں سے خودکار اسلحہ اور بموں کی فرمائش کی جو منظور کرلی گئی اور انہیں بتایا گیا کہ یہ اسلحہ انہیں ایک دن پہلے مل جائے گا۔

مشن والے دن ڈیل اور اس کے ساتھی دو گروپس میں وی موڑ پر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔

ڈیل پہلے گروپ میں تھا اور انہیں محافظ گاڑی کو وی موڑ پر مڑنے سے پہلے روکنا تھا۔ دوسرا گروپ وی موڑ کے کوئی بیس گز بعد سڑک کے دونوں طرف موجود تھا اور اسے خودکار رائفلوں اور دستی بموں سے مارین کی گاڑی پر حملہ کرنا تھا تاکہ اس کے بچنے کا ذرا سا امکان بھی باقی نہ رہے۔ دونوں گروپ واکی ٹاکی سیٹس کی مدد سے آپس میں رابطے میں تھے۔ آج سے کوئی چالیس سال پہلے یہ اتنے عام نہیں تھے لیکن آئی آر اے نے یہ حاصل کرلیے تھے۔ جیسے ہی مشن مکمل ہوتا، وہ یہاں سے نکل جاتے۔

مارین کی پولیس اسٹیشن سے واپسی عام طور سے سات بجے ہوتی۔ سردیوں میں اس وقت تک تاریکی چھاجاتی تھی۔ اس وقت رات ہو چلی تھی۔ انہوں نے دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ ڈیل نے اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا اور جیسے ہی مارین کی گاڑی موڑ مڑ کر آگے گئی، انہوں نے پیچھے آنے والی محافظ گاڑی پر فائر کھول دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اس کے ٹائروں کو نشانہ بنایا۔ ٹائرز برسٹ ہوئے تو گاڑی بے قابو ہوکر کچے میں اتر گئی۔ اس دوران میں ڈیل اور اس کے ساتھی گاڑی پر مسلسل فائرنگ کرتے رہے۔ پھر پولیس والوں کی بدقسمتی کہ کوئی گولی پیٹرول ٹینک میں جا لگی اور گاڑی کو آگ لگ گئی۔ صرف دو پولیس والوں کو باہر نکلنے کا موقع ملا اور وہ ڈیل کے ساتھیوں کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ باقی گاڑی میں ہی جل کر مرگئے۔

یہ کام مکمل کرکے ڈیل اور اس کے ساتھی مارین کی کار کے پیچھے بھاگے لیکن دوسرے گروپ نے اپنا کام کردیا تھا۔ انہوں نے پہلے فائرنگ کرکے مارین کی کار کو روکا اور پھر اسے دستی بموں سے اڑا دیا۔ مارین کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہاں سے کار میں فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ اسلحہ انہوں نے اسی جگہ چھوڑ دیا اور واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ گئے۔ اس رات انہوں نے کامیابی کا جشن منایا۔ ڈیل نے پہلی بار اتنی پی کہ اسے کچھ ہوش نہیں رہا۔

مشن کی کامیابی پر اگلے روز انہیں اوپر والوں کی طرف سے شاباش ملی۔ آنے والے برسوں میں انہوں نے اس طرح کی کئی کامیاب کارروائیاں کیں۔ انہوں نے برطانیہ اور اس کے ایجنٹوں کو کئی بار نقصان پہنچایا لیکن انہیں بھی نقصان اٹھانے پڑے۔ ڈیل کے تین ساتھی مختلف مہمات کے دوران مارے گئے اور اب ڈیل اس گروپ کا سربراہ تھا۔ اس کے ساتھ مزید سات افراد تھے جن میں تین مرد اور تین عورتیں شامل تھیں۔ اب وہ فلیٹ کے بجائے ایک فارم ہاؤس میں رہ رہے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک کی شدت میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ آئی آر اے نے آئرلینڈ کی حدود سے نکل کر بھی کارروائیاں کیں۔ ڈیل ذاتی طور پر ان کارروائیوں کے خلاف تھا کیونکہ ان میں زیادہ تر عام لوگوں کا نقصان ہوتا اور اس کا خیال تھا کہ جو گوریلا تحریک عام افراد اور اپنے دشمنوں میں فرق نہیں کرتی وہ بالآخر ناکام ہوجاتی ہے۔ مگر ڈسپلن کی وجہ سے وہ اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے منہ سے کچھ نکل جاتا جس سے اس کے ساتھیوں کو اندازہ ہوا کہ وہ اس بارے میں کیا سوچ رکھتا ہے۔ گروپ میں ایتا اس کے قریب تھی اور وہ ڈیل سے ایک اور طرح کا لگاؤ بھی رکھتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس لگاؤ کا اظہار نہ تو کبھی ان کی باتوں میں آیا اور نہ ہی ان کے تعلقات سے پتا چلتا تھا۔ لیکن سب جانتے تھے کہ ایتا، ڈیل سے محبت کرتی ہے۔ ڈیل کے دل میں کیا ہے،

یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

آئی آر اے اور برطانوی حکومت کی کشمکش نے آئرلینڈ کے عوام کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ دل سے آئی آر اے سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن اس کے نتیجے میں ان کو برطانوی استبداد کا سامنا کرنا پڑتا۔ آئے دن ان کی آبادیوں کا محاصرہ ہوتا اور ان کو اہانت آمیز انداز میں تلاشیوں اور سوال جواب کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا۔ ذرا سے شبہے پر نوجوانوں کو پولیس اور ایجنسی والے اٹھا لے جاتے اور پھر ان کا برسوں سراغ نہیں ملتا۔ برطانوی حکومت کا یہ رویہ آئی آر اے کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ بن گیا تھا۔ خاص طور سے نوجوان اس کی طرف آرہے تھے۔

آئی آر اے کی فنڈنگ کا سب سے بڑا ذریعہ دنیا بھر اور خاص طور سے امریکا میں آباد آئرش نژاد باشندے تھے۔ یہ ہر سال کروڑوں ڈالرز آئی آر اے کو دیتے لیکن برطانوی حکومت نے بینکوں کی نگرانی سخت کرکے آئی آر اے کو مالی طور پر خاصی زک پہنچائی۔ اس کا ازالہ کرنے کے لیے آئی آر اے نے بینکوں کے لیے رقم لے جانے والی ٹرین لوٹنے کا منصوبہ بنایا اور یہ کام ڈیل کے گروپ کو سونپا گیا۔ گلاسگو سے لندن جانے والی اس ٹرین میں ہر ہفتے ایک ارب پاؤنڈ کی خطیر رقم منتقل کی جاتی اور اس بلٹ پروف ٹرین کو سخت حفاظت میں روانہ کیا جاتا تھا۔ پولیس کا دعویٰ تھا کہ اس کی سیکورٹی فول پروف ہے۔

یہ کوئی الگ ٹرین نہیں تھی بلکہ یہ ایک پسنجر ٹرین کا ڈبا تھا جو رقم لے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ فولادی چادر سے بنے اس ڈبے کا دروازہ کسی تجوری کے دروازے جیسا تھا۔ اسے کھولنا آسان نہیں تھا۔ ڈبے کے اندر چار محافظ ہوتے تھے اور گلاسگو سے روانگی کے بعد اس کا دروازہ صرف لندن میں ایک خاص پلیٹ فارم پر گارڈز کی نگرانی میں کھولا جاتا۔ اس ڈبے میں کوئی سوراخ نہیں تھا اور یہ مکمل طور پر بند تھا۔ اس میں کسی ذریعے سے گیس یا کوئی ایسی چیز نہیں داخل کی جاسکتی تھی جس سے گارڈز ناکارہ ہوجائیں۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحے کے ساتھ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے تمام ذرائع موجود تھے۔

ڈیل کئی مہینے تک اس ٹرین کا جائزہ لیتا رہا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ٹرین کو لوٹنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس نے یہ بات اپنے اوپر والوں کو بھی بتادی۔ اسے کہا گیا کہ ٹرین ہر صورت لوٹنی ہے۔ ڈیل کے ساتھی بھی اس صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ ان میں سے ایک مارش نامی نوجوان تھا۔ اس نے ڈیل سے کہا کہ ٹرین کو لوٹا جاسکتا ہے۔

''میرے پاس ایک منصوبہ ہے جس میں کامیابی کا امکان بہت زیادہ ہے۔'' مارش نے کہا۔

''منصوبہ کیا ہے؟'' ڈیل نے نرمی سے پوچھا۔ وہ تمام امکانات پر غور کرچکا تھا۔

مارش معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''منصوبہ تو قابلِ عمل ہے لیکن شاید تم مانو گے نہیں۔''

''پہلے تم منصوبہ بتاؤ، اس کے بعد فیصلہ کریں گے کہ اس پر عمل کرنا ہے یا نہیں۔'' ایتا بولی۔

مارش ایک پُرجوش اور کسی قدر اذیت پسند شخص تھا۔ کئی بار اس نے ایسی گفتگو کی جس سے پتا چلا کہ وہ جنگ میں عام افراد کو بھی نقصان پہنچانے کا قائل ہے۔ ڈیل اس کے خیالات سے اختلاف رکھتا تھا لیکن ان میں کبھی بحث کی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مارش کسی اہم موقع پر سامنے آیا تھا اور ان کے سامنے اپنا منصوبہ رکھنے والا تھا۔ جب اس نے اپنا منصوبہ بیان کیا تو ڈیل نے فوراً ہی ناپسندیدگی کا اظہار کردیا۔

''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح لوگوں کو براہِ راست نقصان ہوگا۔''

''لیکن ہمارا تو فائدہ ہوگا۔'' مارش بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس طرح کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔''

ڈیل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ کامیابی تحریک کے لیے بہت تباہ کن ہوگی۔ اصل میں جو لوگ ہم سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ بھی ہمارے مخالف ہوجائیں گے۔''

''اب بھی وہ ہم سے صرف زبانی کلامی ہمدردی کررہے ہیں۔'' مارش کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ ''ہمیں ان کی زبانی ہمدردی نہیں رقم اور اسلحے کی ضرورت ہے۔''

ان لوگوں میں بحث چھڑ گئی۔ اگرچہ دیگر ساتھی مارش کے منصوبے کے مخالف تھے لیکن کچھ اس کے حامی بھی تھے۔ ڈیل کو اس وقت شدید حیرت ہوئی جب ایتا نے بھی مارش کی حمایت کی۔ ڈیل نے اسے حیرت سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ ڈیل نے یہ کہہ کر بحث ختم کردی کہ اکثر اس منصوبے کے خلاف ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اب یہ بات دوبارہ نہیں اٹھے گی۔ لیکن ایک رات جب وہ فارم کا گشت لگا رہا تھا، ایتا بھی اس کے ساتھ آگئی۔ اس کے انداز سے ڈیل کو پتا چل گیا کہ وہ کوئی خاص بات کرنے آئی ہے۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ ڈیل منتظر تھا کہ وہ کیا کہتی ہے۔ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

''تمہیں کچھ پتا ہے؟''

''کیا پتا ہے؟''

''مارش نے اپنا منصوبہ اوپر والوں کے سامنے پیش کر

www.pkdigest.com

دیا ہے۔''

ڈیل ایک لمحے کو سن رہ گیا۔ ''میرے علم میں لائے بغیر؟''

''ہاں۔''

ڈیل کو غصہ آنے لگا۔ ''یہ ڈسپلن کی خلاف ورزی ہے۔''

ایبا خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ''اصل بات یہ نہیں ہے۔''

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ڈیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا اوپر والوں نے اس کا منصوبہ قبول کر لیا ہے؟'' اس کا لہجہ پُرسکون تھا۔

ایبا نے سر ہلایا۔ ''اور امید ہے کہ انچارج بھی وہی ہوگا۔''

ڈیل کے لیے یہ اچھی خبر نہیں تھی۔ وہ تحریک کے لیے کام کرتا تھا، عہدے کے لیے نہیں۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ مارش جیسے فرد کو انچارج بنا دیا جائے تو اس سے بہت ساری خرابیاں جنم لے سکتی ہیں۔ ایبا ان کے گروپ میں رابطہ کار تھی اس لیے بہت ساری باتیں قبل از وقت اس کے علم میں آ جاتی تھیں۔ ڈیل جانتا تھا کہ اس نے اندر کی بات بتا کر ڈسپلن کی خلاف ورزی کی ہے لیکن شاید وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اس نے ڈیل سے یہ تک نہیں کہا کہ وہ اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ ڈیل جانتا تھا کہ اسے اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کرنا ہے۔

توقع کے عین مطابق اوپر سے حکم آ گیا کہ مِنی ٹرین مشن کے لیے مارش کو انچارج مقرر کر دیا گیا ہے اور وہ سب اس مشن کی حد تک اس کے ماتحت ہیں۔ ڈیل یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ اگر مشن کامیاب رہا تو مارش گروپ کا باس بھی بن سکتا ہے اور وہ اس سے کہیں اوپر بھی جا سکتا ہے کیونکہ مارش اس مشن کا سربراہ تھا اس لیے ڈیل نے منصوبہ بنانے میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیا مگر اس نے مارش کو اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ مارش نے بہت سادہ سا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ کسی چھوٹے اسٹیشن پر ٹرین روک لیتے اور پھر گارڈز کو مجبور کر کے ڈبے کا دروازہ کھلوا لیتے اور اسے لوٹ کر فرار ہو جاتے۔

انہوں نے ایک دیہی اسٹیشن کا انتخاب کیا۔ رقم لے جانے کے لیے ایک بند وین خریدی گئی اور اس کا رنگ اور نمبر پلیٹ بھی بدل دی گئی — پھر اس دیہی اسٹیشن سے ذرا فاصلے پر انڈسٹریل ایریا میں ایک گودام حاصل کیا جہاں وہ سب واردات کے بعد پہنچتے۔ وہاں وہ وین چھوڑ کر تمام رقم تین کاروں کے خفیہ خانوں میں چھپا کر مختلف راستوں سے ڈبلن کی طرف نکل جاتے۔ ڈیل کو یہ منصوبہ کچھ زیادہ ہی سادہ لگ رہا تھا لیکن اس نے اعتراض نہیں کیا۔

مقررہ تاریخ کو وہ گلاسگو سے ٹرین میں سوار ہوئے۔ انہیں اسلحہ اور دوسری چیزیں ایک اور اسٹیشن سے ملتیں اور اس کے بعد وہ اپنے منصوبے پر عمل کر سکتے تھے۔ اس اسٹیشن پر انہیں اسلحہ اور بارود سے بھرے بیگ مل گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے اسلحے کے زور پر ٹرین کو روکا اور ان کے دو افراد انجن روم میں گھس گئے۔ اس کے بعد انہوں نے تمام مسافروں کو اسلحے کے زور پر دو ڈبوں میں منتقل کیا اور ان میں بارود سے بھرے تھیلوں کے ساتھ ریموٹ لگا دیا۔ انہوں نے مسافروں کو دھمکی دی کہ اگر کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو وہ انہیں بموں سے اڑا دیں گے۔

طے شدہ اسٹیشن پر ٹرین روک کر انہوں نے حکام کو اطلاع دی کہ انہوں نے ٹرین اغوا کر لی ہے اور اگر ایک پولیس والا بھی اسٹیشن کے پاس آیا تو وہ ٹرین کو اڑا دیں گے۔ انہوں نے مسافروں سے بموں کی تصدیق کرائی — اس کے بعد انہوں نے اصل کام شروع کیا اور ڈبے کے گارڈز کو دروازہ کھولنے اور ہتھیار ڈال کر باہر آنے کا حکم دیا۔ ظاہر ہے انہوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ اس پر مارش ٹرین سے کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو لے آیا۔ اس نے گارڈز کو دھمکی دی کہ وہ دروازہ کھولنے میں جتنی دیر لگائیں گے وہ ہر ایک منٹ کے بعد ایک مسافر کو قتل کرتے جائیں گے۔ مارش نے صرف دھمکی نہیں دی بلکہ اس نے منٹ پورا ہوتے ہی ایک لڑکی کو گولی مار دی۔ اس کی چیخ نے گارڈز کے ساتھ ڈیل کو بھی دہلا دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہتھیار ڈال دیں گے۔''

مارش نے سرد نظروں سے اسے دیکھا۔ ''انچارج میں ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈبے میں موجود گارڈز سے چلّا کر کہا۔ ''ایک منٹ بعد ایک اور یرغمالی مارا جائے گا اور اس کی ذمے داری تم پر آئے گی۔''

ایک منٹ بعد اس نے سچ مچ دوسرے یرغمالی کو بھی گولی مار دی۔ ڈیل کا غصے سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ مارش کو ایک طرف لے گیا۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے؟ ہم نے کبھی عام آدمیوں کی اس طرح جان نہیں لی۔''

''اب لیں گے۔'' مارش نے سکون سے جواب دیا۔ ''یہ مان جائیں گے لیکن اس میں بہت تاخیر ہوگی اور پولیس کو ہمارے گرد گھیرا تنگ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس طریقے سے ہم جلد ڈبے کا دروازہ کھلوا لیں گے۔''

''کچھ بھی ہو اب تم کسی کو گولی نہیں مارو گے۔''

''تم یہ بات ذہن سے نکال دو کہ انچارج تم ہو۔ اب

میں انچارج ہوں۔'' مارش نے زہریلے لہجے میں کہا اور ڈبے کی طرف چلا گیا اس نے ایک اور نوجوان کے سر پر پستول رکھ کر بلند آواز سے کہا۔ ''باہر آجاؤ ورنہ ایک منٹ کے بعد یہ تیسرا بھی مارا جائے گا... اور اگر تم مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو کوئی بات نہیں، ہمارے پاس اتنے یرغمالی ہیں کہ ایک ایک منٹ بعد بھی مارتے رہے تو دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں۔''

گارڈز تذبذب میں تھے لیکن جب مارش نے تیسرے کو بھی گولی ماری تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ دروازہ کھول کر اور سروں پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل آئے۔ مارش اور اس کے ساتھی فوری طور پر حرکت میں آئے اور انہوں نے رقم کے بڑے بڑے بکس اٹھا کر باہر نکال لیے۔ یہ کل سات بکس تھے جن میں سے ہر ایک کا حجم بڑے سوٹ کیس سے بھی بڑا تھا۔ ان میں سے کسی بکس کا وزن سو کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے اسٹیشن سے ٹرالی حاصل کی اور بکس اس پر رکھ کر سامان کو پارکنگ میں موجود وین میں منتقل کرنے لگے۔ اس وقت تک باہر پولیس کی ایک کار آگئی تھی لیکن وہ دور تھی۔ رقم کی منتقلی کے بعد انہوں نے دو یرغمالی اپنے ساتھ لیے اور پولیس کو خبردار کیا کہ اگر وہ ان کے پیچھے آئی تو وہ انہیں مار دیں گے۔

پولیس کو اس بارے میں ذرا بھی شک نہیں رہا تھا کیونکہ تین افراد کو وہ پہلے ہی مار چکے تھے۔ اس لیے پولیس نے وین کا تعاقب نہیں کیا۔ وہ کامیابی سے گودام تک پہنچ گئے۔ انہوں نے دونوں یرغمالیوں کو وہیں باندھ کر ڈال دیا۔ اس کے بعد انہوں نے رقم نکال کر تینوں گاڑیوں کے خفیہ خانوں میں چھپائی لیکن رقم اتنی زیادہ تھی کہ وہ ساری رقم نہیں چھپا سکے اور کچھ رقم پھر بھی بچ گئی جو انہیں وہیں چھوڑنا پڑی۔ اس کے بعد وہ گودام سے روانہ ہوگئے۔ یرغمالیوں کے بارے میں کال کرکے پولیس کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ باحفاظت ڈبلن پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔

مارش اور دیگر ساتھی اس کامیابی پر بہت خوش تھے لیکن ڈیل خوش نہیں تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو اس واردات کے دوران تین غیر متعلقہ افراد مارے گئے تھے اور دوسرے ڈیل کے خیال میں کامیابی کے باوجود انہوں نے جا بجا ایسے نشانات چھوڑے تھے جو پولیس اور ایجنسیوں کی ان تک راہنمائی کر سکتے تھے۔ مارش اور اس کے ہم نوا ساتھیوں نے اس وقت ڈیل کے خدشات کا مذاق اڑایا۔

لیکن جلد پولیس نے گاڑیوں کی مدد سے ان کا سراغ لگانا شروع کر دیا اور اس شخص کو گرفتار کرلیا جس نے ان کے لیے گاڑیاں مہیا کی تھیں اور گودام کا بندوبست کیا تھا۔ یہ شخص براہِ راست آئی آر اے سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی گرفتاری بہت بڑا خطرہ تھی۔ حسبِ توقع اس نے سب اگل دیا۔ ڈیل یہ جان کر پریشان ہوگیا کہ اس شخص نے نہ صرف اسے اس کارروائی کا سرغنہ قرار دیا تھا بلکہ اس کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔ اس نے ڈیل کی تصویر بھی پولیس کو مہیا کر دی تھی اور چند گھنٹوں کے اندر برطانیہ کا بچہ بچہ اس سے واقف ہو چکا تھا۔ ڈیل کو فوری طور پر زیرِ زمین جانا پڑا۔

پھر انہیں دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ایجنسیوں نے آپریشن کر کے لوٹی جانے والی رقم کا بڑا حصہ برآمد کرلیا۔ ڈیل کے لیے ذاتی طور پر یہ بڑا نقصان ثابت ہوا کیونکہ اس آپریشن میں اینا زخمی ہوکر گرفتار ہوگئی تھی اور بعد میں پتا چلا کہ اس کی آنکھیں ضائع ہوگئی ہیں۔ جب اسے پتا چلا تو وہ دکھ سے کئی دن تک سو نہیں سکا۔ اسے معلوم تھا کہ انگریز درندے آئی آر اے سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور خاص طور سے عورتوں کے ساتھ تو وہ بہت برا سلوک کرتے تھے۔ ان کے خلاف آبروریزی کے حربے کو بطور آلۂ تفتیش استعمال کرتے تھے۔ ڈیل کے لیے یہ بہت اذیت ناک بات تھی کہ اینا کسی عقوبت خانے میں قید ہے۔

چند مہینے میں اس نے داڑھی مونچھیں بڑھا لیں اور اپنے سنہری مائل بالوں کو سرخی مائل کر کے اپنے حلیے میں خاصی تبدیلی پیدا کرلی۔ اس دوران میں آئی آر اے کے آدمیوں نے معلوم کرلیا کہ اینا اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو شمالی آئرلینڈ میں ایک سابق ائربیس پر رکھا گیا ہے۔ یہ ائربیس جنگِ عظیم دوم میں استعمال ہوا تھا اور اس کے بعد ویران پڑا تھا۔ جب آئی آر اے کی تحریک شروع ہوئی تو برطانوی حکومت نے اس بیس کو ایجنسیوں کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے حریت پسندوں کے خلاف عقوبت خانہ بنا دیں۔

ڈیل نے اپنے اوپر والوں سے مطالبہ کیا کہ اسے اس بیس پر حملہ کر کے اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کی اجازت دی جائے۔ مارش نے اس کی مخالفت کی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ کام بہت خطرناک ہے اور اس میں ناکامی کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔ پھر چھ افراد کو چھڑانے کے لیے اس سے زیادہ افراد کو خطرے میں ڈالنا کوئی عقل مندی نہیں تھی۔ مارش، اب گروپ کا سربراہ تھا اور اس کی بات مانی گئی۔ اوپر والوں نے ڈیل کا مطالبہ رد کر دیا۔ ڈیل مایوس ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ اینا اور دوسرے لوگوں کو برسوں غیر قانونی حراست میں رکھ کر ان سے معلومات حاصل کی جائیں گی اور جب وہ بالکل ناکارہ ہو جائیں گے تو ان کو کسی نام نہاد عدالت میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے جیل میں

ڈال دیا جائے گا۔ اس واقعے کے بعد ڈیل کا دل تحریک سے اچاٹ ہوگیا لیکن اس نے اس بارے میں کچھ کہا نہیں۔ اسے معلوم تھا کہ ایک بار اوپر والوں کو اس کی بیزاری کا علم ہوگیا تو وہ مارا جائے گا۔ کوئی تحریک اپنی صف میں کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرتی جو تحریک سے معمولی سا بھی اختلاف رکھے۔ وہ دل کی بات دل میں رکھنے پر مجبور تھا۔

ڈیل کے کچھ ساتھی اس بات کے حامی تھے کہ ان کو اپنے ساتھی حکومت کی قید سے ہر قیمت پر آزاد کرانے چاہئیں کیونکہ ان کی وجہ سے تحریک کو خطرہ لاحق تھا۔ وہ بہت سارے راز جانتے تھے جن کے افشا ہونے سے اور بھی بہت سے کارکن خطرے میں پڑ جاتے۔ انہیں زیرِ زمین جانا پڑتا یا ملک سے ہی بھاگنا پڑتا۔ یہ لوگ مجبور تھے، چاہنے کے باوجود اپنے طور پر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جب تک اوپر والے ان کو اجازت نہیں دیتے ان کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانا ناممکن تھا۔

ڈیل کا اندازہ درست نکلا، جب دو سال بعد اس نے اخبار میں اینا اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی تصاویر دیکھیں۔ پولیس ان کو دہشت گردی کے الزامات میں عدالت میں پیش کرنے جا رہی تھی۔ ان پر جو الزامات لگائے گئے تھے، ان میں ٹرین کی واردات بھی شامل تھی۔ اس میں تین نوجوان لڑکے لڑکیاں مارے گئے تھے۔ اگر الزامات ثابت ہو جاتے تو اینا اور دوسرے ساتھیوں کو سزائے موت بھی ہو سکتی تھی۔

ڈیل نے ایک بار پھر اوپر والوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو آزاد کرانے کی اجازت دیں۔ اس بار اس کا مطالبہ مان لیا گیا لیکن مشن انچارج اس بار بھی مارش تھا جو اس منصوبے کا مخالف تھا۔

ڈیل نے منصوبہ بنایا کہ وہ اینا اور دیگر ساتھیوں کو اس وقت چھڑانے کی کوشش کریں گے جب انہیں عدالت سے لے جایا جا رہا ہوگا۔ وہ سب اب مقامی جیل میں تھے جہاں سے ان کو سخت حفاظتی انتظامات کے ساتھ لایا اور لے جایا جاتا تھا۔ قیدیوں کی گاڑی کے ساتھ دو عدد بکتر بند گاڑیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس قافلے پر حملہ کر کے قیدیوں کو چھڑا لے جانا آسان کام نہیں تھا کیونکہ بکتر بند گاڑیوں پر گولی اثر نہیں کرتی، اسی طرح قیدیوں کی وین بھی بلٹ پروف تھی۔ اس لیے ڈیل نے ہلکی طاقت کی بارودی سرنگیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حال ہی میں ان ریموٹ کنٹرول سرنگوں کے استعمال کی تربیت حاصل کی تھی۔ یہ چپٹی اور سیاہ رنگ کی بارودی سرنگیں سڑک پر رکھ کر بھی استعمال کی جا سکتی تھیں اور ان کو دور سے دیکھنا ناممکن تھا۔

انہوں نے جو دن منتخب کیا، اس دن اینا اور دوسرے لوگوں کے خلاف فیصلہ سنایا جانا تھا۔ عدالت نے ان سب کو جرم کا مرتکب قرار دیتے ہوئے اینا اور ایک ساتھی کو سزائے موت اور باقیوں کو عمر قید کی سزا سنائی۔ ڈیل اس وقت اس جگہ تھا جہاں اسے حملہ کرنا تھا۔ اس کے ساتھ چار افراد اور تھے۔ باقی راستے میں مختلف مقامات پر موجود تھے اور وہ ڈیل کو اطلاعات دے رہے تھے۔ جب قافلہ قیدیوں کو لے کر روانہ ہوا تو ڈیل کو پتا چل گیا۔ اس نے سڑک پر پانچ عدد بارودی سرنگیں بچھا دی تھیں۔ کاؤنٹی جیل کی طرف جانے والی یہ سڑک عام طور سے ویران ہوتی تھی اس لیے امکان کم تھا کہ کوئی اور گاڑی اس طرف سے گزرے گی۔ بارودی سرنگ کے دھماکوں کے فوراً بعد اس کے ساتھی قافلے پر گیس والے بم پھینکتے اور وہ دھوئیں کی آڑ میں اینا اور دوسرے ساتھیوں کو نکال لے جاتے۔

ڈیل کا دل دھڑک رہا تھا کیونکہ معاملہ صرف اپنی نہیں بلکہ اینا کی زندگی کا بھی تھا۔ ناکامی کا امکان زیادہ تھا۔ دونوں بکتر بند گاڑیوں میں دس سے زیادہ تربیت یافتہ کمانڈوز ہوتے اور وہ صرف چار تھے۔ اگر وہ انہیں نشانہ نہیں بنا پاتا تو خود ان کی جان کے لالے پڑ جاتے۔ جب قافلہ نمودار ہوا تو ڈیل چوکنا ہوگیا۔ سرنگیں اسے ہی بلاسٹ کرنا تھیں اور ٹائمنگ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی تاخیر سے کام خراب ہو جاتا۔ اس کے پاس پانچ سوئچ تھے، ہر سوئچ دبانے سے الگ سرنگ پھٹتی۔ اسے یہ فیصلہ بھی کرنا تھا کہ کون سی سرنگ بلاسٹ کرنی ہے۔

جیسے ہی پہلی بکتر بند گاڑی سب سے آخری سرنگ کے پاس پہنچی، ڈیل نے اس کا سوئچ دبا دیا اور بکتر بند دھماکے سے اچھل کر سڑک سے نیچے جا گری۔ اس کے عقب میں آنے والی قیدیوں کی وین افراتفری میں لہرائی اور وہ بھی سڑک سے نیچے اتر گئی۔ اس کے بعد ڈیل کا کام آسان ہوگیا۔ اس نے دوسری بکتر بند کو تباہ کرنے کے لیے بیک وقت سارے سوئچ دبا دیے۔ بکتر بند مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ڈیل کے ساتھیوں نے سڑک پر گیس اور دھوئیں کے بم پھینک دیے جن سے ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ پھر وہ گیس ماسک منہ پر چڑھا کر قیدیوں والی وین کی طرف بھاگے۔

ڈیل سب سے آگے تھا۔ اس وقت پہلی بکتر بند گاڑی سے زخمی کمانڈوز اتر رہے تھے۔ ڈیل کے ساتھی ان سے نمٹنے لگے اور ڈیل قیدیوں والی وین کے پاس آیا۔ اس کا انجن ابھی اسٹارٹ تھا لیکن بارودی سرنگ کے دھماکے میں اس کے

www.pkdigest.com

سامنے والے فائر زبردست ہو گئے تھے۔ ڈیل نے عقبی تالے کو گولی مار کر کھولا اور اندر موجود اپنے پانچوں ساتھیوں کو باہر آنے کو کہا۔ وہ پہلے ہی تیار تھے۔ انہوں نے نابینا ایتا کو سہارا دے کر اتارا۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈیل کا دل کٹنے لگا لیکن یہ افسوس کا وقت نہیں تھا۔ وہ فوری طور پر ان کو لے کر روانہ ہو گئے۔ دوسری بکتر بند میں موجود کوئی شخص زندہ نہیں بچا تھا اور اس سے معمولی سی مزاحمت ہوئی تھی۔ وہ مزید پولیس فورس کے آنے سے پہلے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈیل، ایتا کو زندہ واپس لانے پر خوش تھا لیکن دوسری طرف اسے افسوس تھا کہ اس کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ تحریک کے لیے مزید خدمات انجام دے سکتی۔ اس لیے اسے جنوبی امریکا کے کسی ملک بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ جنوبی امریکا ان کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ وہاں تک برطانوی ایجنٹوں کی رسائی نہیں تھی۔ ڈیل کو نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں بھیجا گیا ہے، بس اسے اتنا معلوم تھا کہ ایتا اب خیریت سے اور سکون سے رہ رہی ہے۔

اس کارنامے کے بعد ڈیل نے گروپ میں اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن واپس حاصل کر لی تھی۔ انہی دنوں جنوبی آئرلینڈ میں ایک بڑے فوجی آپریشن کے خلاف کارروائیوں کا فیصلہ کیا گیا۔ اس آپریشن میں برطانوی فوج نے بے گناہ آئرش باشندوں کو تشدد کا نشانہ بنایا اور گھروں میں گھس کر لوگوں کو مارا پیٹا تھا۔ ان کی عورتوں کی بے حرمتی کی اور جس نے مزاحمت کی، اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس آپریشن میں دو ہزار افراد گرفتار ہوئے تھے جن میں سے اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ اب ان لوگوں پر سرکاری عقوبت خانوں میں بہیمانہ تشدد کیا جا رہا تھا۔ اس آپریشن کے خلاف آئی آر اے نے عارضی جنگ بندی ختم کر کے بھرپور جواب دینے کا فیصلہ کیا اور پورے آئرلینڈ میں فوج اور پولیس کے خلاف حملے شروع ہو گئے۔ ساتھ ہی سرکاری عمارتوں اور برطانیہ کے حامی آئرش باشندوں کو بھی نشانہ بنایا جانے لگا۔

ڈیل کیونکہ بارودی سرنگوں کے استعمال کا ماہر تھا اس لیے اس کے گروپ کو بارودی سرنگوں کی مدد سے برطانیہ کے فوجی قافلوں کو اڑانے کا کام سونپا گیا۔ ڈیل نے دو بار بہت کامیابی سے فوجی قافلوں کو نشانہ بنایا۔ ان حملوں میں کئی فوجی مارے گئے اور فوج کی کئی گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ ڈیل اس کام سے خوش تھا کیونکہ اس سے صرف وہی لوگ نشانہ بن رہے تھے جنہیں نشانہ بنانا مقصود تھا۔ آئی آر اے شہری علاقوں میں جو حملے کر رہی تھی، ان کا نشانہ عام لوگ بھی بن رہے تھے۔

ان دنوں اسے ایک سڑک سے گزرنے والے فوجی کانوائے کو نشانہ بنانے کا مشن سونپا گیا۔ یہ کانوائے جنوبی آئرلینڈ میں موجود برطانوی سپاہ کے لیے گولہ بارود کی سپلائی لے کر جاتا تھا۔ ڈیل حملے والے دن مقررہ مقام پر اپنا سامان لے کر پہنچ گیا اور اس نے سڑک پر رات کی تاریکی میں بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ یہ سرنگیں بیک وقت ریموٹ کنٹرول اور وائر کنٹرول سے بلاسٹ کی جا سکتی تھیں۔ وائر کا اضافہ اس لیے بھی تھا کہ اگر قافلے کے ساتھ جامر ہوا تو ریموٹ کنٹرول کام نہیں کرتا اور جیسے ہی پہلی گاڑی تنی ہوئی تار سے گزرتی، بارودی سرنگ خود بہ خود پھٹ جاتی۔ یہ بارودی سرنگوں کی ایک سیریز تھی جو اس پورے قافلے کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ تمام سرنگیں ایک ساتھ بلاسٹ ہوتیں۔

ڈیل نے اپنے دو ساتھیوں سمیت ایک بلند جگہ مورچا سنبھال رکھا تھا۔ ان میں ایک مارش کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔ وہ حال ہی میں تربیت مکمل کر کے آیا تھا۔ اس ٹیلے پر جھاڑیاں تھیں جن میں وہ پوری طرح چھپ گئے تھے۔ یہاں نباتات کی خوشبو تھی اور کیڑے اڑ رہے تھے۔ ڈیل کے دونوں ساتھی اس سے خاصے جونیئر تھے اور خاموش بیٹھے تھے۔ صبح سورج کے ساتھ قافلہ بھی نمودار ہوا، ابھی وہ بارودی سرنگوں سے خاصے فاصلے پر تھا۔ ڈیل نے دوربین سے دیکھا اور تسلی کر لی کہ یہ وہی قافلہ ہے۔ اس نے ریموٹ کا ایک بٹن دبایا تو بارودی سرنگیں ایکٹو ہو گئیں، اب جیسے ہی وہ ریموٹ کا بٹن دوسری بار دباتا یا تار پر سے کوئی گاڑی گزرتی، بارودی سرنگیں پھٹ جاتیں۔

ڈیل کے ساتھی مضطرب تھے لیکن وہ بالکل پرسکون تھا۔ وہ مستقل دوربین سے قافلے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ پانچ بڑے فوجی ٹرک تھے اور ہر ٹرک دوسرے سے کوئی دس گز کے فاصلے پر تھا۔ یعنی وہ کوئی اسّی گز کی لمبائی میں تھے اور بارودی سرنگیں بھی اتنی بڑی سڑک پر تھیں۔ ڈیل مطمئن تھا کہ اچانک اسے ٹرکوں کے درمیان کوئی چھوٹی گاڑی دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے دوربین ایڈجسٹ کی، تب اسے پہلی بار وہ چھوٹی سی کار دکھائی دی جس کی چھت کھلی تھی اور اس میں پانچ نوجوان لڑکیاں سوار تھیں۔ انہوں نے اسکول یونیفارم پہن رکھے تھے اور ان ٹرکوں کے درمیان کار لہراتی ہوئی ڈرائیو کر رہی تھیں۔ ان کا انداز شوخی اور شرارت بھرا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی کار لہراتی ہوئی کبھی دو ٹرکوں کے درمیان میں آ جاتیں اور کبھی ان کے دائیں بائیں چلنے لگتیں۔

"میرے خدا!" ڈیل کے منہ سے نکلا۔ "یہ کہاں سے

آ گئیں؟"

ٹرک میں موجود فوجی بھی ان لڑکیوں کی وجہ سے پریشان لگ رہے تھے کیونکہ وہ جس ٹرک کے پاس جاتیں، وہ ان کو خبردار کرنے کے لیے ہارن ضرور بجاتا۔ ڈیل مضطرب ہو گیا۔ اگر لڑکیوں کی کار قافلے کے ہمراہ بارودی سرنگوں تک پہنچ جاتی تو اس کی تباہی لازمی تھی۔ یہ طاقتور بارودی سرنگیں مضبوط فوجی گاڑیوں کو اڑانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ اس ننھی سی کار کی ان کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ کار سمیت لڑکیوں کے چیتھڑے بکھر جاتے۔ اب قافلہ نصف میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

"پلیز..." ڈیل نے دل ہی دل میں التجا کی۔ "یہاں سے نکل جاؤ۔"

قافلہ دھیمی رفتار سے آ رہا تھا اور لڑکیوں کی کار یقیناً اس سے کہیں تیزی سے نکل سکتی تھی۔ اگر وہ پہلے نکل جاتی، تب بھی وہ سرنگوں سے تباہ ہو جاتی۔ اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا کہ لڑکیوں کی کار پیچھے رہ جائے لیکن لڑکیوں کا ایسا کوئی ارادہ نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بدستور ٹرکوں کے درمیان کار دوڑاتی رہیں اور قافلہ تیزی سے سرنگوں کے پاس آتا جا رہا تھا۔ اسی حساب سے ڈیل کے اندر کشمکش بڑھ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے حملے میں کسی عام آدمی کو نقصان ہو مگر یہاں پانچ جوان لڑکیوں کی زندگی بھی اس کے نشانے پر آ گئی تھی۔ نشانہ بھی ایسا کہ وہ چاہتا بھی تو انہیں نہیں روک سکتا تھا۔

قافلہ اب چوتھائی میل دور تھا۔ اسی لمحے ڈیل کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اگر وہ اس پر عمل کر گزرتا تو لڑکیاں بچ جاتیں مگر اس کا مشن بھی ناکام ہو جاتا کیونکہ قافلہ بھی بچ جاتا۔ اس کے پاس فیصلہ کرنے کے لیے وقت کم تھا۔ اس نے ریموٹ دیکھا اور بٹن پر انگلی رکھ دی۔ مارش کے بھائی ایلٹن نے اس کا ارادہ بھانپ لیا۔ اس نے پھرتی سے اپنی گن کا رخ ڈیل کی طرف کر دیا۔ "نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔"

"میں کسی عام فرد کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"تحریک کے مقابلے میں کسی فرد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

ڈیل نے اسے دیکھا اور سکون سے بولا۔ "تم مجھے گولی مار سکتے ہو لیکن میں یہ جرم نہیں کروں گا۔"

ڈیل نے ریموٹ کا بٹن دبا دیا اور اسی لمحے گولی چلی۔ دھماکے کی آواز نے گولی کی آواز دبا دی تھی۔ بارودی سرنگوں نے سڑک کے اس حصے کو تباہ کر دیا تھا لیکن قافلہ ابھی ذرا دور تھا اس لیے وہ بچ گیا اور ٹرک بریک لگا کر رک گئے۔ ڈیل نے مارش کے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور پھر وہ دھپ سے گر گیا۔ اسے ڈیل کے دوسرے ساتھی نے گولی مار دی تھی۔ اس نے ڈیل سے کہا۔ "میں تم سے متفق ہوں۔"

ڈیل نے سر ہلایا۔ "لیکن اب میں اور تم واپس نہیں جا سکتے۔"

یہ بات ڈیل اور اس کا ساتھی دونوں جانتے تھے کہ ان کے لیے کیا سزا ہو سکتی ہے اس لیے وہ دونوں ہی واپس جانے کے بجائے ملک سے نکل گئے۔ ڈیل نے پہلے افریقا کا رخ کیا۔ اس کے پاس کچھ رقم تھی۔ پھر جنوبی افریقا سے اس نے برازیل کا رخ کیا۔ برازیل ایک بڑا ملک ہے اور اسے امید تھی کہ وہ وہاں روپوش ہو جائے گا۔ آئی آر اے کے بیرون ملک ایجنٹس زیادہ تر وسطی امریکا میں سوشلسٹ رجحان رکھنے والی ریاستوں میں تھے، برازیل کی طرف کوئی نہیں جاتا تھا۔

امیزون کے علاقے میں اس نے ایک اسٹور کھول لیا اور اس سے گزر بسر کرنے لگا۔ اپنا حلیہ بدلنے کے لیے اس نے داڑھی مونچھیں صاف کرا دی تھیں اور سر کے بال چھوٹے کر لیے تھے۔ وہ اپنا زیادہ وقت دھوپ میں گزارتا تاکہ اس کا سرخ و سفید رنگ سانولا ہو جائے۔ چند سالوں میں وہ خاصا بدل گیا تھا۔ کم سے کم اسے محسوس تو یہی ہوتا تھا۔ اس کا اسٹور چل نکلا تھا اور اس نے ایک مناسب فلیٹ بھی خرید لیا لیکن وہ پانچویں منزل پر تھا۔ اصل میں اس شہر میں پراپرٹی مہنگی تھی۔ یہاں رہائش کے قابل زمین کم تھی اور اکثر عمارتیں کثیر المنزلہ تھیں۔ لفٹ کا رواج بھی زیادہ نہیں تھا۔ اب تو ڈیل عادی ہو گیا تھا لیکن جس روز کام زیادہ ہوتا، اس دن وہ تھک جاتا اور پھر سیڑھیاں چڑھنا بڑا مشکل لگتا تھا۔

یہاں آنے کے بعد وہ تن آسان بھی ہو گیا تھا۔ ایک تو موسم ایسا تھا جس میں آدمی سست ہو جاتا ہے، دوسرے سخت جان زندگی بھی نہیں رہی تھی۔ شروع کے ایک دو سال تو اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی مگر رفتہ رفتہ وہ اس ماحول میں رہ کر خوف کو بھولتا چلا گیا۔ اب وہ ماضی کو یاد کرتا تو اسے لگتا جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

اس نے تھکے ہوئے انداز میں اپنے فلیٹ کا تالا کھولا۔ اندر آتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ فلیٹ میں کوئی ہے۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا پستول تھا لیکن وہ بھی اس کے بیڈروم میں رکھا تھا۔ وہاں جانے کے لیے اسے نشست گاہ کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اس نے بہت احتیاط سے نشست گاہ میں جھانکا۔ اسے صوفے پر ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ اس کا منہ کھڑکی کی طرف تھا۔ وہ بالکل ساکت تھی اور

www.pkdigest.com

اس کے براؤن بال اس کے شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ڈیل کو عجیب سا احساس ہوا۔ وہ بے ساختہ آگے آیا۔ عورت نے اس کی آہٹ سن لی تھی۔ اس نے کہا۔

''ڈرومت، یہ میں ہوں۔''

''اینا...'' وہ تیزی سے اس کے سامنے آیا۔ اس نے اینا کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ بارہ سال بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی اور اس کی دلکشی لوٹ آئی تھی لیکن اس کی کھلی آنکھیں بدستور بے نور تھیں۔ شدتِ جذبات سے ڈیل کی آواز بھرا گئی۔ ''تم...؟''

''ہاں میں۔''

اچانک ڈیل کو خطرے کا احساس ہوا۔ ''اینا! تمہیں میرے بارے میں کس نے بتایا؟''

''وہی جو میری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ مجھے پتا چلا کہ تم بھی یہاں آگئے ہو۔''

''ایک منٹ!'' ڈیل نے کہا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی اور پھر بیڈ روم سے پستول نکال کر پورے فلیٹ کا معائنہ کیا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اینا کے پاس واپس آگیا۔ وہ پھر اینا کے سامنے بیٹھ گیا۔

''انہیں کیسے پتا چلا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟''

''کیا انہیں نہیں پتا تھا؟'' اینا تعجب سے بولی۔

ڈیل نے گہری سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے تمہیں کچھ معلوم نہیں؟''

''کیا نہیں معلوم؟'' اینا مضطرب لہجے میں بولی۔

''میں نے دس سال پہلے تحریک چھوڑ دی تھی اور جان بچانے کے لیے ملک بھی چھوڑ دیا تھا۔''

اینا اس کی بات سمجھ رہی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے آلۂ کار بنایا گیا ہے؟''

''ہاں، یہی بات ہے۔ تم دیکھ نہیں سکتی ہو، میں اس دوران میں خاصا بدل گیا ہوں اور انہوں نے میری حتمی شناخت کے لیے تمہیں استعمال کیا ہے۔'' ڈیل کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی جان کے دشمن یہاں باہر موجود ہوں گے۔ اسے ان سے بچ کر نکلنا تھا۔ اسے اینا کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

''اینا! میں تحریک سے الگ ہو گیا ہوں لیکن میں نے کبھی اسے نقصان نہیں پہنچایا۔ اب تم میرے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''میں سمجھتی ہوں کہ تم نے کسی معقول وجہ کی بنا پر تحریک چھوڑی ہوگی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کبھی غداری نہیں کر سکتے۔''

''تب تم میرے ساتھ چل رہی ہو؟''

اینا سوچتی رہی پھر اس نے سر ہلا دیا۔ ''ہاں، میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میں ان لوگوں کے پاس واپس نہیں جانا چاہتی جنہوں نے مجھے اس طرح استعمال کیا ہے۔''

اگرچہ ڈیل بڑی حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ اب اس تک کوئی نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کے اندر ایک کھٹک باقی تھی اس لیے اس نے جب رہائش لی تو خاص طور سے اس عمارت کا انتخاب کیا تھا۔ اس نے فلیٹ میں موجود اپنی جمع پونجی نکالی اور پستول کے اضافی میگزین لے کر اینا سے کہا۔ ''چلو۔''

وہ بلا جھجک اس کے ساتھ چل پڑی۔ ڈیل نے نیچے جانے کے بجائے اوپر کا رخ کیا۔ اینا اس کا سہارا لے کر چل رہی تھی۔ وہ چھت پر آئے۔ ڈیل نے وہاں موجود لکڑی کی سیڑھی اٹھا کر برابر والی عمارت کی دیوار پر رکھ دی۔ اس نے اینا سے کہا۔ ''میری پشت پر آجاؤ۔''

اینا گردن پکڑ کر اس کی پشت سے لپٹ گئی اور ڈیل اسے اٹھا کر سیڑھی کی مدد سے دوسری عمارت پر اتر گیا۔ اس نے سیڑھی کھینچ لی تا کہ اگر دشمن یہاں آجائے تو اس عمارت پر نہ آسکے۔ اس نے یکے بعد دیگرے دو عمارتیں اسی طرح عبور کیں اور اس عمارت پر آ گیا جو ایک پہاڑی کے ساتھ اس طرح کھڑی تھی کہ پہاڑی کا سرا اس کی آخری منزل سے مل گیا تھا۔ یہاں سے ڈیل اور اینا بڑے آرام سے پہاڑی پر اتر گئے۔ کچے راستوں سے گزرتا ہوا ڈیل اینا کو لے کر ایک گیراج تک آیا جہاں اس نے ایک بائیک کھڑی کر رکھی تھی۔ ڈیل نے اینا کو اس پر پیچھے بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے فلیٹ کی مخالف سمت کو چنا تھا۔ یہاں ایک اونچی پہاڑی پر تفریح گاہ تھی۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے بائیک وہاں روک دی۔ تفریح گاہ میں بے شمار لوگ تھے۔ ایک اوپن ایئر ڈانس پر بے شمار جوڑے ناچ رہے تھے۔ ڈیل اینا کو لے کر اوپر پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہاں چند ہی لوگ تھے اور موسیقی کا شور بھی کم سنائی دے رہا تھا۔ ڈیل نے ایک میز منتخب کی جہاں سے وہ اوپر آنے والے راستے کو دیکھ سکتا تھا۔ اینا اب تک خاموش تھی لیکن جیسے ہی وہ بیٹھے، اس نے پہلا سوال کیا۔

''تم نے تحریک کیوں چھوڑی؟''

ڈیل نے اسے اختصار سے لیکن مکمل حالات اور پھر وہ واقعہ سنایا جس کی وجہ سے اسے فوری طور پر برطانیہ سے نکلنا پڑا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''مجھے برطانیہ سے نکلے دس برس ہو چکے ہیں اس کے بعد میرا کسی سے رابطہ نہیں ہوا اور نہ ہی میں نے

پلٹ کر جانے کے بارے میں سوچا۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ اب تک مجھے تلاش کر رہے ہوں گے۔''

اینا بے تاثر انداز میں اس کی داستان سن رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں بھی بارہ سال سے اسی طرح خاموش زندگی گزار رہی ہوں۔ ریوڈی جنیرو میں نابینا لوگوں کے لیے مخصوص ایک ادارے میں میری رہائش ہے۔''

''تمہارے اخراجات کون ادا کرتا ہے؟''

''یہی لوگ ... ہر مہینے میرے اخراجات کوئی آکر ادارے میں جمع کرا جاتا ہے۔''

''یہاں کیا کہہ کر لائے تھے؟''

''یہی کہ وہ مجھے تم سے ملانے لا رہے ہیں، تم بھی ملک سے نکل آئے ہو۔''

''یعنی تمہیں بالکل نہیں معلوم کہ میں تحریک چھوڑ چکا ہوں؟''

اینا اس سوال پر کچھ دیر ساکت رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟''

''نہیں.... تعجب اس بات پر ہے کہ اگر کوئی تحریک چھوڑ جائے تو سب کو خبردار کیا جاتا ہے تا کہ کوئی دھوکا نہ کھائے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن یہ اصول ان لوگوں کے لیے ہے جو ملک سے باہر بھی کوئی عملی کردار ادا کر رہے ہوں جبکہ میرا اب تحریک میں کوئی کردار نہیں ہے۔ میں ایک عضوِ معطل ہوں۔''

''لیکن انہوں نے تمہیں استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔'' ڈیل کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''مارش کا بھائی مارا گیا تھا، وہ میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہوگا۔''

''میرا مارش سے پھر رابطہ نہیں ہوا۔'' اینا بولی۔

ڈیل سوچ رہا تھا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہاں تک لانے میں مارش کا کوئی نہ کوئی ہاتھ ضرور ہوگا۔''

''ممکن ہے... لیکن جو شخص مجھے لایا، وہ مارش نہیں تھا۔''

ڈیل کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔ ''میں اتنے عرصے خاموش رہا اور میں نے تحریک کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا پھر مجھے اس طرح ٹریپ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔'' اینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی ہوں... میں اس معاملے میں بالکل بے بس ہوں۔''

''یہ درست کہہ رہی ہے۔'' اچانک ہی ڈیل کو پاس سے آواز آئی۔ اسے شناخت کرنے میں کچھ دیر لگی لیکن اس نے پہچان لیا۔ وہ مارش تھا۔ اس دوران میں اس کا حلیہ بھی بہت حد تک بدل چکا تھا۔ وہ کب اوپر آیا، ڈیل بالکل نہیں دیکھ سکا لیکن وہ اب ریلنگ کے ساتھ کھڑا تھا جس کے پاس ڈانس پر لڑکے لڑکیاں ناچ رہے تھے۔ مارش کا ہاتھ اپنی پتلون کی جیب میں تھا جس کا ابھار بتا رہا تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار ہے۔ مارش نے اسے وارننگ دی۔

''کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ میرا ہاتھ پستول کے ٹریگر پر ہے۔''

ڈیل نے ہاتھ میز پر سامنے رکھ لیے۔ ''تو یہ تم تھے جسے اتنے عرصے بعد بھی میری تلاش تھی؟''

''میں تمہیں ہمیشہ تلاش کرتا رہا۔ میں ایلش کی موت کبھی نہیں بھول سکا۔''

''وہ اپنی حماقت سے مارا گیا تھا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش کی تھی اور ہمارے ساتھ موجود تیسرے شخص نے اسے شوٹ کر دیا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' مارش نے سر ہلایا۔ ''میں نے دو مہینے پہلے ہی اسے نیویارک میں قتل کیا ہے۔''

ڈیل کو افسوس ہوا۔ ''تمہیں میرا پتا کیسے چلا؟''

''اتفاق سے... تحریک کا ایک آدمی یہاں آیا تھا اور اس نے تمہیں دیکھا۔ اسے شبہ ہوا۔ اس نے واپس آکر مجھے بتایا اور میں نے اینا کو استعمال کیا تا کہ تمہاری شناخت یقینی ہو جائے۔''

''تم مجھے شناخت کر چکے ہو، اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

اس دوران میں اوپر موجود چند افراد بھی اٹھ کر نیچے جا چکے تھے۔ وہاں روشنی اتنی نہیں تھی کہ نیچے والوں کو پتا چلتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ مارش نے جیب سے پستول نکال لیا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کیا کروں گا۔''

اسی لمحے ڈیل نے اتنی پھرتی سے اپنا پستول نکال کر مارش پر تانا کہ ایک لمحے کو وہ ششدر رہ گیا مگر پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ڈیل! تم یہاں مجھ پر گولی چلاؤ گے؟''

''ہاں، میں تمہیں مار سکتا ہوں۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''لیکن تم دیکھ رہے ہو، نیچے بہت سارے بے گناہ لوگ ہیں اور اگر تمہارا نشانہ خطا گیا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور گولی کا شکار ہو جائے گا۔''

اس کی بات نے ڈیل کو تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نیچے لوگ بہت تھے اور اگر نشانہ خطا جاتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی مارا جاتا۔ اس نے تحریک اسی وجہ سے تو چھوڑی تھی کیونکہ وہ کسی بے گناہ کو نہیں مار سکتا تھا تو اب وہ کیسے کسی بے گناہ کو نشانہ بنا سکتا تھا؟ اس کے تذبذب کا فائدہ اٹھا کر مارش نے آرام سے اپنے پستول پر سائلنسر فٹ کیا اور پھر پستول کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میرا خیال تھا کہ تم بزدل ہو اور اپنی بزدلی کو ضمیر کی

www.pkdigest.com

آڑ میں چھپاتے ہو... لیکن اب میں سمجھا کہ تم احمق ہو... سچ سچ کسی کو نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتے۔ ایسے لوگوں کو مرنا ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے دوست... ہم نے بھی ایک ساتھ وقت گزارا تھا۔'' اس نے پستول کا رخ ڈیل کے سینے کی طرف کیا۔ ڈیل نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے انتظار تھا کہ کب گولی اس کے جسم میں اترتی ہے لیکن اس کے بجائے مارش کی کراہ سنائی دی اور ڈیل نے آنکھیں کھولیں تو اسے فرش پر اوندھے منہ پڑے پایا۔ اس کی پشت پر پھیلنے والا گہرے رنگ کا داغ یقیناً خون کا تھا۔ ابھی ڈیل حیران ہو رہا تھا کہ سیڑھیوں کی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا سائلنسر لگا پستول تھا اور اسی نے مارش کو شوٹ کیا تھا۔ اس نے جھک کر مارش کی نبض دیکھی اور ڈیل سے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

ڈیل نے سر ہلایا۔ ''تم بروقت آگئے ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ آج میں نہیں بچوں گا۔''

آنے والے نے اینا کی طرف دیکھا لیکن ڈیل نے جلدی سے کہا۔ ''یہ بے گناہ ہے، اسے استعمال کیا گیا ہے۔''

اس آدمی نے سر ہلایا اور بولا۔ ''دس منٹ کے اندر یہاں سے چلے جانا، اس کے بعد پولیس آجائے گی۔''

اینا بے حد مضطرب تھی۔ اس شخص کے جاتے ہی اس نے کہا۔ ''کون تھا یہ... اور یہاں کیا ہوا ہے؟''

''مارش مارا گیا ہے۔'' ڈیل نے اسے آگاہ کیا۔ ''اسے مارنے والا مقامی انٹیلی جنس کا آدمی ہے کیونکہ میں نے یہاں آنے کے بعد مقامی حکام کو اپنے بارے میں سب بتا کر ان سے پناہ کی درخواست کی تھی۔ انہوں نے میری درخواست قبول کر لی اور اب یہ میری حفاظت بھی کرتے ہیں۔''

اینا کا چہرہ سفید ہو گیا۔ ''تم نے انہیں تحریک کے بارے میں بتا دیا؟ تم نے تحریک سے غداری کی ہے۔''

''غدار میں کب نہیں تھا۔'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''جب میں برطانیہ سے نکلا تھا، تب ہی تم لوگوں نے مجھے غدار قرار دے دیا تھا۔ مجھے اپنی جان بچانے کا حق تھا اور ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ میں نے انہیں تحریک کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتایا ہے۔ چلو، اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

اینا نے اٹھتے ہوئے اپنا پرس اٹھانا چاہا لیکن ڈیل نے اس سے پہلے اس کا پرس اٹھا لیا۔ وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''میرا پرس دو۔''

ڈیل نے پرس کا سامان میز پر الٹ دیا اور اس میں موجود ایک چھوٹا سا آلہ اٹھا کر بولا۔ ''تاکہ تم اپنے دوسرے ساتھیوں کو اطلاع دے سکو۔''

اینا کا چہرہ مزید سفید ہو گیا۔ ''تم جانتے تھے؟''

ڈیل نے سر ہلایا۔ ''مجھے شروع میں اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ٹریپ نہیں ہوئی ہو بلکہ اپنی مرضی سے آئی ہو... اور تم ان لوگوں سے متفق ہو۔''

اینا آہستہ سے بولی۔ ''میں تمہیں مارنے کے حق میں نہیں تھی لیکن اوپر والوں کا حکم یہی تھا۔''

ڈیل نے آلہ نیچے گرا کر اسے جوتے سے کچل کر توڑ دیا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ ''مارش کے ساتھ اور کتنے افراد ہیں؟''

''مجھے صحیح سے نہیں معلوم، شاید دو افراد اور ہیں۔''

''وہ کہاں ہیں؟''

اینا نے ہاتھ پھیلائے۔ ''میں دیکھ نہیں سکتی اور پھر مجھے اس شہر کا کچھ پتا نہیں ہے اس لیے میں کیا کہہ سکتی ہوں؟''

ڈیل نے اس کا سامان واپس پرس میں ڈالا اور پرس اسے تھما کر اس کے ہمراہ تفریح گاہ سے باہر آگیا۔ اینا اب کسی قدر ہراساں تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم شاید مجھے بھی مار دو گے۔''

ڈیل نے اسے دیکھا۔ ''مجھے کرنا تو یہی چاہیے لیکن شاید مارش ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں احمق ہوں اور ایسے لوگ تحریک کے لیے بے کار ہوتے ہیں۔''

ڈیل اسے بائیک پر بٹھا کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جیسے ہی پہلا فون بوتھ آیا، اس نے اینا کو اس کے سامنے اتار دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس رابطے کے لیے کوئی نہ کوئی فون نمبر ضرور ہوگا؟''

اینا بے یقینی سے بولی۔ ''تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو؟''

''ہاں... اور میں اس شہر سے بھی جا رہا ہوں۔ اپنے اوپر والوں کو بتا دینا کہ مجھے چھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ویسے بھی میں اب مقامی ایجنسی کی پناہ میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جلد تم سمیت تمام افراد کو ملک بدر کر دیا جائے گا۔''

''ڈیل! میں نے تم سے محبت کی ہے۔'' اینا نے اچانک کہا۔

''یہ ماضی کی بات ہے۔'' ڈیل نے اسے فون بوتھ تک پہنچایا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ کسی سے محبت نہیں کر سکتے... خدا حافظ۔''

اینا نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے الفاظ بائیک کے شور میں گم ہو کر رہ گئے۔ جانے والا جا چکا تھا۔

www.pkdigest.com

زندگی کی چادر سر پر تنی ہو تو اس چھتر کی چھاؤں سے دل و دماغ میں جذبات و احساسات پروان چڑھتے رہتے ہیں۔ وہ بھی خالی ہاتھوں زندگی کی دوڑ میں دوڑتا رہا مگر تکمیلِ تمنا تو بڑی بات تھی۔

احساس

ولید بلال

اس دور افتادہ مقام پر جنگل، کھاڑی، صحرائی ٹیلوں اور اس طرح کی دوسری فطری چیزوں کے پس منظر میں وہ تفریحی قیام گاہ تعمیر کی گئی تھی۔ اس کا معیار فائیو اسٹار ہوٹل کا تھا۔ جورگ وہاں ویٹر تھا۔

اس روز اس کی ڈیوٹی طویل و عریض سبزہ زار کے درمیان بنے ہوئے کشادہ سوئمنگ پول پر تھی۔ موٹی سی وہ عورت سوئمنگ پول کے کنارے ایک خوبصورت کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ اپنے سائز سے کچھ چھوٹا سوئمنگ ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ شاید وہ ابھی تک اسی خوش فہمی میں تھی کہ اس کا وزن کچھ خاص نہیں بڑھا ہے۔ اس کا سفید چربی زدہ جسم گویا سوئمنگ ڈریس سے ابلا پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس نے کھانے کی

ایسے شخص کا ماجرا جس کی زندگی میں جذبات موجزن تھے... مگر؟

کچھ چیزیں منگائی تھیں۔ جورگ نے اسے سرو کیا تھا۔

''اے...... سنو......'' عورت نے نخوت آمیز انداز میں انگلی کے اشارے سے جورگ کو بلایا ''میں کھا چکی ہوں۔ یہ پلیٹ لے جاؤ۔''

''یس میڈم!'' جورگ نے فرماں برداری سے گردن خم کی اور قریب آ کر مہارت سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اپنی ٹرے میں منتقل کر لی۔ عورت یوں تو سوئمنگ کے لیے آئی تھی لیکن اس وقت بھی وہ گہرے میک اپ میں تھی۔

''اور ہاں...... اب تم آ ہی گئے ہو تو میرے لیے کافی بھی لے آؤ۔'' عورت نے نخوت سے ہی کہا ''لیکن ذرا خیال رکھنا...... اسی طرح ٹھنڈی نہ ہو جیسی تم پہلے لائے تھے۔''

''میں معذرت چاہتا ہوں میڈم!'' جورگ نے ایک بار پھر مؤدبانہ انداز میں سر جھکایا اور پوری کوشش کی کہ اس کے چہرے سے ناگواری ظاہر نہ ہو۔

وہ ہوٹل کی عمارت کی طرف جانے کے لیے پلٹا تو اسے سبزہ زار پر رکھی ہوئی میزوں کے قریب درختوں کے عقب میں نو دس سالہ ایک لڑکے کے چہرے کی جھلک نظر آئی۔ جورگ چند قدم آگے گیا تو اس نے پہچانا، وہ اس کا اپنا بیٹا تھا۔ اس کا بیٹا بھی کبھی کھیلتا کودتا ہوٹل کی حدود میں آ نکلتا تھا۔ اس کی رسائی ہوٹل کے کھلے حصوں میں سے صرف دو تین جگہوں تک ہی ہو سکتی تھی۔ وہ وہیں گھوم پھر کر واپس چلا جاتا تھا۔ یہ گویا اس کی ایک تفریح تھی۔

جورگ نے اسے کئی بار اس طرف آنے سے منع کیا تھا تاہم سختی سے منع نہیں کیا تھا۔ دل میں تو وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بغیر خرچ کی اس تفریح سے بھی محروم ہو جائے لیکن وہ ڈرتا تھا کہ کبھی ہوٹل کا کوئی گارڈ وغیرہ اسے ڈانٹ ڈپٹ نہ دے یا اس کی آمد پر اعتراض نہ کر دے اور ہوٹل کی انتظامیہ کو اس کے بارے میں نہ بتا دے۔ اس لیے جورگ حتی الامکان احتیاط کرتا تھا اور ہوٹل کی حدود میں اپنے بیٹے سے شناسائی کا اظہار ہی نہیں کرتا تھا۔ بیٹا بھی کمسن ہونے کے باوجود اس کی مجبوری کو سمجھتا تھا اور خود بھی اسے مخاطب کرنے یا اس کے قریب آنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنے رہتے تھے۔

وہ ماربل کی روش پر آگے بڑھا تو اس کا بیٹا درختوں کے عقب میں کہیں غائب ہو گیا لیکن اس دوران میں ایک لمحے کے لیے ان کی نظریں ملی تھیں۔ جورگ کو اس لمحے کچھ یوں لگا تھا جیسے اس کا بیٹا کہہ رہا ہو ''ڈیڈی! میں آپ کی دلی کیفیت اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ آپ بہ ظاہر سر جھکا کر ان دولت مند، متکبر اور نخوت پسند دولت مندوں کے ہر حکم کی تعمیل کرتے...... ہیں لیکن دل ہی دل میں کڑھتے رہتے ہیں۔ محرومی کا احساس آپ کو اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے۔''

جورگ نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی کہ اس نے اپنے بیٹے کی آنکھوں میں ایسا کوئی تاثر محسوس کیا تھا۔ اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ صرف اس کے اپنے احساسات تھے جنہیں وہ بیٹے کی آنکھوں میں پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا دھیان بٹانے کے لیے اس نے سوئمنگ پول سے کچھ دور آنے کے بعد بڑی سی پلیٹ کا جائزہ لیا کہ عورت نے جو کچھ منگوایا تھا، اس میں سے کیا چھوڑ دیا تھا۔ اس ہوٹل میں قیام کرنے والے کھانے پینے کی چیزیں بے دردی سے ضائع کرتے تھے۔ اکثر وہ جو چیزیں منگواتے تھے، ان میں سے بہت کم کھاتے تھے۔

اس ہوٹل کے ساتھ سلمنگ سینٹر، ہیلتھ سینٹر اور حسن و جسمانی صحت کے مختلف پروگرامز پر عملدرآمد کرنے والا سینٹر بھی موجود تھا۔ اکثر مہمان وہاں کے پروگرامز میں بھی باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ شاید کھاتے پیتے وقت انہیں وہاں کی کچھ ہدایات یاد آ جاتی تھیں...... لیکن وہ ضرورت سے زیادہ چیزیں منگوانے سے باز نہیں رہتے تھے۔ خاص طور پر بوفے لنچ اور ڈنرز میں چونکہ تمام مہمانوں کو یکساں ہی بل ادا کرنا ہوتا تھا...... خواہ وہ کم کھاتے یا زیادہ...... شاید اس لیے وہاں مہمان اپنی پلیٹوں میں اتنی چیزیں ڈھیر کر لیتے تھے کہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں سی بن جاتی تھیں۔ ان میں سے بیشتر چیزیں بچ جاتی تھیں۔ بعض کو تو مہمانوں نے چھوا بھی نہیں ہوتا تھا مگر ہوٹل کے اصول کے مطابق وہ سب کوڑے میں جاتا تھا۔ ایک بار جو چیز پلیٹ میں ڈال دی جاتی تھی پھر خواہ وہ جوں کی توں بچ جاتی اسے بہرحال کوڑے میں ہی جانا ہوتا تھا۔ مہمان غالباً یہی سوچ کر وہ چیزیں پلیٹوں میں ڈالتے تھے کہ انہیں بہرحال ان چیزوں کی ادائیگی کرنی ہے اس لیے انہیں ضائع اور برباد کرنے کا حق بھی انہیں حاصل ہے۔

جورگ اس عورت سے جو پلیٹ واپس لے کر آیا تھا، اس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس میں کم از کم...... آدھا چکن اور ایک بڑی چانپ سلاد کے نیچے بچی پڑی تھی۔ جورگ اور اس کے کنبے کو ایک ہفتے میں بھی اتنا گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار پھر اس کے رگ و پے میں غصے کی لہر سی ابھری جس سے اس کے پیٹ میں گرہیں سی پڑنے لگی تھیں۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو اس نے کئی بار اپنے باپ کو کہتے سنا تھا ''جو لوگ اپنی پلیٹ میں ضرورت

سے زیادہ کھانا بھر لیتے ہیں وہ ندیدے ہوتے ہیں۔'' لیکن وہ یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اتنے دولت مند لوگ ندیدے کیسے ہو سکتے تھے؟ ندیدے تو اس جیسے غریبوں کو ہونا چاہیے تھا جنہیں ایسی چیزیں کھانا تو در کنار، دیکھنا بھی کبھی کبھی نصیب ہوتی تھیں۔ اس قسم کے لوگوں کا ندیدہ ہونا قطعاً کوئی حیرت کی بات نہ ہوتی لیکن اتنے امیر لوگوں کا ندیدہ ہونا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میکسیکو کے اس دور افتادہ ساحلی علاقے میں جب اس فائیو اسٹار تفریحی قیام گاہ کا منصوبہ بنا تھا تو اس بات کا بہت چرچا ہوا تھا کہ اس سے علاقے میں خوش حالی آئے گی۔ بہتر سڑکیں تعمیر ہوں گی، بہتر سہولیات میسر آئیں گی، سیاحت کو فروغ ملے گا، ملازمتوں کے مواقع پیدا ہوں گے۔ غرض یہ کہ ترقی اور خوش حالی کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا...... لیکن اب جبکہ اس فائیو اسٹار ہوٹل اور اس سے ملحقہ تعمیرات کو مکمل ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا...... جورگ کو وہ خوش حالی کم از کم اپنی سطح تک پہنچتی دکھائی نہیں دی تھی۔ البتہ علاقے میں مزید کچھ دولت مندوں اور ان کی پرتعیش قیام گاہوں کا اضافہ ہو گیا تھا جن کے دروازوں پر سیکیورٹی گارڈز تعینات رہتے تھے۔ ان میں اس منصوبے کے مالکان، ہوٹل ایجنسیوں وغیرہ کے مالکان اور متعلقہ وزارتوں کے کچھ افسران شامل تھے جنہیں اس قسم کے منصوبوں کے سلسلے میں ہمیشہ بھاری رشوتیں ملتی تھیں۔ علاقے کے بیشتر پرانے اور غریب باشندوں کے روز و شب کم و بیش ویسے ہی تھے، جیسے پہلے ہوا کرتے تھے۔ صرف بعض کی ملازمت یا کام کی نوعیت تھوڑی بہت بدل گئی تھی۔

جورگ کے دونوں بچے اب بھی زیادہ تر [illegible] مٹر اور چاول کھاتے تھے اور ان کے گھر کی چھت اب بھی بارشوں میں ٹپکتی تھی۔ اگر اس کی بیوی کلاڈیا کوئی ملازمت وغیرہ کرنے کے قابل ہوتی تو شاید حالات کچھ بہتر ہوتے لیکن وہ ان دنوں امید سے تھی۔ ان کے گھر میں تیسرے بچے کی آمد آمد تھی۔ پہلے دو بچوں کی پیدائش کے وقت کچھ پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں اور اس مرتبہ بھی کچھ ایسے ہی آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس لیے زائد آمدنی تو کیا ہوتی تھی، جورگ کی آمدنی کا بھی خاصا بڑا حصہ ڈاکٹر کی فیس اور علاج معالجے میں چلا جاتا تھا۔ جورگ نے ڈاکٹر سے اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا تھا تو اس نے فوراً آئندہ کے لیے بچوں کا خیال دل سے نکال دینے کا مشورہ دیا تھا۔

اس کا کہنا تھا کہ دنیا کی آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی تھی اسے دیکھتے ہوئے جورگ جیسے آدمی کے گھر میں تین بچے بھی زیادہ تھے۔

یہ سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک بار پھر اپنے بچوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بچے صحت مند، تیز و طرار تھے۔ خاص طور پر اس کا بڑا بیٹا فرنانڈو جسے اس نے کچھ دیر پہلے درختوں کے پیچھے دیکھا تھا، خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اگر ان بچوں کو تعلیم حاصل کرنا نصیب ہوتا تو شاید وہ کچھ بن ہی جاتے لیکن جورگ اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتا تھا کہ انہیں تعلیم دلا سکتا۔ کہنے کو وہ فائیو اسٹار ہوٹل کا ویٹر تھا لیکن اس کے طبقے کے لوگوں کی تنخواہیں علاقے کی مناسبت سے مقرر کی جاتی تھیں۔ کبھی کبھی اس خیال سے جورگ کا دل دکھ سے بوجھل ہونے لگتا تھا کہ کیا اس کے بچے بڑے ہو کر سوچیں گے کہ ان کے باپ کی ساری عمر گورے غیر ملکیوں کے آگے سر جھکاتے ان کے جھوٹے برتن اٹھاتے، ان کے احکام کی تعمیل کرتے اور ان کا تکبر و نخوت برداشت کرتے گزر گئی مگر وہ انہیں تعلیم بھی نہیں دلا سکا؟

جورگ نے افسردہ کر دینے والے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور ریستوران کے عقب میں اس کمرے میں پہنچا جہاں کوڑا پھینکنے کے خوبصورت ڈھکن دار ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ بچے ہوئے کھانے بھی انہی میں پھینکے

جاتے تھے۔ وہ بھی کوڑے میں ہی شمار ہوتے تھے۔ ایک ڈرم کے قریب رک کر اس نے خود کو سمجھایا کہ اس طرح کے دل جلانے والے خیالات میں الجھے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں...... نوکری بہرحال نوکری تھی۔ زندہ رہنے کے لیے ہر کسی کو کوئی نہ کوئی کام تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ وہ جس طرح گزر بسر کر رہا تھا اس کے طبقے کے بعض لوگوں کا تو اس سے بھی بُرا حال تھا۔

اپنے آپ کو اسی قسم کی تسلیاں دیتے ہوئے وہ عورت کے بچائے ہوئے کھانے کی بڑی سی پلیٹ ڈرم میں الٹنے ہی لگا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں لپکا۔ عورت نے جو آدھا روسٹ چکن چھوڑا تھا، اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے چھوا بھی نہیں گیا تھا۔ وہ اس کی پوری فیملی کے لیے سوپ یا سالن بنانے کے لیے کافی تھا۔ اسے کوڑے میں پھینکنا گویا ایک اچھی بھلی نعمت کا زیاں تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے چکن کو جلدی سے ایک نیپکن میں لپیٹا اور اپنے بش کوٹ کی بڑی سی جیب میں ڈال لیا۔

اسے معلوم تھا کہ ہوٹل میں کسی ویٹر کا کھانے پینے کی کوئی چیز چرانا اسے فوری طور پر نوکری سے نکالے جانے کا سبب بن سکتا تھا لیکن اس کے خیال میں یہ اصول بچے ہوئے کھانے کے سلسلے میں تو لاگو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے چکن کو جیب سے نکالا اور بہتر طور پر لپیٹ کر اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔ وہاں وہ ڈھیلے ڈھالے بش کوٹ کے نیچے زیادہ اچھے طریقے سے چھپا رہ سکتا تھا۔ اس کی شفٹ جلد ہی ختم ہونے والی تھی۔

☆☆☆

آخر کار اس کی شفٹ ختم ہوگئی۔ ملازمین کو ایک طویل فاصلہ طے کر کے ایک مخصوص گیٹ سے گزر کر باہر جانا ہوتا تھا جہاں گارڈ تعینات رہتا تھا۔ ہوٹل میں مقیم مہمانوں کو تو گولف کورس تک لے جانے اور وہاں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے بھی چھوٹی چھوٹی گاڑیوں کا انتظام تھا لیکن ملازموں کو اپنے گھر بھی پیدل جانا پڑتا تھا۔ جورگ کی شفٹ دن کی تھی۔ وہ جب گھر جانے کے لیے ریستوران سے نکلا تو سورج دور ٹیلوں کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی نارنجی روشنی میں کھاڑی کا پانی سیال سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ خوبصورت درختوں کے سلسلے، خودرو منگروز کے پودے اور نارنجی افق کا پس منظر پورے نظارے کو بے حد خوبصورت اور دلکش بنا رہا تھا۔ پانی کی سطح سے چند پرندے اڑ کر اپنے ٹھکانوں کی طرف جا رہے تھے۔ جورگ چند لمحوں کے لیے وہیں کھڑا نظارے کی خوبصورتی میں کھو کر رہ گیا۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنی موجودہ پریشانیوں اور مشکلات کو بھول گیا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ چھوٹا تھا تو یہ ساحلی پٹی میلوں تک ویران تھی۔ پھر رفتہ رفتہ غیر ملکی آئے۔ ہوٹل، ریسٹورنٹس اور نائٹ کلب بنے۔ سیاح آنے شروع ہوئے۔ رفتہ رفتہ مچھلی، مرغی، گوشت اور دیگر بہت سی چیزوں کی قیمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ مقامی لوگوں کے لیے انہیں خریدنا بہت مشکل ہوگیا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اس چکن کا بھی خیال آ گیا جو نیپکن میں لپٹا ہوا اس کے پیٹ سے رگڑ کھا رہا تھا۔

اسے اچانک ہی خیال آیا کہ اگر گیٹ پر سیکیورٹی والوں نے اس کی تلاشی لے لی تو......؟ تلاشی لینا ان کا معمول تو نہیں تھا لیکن کبھی کبھی وہ اچانک ہی کسی ملازم کی تلاشی لینے لگتے تھے۔ جورگ نے سوچا کہ اگر وہ اس کی تلاشی لیں گے اور چکن برآمد کر لیں گے تو وہ کہہ دے گا کہ ایک مہمان کی پلیٹ میں بچا ہوا یہ چکن وہ اپنے کتے کے لیے لے کر جا رہا ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کا یہ جواز قبول کر لیا جاتا اور اسے چھوڑ دیا جاتا...... لیکن دوسری طرف اس بات کا بھی امکان تھا کہ اس کا یہ بہانہ کارگر نہ رہتا اور اسے روک لیا جاتا۔ اگر اسے ایک بار چوری کے الزام میں نکال دیا جاتا تو پھر اس علاقے میں اسے کہیں بھی دوسری ملازمت ملنے کا امکان نہیں تھا۔

اس معاملے پر غور کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہوگئے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس وقت وہ کھاڑی کے قریب سے گزر رہا تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد اس نے اپنی بیلٹ میں اڑسا ہوا چکن نکالا اور اسے کھاڑی کی طرف اچھال دیا۔

عین اسی لمحے پانی کی سطح پر ایک مگرمچھ کے جبڑے نمودار ہوئے۔ مگرمچھ نے چکن کو غڑپ سے منہ میں لے لیا اور فوراً ہی دوبارہ منہ پانی کی سطح سے نیچے کر لیا۔ وہ گویا پانی کی سطح سے نیچے گھات لگائے ہی بیٹھا تھا کہ کوئی کچھ پھینکے تو وہ فوراً ہڑپ کرے۔ پانی کی سطح پر صرف دائرے اور بلبلے حرکت کرتے رہ گئے۔

جورگ چند لمحوں کے لیے وہیں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کھاڑی میں کوئی مگرمچھ موجود تھا۔ اس کی معلومات کے مطابق اس ہوٹل کی تعمیر کے وقت کھاڑی کو مگرمچھوں سے پاک کر دیا گیا تھا...... لیکن شاید یہ ایک مگرمچھ باقی رہ گیا تھا یا پھر شاید جس وقت مگرمچھوں کو پکڑا یا بھگایا جا رہا تھا اس وقت یہ کھاڑی سے سمندر میں واپس چلا گیا تھا اور سکون ہونے کے بعد دوبارہ آ گیا تھا۔ جورگ نے سنا تھا

کہ مگرمچھ ایک چالاک اور ذہین جانور ہے۔ جورگ نے اس کے لیے جبڑوں کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ایک جسیم مگرمچھ تھا۔

اس کھاڑی میں مہمان واٹر اسکی انگ...... یعنی پانی کی سطح پر پھسلنے کا شغل بھی کرتے تھے اور کبھی کبھی تیراکی کے لیے بھی آ جاتے تھے۔ جورگ اس تصور سے مسکرا دیا کہ اگر کوئی متکبر اور نخوت پسند...... مہمان اسکی انگ کے تختوں سے الٹ کر پانی میں جا گرا یا تیراکی کرتے ہوئے مگرمچھ کے قریب چلا گیا اور مگرمچھ اس وقت بھوکا ہوا تو وہ اس کی خوراک بھی بن سکتا تھا۔ یہ تصور جورگ کے لیے خاص فرحت بخش تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا تھا۔ خیال اتنا ہیجان انگیز اور سنسنی خیز تھا کہ چند لمحوں کے لیے اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوگئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اس پر عمل کر پائے تو کتنا لطف آئے۔ یہ گویا اس کے لیے ایک لذت بخش انتقام ہوتا۔ ہوٹل کے وہ تمام متکبر سے مہمان جو اسے نخوت اور قدرے حقارت سے بلاتے تھے اور مختلف چیزیں منگوانے کے لیے ادھر سے اُدھر دوڑاتے رہتے تھے، ان سے وہ بہت عمدہ انتقام لے سکتا تھا۔ ان میں سے اگر وہ صرف اس موٹی سی عورت کو ہی کسی عبرتناک انجام سے دوچار کر سکتا تو اس کے دل کو بڑی تسکین ملتی۔

دوسرے روز اس نے ایک مہمان کی پلیٹ میں بچا ہوا چکن اسی طرح چھپایا اور کھاڑی کے قریب سے گزرتے ہوئے گزشتہ روز ہی کی طرح پانی میں عین اسی جگہ پھینکا جہاں سے اس نے مگرمچھ کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کی توقع پوری ہوئی۔ مگرمچھ وہیں موجود تھا۔ اس نے پانی سے تھوتھنی نکال کر کل ہی کی طرح چکن منہ میں لے لیا اور اس کے جبڑے مشینی انداز میں بند ہوگئے۔

اس کے بعد سے جورگ نے معمول بنا لیا۔ وہ کسی نہ کسی پلیٹ سے چکن بچا کر لاتا اور اسی مخصوص جگہ پر کھڑے ہو کر مگرمچھ کی نذر کر دیتا۔ وہ مگرمچھ کو چکن کے ذائقے کا عادی بنا رہا تھا لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اتنے سے چکن سے مگرمچھ کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اس کی بھوک شاید اور بھی بھڑک جاتی ہوگی۔ ایک کام وہ یہ بھی کر رہا تھا کہ ہر روز چکن پھینکنے کے لیے اپنے اور مگرمچھ کے درمیان فاصلہ کم کرتا جا رہا تھا۔

روزانہ کھاڑی کے کنارے کے زیادہ قریب آنے کا عادی بنا رہا تھا جہاں پانی کی گہرائی کم تھی۔ دل ہی دل میں وہ دعا بھی کرتا رہتا تھا کہ اس کے منصوبے پر عمل درآمد سے پہلے کوئی

روحانی سکالر پیرزادہ وسیم جعفری کا اعلان

مایوسی گناہ ہے

ہم چھین لیں گے آپ کی ہر پریشانی اللہ کے کرم سے

وہ کام جو بڑے سے بڑا عامل و جادوگر نہ کر سکے وہ میرے بزرگوں کی دعا سے ہو جاتا ہے مثلاً شوہر کے دل سے شک و نفرت کی آگ، سنگدل محبوب نے نیند حرام کر دی ہو تجارت میں دن بدن نقصان ، رشتوں میں بندش، عزیزوں سے لڑائی جھگڑا عزت و وقار میں کمی یا دشمن حاوی ہو، بیٹی کی سسرال میں عزت نہیں، امیگریشن کے مسائل، لاٹری نمبر غرضیکہ ہر مشکل کیسی ہی کیوں نہ ہو اپنی آخری امید سمجھ کر رابطہ کریں

پیرزادہ وسیم جعفری

گجرات پاکستان

0300-7462777
0333-8217808

مہمان' کھاڑی میں مگر مچھ کی موجودگی سے باخبر نہ ہو جائے۔ اس پر یقیناً شور برپا ہو جاتا اور فوراً مگر مچھ کو پکڑنے اور وہاں سے ہٹانے کے انتظامات ہو جاتے...... لیکن وہ مگر مچھ بہت چالاک معلوم ہوتا تھا۔ جب تک اسے کوئی چیز میسر آنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے تب تک وہ چھپا رہتا تھا۔ عین صحیح وقت پر اس کے کھلے ہوئے جبڑے سطحِ آب پر نمودار ہوتے تھے۔

کئی روز تک اپنا معمول برقرار رکھنے کے بعد جورگ کو اندازہ ہو گیا کہ مگر مچھ اس کا انتظار کرنے لگا ہے۔ کھاڑی سے کچھ دور باربی کیو کا انتظام تھا اور قریب ہی خوبصورت انداز میں ایک اوپن ائر بار بھی بنایا گیا تھا۔ کبھی کبھی شام کو جب فضا حبس زدہ ہوتی تھی تو اِکا دُکا مہمان اپنی ڈرنکس ہاتھوں میں لیے کھاڑی میں ان جگہوں پر آن کھڑے ہوتے تھے جہاں پانی ان کے گھٹنوں یا پیٹ تک آتا تھا۔

اس شام وہ اپنی شفٹ ختم کر کے حسبِ معمول اپنے بش کوٹ کے نیچے نیپکن میں لپٹا ہوا چکن چھپائے کھاڑی کی طرف روانہ ہوا تو یہ دیکھ کر اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی کہ وہ موٹی عورت اسپورٹس شرٹ اور نیکر پہنے ڈرنک ہاتھ میں لیے گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھاڑی میں کھڑی تھی جس سے جورگ خاص طور پر دل ہی دل میں بڑی نفرت محسوس کرتا تھا۔ آس پاس دو تین دوسرے مہمان بھی موجود تھے۔ عورت اپنی مخصوص تیز' کھردری اور اونچی آواز میں دوسرے مہمانوں سے بات کر رہی تھی" مجھے معلوم تھا کہ وہ ڈریس ایک ہزار ڈالر میں مہنگا ہے...... لیکن میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اسے خرید کر رہوں گی۔ آخر مجھے ایک دولت مند شوہر نے طلاق دی ہے...... اور وہ گویا اس کی سزا بھگت رہا ہے کہ ایک بھاری رقم ہر ماہ مجھے نان نفقے کے طور پر ادا کرے۔ اب میں اس کی دولت بے پروائی سے خرچ کر کے زندگی کا لطف بھی نہ اٹھاؤں تو لعنت ہے مجھ پر......"

وہ بے ہودہ انداز میں زور سے ہنسی جیسے اس نے کوئی بہت عمدہ مذاق کیا ہو۔ جورگ کھاڑی کے کنارے آگے بڑھ کر پام کے ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ اس وقت ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جورگ نے بش کوٹ کے نیچے سے نیپکن میں لپٹے ہوئے چکن کے ٹکڑے نکالے جو خاصے بڑے بڑے تھے۔ ان میں دو چکن لیگز' دو ڈرم اسٹکس اور دو تین بچے کھچے ٹکڑے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نشانہ باندھ کر سب سے بڑا ٹکڑا موٹی عورت کے قریب پھینکے گا اور باقی ٹکڑے اس طرح پھینکے گا کہ وہ دوسرے مہمانوں کے آس پاس گریں۔ اسے یقین تھا کہ مگر مچھ قریب ہی موجود ہے تاہم اسے یہ یقین نہیں تھا کہ وہ اس عورت کو یا کسی دوسرے مہمان کو جبڑوں میں دبوچ کر لے جائے گا یا نہیں...... تاہم اگر اس کی یہ توقع پوری نہ ہوتی تب بھی وہ سب لوگ اس بری طرح دہشت زدہ ہو جاتے کہ ان کی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر جورگ بعد میں برسوں تک لطف اندوز ہو سکتا تھا۔

اس نے چکن کا سب سے بڑا ٹکڑا ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے پھینکنے کے لیے تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ تمام مہمانوں کی نظریں اس سمت سے ہٹ جائیں جدھر وہ چھپا ہوا تھا تاکہ کسی کو اندازہ نہ ہو سکے کہ اس طرف سے کچھ پھینکا گیا تھا۔ ویسے تو کوئی بھی بطورِ خاص اس طرف نہیں دیکھ رہا تھا پھر بھی جورگ چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ آخر ان سب لوگوں نے غالباً ذرا ترنگ میں آ کر مل کر ایک گانا گانا شروع کر دیا۔ تب جورگ نے بازو اونچا کیا اور چکن ان کی سمت میں پھینک دیا...... لیکن عین اسی لمحے عورت چلائی" ارے...... میرا ہیرے کا نیا نیکلس پانی میں گر گیا ہے جو میں تم لوگوں کو دکھا رہی تھی...... کوئی ہے جو اسے پانی میں سے ڈھونڈ کر نکال لائے؟ میں اسے دو سو ڈالر انعام دوں گی۔"

اس سے پہلے کہ کوئی مہمان جواب دیتا یا اپنی جگہ سے حرکت کرتا عورت کے عقب میں نظر آنے والے درختوں کے جھنڈ سے ایک کم عمر لڑکا برآمد ہوا اور پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے چلایا" آپ فکر نہ کریں میڈم! میں ابھی ڈھونڈ لاتا ہوں۔"

اور عین اسی لمحے مگر مچھ کے مہیب جبڑے پانی کی سطح پر نمودار ہوئے۔ جورگ کو ایسا لگا جیسے اس کا چکن پھینکنا...... عورت کا چلانا' لڑکے کا چھلانگ لگانا اور مگر مچھ کا نمودار ہونا یہ سب کچھ تقریباً ایک ساتھ ہی ہوا تھا۔ لڑکا کھلے ہوئے جبڑوں کے عین قریب تھا اور جورگ کے حواس جواب دے رہے تھے کیونکہ وہ اس کا اپنا دس سالہ بیٹا تھا!

جورگ کی نظر گو کہ دھندلا رہی تھی مگر اس نے اندھا دھند دوڑتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ لگائی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ مگر مچھ کے منہ اور لڑکے کے درمیان جا گرے تاکہ لڑکے کے بجائے وہ خود مگر مچھ کے جبڑوں میں آ جائے۔

وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ اس کے جسم میں ایک ساتھ گویا سیکڑوں خنجر پیوست ہو گئے اور اس کا وجود گویا کسی بہت بڑے آہنی شکنجے میں پس کر رہ گیا۔ چند ہی لمحوں میں اسے زندگی کے ہر احساسِ محرومی سے نجات مل گئی!

پہلا رنگ

چراغ آرزو

سلیم فاروقی

زندگی میں ہر آرزو تکمیل کا روپ دھارنے لگے تو اُمید کے چراغ روشن ہونا چھوڑ دیں لیکن کبھی کبھی کوئی تشنہ آرزو دل کا ناسور بن جاتی ہے۔ ناتمام آرزوؤں کے زخم مندمل کرنے کے لیے وقت کو مرہم کہتے ہیں مگر کبھی یہ وقت آنے میں بہت دیر لگ جاتی ہے۔ تمناؤں ...... خواہشات کے چراغ ...... جس کی لو مدھم ضرور پڑتی ہے...... بجھتی نہیں۔

محبت کے مزار کی پجارن...... جو دل کے ہاتھوں ہر حد سے گزر گئی

اغوا کی اس واردات سے پورا شہر بلکہ پورا ملک ہل کر رہ گیا تھا۔ پولیس کے کئی افسران معطل ہو گئے تھے، کچھ افسران کی تنزلی ہوئی تھی اور کچھ لائن حاضر کر دیے گئے تھے۔ وہ واردات ہی ایسی تھی۔ وزارتِ داخلہ کے چیف سیکریٹری مرزا اسد بیگ کا نوزائدہ پوتا میٹرنٹی ہوم سے اغوا ہو گیا تھا۔ مرزا انور بیگ بھی وزارتِ خارجہ میں فرسٹ سیکریٹری تھا اور ان

دنوں ایران میں تھا۔

میں انور کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ پرائمری کا طالب علم تھا۔

میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ پھر ہم دونوں سیکنڈری اسکول میں بھی ایک ہی کلاس میں رہے، ایک ہی کالج سے پڑھا۔ اس کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے۔

میں اعلیٰ تعلیم کے لیے کیلی فورنیا چلا گیا اور وہ آکسفورڈ یونیورسٹی۔ ہمارے راستے ضرور جدا ہوئے تھے لیکن دل جدا نہیں ہوئے تھے۔

ہماری دوستی مثالی تھی۔ حسبِ روایت انور کو وہاں ایک گوری میم پسند آگئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے والدین خصوصاً مرزا صاحب اس میم کو بہو کے روپ میں قبول نہیں کریں گے۔

اس نے مجھے ٹیلی فون کیا اور کہا۔ ”اگر تیرے پاس وقت ہے تو لندن کا ایک چکر لگا لے۔ تجھ سے بہت ضروری کام ہے ورنہ مجھے وقت ملا تو میں ایک دو ہفتے میں وہاں آجاؤں گا۔“

میرے پاس وقت تو تھا لیکن اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں لندن کا چکر لگانے کی عیاشی کرتا۔ اس کی طرح میں بڑے باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ میں تو یوں بھی اسکالرشپ پر امریکا گیا تھا اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے چھٹیوں میں چھوٹے موٹے کام کر کے گزارہ کرتا تھا۔ میں نے وہاں آنے سے صاف انکار کر دیا۔

دوسرے ہی دن اس نے مجھے ایک ایکسچینج کمپنی کے ذریعے پیسے بھجوا دیے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ معاملہ خاصا سیریس ہے۔

میں انہی دنوں سیمسٹر سے فارغ ہوا تھا۔ دوسرا سیمسٹر شروع ہونے میں ابھی دس بارہ دن باقی تھے۔ میں پہلی میسر آنے والی پرواز کے ذریعے لندن روانہ ہو گیا۔

انور ائرپورٹ پر موجود تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے خدشات تھے لیکن اس کا پُرسکون اور کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

وہاں اس نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے رکھا تھا۔

اپارٹمنٹ بہت خوب صورت تھا، آراستہ تھا لیکن اس میں صرف ایک ہی بیڈ روم اور ٹی وی لاؤنج تھا۔ بہرحال، یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”یار! اب تو منہ سے کچھ پھوٹ... ایسا کیا مسئلہ درپیش ہے کہ تو نے مجھے یہاں بلایا ہے؟“

”یار کمال!“ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے محبت ہو گئی ہے۔“

میرا دل چاہا کہ ماربل کی بھاری ایش ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر دے ماروں۔ میں نے بھنا کر کہا۔ ”تو نے مجھے صرف یہ اطلاع دینے کے لیے یہاں بلایا ہے؟“

”پوری بات سنے بغیر بیچ میں بولنا تو تیری پرانی عادت ہے۔“ انور نے کہا۔

”اور سسپنس پیدا کرنا تیری فطرت ہے۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”یار! اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ میں تجھ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ انجلینا میرے ساتھ ہی پڑھتی ہے، انتہائی ذہین اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے، اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ تو بتا، مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

”اگر تو فیصلہ کر چکا ہے تو مجھ سے مشورہ کرنا فضول ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہاں، اگر ابھی تک فیصلہ نہیں کیا ہے تو اس موضوع پر غور کر سکتا ہوں۔“

”اگر فیصلہ کر لیتا تو تجھے یوں ہنگامی طور پر نہ بلاتا۔“

”دیکھ انور! اگر تو میرا مشورہ چاہتا ہے تو پھر برا مت ماننا۔“

”اب تو تمہید ہی باندھے جائے گا یا کچھ منہ سے پھوٹے گا بھی؟“ انور نے کہا۔

”اگر تو میری رائے جاننا چاہتا ہے تو میں یہاں کی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھتا۔ ممکن ہے سو میں سے کوئی ایک آدھ لڑکی اچھی بھی ہو کیونکہ ساری زندگی کا سودا ہوتا ہے۔ میں جب تک ان موصوفہ سے ملوں گا نہیں، تجھے کیا مشورہ دے سکتا ہوں... پھر ان کے بارے میں تحقیقات بھی کروں گا کہ جو کچھ انہوں نے تجھے بتایا ہے، اس میں کس قدر حقیقت ہے؟“

”اب تیری کرمنالوجی کی رگ پھڑکنے لگی۔“

”اسے چھوڑ، یہ تو ہر وقت پھڑکتی رہتی ہے۔ تو شاید بھول جاتا ہے کہ میں کرمنالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ اب یہ بھی اتفاق ہے کہ مجھے پہلا کیس تیرا ہی ملا ہے ورنہ ابھی تک ہماری عملی ٹریننگ شروع نہیں ہوئی ہے۔“

”چل ٹھیک ہے، تو پہلے انجلینا سے مل لے۔“ انور نے کہا۔ ”باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“

پھر ہم دیر تک اسکول اور کالج کے واقعات دہراتے رہے۔ پاکستان کی باتیں کرتے رہے۔

صبح ہم لوگ نکلنے والے تھے کہ انور کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انور نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی اور کال ریسیو کر لی۔ ”السلام علیکم ڈیڈی... جی ہاں، میں جا ہی رہا

تھا... جی اچھی ہو رہی ہے... ڈیڈی! آج کل کمال بھی میرے ساتھ ہے... اچھا، امی اور شانو کیسی ہیں؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟... جی ہاں موجود ہے، لیں بات کریں۔“ اس نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈی ہیں۔ تجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔“

میں نے فون کان سے لگا کر کہا۔ ”السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ؟“

”وعلیکم السلام۔“ انکل نے جواب دیا۔ ”بیٹا! ہم تو ٹھیک ہیں، بس تم لوگوں کی فکر لگی رہتی ہے۔ ہاں، تم لندن میں کیسے ہو؟“

”انکل! ابھی میرا سمسٹر ختم ہوا ہے۔ کچھ دن کی فراغت تھی اس لیے لندن چلا آیا۔“

”اچھا کیا بیٹا!“ انہوں نے کہا۔ ”میں تو چاہتا تھا کہ انور کا ایڈمیشن بھی تمہارے ہی ساتھ کراؤں۔ تم اگر مستقل اس کے ساتھ ہوتے تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی۔ تم اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہو۔“

”ارے انکل! اب ایسا بھی نہیں ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”گھر کے دوسرے لوگ تو خیریت سے ہیں؟“

”بیٹا! یہاں سب خیریت ہے۔ اکثر تمہارے گھر بھی جانا ہوتا ہے۔ وہاں سے بھی کوئی نہ کوئی آجاتا ہے۔ وہاں بھی سب خیریت ہے۔ بس تم لوگ دل لگا کر پڑھو اور اچھے نمبروں سے پاس ہو کر آؤ۔“

”جی انکل!“ میں نے اتنا ہی کہا۔

”اب ذرا فون اس گدھے کو دو۔“ ان کا اشارہ انور کی طرف تھا۔

وہ گدھا ٹائی کی ناٹ باندھنے اور کھولنے میں مصروف تھا۔ میں نے فون اس کے حوالے کر دیا۔

جتنی دیر میں اس نے انکل سے بات کی، میں نے اس کی ٹائی کی ناٹ باندھ دی۔

میں نے اس روز آکسفورڈ یونیورسٹی کو پہلی دفعہ دیکھا۔ اس وسیع و عریض عمارت سے کیسے کیسے گوہرِ نایاب فارغ التحصیل ہوئے تھے۔

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 350/-

اندھیری رات کے مسافر 325/-

ثقافت کی تلاش 150/-

قیصر و کسریٰ 380/-

اور تلوار ٹوٹ گئی 350/-

گمشدہ قافلے 350/-

داستانِ مجاہد 200/-

پردیسی درخت 325/-

یوسف بن تاشفین 325/-

معظم علی 325/-

خاک اور خون 350/-

کلیسا اور آگ 300/-

قافلۂ حجاز 350/-

محمد بن قاسم 300/-

پورس کے ہاتھی 180/-

انسان اور دیوتا 80/-

پاکستان سے دیارِ حرم تک 0/-

آخری چٹان 5/-

سو سال بعد 50/-

سفید جزیرہ 25/-

شاہین 25/-

Buy online:
w.anarkalimall.com
ww.jbdpress.com

جہانگیر بک ڈپو
061-4781781 022-2780128
051-35539609 021-?765086
042-37220879 041-2627568

میں ابھی یونیورسٹی کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کے گروپ سے ملاقات ہوئی۔ وہ سب انور کے کلاس فیلو تھے۔ ان میں سے ایک کا تعلق ترکی سے تھا اور دوسرے کا تعلق بھارت سے۔ دو لڑکیاں مقامی تھیں، تیسری بھارتی تھی۔

انور نے ان لوگوں سے میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میرے دوست کمال احسن ہیں، کیلی فورنیا یونیورسٹی سے کرمنالوجی میں ماسٹر کر رہے ہیں۔'' پھر اس نے ان لوگوں کا تعارف کرایا۔ ''یہ وجے ہے، الٰہ آباد انڈیا سے اس کا تعلق ہے۔ یہ سارم ہے، ترکی سے آیا ہے۔ یہ مینا ہے، یہ جولیا ہے اور یہ انجلینا ہے۔''

وہ سب بہت تپاک سے ملے۔ خاص طور پر سارم تو مجھ سے بہت والہانہ انداز میں ملا اور بولا۔ ''مجھے پاکستانیوں سے بہت محبت ہے۔ پھر آپ کا تو نام بھی ہمارے ایک قومی ہیرو کے نام پر ہے۔''

ان لوگوں سے فارغ ہو کر انور انجلینا کو لے کر ایک طرف لے گیا۔

انجلینا واقعی بہت حسین تھی۔ عام انگریز لڑکیوں کے برعکس اس کی جلد شفاف... آنکھیں اور بال براؤن اور جسم گویا سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اس نے وائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ خاصی دراز قد اور صحت مند لڑکی تھی۔ میں تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بس کر یارا!'' انور نے کہا۔ ''تیری بھابی ہے۔''

''ہونے والی بھابی...'' میں نے کہا پھر بولا۔ ''یارا بھابی واقعی حسین ہے۔ میں نے پچاس نمبر تو اسے دے دیے۔ ان نمبروں میں حسن کے ساتھ ساتھ اس کی آواز، گفتگو کا انداز اور چال ڈھال بھی شامل ہے۔''

''ابے تو کسی اشتہار کے لیے ماڈل سلیکٹ کر رہا ہے یا...''

''میری مارکنگ تو ایسی ہی ہوتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بقیہ پچاس نمبر اس وقت دوں گا جب میں بھابی کے بارے میں تحقیقات کرلوں گا۔''

''یہ ایٹی کیٹس کے خلاف ہے۔'' انجلینا نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو انگلش میں بات کرنا چاہیے۔''

''سوری۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہم دونوں بہت عرصے بعد ملے ہیں اس لیے دھیان نہیں رہا، ویسے اب آپ کو بھی اردو سیکھ لینی چاہیے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ انور نے آپ کو میرے بارے میں بتا دیا؟'' انجلینا مسکرا کر بولی۔

''ہم دونوں پرائمری اسکول سے ایک ساتھ پڑھتے آئے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپاتے۔''

''بہت اچھے۔'' انجلینا نے توصیفی انداز میں کہا۔ ''یہاں تو اب ایسے دوستوں کا کال ہے مسٹر کمال!''

''مسٹر کمال نہیں... صرف کمال!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اوکے اوکے!'' انجلینا نے کہا پھر انور سے بولی۔ ''اب کیا پروگرام ہے؟ کیا کلاس اٹینڈ نہیں کرو گے؟''

''آج بالکل موڈ نہیں ہے ڈیئر!'' انور نے کہا۔ ''میرا دوست صرف میری خاطر امریکا سے یہاں آیا ہے۔''

''اچھا تو پھر میں کلاس میں جاؤں؟''

''نہیں بھابی... میرا مطلب ہے انجلینا!'' میں نے کہا۔ ''انور نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ میں تو آپ سے حسد کرنے لگا ہوں۔ بہرحال، آپ بھی ہمارے ساتھ ہی رہیں گی۔''

''اوکے!'' اس نے کندھے اچکا دیے۔ ''مجھے کیا اعتراض ہے۔ کلاسز اٹینڈ نہ کرنے کا جرمانہ تو انور ہی دے گا۔''

اس دن ہم بسوں کے ذریعے، انڈر گراؤنڈ ریلوے کے ذریعے اور پیدل گھنٹوں گھومتے رہے۔ اس دوران میں ہم نے ایک ریستوران میں لنچ بھی کیا۔

انجلینا سے گفتگو کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پڑھی لکھی اور ذہین لڑکی ہے اور کسی بھی موضوع پر بات کرسکتی ہے۔

میں اور انور جب اپارٹمنٹ واپس آئے تو اس نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''اب بتا، کیسی لگی تجھے اپنی ہونے والی بھابی؟''

''خوب صورت، ذہین، سلجھی ہوئی اور اسمارٹ۔'' میں نے کہا۔ ''اب تو مجھے اس کا ایڈریس دے تاکہ میں بقیہ پچاس نمبرز پر بھی کام کرسکوں۔ تو نے بتایا ہے کہ بھابی کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔''

''یہ میں نے کب کہا؟'' انور نے کہا۔ ''انجلینا کا تعلق یہاں کی ایک نواب فیملی سے ہے۔''

''اور وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک کالے آدمی سے کر دیں گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہ پاکستان نہیں ہے۔'' انور نے کہا۔ ''یہاں لڑکیوں کی مرضی چلتی ہے، ان کے والدین کی نہیں۔''

دوسرے دن سے میں نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ میں نے سب سے پہلے میونسپل آفس جا کر انجلینا کا برتھ ریکارڈ دیکھا۔ وہ واقعی بائیس سال سے زیادہ کی نہیں تھی۔ پھر میں نے وہیں دوسرے شعبوں سے برطانیہ کے نوابوں کا ریکارڈ حاصل کیا۔ ان نوابوں میں انجلینا کے دادا کا نام تو تھا لیکن باپ کا نام شامل نہیں تھا۔ میں نے اس کے اسکول اور کالج جا کر اس کے بارے میں معلوم کیا۔ یونیورسٹی کے کچھ لوگوں سے بھی ملا، پھر میں نے بقیہ پچاس نمبر بھی انجلینا کو دے دیے۔

''یار انور! تو بہت لکی ہے کہ تجھے انجلینا بھابی جیسی ذہین، خوب صورت، خاندانی اور صاف گو لڑکی ملی ہے۔ میری طرف سے سو میں سے ایک سو ایک نمبر۔''

''تو میرا دل رکھنے کو تو نہیں کہہ رہا ہے؟'' انور نے کہا۔

''انور! تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ ہمارا کتنی ہی باتوں پر اختلاف ہوا ہے۔ پھر میں تو سرے سے یہاں شادی کا قائل ہی نہیں ہوں۔ جب ہی تو تجھے خوش قسمت کہہ رہا ہوں۔''

''یار! ایک مسئلہ اور ہے۔'' انور نے کہا۔ ''ڈیڈی اور مما کو کیسے راضی کیا جائے؟''

''یہ مسئلہ نہیں بیٹے... مسئلہ کشمیر ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اس کے لیے مجھے بیک ڈور چینل سے مذاکرات کرنا ہوں گے لیکن تو ابھی فوری طور پر اس مسئلے کو بھول جا۔ اس کے لیے تو میں پاکستان جا کر ہی کچھ کرسکتا ہوں۔''

☆☆☆

یہ الگ داستان ہے کہ میں نے انور کے گھر والوں کو کیسے راضی کیا۔ میں نے انکل کو یہ بھی بتایا کہ یہ انور کی سعادت مندی ہے کہ وہ آپ سے اجازت مانگ رہا ہے ورنہ عموماً لوگ واپس آتے ہیں تو ان کے ساتھ ایک بدشکل اور نخریلی میم ضرور ہوتی ہے۔

یوں انور اور انجلینا کی شادی ہوگئی۔

انور نے دو سال میں اسے اسلام کی طرف راغب کر لیا تھا، وہ بہت اچھا ڈبیٹر تھا اور اب تو قانون کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

یوں انجلینا نے شادی سے چھ سات مہینے پہلے ہی اسلام قبول کرلیا اور اس کا اسلامی نام مریم رکھا گیا۔

تعلیم سے فارغ ہو کر میں نے پولیس کا محکمہ جوائن کر لیا اور انور نے خارجہ امور کے شعبے کو ترجیح دی۔

شادی کے پانچ سال بعد تک ان کے یہاں اولاد نہیں ہوئی۔ انور نے بھابی کا مہنگے سے مہنگا علاج کرایا۔ اس نے اپنا چیک اپ بھی کرایا۔ رپورٹس بالکل نارمل تھیں۔ پاکستان سے لے کر لندن اور امریکا تک ہر ڈاکٹر نے یہی کہا کہ سب کچھ نارمل ہے۔ نہ انور میں کوئی کمی ہے، نہ بھابی میں کوئی خامی ہے۔

انور بھی اب اولاد کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔

انکل تو کچھ نہیں کہتے تھے لیکن آنٹی کہتیں۔ ''میں انور کی دوسری شادی کراؤں گی۔ میں دادی بننے کا ارمان لیے اس دنیا سے رخصت نہیں ہو سکتی۔''

''اور اگر دوسری بیوی سے بھی اولاد نہ ہوئی؟'' انکل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو پھر کیا اپنے بیٹے کی تیسری شادی کراؤ گی؟ مریم کی رپورٹ نارمل ہے، بس اللہ کی مرضی نہیں ہے۔ اس کی مرضی نہیں ہوئی تو تم دو چھوڑ بیٹے کی چار شادیاں بھی کرا دو، اولاد نہیں ہوگی۔''

مریم بھابی خود بھی انور سے کہتی۔ ''مما اگر آپ کی شادی کرنا چاہ رہی ہیں تو کرلیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

انور جواب دیتا۔ ''جب تمہاری ہر رپورٹ نارمل ہے، میری رپورٹ بھی بالکل ٹھیک ہے، پھر تم اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہو؟''

☆☆☆

آخر اللہ کو بھی انور پر رحم آ گیا۔ مریم بھابی کی طبیعت خراب تھی۔ انور ان دنوں جرمنی میں تھا۔ آنٹی، بھابی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد بھابی کو مشورہ دیا کہ آپ اپنا الٹرا ساؤنڈ بھی کرالیں۔ وہ ان کی فیملی ڈاکٹر تھی۔ اسے معلوم تو ہو گیا تھا کہ بھابی ماں بننے والی ہیں لیکن وہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد انہیں یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی۔

آنٹی نے تشویش سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے؟ آپ نے مریم کا الٹرا ساؤنڈ کیوں کرایا ہے؟''

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''ارے نہیں مسز بیگ! میں تو بس اپنا اطمینان کرنا چاہتی ہوں۔''

رپورٹ ملتے ہی اس نے آنٹی کو خوش خبری سنا دی۔ ''مبارک ہو، آپ دادی بننے والی ہیں۔''

یہ خبر سن کر آنٹی پہلے تو سکتے میں رہ گئیں، پھر خوشی کے مارے ان کے آنسو بہنے لگے۔ بھابی بھی یہ خبر سن کر رونے لگیں لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔

انہوں نے گھر آتے ہی پہلے انور کو ٹیلی فون کیا پھر مجھے اطلاع دی۔

میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر پہنچا اور اپنی بیوی فرحانہ اور بیٹے رافع کو لے کر سیدھا انور کے گھر پہنچا۔

وہاں تو گویا عید کا سماں تھا۔ گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ آنٹی

www.pkdigest.com

نے بھابی کو ہتھیلی کا چھالا بنالیا تھا۔ وہ انھیں بیڈ سے قدم بھی نہیں اتارنے دے رہی تھیں کہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابتدائی دو تین ماہ بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ وزن اٹھانے، سیڑھیاں چڑھنے اور کسی بھی قسم کی فکر و پریشانی سے پرہیز کریں۔

بھابی کا کمرا بالائی منزل پر تھا۔ آنٹی نے بھابی کے لیے نیچے ایک کمرا مخصوص کردیا۔

بھابی خود بھی بہت خوش تھیں۔ وہ فرحانہ سے ملیں، تب بھی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اسی وقت انکل بھی آگئے۔ انھیں بھی آفس میں اطلاع دی جاچکی تھی۔ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

دوسرے دن انور بھی جرمنی سے کراچی پہنچ گیا۔ وہ وہاں سے بچے کے لیے نہ جانے کیا کچھ لے آیا تھا۔ سب اس پر ہنسنے لگے کہ ان چیزوں کو استعمال کرنے کے لیے ابھی دو تین سال انتظار کرنا پڑے گا اور اس وقت تک اس سے بھی زیادہ اچھی چیزیں مارکیٹ میں آچکی ہوں گی۔

وہ دو دن کراچی میں رہا اور یہ پہلا موقع تھا جب میری اس سے صرف ایک دفعہ ملاقات ہوسکی۔ وہ اس دوران میں شاید گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔

☆☆☆

دن گزرتے رہے۔ انور جرمنی سے اٹلی گیا اور پھر فرسٹ سیکریٹری ہوکر ایران چلا گیا۔ جس دن اس کا پروموشن ہوا، اس دن میرا بھی پروموشن ہوا۔ میں ایس پی تھا۔ مجھے کرائم برانچ کا ایس ایس پی بنادیا گیا۔ میرے افسران خاص طور پر میرے ڈائریکٹر جنرل اور ہوم منسٹر میری کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ میں نے کچھ ایسے کیس حل کیے تھے جو بظاہر بہت مشکل تھے۔ میڈیا کی وجہ سے مجھے خوب شہرت ملی تھی۔ ویسے بھی میڈیا جسے چاہے آسمان پر چڑھادے۔

ایران جانے سے پہلے انور بہت فکرمند تھا کیونکہ ڈلیوری کا وقت بہت نزدیک تھا لیکن اس کا جانا بھی ضروری تھا۔ انکل اور آنٹی نے اسے سمجھایا کہ مریم یہاں اکیلی تو نہیں ہے۔ پورا گھر اس کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہے، پھر سب سے بڑھ کر تمہارا ہم زاد یہاں ہے۔

وہ مجھے انور کا ہم زاد کہتے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انور کو ایران جانا پڑا۔

☆☆☆

بھابی نے انتہائی خوب صورت بچے کو جنم دیا تھا۔ جب ماں اور باپ دونوں خوب رو ہوں تو بچہ بھلا خوب صورت کیوں نہیں ہوگا۔

میں عموماً نوزائیدہ بچوں کو دور ہی دور سے دیکھتا ہوں۔ انھیں گود میں اٹھاتے ہوئے مجھے عجیب سا لگتا ہے لیکن یاسر وہ واحد بچہ تھا جسے میں نے گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا۔

میں اور فرحانہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے کیونکہ یاسر آپریشن کے ذریعے پیدا ہوا تھا اور اس کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی کہ بھابی کی جان پر بن گئی تھی۔

بالآخر یہ بری گھڑی بھی ٹل گئی۔ ڈاکٹر نسرین ارشد ملک کی بہترین گائناکولوجسٹ تھیں۔ وہ آپریشن کے وقت خود بھی او ٹی میں موجود تھیں۔ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اگر ڈاکٹر نسرین نہ ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوجاتا۔

بھابی اب بھی نیم غنودگی کے عالم میں تھیں۔ انہوں نے صرف ایک دفعہ آنکھیں کھول کر مجھے اور فرحانہ کو دیکھا پھر مسکرا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

☆☆☆

دوسرے دن یہ خبر بم کی طرح مجھ پر گری کہ یاسر کو اس اسپتال سے اغوا کرلیا گیا ہے۔ یہ خبر ہم نے بھابی کو نہیں بتائی تھی۔ ان سے یہی کہا گیا تھا کہ یاسر کو بچوں کی نرسری میں رکھا گیا ہے کیونکہ اسے انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہے۔

اس خبر سے پورے ملک میں گویا ایک بھونچال سا آگیا۔ انکل اس وقت وزارت داخلہ کے ہوم سیکریٹری تھے۔ وفاقی ہوم سیکریٹری کے اختیارات کسی بھی طور وزیر داخلہ سے کم نہیں ہوتے۔

انور کو اطلاع دی جاچکی تھی بلکہ اسے میڈیا کے ذریعے پہلے ہی اس خبر کا علم ہوگیا تھا۔ ان کے گھر میں گویا صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ اتنی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہونے والا بچہ دوسرے ہی دن اسپتال سے پُراسرار طور پر غائب ہوجائے، اس سے بڑا سانحہ اور کیا ہوگا۔

کیس علاقے کے ایس ایس پی ظفر خان کے پاس تھا۔ وہ اپنے طور پر تحقیقات کررہا تھا لیکن ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔

اسی طرح دس گھنٹے گزر گئے تو انکل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ انہوں نے پولیس کے کئی افسران کو معطل کردیا، کئی افسران کا ایسے علاقوں میں تبادلہ کردیا جنھیں پولیس والے ”کالا پانی“ کی سزا کہتے تھے لیکن یاسر کا کوئی سراغ نہ ملا۔

میں اپنے طور پر تحقیقات کررہا تھا لیکن باضابطہ طور پر یہ کیس ہاتھ میں لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ مجھے بھی ناکامی ہوئی تو انکل، آنٹی، انور اور بھابی کو کیا منہ دکھاتا۔ میں تو اپنے حل کیے ہوئے کیسوں کے واقعات بڑے

فخر سے نمک مرچ لگا کر انھیں سنایا کرتا تھا۔ اب اگر میں بھی ناکام رہتا تو فرحانہ سمیت میں ان سب کی نظروں میں گر جاتا۔ میرے افسران بالا مجھے لعن طعن کرتے اور صوبائی ہوم سیکریٹری جو میری تعریف کرتے نہ تھکتے تھے، مجھے کشمور یا جیکب آباد جیسے کسی علاقے میں بھیج دیتے۔

آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ڈی جی صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا کہ وہ فوری طور پر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

میں دس منٹ کے اندر اندر ان کے پاس پہنچ گیا۔

”یس سر!“ میں نے انھیں سیلیوٹ کرتے ہوئے کہا۔

”تشریف رکھیے مسٹر کمال!“ انہوں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔

”ایس ایس پی کمال!“ انہوں نے گونج دار آواز میں کہا۔ ”آپ یہ تو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اس وقت ہر چینل، ہر اخبار کی نیوز الرٹ کیا ہے؟“

”یس سر!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”ہم پر ہوم منسٹری کا دباؤ تو ہے ہی، میڈیا نے ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا ہے۔ پھر مسٹر انور بیگ آپ کے بہترین دوست بھی ہیں۔“

”یس سر!“ میں نے پھر اختصار پر اکتفا کیا۔

”میں اغوا کا یہ کیس آپ کے حوالے کررہا ہوں۔“ انہوں نے چند فائلیں میری طرف بڑھائیں۔ ”ان فائلوں میں اس کیس کی تمام تفصیلات ہیں اور مجھے جلد از جلد رزلٹ چاہیے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا سر!“ میں نے کہا۔ ”لیکن آپ جانتے ہیں کہ میں سیاست اور مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر کام کرتا ہوں۔ میں اس کیس میں بھی فری ہینڈ چاہتا ہوں۔“

”آپ کو ہر قسم کی سہولت دی جائے گی مسٹر کمال! اپنے وسائل کے مطابق میں آپ کی ہر ڈیمانڈ پوری کروں گا، ہر طرح سے تعاون کروں گا۔ حتیٰ کہ اگر آپ کو مجھ پر بھی شبہ ہو تو آپ مجھے گرفتار کرسکتے ہیں۔ میں ابھی خصوصی اجازت نامہ ٹائپ کرا کے آپ کے حوالے کردیتا ہوں۔“

”تھینک یو سر!“ میں نے کہا۔

”مجھے یقین ہے مسٹر کمال! آپ اس کیس کو ضرور حل کرلیں گے۔“

”خدا کرے کہ میں آپ کے اعتماد پر پورا اتروں۔“ میں نے کہا۔

انہوں نے میرے لیے چائے منگوالی تھی۔ اتنے بڑے افسران معمولی سے ایک ایس ایس پی کو زیادہ منہ نہیں لگاتے۔ ڈی جی صاحب واقعی مجھے پسند کرتے تھے۔

جب تک میں چائے پی کر فارغ ہوا، وزارت داخلہ کے خصوصی اجازت نامے کا پرنٹ آؤٹ آگیا۔ ڈی جی صاحب نے میرے سامنے ہی دستخط کیے اور وہ کاغذ میری طرف بڑھادیا جس کی رو سے مجھے لامحدود اختیارات حاصل ہوگئے تھے۔

اس خصوصی اجازت نامے کو احتیاط سے اپنی جیب میں رکھنے کے بعد میں نے کیس کی فائلوں کا پلندا سنبھالا، ڈی جی صاحب کو سیلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

”وش یو بیسٹ آف لک۔“ ڈی جی صاحب نے کہا۔

”یس سر!“

میں کمرے سے باہر آگیا۔

واپسی میں مجھے ایس پی نادر ملا۔ وہ میرے ہی بیچ کا تھا لیکن مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ اس میں وہ تمام عیوب موجود تھے جن کی وجہ سے پولیس کا پورا محکمہ بدنام ہے۔ ظلم، زیادتی، رشوت خوری اور بااثر ملزمان کی پشت پناہی... ایس پی نادر کی طرح ایس ایس پی ظفر بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ اس تالاب کی تو ہر مچھلی ہی گندی تھی۔

”ہاں بھئی ایس ایس پی صاحب!“ نادر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے یاسر اغوا کا کیس ڈی جی صاحب نے تمہارے حوالے کردیا؟“

”تم تو بہت جینئس ہو یار!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ کیس میرے حوالے کردیا گیا ہے؟“

وہ میرے طنز پر تلملا کر رہ گیا اور بولا۔ ”ایس ایس پی ظفر انتہائی تجربہ کار اور زیرک پولیس افسر ہیں۔ جب ان کے ہاتھ کوئی سرا نہیں آیا تو تم بھلا کون سا تیر مار لوگے؟“

”تیر نہیں، میں گولی مارتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”مدت ہوئی تیر کمان کا زمانہ گزر گیا۔ اور تم جانتے ہو کہ میں گولی بھی پیشانی کے عین وسط میں مارتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں باہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

نادر خان، ایس ایس پی ظفر خان کا چہیتا تھا۔ دونوں کی دلچسپیاں مشترک تھیں۔ دونوں شراب، شباب اور حرام خوری کے رسیا تھے۔ ایس ایس پی ظفر، نادر خان کی پشت پناہی بھی کرتا تھا۔ اب ان دونوں کو الگ الگ کردیا گیا تھا۔ ایس ایس پی ظفر خان کو کشمور جیسے دور دراز اور خطرناک علاقے میں بھیج دیا گیا تھا جہاں واقعی کام کرنا پڑتا تھا۔ پھر

www.pkdigest.com

موسم کی شدت اس پر سونے پر سہاگا کا کام دیتی ہے۔

یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں اپنے آفس پہنچا اور ایس ایس پی ظفر کی تفتیشی رپورٹ کا مطالعہ کرنے لگا۔

اس نے اسپتال کے ان تمام ملازمین، ڈاکٹرز، نرسوں اور نچلے اسٹاف کے بیانات لیے تھے جو اس رات ڈیوٹی پر موجود تھے۔ وہی رسمی سوالات تھے۔ اس میں انکل کا بیان بھی شامل تھا اور حسب روایت ان سے بھی یہی سوال کیا گیا تھا کہ ان کی کسی سے دشمنی تو نہیں ہے یا انہیں کسی پر شبہ ہے تو بتائیں۔

ان فائلوں میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ میں نے آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ فائلیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے ان میں کوئی نکتہ ایسا ہو جو میرے کام آجائے، میں نے وہ فائلیں اپنے بریف کیس میں رکھ لیں اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

بھابی کی حالت اب خاصی بہتر تھی اور وہ بار بار یاسر کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

ان کے کمرے سے ٹی وی ہٹا دیا گیا تھا۔ اخبارات کا داخلہ ممنوع تھا اور کسی ایسے شخص کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہیں تھی جو ان سے الٹی سیدھی گفتگو کر سکے۔

وہ شہر کا سب سے بڑا اسپتال تھا۔ ان کا اپنا سیکیورٹی سسٹم خاصا موثر تھا۔ سیکیورٹی گارڈز الرٹ تھے لیکن اس کے باوجود یہ واردات ہو گئی تھی۔ واردات تو خیر ایوان صدر اور پی ایم ہاؤس میں بھی ہو سکتی ہے، یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔

میں مریم بھابی سے ملنے کے لیے پہنچا تو وہ پوری طرح ہوش میں تھیں۔ ”کمال بھائی! یہ اسپتال والے آخر میرے بچے کو میرے حوالے کیوں نہیں کرتے؟“

”یاسر آئی سی یو میں ہے بھابی!“ میں نے ان سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر بتا رہی تھی کہ اسے محض احتیاط کے طور پر نرسری میں رکھا گیا ہے کیونکہ آپ تو اس پوزیشن میں تھی نہیں کہ اس کی دیکھ بھال کر سکیں۔“

ان سے مل کر میں باہر نکلا تو میرا رخ ڈاکٹر نسرین کے آفس کی طرف تھا۔

وہ ابھی ابھی ایک آپریشن سے فارغ ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ انہوں نے آج کے بعد دیگرے چار آپریشن کیے ہیں۔

”سوری ڈاکٹر!“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ بہت تھکی ہوئی ہیں، میں صرف آپ کے چند منٹ لوں گا۔“

”دیکھیے آفیسر!“ ڈاکٹر نسرین کے پژمردہ چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ چند منٹ کا مطلب ہوگا چند منٹ...“ جواباً انہوں نے کہا۔

”اچھا ایسا کریں، آپ فی الحال آرام کریں۔ میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا۔“

”ایک منٹ!“ انہوں نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور بولیں۔ ”ذرا ڈاکٹر شائستہ کو یہاں بھیج دیں۔“ پھر وہ مجھ سے بولیں۔ ”ڈاکٹر شائستہ میری اسسٹنٹ ہے۔ میری تمام تر مصروفیات کا شیڈول اس کے پاس ہوتا ہے۔ بہت مخلص اور باصلاحیت لڑکی ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر شائستہ کمرے میں داخل ہوئی تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ اتنی ہی حسین تھی۔ سرخ و سفید رنگ، سیاہ چمک دار لمبے اور گھنے بال اور متناسب جسم!

”یس ڈاکٹر!“ اس نے ڈاکٹر نسرین سے پوچھا۔

”ڈاکٹر شائستہ! میری آج شام کی مصروفیات کیا ہیں؟“ ڈاکٹر نسرین نے پوچھا۔

”میڈم! آج رات صرف ایک ڈلیوری کیس ہے۔ ابھی تک کیس نارمل ہے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر سلمٰی اسے ہینڈل کر لیں گی۔ آپ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”اوکے آفیسر!“ ڈاکٹر نسرین نے کہا۔ ”آپ شام کو سات بجے مجھ سے مل سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہو ڈاکٹر!“ میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

وہ شعلہ جوالا مجھ سے پہلے ہی کمرے سے نکل چکی تھی اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر شائستہ ہی سے کچھ سوالات کر لوں حالانکہ ظفر اس سے پوچھ گچھ کر چکا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ناک کر کے میں بھی اندر داخل ہو گیا۔

”آئیے آفیسر!“ وہ مسکراہٹ کی بجلیاں گراتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین تھا کہ بالآخر یہ کیس آپ ہی کے ہاتھ میں آئے گا۔“

”اور آپ کو یقین کیوں تھا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں نے اس سے پہلے بھی آپ کے کارناموں کے بارے میں سنا ہے۔ ٹی وی چینلز اور اخبارات میں آپ کے انٹرویوز دیکھے ہیں۔“

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔

”ایکسکیوزمی!“ میں نے کہا اور سیل فون جیب سے نکال کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ انور کی کال تھی۔ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں انور!“

”تو کہاں ہے کمال؟“ انور نے پوچھا۔

”خیریت تو ہے؟“ میں اس کے لہجے سے گھبرا گیا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے اغوا کرنے والوں کا ٹیلی فون آیا تھا۔ انہوں نے دس کروڑ روپے کی ڈیمانڈ کی ہے۔“

”فون کہاں سے آیا تھا؟“

”فون کرنے والا کسی پی سی او سے بات کر رہا تھا۔“

”جس نمبر سے کال آئی تھی، تو وہ نمبر مجھے ایس ایم ایس کر دے... ابھی فوراً۔“

”تو یہ کیس اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتا؟“ انور نے کہا۔

”یہ کیس مجھے مل چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو فوراً مجھے وہ نمبر ایس ایم ایس کر دے۔“ یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ڈاکٹر شائستہ بہت غور سے میری بات سن رہی تھی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ جلدی سے ایک فائل دیکھنے لگی... جیسے میں نے اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔

”ڈاکٹر شائستہ!“ میں نے کہا۔ ”آپ کو یہاں جاب کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟“

”میں دو سال سے اس اسپتال میں ہوں اور ڈاکٹر نسرین کو اسسٹ کر رہی ہوں۔“ ڈاکٹر شائستہ نے کہا۔

”آپ نے ایم بی بی ایس کہاں سے کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ نے تو باقاعدہ میرا انٹرویو شروع کر دیا۔“ ڈاکٹر شائستہ مسکرا کر بولی۔ ”میں نے ڈی ایم سی سے ایم بی بی ایس کیا ہے، پھر وہیں ہاؤس جاب بھی کیا۔ ایم بی بی ایس میں میری فرسٹ پوزیشن تھی اس لیے مجھے اسی اسپتال میں بغیر کسی سفارش کے جاب مل گئی۔“

”آپ کے ڈیوٹی اوقات کیا ہیں؟“

”ڈیوٹی کے اوقات تو صبح نو سے شام پانچ بجے تک ہیں لیکن ڈاکٹر نسرین کی معاون کی حیثیت سے مجھے تقریباً اٹھارہ گھنٹے ڈیوٹی پر رہنا پڑتا ہے۔“

”جس رات اغوا کی یہ واردات ہوئی، اس رات آپ کہاں تھیں؟“

”میں ان سوالات کے جواب آپ سے پہلے ایک آفیسر کو دے چکی ہوں لیکن چلیں، ایک مرتبہ پھر سہی۔“ شائستہ مسکرائی۔ ”میں اس وقت یہیں اسپتال میں موجود تھی۔ اصل میں مسز بیگ کے کیس نے مجھے اتنا تھکا دیا تھا کہ میں اپنے کمرے میں آکر کچھ دیر کے لیے سو گئی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو اسپتال میں کھلبلی مچی ہوئی تھی کہ یہاں سے ایک بچہ غائب ہو گیا۔“

میں اس کی گفتگو ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر رہا تھا جو میری جیب میں تھا۔ اس کا مائیکرو فون اتنا طاقتور تھا کہ وہ کمرے سے باہر کی آوازیں بھی بہت واضح طور پر ریکارڈ کر سکتا تھا۔

”آپ کا قیام کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا آپ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں؟“ پھر اس نے اپنے سامنے رکھے ہوئے پیڈ پر کچھ لکھا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ”یہ میرا ایڈریس اور دوسری معلومات ہیں۔“

”ارے ڈاکٹر! آپ تو واقعی برا مان گئیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ سب تو رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو فائلوں کا پیٹ بھرنا ہوتا ہے۔“ پھر میں اچانک بولا۔ ”شاہ فیصل کالونی تو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے... مشکل سے دس، بارہ منٹ کی ڈرائیو ہوگی۔“

”میں گاڑی بہت احتیاط سے ڈرائیو کرتی ہوں، پندرہ منٹ لگ جاتے ہیں۔“

”ٹریفک جام میں بڑی گاڑیاں پھنس بھی تو جاتی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہ پرابلم تو ہے۔ میں خود سوچ رہی ہوں کہ ہنڈا سٹی کے بجائے کوئی چھوٹی گاڑی خرید لوں۔ ویسے آپ کو تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا ہوگا؟ پولیس کی جیپ کو تو ہر شخص راستہ دے دیتا ہے۔“

”ڈاکٹر شائستہ! مجھے ایک بات بتائیے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ کو یہاں جاب کرتے ہوئے صرف دو سال ہوئے ہیں اور آپ کے پاس ہنڈا سٹی جیسی قیمتی گاڑی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی سیلری کتنی ہے؟“

ڈاکٹر شائستہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے سنبھل کر کہا۔ ”یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے آفیسر! آپ کیس کی تحقیقات کر رہے ہیں یا میرا انٹرویو کر رہے ہیں؟“

”یہ سوال کیس ہی سے متعلق ہے۔“ میں نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟“

”ابو، امی، میں اور دو چھوٹی بہنیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں بھائی کی نعمت سے محروم ہوں۔“

”گویا آپ اپنے خاندان کی کفالت بھی کرتی ہیں؟“

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ان سوالات سے آپ کا مقصد کیا ہے؟“ شائستہ کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے حالانکہ کمرے میں اے سی چل رہا تھا۔

”اچھا، اس رات اور کون کون ڈیوٹی پر تھا؟“

”اس کا صحیح جواب تو آپ کو میٹرن ہی دے سکے گی۔ وہی ریکارڈ رکھتی ہے۔“

www.pkdigest.com

”تھینک یو ڈاکٹر شائستہ!“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔ ممکن ہے میں آپ کو دوبارہ بھی زحمت دوں۔“

اس کے کمرے سے نکل کر میں اسپتال کے چیف سیکیورٹی آفیسر کی طرف جانے کا ارادہ کررہا تھا کہ پھر انور کی کال آگئی۔

”ہاں انور!“ میں نے کہا۔ ”کوئی خاص بات؟“

”تو اس وقت ہے کہاں؟“ انور نے پوچھا۔

”میں اس وقت اسپتال میں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔“

اس نے مجھے اس پی سی او کا نمبر ایس ایم ایس کردیا تھا جہاں سے اغوا کرنے والوں کی کال آئی تھی۔

میں نے اپنے ایک ماتحت انسپکٹر اقبال کو ٹیلی فون کیا اور اسے نمبر لکھوا کر ہدایت کی کہ مجھے فوری طور پر اس نمبر کے بارے میں تفصیلات چاہئیں۔ پھر میں نے کوریڈور کے گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ سے کہا۔ ”ابھی یہاں انور صاحب آئیں گے، انہیں چیف سیکیورٹی آفیسر کے آفس میں بھیج دینا۔ میں وہیں جارہا ہوں۔“

گارڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور میں اس سے چیف سیکیورٹی آفیسر کے آفس کا پتا پوچھ کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

چیف سیکیورٹی آفیسر تقریباً پینتالیس سال کا چاق و چوبند شخص تھا۔ وہ سابق آرمی آفیسر تھا اور میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ اس نے بہت خندہ پیشانی سے میرا استقبال کیا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ایس ایس پی کمال!“

”میں جمشید... میجر ریٹائرڈ جمشید علی خان۔“ اس نے اپنے مضبوط ہاتھ میں میرا ہاتھ تھام لیا۔

”میجر صاحب!“ میں نے کہا۔ ”آپ ذرا تفصیل سے مجھے یہاں کی سیکیورٹی کے بارے میں بتایئے۔“

”میں ایس ایس پی ظفر کو سب کچھ تفصیل سے بتا چکا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ”انہوں نے آدھے گھنٹے تک میرا بیان لیا تھا اور وہ سب کچھ فائل میں موجود ہوگا۔“

”میں اس کا کیا مطلب لوں؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میجر صاحب! آپ تو خود سیکیورٹی کے آدمی ہیں، پاکستان آرمی میں رہ چکے ہیں۔ کیا میں اب آپ سے کچھ نہیں پوچھ سکتا؟“

”ایس ایس پی صاحب!“ جمشید نے کہا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں ایک ایک آدمی کو بیٹھ کر اپنا بیان دے سکوں۔“

”گویا آپ مجھ سے تعاون کے لیے تیار نہیں ہیں؟“ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں اپنے بیان میں کہہ چکا ہوں۔ اب میرے پاس کوئی نئی بات نہیں ہے بتانے کو۔“ میجر کا لہجہ سرد تھا۔

میں نے حسب معمول ٹیپ ریکارڈر آن کردیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میجر صاحب! یہ بتایئے کہ جس وقت اغوا کی یہ واردات ہوئی اس وقت آپ کہاں تھے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ اغوا کی واردات کب ہوئی۔ مجھے کیا کسی کو بھی معلوم نہیں ہے پھر میں کیسے بتا سکتا ہوں کہ اس وقت میں کہاں تھا؟“

”میجر صاحب! آپ اتنے بڑے اسپتال کے چیف سیکیورٹی آفیسر ہیں۔ آپ کے انتظامات تو فول پروف ہونا چاہئیں۔ چلیں یہی بتا دیں کہ جب آپ کو اس واردات کا علم ہوا، اس وقت آپ کہاں تھے؟“

”میں سب کچھ اپنے بیان میں بتا چکا ہوں۔“ میجر نے ڈھٹائی سے کہا۔

”میجر صاحب! آپ اگر سیدھی طرح میری باتوں کا جواب نہیں دیں گے تو مجبوراً آپ کو پولیس اسٹیشن لے جانا پڑے گا۔ پھر آپ کے پاس وقت ہی وقت ہوگا۔“

”کون لے جائے گا مجھے پولیس اسٹیشن؟“ میجر مجھ سے اکھڑ گیا۔ ”میرے ایک ٹیلی فون پر آپ کی ملازمت چلی جائے گی۔“ میجر نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تو پھر ٹھیک ہے، آپ پولیس اسٹیشن جا کر ایک نہیں دس ٹیلی فون کیجیے گا۔“

”کیا آپ مجھے اریسٹ کررہے ہیں؟“ میجر نے بھنّا کر پوچھا۔

”ابھی تو گرفتار نہیں کررہا ہوں لیکن اگر آپ شرافت سے پولیس اسٹیشن نہ چلے تو مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“

میجر نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنا چاہا لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے ریسیور اور فون چھین لیا بلکہ جھٹکے سے اس کا تار ٹیلی فون سیٹ سے علیحدہ کرکے اسے ایک طرف پھینک دیا۔

”لگتا ہے، پولیس کی ملازمت سے آپ کا دل بھر گیا ہے۔“ میجر بھجر کر بولا اور اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔

میں نے جھپٹ کر سیل فون بھی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”ابھی نہیں میجر صاحب! آپ پولیس اسٹیشن جا کر دس ٹیلی فون کر لیجیے گا۔“ اسپتال میں پولیس کے دو سپاہی بھی موجود تھے۔ میں نے انٹرنل ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا۔ ”مجھے پرائیویٹ ونگ کے ڈیوٹی ڈاکٹر سے بات کرنی ہے۔“ فوراً ہی گھنٹی بجی اور کسی نے ریسیور اٹھا لیا۔ ”پرائیویٹ ونگ سر!“

”دیکھیے، میں ایس ایس پی کمال بول رہا ہوں۔ وہاں پولیس کے دو کانسٹیبل موجود ہوں گے۔ ان میں سے کسی ایک کو چیف سیکیورٹی آفیسر کے آفس میں بھیج دیں۔“

پھر پولیس کانسٹیبل اور انور ایک ساتھ وہاں پہنچے۔

انور نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ”تو یہیں اسپتال میں موجود ہے اور...“

میں نے اشارے سے اسے بولنے سے روک دیا۔ پھر میں پولیس کے سپاہی سے مخاطب ہوا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”صغیر احمد سر!“ سپاہی نے جواب دیا۔

”صغیر! یہ میجر صاحب اب تمہاری تحویل میں ہیں۔ یہ اس کمرے سے باہر نہ جانے پائیں، کسی کو ٹیلی فون کرنا چاہیں تو وہ بھی مت کرنے دینا۔ زیادہ ہٹ دھرمی دکھائیں تو تم خود جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔“

”یس سر!“ کانسٹیبل نے مستعدی سے کہا۔

”کوئی اس کمرے میں آنا چاہے تو اسے آنے بھی مت دینا۔“ یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا اور انور سے پوچھا۔ ”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“

”کمال! ان لوگوں نے پھر ٹیلی فون کیا تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے سیل فون استعمال کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ اگر چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا تو وہ بچے کو ہلاک کردیں گے۔“ پھر وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ”کمال! اب تو ہی بتا میں اتنی بڑی رقم اتنی جلدی کہاں سے لا سکتا ہوں؟“

”مجھے وہ سیل نمبر دے جس سے انہوں نے کال کی تھی... اور تو پریشان مت ہو۔ چوبیس گھنٹے بہت ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میں اس سے پہلے ہی ان کی گردن دبوچ لوں گا۔“

”کیا تجھے کوئی کلیو ملا ہے؟“

”کلیو ملا ہے جب ہی تو کہہ رہا ہوں۔“ میں نے اسے تسلی دینے کو جھوٹ بولا حالانکہ میں ابھی تک اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔

اچانک اسپتال کے اسپیکرز پر آواز گونجی۔ ”ایس ایس پی کمال! آپ جہاں کہیں بھی ہیں اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے رابطہ کریں۔“

میں لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا اور پرائیویٹ ونگ کے استقبالیہ سے ایڈمنسٹریٹر کو ٹیلی فون کیا۔

”جی سر! فرمایئے، میں ایس ایس پی کمال بول رہا ہوں۔“

”ایس ایس پی صاحب!“ ایڈمنسٹریٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ میرے ہی آدمیوں کو ہراساں کرنے کی کوشش کررہے ہیں؟“

”میں نے کسی کو ہراساں نہیں کیا ہے اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ اسپتال کی انتظامیہ کی ذمے داری ہے۔ یہاں سے ایک بچہ اغوا ہوا ہے۔ آپ ہراساں کرنے کی بات کررہے ہیں۔ مجھے تو جس شخص پر بھی ذرا سا شبہ ہوگا، میں اسے درست کردوں گا۔“

”مسٹر آفیسر!“ ایڈمنسٹریٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ آپ کس سے بات کررہے ہیں؟“

”جی ہاں، بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں ابھی ہوم منسٹر سے بات کرتا ہوں۔ ضرورت پڑی تو صدر سے بھی بات کروں گا۔“

”آپ صدر امریکا سے بھی بات کریں تو مناسب رہے گا لیکن مجھے میرا کام کرنے دیں۔ آپ کے اسپتال سے ایک بچہ اغوا ہوا ہے اور آپ میرے کام میں مداخلت کررہے ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

پھر میں نے انسپکٹر اقبال کو ٹیلی فون کیا اور اس سے پوچھا۔ ”ہاں اقبال! کیا رپورٹ ہے؟“

”سر! وہ نمبر کورنگی کے کسی پی سی او کا ہے۔“ اقبال نے کہا۔ ”میرے آدمی ابھی اس پی سی او کی لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔“

”ابھی تک کوشش کررہے ہیں؟“ میں بھنّا کر بولا۔ ”انسپکٹر رحمان سے کہو کہ وہ مجھ سے بات کرے۔“

”اوکے سر!“ اقبال نے کہا۔

میں نے رابطہ منقطع کردیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اغوا کرنے والوں تک کیسے پہنچوں؟ ابھی تک دو افراد پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ اس اغوا میں ملوث ہوسکتے ہیں۔ بھولی بھالی صورت والی ڈاکٹر شائستہ اور چیف سیکیورٹی آفیسر میجر جمشید... یہ دونوں ہی مجھ سے تعاون نہیں کررہے تھے۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ اگر اب بھی ان لوگوں نے میرے ساتھ تعاون نہ کیا تو میں ان لوگوں کو گرفتار کرلوں گا۔ ڈائریکٹر جنرل صاحب کا

www.pkdigest.com

خصوصی اجازت نامہ میری جیب میں تھا۔ اس اجازت نامے کے لامحدود اختیارات کے تحت میں شبہے میں کسی کو بھی گرفتار کر سکتا تھا۔

"یار انور! تو جا کر بھابی کے پاس بیٹھ۔ وہ بھی بہت پریشان ہو رہی ہیں۔"

"کہیں تو نے مریم کو کچھ بتا تو نہیں دیا؟" انور نے چونک کر پوچھا۔

"میں نے ابھی تک تو انہیں کچھ نہیں بتایا ہے لیکن ہم لوگ آخر کب تک ان سے یہ خبر چھپا سکتے ہیں؟"

"چوبیس گھنٹے تک تو چھپا ہی سکتے ہیں۔" انور نے کہا۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تو بھابی کے پاس جا کر بیٹھ۔ وہ بے چاری بہت بور ہو رہی ہیں۔ ان کے کمرے سے ٹی وی ہٹا دیا گیا ہے۔ کوئی اخبار ان تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ وہ بور تو ہوں گی۔"

"اچھا، میں مریم کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں۔" یہ کہہ کر انور، بھابی کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اسی وقت مجھے انسپکٹر رحمان کی کال موصول ہوئی۔

"یس سر! آپ نے ٹیلی فون کرنے کو کہا تھا۔"

رحمان ہمارے محکمے میں آئی ٹی کا انچارج تھا۔ وہ کمپیوٹر کا بھی ماہر تھا۔ وہ اتنا ماہر تھا کہ اگر وہ پولیس فورس جوائن نہ کرتا تو یقینی طور پر ہیکر ہوتا۔ وہ کسی بھی ویب سائٹ میں بہت آسانی سے گھس جاتا ہے۔

"انسپکٹر! میں آپ کو کچھ ٹیلی فون نمبرز لکھوا رہا ہوں۔ ان میں پی ٹی سی ایل نمبر بھی ہیں اور سیل نمبر بھی۔ ان نمبروں پر کی جانے والی ہر کال آپ کو ٹریس کرنی ہے۔ یہ تمام نمبرز ٹریکنگ پر لگا دیں اور ان پر ہونے والی گفتگو ریکارڈ بھی ہونی چاہیے۔"

پھر میں نے اسے انور کے گھر، انکل کے آفس اور ان کے تمام سیل نمبرز لکھوا دیے۔ میں نے انور کے گھر کے نمبروں اور سیل نمبروں کو ٹریس کرنے کی خاص طور پر ہدایت کی۔

"او کے سر!" انسپکٹر رحمان نے جواب دیا۔ "میں دس منٹ کے اندر اندر سارا انتظام کر کے آپ کو رپورٹ دیتا ہوں۔"

"لیکن بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے انسپکٹر! کمپیوٹر روم میں کوئی غیر متعلقہ آدمی جانے نہ پائے۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں بھی کالی بھیڑیں ہیں اور کچھ زیادہ ہی ہیں۔"

"آپ فکر مت کریں سر! کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی کہ میں کیا کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد میں نے انسپکٹر اقبال کو فون کیا اور کہا۔

"میں تمہیں شاہ فیصل کالونی کا ایک ایڈریس دے رہا ہوں۔ وہاں جا کر معلوم کرو کہ وہاں کون رہتا ہے اور ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟" پھر میں نے اسے ڈاکٹر شائستہ کا ایڈریس لکھوا دیا اور ہدایت کر دی کہ یہ کام بہت راز داری سے ہونا چاہیے۔ "چاہو تو سب انسپکٹر راحیلہ کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو لیکن سادہ کپڑوں میں۔"

وہاں سے فارغ ہو کر میں ایک دفعہ پھر چیف سیکیورٹی آفیسر کے آفس میں پہنچا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ سپاہی صغیر نے اسے کرسی سے ہلنے بھی نہیں دیا تھا کیونکہ صغیر نے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

"سر! یہ مسلسل مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ اگر یہ تھانے میں ہوتا تو میں اسے بتاتا کہ گالیاں کیسے بکتے ہیں۔"

"دیکھو آفیسر! میں ایک باعزت شہری ہوں۔ میں پولیس پر ہتک عزت کا دعویٰ ضرور دائر کروں گا۔"

کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنا خفیہ ٹیپ ریکارڈر آن کر لیا تھا۔

"باعزت اور قانون پسند شہری پولیس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ تو تعاون کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہیں۔ ورنہ اتنی دیر میں تو آپ دس دفعہ اسپتال کی سیکیورٹی کی تفصیلات بتا چکے ہوتے۔"

پھر میں نے سیل فون پر علاقے کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کیا اور انچارج سے کہا۔ "پولیس اسٹیشن سے ایک موبائل وین اور چار کانسٹیبل اسپتال بھیج دو۔" میں میجر سے مخاطب ہوا۔ "اگر آپ کا وقت قیمتی ہے تو ہمارا وقت بھی قیمتی ہے۔ میں نے پولیس موبائل بلائی ہے۔ اگر آپ نے یہاں میرے سوالوں کا جواب نہ دیا تو پولیس اسٹیشن جا کر دیں گے۔"

"میں سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔" میجر نے زچ ہو کر کہا۔ "اب آپ مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں؟"

"اسپتال کی سیکیورٹی کے کیا انتظامات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"لوگ اسپتال کی حدود میں تو داخل ہو سکتے ہیں لیکن ملاقات کا ٹائم نہ ہو تو وارڈز میں نہیں جا سکتے۔" میجر نے جواب دیا۔

"اس وقت تو ملاقات کے اوقات نہیں ہیں لیکن پرائیویٹ ونگ میں اس وقت بھی باہر کے لوگ موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"پرائیویٹ ونگ میں اتنی سختی نہیں کی جاتی ہے۔" میجر نے جواب دیا۔ "ہاں، وہاں بھی آئی سی یو یا آئی سی سی یو

میں کوئی غیر متعلقہ شخص داخل نہیں ہو سکتا۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ پرائیویٹ ونگ میں جس کا دل چاہے، وہ منہ اٹھا کر چلا آئے۔ یہ کیسی سیکیورٹی ہے؟"

"ہمیں یہی ہدایات ہیں۔" میجر نے کہا۔ "اس سلسلے میں اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر صاحب سے بات کریں۔"

"اس رات ڈیوٹی پر کون کون تھا؟" میں نے پوچھا۔ "آپ ان سب لوگوں کو یہاں بلا لیں۔"

"اس کے لیے مجھے ریکارڈ دیکھنا پڑے گا۔" میجر نے کہا۔ "پھر نائٹ شفٹ والے گارڈز تو اس وقت موجود بھی نہیں ہوں گے۔ وہ لوگ دس بجے آ کر چارج لیتے ہیں۔"

"ان کے ایڈریس اور سیل نمبر تو آپ کے پاس ہوں گے۔ وہ یہاں موجود نہیں ہیں تو گھروں سے انہیں بلائیں۔"

"آپ اس موت کے فرشتے کو تو میرے سر سے ہٹائیں۔ اس نے تو مجھے پانی تک نہیں پینے دیا۔"

"صغیر! تم باہر جاؤ۔" میں نے کہا۔ "میجر صاحب قانون پسند شہری ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ تعاون بھی کر رہے ہیں۔"

صغیر کے جاتے ہی میجر نے اپنا پی سی آن کیا اور اس میں مصروف ہو گیا۔

میں نے جب اس کے ہاتھ سے ریسیور چھینا تھا تو اس کا تار بھی ٹوٹ گیا تھا۔ "آپ اپنے ٹیلی فون کو درست کرا لیں۔"

"میرے پاس ایک دوسرا اسیٹ موجود ہے۔" میجر نے کہا۔

"سوری میجر! میں اس سلوک کی معافی چاہتا ہوں۔ اصل میں مجھ پر بھی ہوم منسٹر اور اپنے افسروں کا بہت پریشر ہے۔ آپ ان لوگوں کو بلائیں، میں اس وقت تک اسپتال کے دوسرے اسٹاف سے بات کر کے آتا ہوں۔"

میں وہاں سے میٹرن کے آفس پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی خرانٹ قسم کی ادھیڑ عمر عورت ہو گی لیکن وہ تو بہت جاذب نظر اور اسمارٹ خاتون تھی۔ اسے لڑکی تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی۔ وہاں میں نے خاص طور پر ایک بات نوٹ کی کہ اسپتال کی تقریباً تمام نرسیں خوب صورت اور زندگی سے بھرپور تھیں۔ ان کے یونیفارم بھی بے داغ تھے اور چہروں پر بھی وہ کرختگی نہیں تھی جو سرکاری اسپتالوں کی نرسوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اس نے مترنم لہجے میں کہا۔ "یس!"

میں کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ میرے استقبال کے لیے کھڑی ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔ "تشریف رکھیں آفیسر!"

میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ "میڈم... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے صرف یہ بتائیے کہ جس وقت بچہ اغوا ہوا ہے، اس وقت ڈیوٹی پر کون کون تھا؟"

وہ کرسی گھما کر کمپیوٹر کی طرف مڑی اور ایک منٹ بعد بولی۔

"میں نام لے رہی ہوں، آپ نوٹ کر لیں۔"

"آپ نام بتائیں میرا ذہن بھی کمپیوٹر ہے۔" میں نے کہا کیونکہ میں اپنا خفیہ ٹیپ ریکارڈر آن کر چکا تھا۔

"اس دن سسٹر روبی، سسٹر جوئی، سسٹر نجمہ اور سسٹر شمسہ کے علاوہ میں بھی ڈیوٹی پر تھی۔ لوئر اسٹاف میں سوئپر یونس، سوئپر ڈینئیل، حمیدہ اور زینت ڈیوٹی پر تھیں۔"

"کیا آپ ان سب لوگوں کو بلا سکتی ہیں؟"

اس نے بھی وہی جواب دیا جو میجر جمشید نے دیا تھا کہ یہ لوگ رات کے دس بجے چارج لیتے ہیں۔ میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ آپ ان لوگوں کو گھروں سے بلا لیں۔ آپ کے پاس ان سب لوگوں کے ایڈریس یا ٹیلی فون نمبرز تو ہوں گے۔

"میں ابھی ان سب کو کال کرتی ہوں۔"

اس نے ٹیلی فون کر کے باری باری ان سب کو کال کر لیا اور بولی۔ "یہ سب لوگ ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"دیکھیے، میں اپنی پریشانی میں آپ کا نام پوچھنا بھی بھول گیا۔" میں نے کہا۔

"میرا نام شاہینہ ہے۔ میں گزشتہ دس سال سے اس اسپتال میں ہوں۔"

"آپ کو کب معلوم ہوا کہ بیگ صاحب کا بچہ اغوا ہو چکا ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر نسرین راؤنڈ پر تھیں۔ انہوں نے مسز بیگ کا چیک اپ کیا، انہیں انجکشن دیا۔ اس وقت تک بچہ وہاں موجود تھا۔ شاید دس یا پندرہ منٹ بعد سسٹر روبی کو خیال آیا کہ اس نے بچے کو فیڈ نہیں کرایا ہے۔ مسز بیگ تو اس کنڈیشن میں نہیں تھیں کہ بچے کو فیڈ کرا سکتیں۔ روبی کمرے میں پہنچی تو بچے کا کاٹ خالی تھا۔ اس نے سوچا شاید بچہ نیچے گر گیا ہے لیکن اتنا چھوٹا بچہ کروٹ بھی نہیں لے سکتا، وہ نیچے کیسے گر سکتا تھا۔ اس نے پورے کمرے کی تلاشی لی، پھر احتیاطاً نرسری کا ایک چکر بھی لگایا کہ ممکن ہے ڈاکٹر نسرین نے بچے کو نرسری میں بھجوا دیا ہو۔ بچہ وہاں بھی نہیں تھا۔ روبی نے مجھے آ کر بتایا کہ بیگ صاحب کا بچہ غائب ہے۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"میں نے اسی وقت اسسٹنٹ سیکیورٹی آفیسر کیپٹن علی کو اطلاع دی کہ اسپتال سے ایک بچہ غائب ہوگیا ہے۔ کیپٹن علی نے اسی وقت اسپتال کے تمام دروازے سیل کرادیے۔ پرائیویٹ ونگ کے گارڈز نے بتایا کہ دس بجے کے بعد پرائیویٹ ونگ کا صرف بھی ایک دروازہ کھلا ہوتا ہے۔ بچے لے کر کوئی بھی یہاں سے نہیں گیا۔"

"تھینک یو مس شاہینہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔

"مسز شاہینہ!" اس نے مسکرا کر میری تصحیح کی۔ "مسز شاہینہ اکبر!"

"سوری مس... میرا مطلب ہے مسز شاہینہ اکبر!" میں نے مسکرا کر کہا اور باہر نکل گیا۔

میں ٹہلتا ہوا گارڈ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا۔ "کیپٹن علی اس وقت کہاں ہوں گے؟"

"ان کی نائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے سر!" ایک گارڈ نے جواب دیا۔

میں نے استقبالیہ سے میجر جمشید کو ٹیلی فون کیا اور کہا۔ "میجر صاحب! میں ایس ایس پی کمال بول رہا ہوں۔ مجھے کیپٹن علی کا سیل نمبر چاہیے۔"

"میں نے کیپٹن علی کو کال کرلیا ہے۔" میجر نے کہا۔ "وہ بھی آنے ہی والے ہوں گے۔ ویسے آپ ان کا سیل نمبر نوٹ کرلیں۔"

میں نے جیب سے دوسرا سیل فون نکالا اور کیپٹن علی کا نمبر اس میں نوٹ کرلیا۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے صبح سے ایک سلائس اور کافی کے ایک کپ کے سوا کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ ہاں، ایک دو مرتبہ چائے ضرور پی تھی۔

میں کیفے ٹیریا میں چلا گیا۔ وہاں سیلف سروس کا سسٹم تھا۔ میں نے اپنے لیے چکن روسٹ اور کولڈ ڈرنک لی اور میز پر آگیا۔ اس وقت کیفے ٹیریا میں اچھا خاصا رش تھا کیونکہ ملاقات کا وقت تھا اور مریضوں کے لواحقین وہاں یوں کھا پی رہے تھے جیسے مریض کی عیادت کو نہ آئے ہوں، پکنک پر آئے ہوں۔

میں میز پر بیٹھا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف انسپکٹر رحمان تھا۔

"ہاں رحمان!" میں نے کہا۔ "کوئی خاص خبر؟"

"سر! ابھی ابھی اغوا کرنے والوں نے انور صاحب کے سیل فون پر کال کی ہے۔ یہ کال کسی تیسرے نمبر سے کی گئی ہے۔ میں نے ٹریکنگ کے بعد معلوم کرلیا ہے کہ ملزمان اس وقت کورنگی کے علاقے میں موجود ہیں۔ انہوں نے پی سی او سے جو کال کی تھی، وہ بھی کورنگی ہی کے علاقے سے کی تھی۔"

"ویری گڈ۔" میں نے کہا۔ "اپنا کام جاری رکھو۔ اگر اب بھی کورنگی کے علاقے سے کال کی جائے تو پھر کنفرم ہو جائے گا کہ ملزمان اسی علاقے میں موجود ہیں۔ پھر انہیں ٹریس کرنا زیادہ آسان ہوگا۔"

"سر! آسان نہیں بلکہ ہم ملزمان کے سر پر جا پہنچیں گے۔ بس ان کی مزید ایک کال کا انتظار ہے۔"

"او کے انسپکٹر رحمان! وش یو گڈ لک۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور سیل فون جیب میں رکھ کر کھانے میں مصروف ہوگیا۔

اچانک میری نظر اپنی دائیں جانب کی میز پر بیٹھے ہوئے شخص پر پڑی۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا لیکن جب میں نے اسے دیکھا تو اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے، یہ مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہو چکا تھا اس لیے اب سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ میں عادی سگریٹ نوش نہیں ہوں لیکن کھانے کے بعد عموماً سگریٹ پی لیتا ہوں۔ وہاں سگریٹ نوشی منع تھی۔

میں اسپتال کی چھت پر چلا گیا۔ وہاں ایک دو آدمی پہلے ہی سگریٹ نوشی کر رہے تھے۔ اچانک میری نظر اس آدمی پر پڑی جو مجھے کیفے ٹیریا میں نظر آیا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ کسی سے سیل فون پر بات کر رہا تھا۔ میں غیر محسوس انداز میں اس کے مزید نزدیک ہوگیا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس پر شبہ ہوگیا تھا۔

وہ سیل فون پر کسی سے کہہ رہا تھا۔ "اب تم لوگ کورنگی کے علاقے سے ٹیلی فون مت کرنا۔ اس حرامزادے نے معلوم کرلیا ہے کہ تم لوگ کورنگی میں موجود ہو... یا تو اپنا ٹھکانا بدل دو یا پھر ٹیلی فون کرنا ہو تو کہیں دور... جا کر کرو۔"

اس کی بات سن کر میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ گویا وہ بھی اغوا کنندگان کا ساتھی تھا۔

میں نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی۔

وہ تڑپ کر پلٹا اور مجھے سامنے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا۔

"سس... سر... مجھ سے کیا قصور سرزد ہوگیا ہے جو آپ...؟"

"قصور کے بچے۔" میں نے اس کی گردن چھوڑ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا۔ "میں تجھے بتاؤں گا کہ تجھ سے

کیا قصور سرزد ہوا ہے تو مجھے گالیاں دے رہا تھا۔"

وہ چند لمحے تک مجھے دیکھتا رہا پھر اچانک وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ تو گویا چھلاوا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اترنے کے بجائے اس چکنی دیوار پر سلائڈنگ کرتا ہوا تیزی سے نیچے چلا گیا جو حفاظت کے لیے سیڑھیوں کے دونوں اطراف۔۔۔۔ بنائی جاتی ہیں۔ وہ اس چکنی گر پر زناٹے سے نکل گیا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور میجر جمشید کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ "میجر! ابھی ابھی ایک مشتبہ شخص مجھ سے بچ کر بھاگا ہے۔ میں نے سیل فون پر اسے بات کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ اغوا کرنے والوں کا ساتھی ہے۔ آپ اپنے گارڈز کو الرٹ کر دیں کہ وہ کسی بھی مشتبہ شخص کو نکلنے نہ دیں۔"

"اس کا حلیہ کیا ہے؟" میجر نے پوچھا۔

"وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ہے۔ سر کے بال لمبے ہیں جو اس کی گردن تک آ رہے ہیں۔ وہ دبلا پتلا آدمی ہے، عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ ٹی شرٹ کا رنگ وائٹ ہے اور اس پر نیلی دھاریاں ہیں۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" میجر نے کہا۔ "اس وقت لوگ مریضوں سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ اس بھیڑ بھاڑ میں اسے پکڑنا مشکل ہے۔ پھر کیا ضروری ہے کہ وہ فوری طور پر باہر نکلنے کی کوشش کرے۔ وہ اسپتال کے اندر ہی کہیں چھپ سکتا ہے۔"

میجر کی بات درست تھی۔ اس لباس اور حلیے کے بہت سے لوگ وہاں تھے۔ ایسے میں اسے پکڑنا ایسا ہی تھا جیسے بھوسے میں سوئی تلاش کرنا۔

میں اس کی تلاش میں نیچے تک گیا لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے ایک ایک فلور چھان مارا۔ وارڈز میں بھی جھانک کر دیکھ لیا لیکن مجھے وہ آدمی نظر نہیں آیا۔

اسی وقت مجھے انور نظر آیا۔ وہ بہت جھلایا ہوا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ "میں گزشتہ بیس پچیس منٹ سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ تم آخر تھے کہاں؟"

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر انسپکٹر رحمان کا نام تھا۔

"ہاں انسپکٹر رحمان!" میں نے پوچھا۔ "کوئی پیش رفت؟"

"سر! ان لوگوں نے ابھی پھر انور صاحب کے موبائل پر کال کی تھی۔ نمبر اس دفعہ بھی نیا تھا لیکن اس مرتبہ انہوں نے شاہ فیصل کالونی یا اس کے کسی قریبی علاقے سے کال کی تھی۔ لگتا ہے ان لوگوں کو بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم ٹریکنگ کے ذریعے ان تک پہنچ سکتے ہیں۔۔۔ لیکن سر! میں آج انہیں ہر قیمت پر ٹریس کر لوں گا۔"

"او کے انسپکٹر! آپ اپنا کام جاری رکھیں۔" پھر میں انور سے مخاطب ہوا۔ "کیا ہوا؟ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"ان لوگوں نے پھر کال کی تھی اور دھمکی دی ہے کہ پولیس کا چکر چھوڑو اور رقم کا بندوبست کرو۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ تم ہماری کال ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اب اگر ایسا ہوا تو پھر تم سے کوئی ڈیل نہیں ہوگی۔ ہاں، چوبیس گھنٹوں میں سے پانچ گھنٹے گزر چکے ہیں اور تم ابھی تک اسپتال میں بیوی کے سرہانے بیٹھے ہو۔ یہ مت سمجھنا کہ ہم محض دھمکی دے رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا جب تمہیں اپنے نوزائیدہ بچے کی لاش کسی کوڑے کے ڈھیر پر ملے گی۔ ہاں، لاش وہاں پھینکنے سے پہلے ہم تمہیں اطلاع ضرور دیں گے تاکہ اس کی لاش کو آوارہ کتے اور بلیاں نہ کھا سکیں۔ بس اب وہاں سے نکلو اور رقم کا بندوبست کرو۔"

"رقم کا بندوبست میرے والد کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن دس کروڑ بہت زیادہ ہیں۔ تم اس میں کچھ کمی بیشی نہیں کر سکتے؟"

"اس میں بیشی تو ہو سکتی ہے کمی نہیں مسٹر انور۔" بولنے والے نے کہا۔ "ہم ایک گھنٹے بعد پھر کال کریں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ رقم کہاں اور کیسے پہنچانا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تو پریشان کیوں ہو رہا ہے؟ ابھی انیس گھنٹے باقی ہیں۔ میں ان لوگوں کے گرد اپنا گھیرا تنگ کر رہا ہوں اور انیس گھنٹے سے پہلے ہی یاسر تیرے پاس ہوگا۔"

"یار کمال! کیوں مجھے جھوٹی تسلیاں دے رہا ہے۔ مجھے صاف صاف بتا کہ تجھے ابھی تک ان لوگوں کا کوئی سراغ بھی ملا ہے یا نہیں؟"

"تو کیا سمجھتا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں تجھے جھوٹی تسلیاں دوں گا۔ تجھے دھوکا دینے کا مطلب ہے کہ خود کو دھوکا دینا۔ تو کیا سمجھتا ہے، یاسر صرف تیرا ہی بیٹا ہے۔ مجھے بھی اس کی اتنی ہی فکر ہے۔ ہاں، اگر تجھے مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو تو کیس کسی اور قابل اور ذہین افسر کو دلوا دے۔"

"یار کمال! تو تو بات بات پر عورتوں کی طرح روٹھ جاتا ہے۔ مجھے تیری صلاحیتوں پر بھی اعتماد ہے اور ذہانت پر

بھی۔ بس ان لوگوں کی باتیں سن کر میں جھنجلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔"

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجی۔ میجر جمشید کا فون تھا۔ اس نے بتایا۔ "گارڈز نے آپ کے بتائے ہوئے حلیے کے دو آدمیوں کو پکڑ لیا ہے۔ آپ آ کر ان کی شناخت کر لیں اور ہاں۔۔۔ رات کی ڈیوٹی والا تمام اسٹاف پہنچ چکا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔"

میں میجر جمشید کے آفس۔۔۔۔۔ پہنچا تو کوریڈور میں نو آدمی کھڑے تھے۔ میں ان لوگوں پر کوئی توجہ دیے بغیر میجر کے آفس میں داخل ہو گیا۔

"آئیے ایس ایس پی صاحب!" میجر نے مسکرا کر کہا۔ "رات کی ڈیوٹی والا تمام اسٹاف موجود ہے۔"

"میں ان لوگوں سے بعد میں بات کروں گا، پہلے مجھے وہ آدمی دکھائیں جنھیں آپ کے گارڈز نے پکڑا ہے۔"

"آئیے میرے ساتھ۔" میجر نے کہا اور اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

پھر ہم لوگ کمرے سے باہر نکلے تو باہر کھڑے ہوئے گارڈز نے میجر کو سیلوٹ کیا۔ وہ ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا اسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مین گیٹ کے ساتھ گارڈز کا کمرا تھا۔ میجر کو دیکھ کر ایک گارڈ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں دو آدمی سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ ان دونوں میں سے کوئی بھی میرا مطلوبہ آدمی نہیں تھا۔

میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میجر صاحب! ان دونوں میں سے کوئی بھی میرا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔"

ان دونوں کے حلیے اس آدمی سے مختلف تھے۔ وہ دونوں خاصے دراز قد اور صحت مند تھے۔ ان دونوں نے جینز اور ٹی شرٹ ضرور پہن رکھی تھی لیکن ایک کی ٹی شرٹ بالکل پلین تھی، دوسرے کی ٹی شرٹ سیاہ تھی اور اس پر سفید دھاریاں تھیں۔ ان دونوں کے بال بھی بڑے تھے اور گردن تک آ رہے تھے لیکن وہ دونوں بے قصور تھے۔ میجر کے کہنے پر گارڈز نے ان دونوں کو چھوڑ دیا۔

وہ دونوں وہاں سے نکل کر ایسے بھاگے جیسے اگر وہ ایک لمحہ بھی رک گئے تو میجر کا ارادہ بدل جائے گا۔

وہاں سے میں دوبارہ میجر کے آفس میں آیا اور اس سے پوچھا۔ "اغوا کے وقت پرائیویٹ ونگ کے داخلی دروازے پر کون تھا؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رات دس بجے کے بعد اس ونگ کے دوسرے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، صرف ایک ہی دروازہ آمدورفت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ وہاں دو گارڈز ہوتے ہیں۔ میں انہی گارڈز سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"کیا میں انہیں یہیں بلا لوں؟" میجر نے پوچھا۔

"یہاں کوئی ایسا کمرا یا ایسی جگہ ہے جہاں میں ان سے پوچھ گچھ کر سکوں؟"

"جی ہاں، برابر والا کمرا میرے اسسٹنٹ کیپٹن علی کا ہے۔ میں علی کو یہاں بلا لیتا ہوں کیونکہ وہ بھی پہنچ چکے ہیں۔ آپ ان کے کمرے میں بیٹھ کر ان لوگوں سے بات چیت کر سکتے ہیں۔" میجر نے انٹرکام پر کیپٹن علی کو بلا لیا۔

کیپٹن علی خاصا چاق و چوبند، خوب رو اور اسمارٹ شخص تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے آرمی سے خود ہی ریٹائرمنٹ لی ہوگی کیونکہ اس کی عمر مشکل سے تیس، بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔

میجر جمشید نے اس سے میرا تعارف کرایا اور کہا۔ "ایس ایس پی صاحب ہمارے گارڈز سے کچھ تفتیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کا کمرا استعمال کریں گے، آپ اس وقت تک میرے ساتھ بیٹھیں۔"

"ضرور!" کیپٹن علی نے کہا۔ پھر وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور اپنی کرسی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیں۔"

"کیپٹن! سب سے پہلے ان دو گارڈز میں سے ایک کو بھیجیں جو اغوا کے وقت پرائیویٹ ونگ کے دروازے پر تھا۔" میں نے کہا اور کیپٹن کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

کیپٹن علی کے جانے کے بعد چاق و چوبند ایک جوان کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے زوردار انداز میں سیلوٹ کیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام اصغر ہے جی۔۔۔ میں اس سے پہلے وائٹا کمک سیکیورٹی ایجنسی میں تھا۔ گزشتہ تین سال سے یہاں ہوں۔"

"اس رات پرائیویٹ ونگ میں کون کون آیا تھا، کچھ یاد ہے تمہیں؟"

اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس رات روم نمبر 207 میں ایک مریض آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو خواتین بھی تھیں۔ پھر روم نمبر 211 میں ایک مریضہ آئی۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔"

"اور؟" میں نے پوچھا۔ "ذہن پر زور دو۔ مریضوں اور ان کے لواحقین کے علاوہ اسٹاف میں سے بھی تو کوئی آیا ہوگا؟"

www.pkdigest.com

''ان کے علاوہ روم نمبر 215 میں مسز انور بیگ کے پاس انور صاحب کی والدہ اور ان کے بھائی بھی آئے تھے۔ ہاں، ڈاکٹر شائستہ بھی آئی تھیں اور سسٹر روبی بھی۔''

''اور واپس کون کس وقت گیا؟''

''روم نمبر 207 میں جو مریض آیا تھا، اس کے ساتھ آنے والی خواتین تقریباً آدھے گھنٹے بعد چلی گئی تھیں۔ روم نمبر 211 کی مریضہ کے ساتھ آنے والا نوجوان بھی فوراً ہی چلا گیا تھا۔'' اصغر کی یادداشت واقعی بہت اچھی تھی۔

''جو خواتین واپس گئیں، ان کے ساتھ کوئی بچہ بھی تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں صاحب!'' وہ دونوں خالی ہاتھ تھیں۔ ان کے پاس صرف ان کے پرس تھے۔ نوجوان بھی خالی ہاتھ گیا تھا۔''

''ڈاکٹر شائستہ واپس گئی تھیں یا...؟''

''ڈاکٹر شائستہ ڈیوٹی پر تھیں۔ وہ آنے کے بعد ایک مرتبہ باہر نکلی تھیں اور موبائل فون پر دیر تک کسی سے بات کرتی رہی تھیں، پھر وہ مجھ سے بولیں کہ میں کیفے ٹیریا تک جارہی ہوں۔''

''کیا وہ یا دوسرے ڈاکٹرز ہمیشہ تمہیں اطلاع دے کر جاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیشہ تو نہیں۔'' اصغر نے جواب دیا۔ ''لیکن اگر کوئی ایمرجنسی کیس ہو یا کوئی آپریشن ہو تو ڈاکٹر عموماً ہمیں بتا کر جاتے ہیں تاکہ ان کی ضرورت پڑے تو ہم انہیں فوری طور پر اطلاع دے سکیں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں، حمیدہ بھی دو دفعہ آئی تھی۔ ایک دفعہ سوا دس بجے کے قریب اور دوسری دفعہ تقریباً بارہ بجے کے قریب۔''

''واپسی میں اس کے ہاتھ میں کچھ تھا یا وہ بھی خالی ہاتھ تھی؟''

''وہ آئی تو خالی ہاتھ تھی لیکن دوسری دفعہ جب وہ واپس گئی تو اس کے ہاتھ میں بڑی سی ایک بالٹی تھی یا آپ اسے ڈسٹ بن بھی کہہ سکتے ہیں۔''

میں چونک اٹھا۔ ''اس ڈسٹ بن کا سائز کیا تھا؟''

''اچھا خاصا بڑا ڈسٹ بن تھا صاحب!'' اصغر نے جواب دیا۔

''اس ڈسٹ بن میں کوئی نوزائیدہ بچہ آسکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں تو دو تین سال کا بچہ بھی آسانی سے چھپ سکتا ہے۔''

''اور کوئی خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے اور تو کوئی خاص بات یاد نہیں آرہی۔ ہاں، جب حمیدہ ڈسٹ بن لے کر باہر نکل رہی تھی تو ڈاکٹر شائستہ واپس آرہی تھیں۔ انہوں نے رک کر حمیدہ سے کچھ بات بھی کی تھی۔ پھر وہ دونوں مسکراتی ہوئی چلی گئی تھیں۔''

''ٹھیک ہے تم جاؤ اور تمہارے ساتھ اس روز جو گارڈ تھا اسے یہاں بھیج دو۔''

وہ مجھے سیلیوٹ کرکے چلا گیا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر انسپکٹر اقبال کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگایا اور بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔ ''ہاں اقبال! کیا رہا؟''

''اقبال تو اب دوسرے جہان کی سیر کررہا ہوگا ایس ایس پی صاحب!'' کوئی مکروہ آواز میں بولا۔

''تم ہو کون اور اقبال کہاں ہے؟''

''میں کون ہوں؟ یہ احمقانہ سوال ہے اور اقبال کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ وہ دوسرے جہان کی سیر کررہا ہے۔''

''تم نے مجھے ٹیلی فون کیوں کیا ہے؟''

''میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ آپ کی یہ جو ٹیم ہے جسے آپ ناقابلِ تسخیر کہتے ہیں، یہ میرے سامنے ریت کی دیوار ہے۔ آئندہ کوئی اقبال، فیض یا فراق میرے راستے میں نہ آئے۔''

''اوہو، تم تو مجھے پڑھے لکھے لگتے ہو۔ تم اقبال کے ساتھ ساتھ فیض اور فراق سے بھی واقف ہو... بھئی واہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میری تعریفیں چھوڑیں ایس ایس پی صاحب! اقبال کی فکر کریں۔ وہ شاہ فیصل کالونی کے ریلوے اسٹیشن پر پڑا ہے۔''

اسی وقت دوسرا گارڈ اندر داخل ہوا اور اس نے بھی مجھے زوردار سیلیوٹ کیا۔

میں نے اشارے سے اس کا جواب دیا اور سیل فون پر بولا۔ ''کیا تم نے اسے مار دیا؟''

''مارا تو نہیں ہے لیکن اب کوئی اقبال راستے میں آیا تو اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم آخر چاہتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔ اس دوران میں دوسرا سیل فون نکال کر میں نے رحمان کو ایس ایم ایس کر دیا کہ میرے نمبر کو ٹریک کرو۔ میں ابھی بات کررہا ہوں۔

میں جان بوجھ کر گفتگو کو طول دے رہا تھا۔

''واہ ایس پی صاحب!'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''ابھی تک آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اپنے دوست سے کہیں کہ وہ مقررہ مدت تک دس کروڑ روپے

کا بندوبست کرے۔''

''او بھائی، کچھ تو خیال کرو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بے چارہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائے گا؟''

''کہیں سے بھی لائے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور آپ بیچ میں سے ہٹ ہی جائیں تو بہتر ہے، ورنہ انور کے بیٹے کو مزید نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس وقت بھی اسے بخار ہے۔ مچھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کا حشر کر دیا ہے۔ پھر گرمی کی شدت! اُمیں کی چھتیں ہیں... وہ بھی جلتے ہوئے توے کی طرح تپتی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

لائن کٹتے ہی انسپکٹر رحمان کا ٹیلی فون آگیا اور وہ بولا۔ ''سر! یہ کال بھی کورنگی کے اسی علاقے سے کی گئی ہے جہاں سے پہلے کالز آتی رہی ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بالکل صحیح ٹریک پر جارہے ہیں۔ آپ اسی طرح کام کرتے رہیں انسپکٹر!''

میں نے آنے والے گارڈ سے کہا کہ تم ذرا باہر انتظار کرو، میں تمہیں ابھی بلواتا ہوں۔

مجھے اقبال کی فکر تھی۔ وہ ایسا تر نوالہ تو نہیں تھا کہ یوں آسانی سے مار کھا جاتا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ چاہے تو سب انسپکٹر راحیلہ کو بھی ساتھ لے جا سکتا ہے۔

میں نے سب انسپکٹر راحیلہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی کال موصول کی گئی اور راحیلہ کی آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم سر!''

''وعلیکم السلام... راحیلہ! آپ انسپکٹر اقبال کے ساتھ شاہ فیصل کالونی گئی تھیں؟''

''یس سر!'' اس نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو کال کرنے ہی والی تھی۔''

''انسپکٹر اقبال کہاں ہے؟''

''سر! ہم دونوں الگ الگ اس علاقے میں پہنچے تھے۔ یہ انسپکٹر صاحب ہی کی تجویز تھی۔''

''میں پوچھ رہا ہوں کہ اقبال کہاں ہے؟'' میں نے جھنجلا کر اسے جھڑک دیا۔

''سر! میں وہی بتانے کی کوشش کررہی ہوں۔ واپسی پر بھی ہم لوگ الگ الگ تھے۔ انسپکٹر اقبال اپنی بائیک کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک دو لڑکے بائیک پر آکر ان کے پاس رکے اور کچھ کہا۔ ان دونوں کے چہرے ہیلمٹ میں چھپے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے پسٹل کی جھلک نظر آئی۔

''انسپکٹر اقبال نے شانے اچکائے اور اپنا پرس اور موبائل نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے موٹر سائیکل سوار نے جیسے ہی انسپکٹر کا پرس اور سیل فون لینے کی کوشش کی، انسپکٹر نے بائیک چلانے والے کے سینے پر زوردار لات رسید کر دی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا۔ بائیک چلانے والا اچھل کر بائیں جانب گرا۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے بیٹھا ہوا شخص بھی گر گیا۔ آگے والے میں تو مقابلے کی سکت ہی نہیں تھی۔ پیچھے والا اٹھ کر بھاگا تو اقبال صاحب نے جھپٹ کر اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ ان کے ہاتھ میں آبھی گیا۔ اقبال صاحب نے اس سے اپنا پرس اور سیل فون واپس مانگا۔ اس نے جیب سے اقبال صاحب کا پرس نکال کر دیا، پھر اچانک دوڑ لگا دی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ اقبال صاحب بھی حیران رہ گئے۔ انہوں نے بھی اس کے پیچھے دوڑ لگائی اور دونوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے ایک گلی میں غائب ہوگئے۔ میں بھی سوچے سمجھے بغیر ان کے پیچھے دوڑنے لگی۔ پھر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں آخر ان کے پیچھے کیوں دوڑ رہی تھی؟ میرا سانس پھول گیا تھا۔ وہ تو قسمت ہے کہ اس وقت وہاں سناٹا تھا ورنہ...''

''کام کی بات کرو راحیلہ!'' میں نے غرا کر اسے ٹوک دیا۔ اس میں بے شمار خوبیاں تھیں، بس ایک یہی برائی تھی کہ وہ بولتی بہت تھی۔

''سر! میں واپس اس جگہ پہنچی جہاں اقبال صاحب کی بائیک کھڑی تھی۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں اب وہ موٹر سائیکل اور سوار دونوں غائب تھے جس کی اقبال صاحب سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔''

''وھاٹ ربش!'' میں نے غرا کر کہا۔ ''جب وہ بائیک والا گر ہی گیا تھا تو تمہیں اسے گرفتار کر لینا چاہیے تھا۔ فوری طور پر تو اس کا یہ جرم ہی کافی تھا کہ اس نے گن پوائنٹ پر کسی کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔''

''سر! وہ اقبال صاحب نے کہا تھا کہ...''

''مجھ سے دور رہنا۔'' میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ''اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر تم میں سے کسی ایک کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو دوسرا اسے کور دے سکے۔ تم تو کھڑے ہوکر تماشا دیکھنے لگیں۔''

''سر! وہ... دراصل...''

''اچھا چھوڑو۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ شاہ فیصل کالونی کے اس مکان پر گئی تھیں؟''

www.pkdigest.com

"جی سر!" راحیلہ نے کہا۔ "وہاں محکمۂ تعلیم کے ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ غلام عباس صاحب رہتے ہیں۔ اس خاندان میں کل پانچ افراد ہیں۔ تین بیٹیاں اور دو میاں بیوی۔ غلام عباس صاحب کی ایک بیٹی ڈاکٹر ہے اور دو بیٹیاں ابھی پڑھ رہی ہیں۔ غلام عباس صاحب خود فالج کے مریض ہیں۔ اس لیے بستر تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ گھر کی کفالت ان کی ڈاکٹر بیٹی شائستہ کرتی ہے۔"

"گھر کی حالت دیکھ کر کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے حالات کیسے ہیں؟"

"بس عام سا متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا خاندان ہے۔ مکان بھی پرانے وقتوں کا بنا ہوا ہے۔ اس کا صرف ایک کمرا بہتر حالت میں ہے۔ وہ اس گھر کا ڈرائنگ روم ہے، وہاں فرنیچر بھی نیا ہے۔"

"اقبال کی کوئی خیر خبر؟"

"نہیں سر! وہ ابھی تک واپس نہیں آئے ہیں۔"

میں تلملا کر رہ گیا۔ ایک شکار تو میرے ہاتھوں سے نکلا تھا، دوسرا انسپکٹر اقبال کے ہاتھوں سے نکل گیا اور تیسرا راحیلہ کی حماقت کی وجہ سے بچ نکلا۔ سب انسپکٹر راحیلہ خاصی ذہین اور باصلاحیت تھی لیکن بعض اوقات انسان کی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میں ابھی تک اندھیرے میں ہاتھ پیر مار رہا تھا۔

البتہ اس واقعے کی وجہ سے ڈاکٹر شائستہ پر میرا شبہ مزید بڑھ گیا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اغوا کی اس واردات میں ڈاکٹر شائستہ کا ہاتھ ہے، ورنہ متوسط طبقے کی ایک لڑکی یوں شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے کیسے رہ سکتی تھی؟

میں نے گھنٹی بجا کر اس گارڈ کو بلا لیا جو تھوڑی دیر پہلے بھی آیا تھا۔

وہ صغیر کے مقابلے میں زیادہ پختہ عمر کا تھا۔ دبلا پتلا جسم تھا۔ اس کی حرکات اور سکنات میں وہ مستعدی بھی نہیں تھی جو ایک گارڈ میں ہونی چاہیے۔ سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لینے کے بعد میں نے پوچھا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"میرا نام محمد اکرم ہے سر!" اس نے جواب دیا۔

"اس اسپتال میں کب سے ملازم ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جب سے یہ اسپتال بنا ہے۔ مجھے یہاں کام کرتے ہوئے تقریباً پندرہ سال ہو گئے ہیں۔"

"اس سے پہلے کہاں جاب کرتے تھے؟"

"میں کراچی پورٹ ٹرسٹ کے سیکیورٹی ڈپارٹمنٹ میں تھا سر... وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد مجھے یہاں ملازمت مل گئی۔"

"جس رات بچے کا اغوا ہوا، اس رات تم بھی صغیر کے ساتھ تھے؟"

"جی سر!" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں کچھ یاد ہے، اس رات وہاں کون کون آیا تھا؟"

"دو مریض آئے تھے۔" اکرم نے جواب دیا۔ "ایک مریض کے ساتھ دو خواتین تھیں اور ایک مریضہ کے ساتھ صرف ایک لڑکا تھا۔ وہ مریضہ بہت خراب حالت میں تھی۔ وہ اسٹریچر پر آئی تھی۔"

میں چونک اٹھا۔ "اسٹریچر پر؟"

"جی سر! اس بے چاری کو نہ جانے کیا تکلیف تھی؟" اکرم نے بتایا۔

"اسٹریچر وارڈ بوائز لے کر آئے ہوں گے، پھر وہ واپس بھی گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں سر! وہ فوراً ہی واپس چلے گئے تھے۔"

"تم نے اسٹریچر کو غور سے دیکھا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "وہ خالی تھا یا...؟"

"اسٹریچر بالکل خالی تھا سر!"

مجھے یہ بات صغیر نے نہیں بتائی تھی۔ ممکن ہے وہ بھول گیا ہو۔ "مریضوں کے علاوہ ڈاکٹرز اور دوسرے اسٹاف میں کون کون آیا تھا اور کون کون اس وقت اندر ڈیوٹی پر تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے دس بجے چارج لیا تھا۔ صغیر مجھ سے دو تین منٹ پہلے آ چکا تھا۔ میرے بعد ڈاکٹر شائستہ آئی تھیں، پھر سسٹر روبی آئی تھیں، سویپر یونس آیا تھا اور حمیدہ۔"

"یہ لوگ باہر کب نکلے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یونس تو چند منٹ بعد ہی باہر چلا گیا تھا۔ پھر حمیدہ نکلی تھی۔"

"وہ خالی ہاتھ تھی یا اس کے ہاتھ میں کچھ تھا؟"

"اس نے بڑا سا ایک ڈسٹ بن اٹھا رکھا تھا۔" اکرم نے کہا۔ وہ اتنا احمق نہیں تھا جتنا شکل سے نظر آ رہا تھا۔ اس کی یادداشت بھی اچھی تھی۔

"ہاں، ڈاکٹر شائستہ بھی باہر چلی گئی تھیں اور موبائل فون پر کافی دیر تک کسی سے بات چیت کرتی رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سے بحث کر رہی ہوں۔ ٹیلی فون سے فارغ ہو کر وہ کیفے ٹیریا کی طرف چلی گئی تھیں۔"

"وہ حمیدہ سے پہلے باہر نکلی تھیں یا بعد میں؟" میں نے پوچھا۔

"حمیدہ بعد میں باہر نکلی تھی، اس وقت تو ڈاکٹر شائستہ کیفے ٹیریا سے واپس آ چکی تھیں۔"

"ان دونوں کے درمیان کوئی بات ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر شائستہ بہت اچھی انسان ہیں ایس ایس پی صاحب! وہ غریبوں کا بہت خیال رکھتی ہیں۔ آتے جاتے خیر خیریت بھی معلوم کرتی رہتی ہیں۔ حمیدہ سے بھی انہوں نے رک کر دو چار باتیں کی تھیں پھر وہ اندر چلی گئی تھیں۔"

"اب ذرا ذہن پر زور دے کر بتاؤ کہ کوئی اور تو اندر نہیں گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

اکرم کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "نہیں، میرا خیال ہے کہ اور کوئی اندر نہیں گیا تھا۔ سسٹر شمسہ اور سسٹر نینا شاید وقت سے پہلے آ گئی تھیں۔ اس لیے میں نے انہیں جاتے نہیں دیکھا۔"

"ممکن ہے، تم چائے پینے یا کچھ کھانے کے لیے وہاں سے کچھ دیر کو ہٹے ہو؟" میں نے کہا۔

"اول تو ہم وہاں سے ہٹتے ہی نہیں ہیں۔" اکرم نے کہا۔ "اور اگر جانا بھی ہو تو ہم میں سے کوئی ایک جاتا ہے، دوسرا ڈیوٹی پر موجود رہتا ہے۔ کھانا تو ہم گھر سے کھا کر آتے ہیں اور... ہاں، کھانے پر مجھے یاد آیا کہ احمد بخش کھانے کی ٹرالی لے کر اندر گیا تھا۔"

"اتنی رات گئے؟" میں چونک کر بولا۔

"اصل میں ڈاکٹر نسرین آپریشن سے پہلے کچھ نہیں کھاتی ہیں۔ ان کے ساتھ دوسرا عملہ بھی آپریشن میں مصروف ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کا کھانا بعد میں جاتا ہے۔"

میں نے اسپتال کی کھانے کی ٹرالیاں دیکھی تھیں۔ ان میں اوپر تلے تین چار خانے ہوتے ہیں اور ٹرالی پر اوپر سے لے کر نیچے تک پردہ پڑا ہوتا ہے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ احمد بخش اس ٹرالی میں بچے کو لے گیا ہو؟" میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"احمد بخش ایسا نہیں کر سکتا۔" اکرم نے کہا۔ "اول تو وہ مریضوں کے کمروں کی طرف جاتا ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نسرین کا کمرا کوریڈور کے دوسرے سرے پر ہے۔ وہ اگر مریضوں کے کمرے کی طرف جاتا تو ڈاکٹرز اور سسٹرز کی نظروں میں ضرور آتا۔ پھر بچے کو کمرے سے نکالنا اور اسے ٹرالی تک پہنچانا بھی احمد بخش جیسے آدمی کے لیے بہت مشکل ہے۔ اور وہ بچہ تھا سر... کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ کسی بھی وقت رو سکتا تھا۔ احمد بخش ملازمت سے تو نکالا ہی جاتا، اسے سزا بھی ہو جاتی۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کیس نے میرے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ بچہ وہاں سے یوں غائب ہو گیا تھا جیسے دھواں بن کر اڑ گیا ہو۔ اس کے باہر جانے کا کوئی ثبوت نہیں تھا اس کے باوجود بچہ غائب تھا اور اسے اغوا کرنے والے دس کروڑ روپے کا تاوان مانگ رہے تھے۔

میں نے بقیہ لوگوں سے بھی اسی قسم کے سوالات کیے۔ ان سب نے یہی بتایا کہ رات دس بجے کے بعد کچھ لوگوں کے ساتھ بچے باہر تو گئے تھے لیکن ان میں سے کوئی ایک سال کا تھا، کوئی تین سال کا... نوزائیدہ بچہ کوئی نہیں تھا۔

ایک مرتبہ پھر میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ انور کی کال تھی۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ تو کہاں ہے؟

"میں یہیں اسپتال میں ہوں۔ تو بھابی کے پاس ٹھہر۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔"

میں نے میجر جمشید کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس وقت کیپٹن علی کمرے میں موجود نہیں تھا۔

وہ مجھے کوریڈور کے سرے پر ملا۔ وہاں وہ کسی شخص سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "ایس ایس پی صاحب! میں سمجھتا تھا کہ آرمی کی لائف بہت ٹف ہوتی ہے لیکن آپ کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ پولیس میں اس سے کہیں زیادہ ٹینشن ہے۔"

"یہ ٹینشن ہی تو میرے لیے چیلنج ہے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ سی ایس ایس کرنے کے بعد میں بھی اطمینان سے ایڈمنسٹریشن کا انتخاب کرتا اور ٹھاٹ سے کسی علاقے کا ڈی سی بن کر بیٹھ جاتا لیکن میں نے تو خود اس ڈپارٹمنٹ کا انتخاب کیا ہے۔"

"آپ گزشتہ کئی گھنٹے سے کام کر رہے ہیں۔" علی نے کہا۔ "آئیے، میری طرف سے گرما گرم چائے پی لیں۔"

"شکریہ کیپٹن!" میں نے کہا۔ "میں آپ کی آفر ضرور قبول کرتا لیکن مجھے اس وقت بھی کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا ہے۔" پھر میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "ویسے کیپٹن علی! اتنے بڑے اسپتال کا سیکیورٹی آفیسر ہونے کی حیثیت سے آپ کو تو چہرہ شناس بھی ہونا چاہیے۔ آپ تو کسی کو بھی دیکھ کر اس کے بارے میں اندازہ لگا لیتے ہوں گے؟"

"مجھ سے زیادہ پولیس والے اس کام میں ماہر ہوتے ہیں۔" علی نے کہا۔ "ویسے کسی حد تک میں بھی اندازے لگا لیتا ہوں۔ بس کام چل جاتا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر شائستہ کیسی ہے؟"

"ڈاکٹر شائستہ؟" علی نے پوچھا۔ "یہاں ڈاکٹرز کی

www.pkdigest.com

تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں ہر ڈاکٹر کو نام سے نہیں جانتا۔ شاید شکل دیکھ کر کچھ بتا سکوں۔"

"حالانکہ ایک اچھا سیکیورٹی آفیسر اپنے ادارے کے ہر فرد سے واقف ہوتا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں پرائیویٹ ونگ کی لیڈی ڈاکٹر شائستہ کی بات کر رہا ہوں جو ڈاکٹر نسرین کی اسسٹنٹ ہے۔"

"اچھا، وہ ڈاکٹر شائستہ!" علی نے ہنس کر کہا۔ "وہ ڈاکٹر سے زیادہ ماڈل لگتی ہے یا فلمی اداکارہ۔" اس کا یہ انداز مجھے بہت گھٹیا لگا۔

"ہاں، میں اسی ڈاکٹر شائستہ کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اس کے بارے میں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ اچھی لڑکی ہے، اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔ پرو فیشنلی وہ کیسی ہے، اس کے بارے میں تو اس کے ڈپارٹمنٹ کے لوگ ہی بتائیں گے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ اپنے پروفیشن کے ساتھ مخلص ہے اور بہت محنت کرتی ہے۔"

اسی وقت مجھے انور نظر آیا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار تھے۔ اسے دیکھ کر میں نے علی سے کہا۔ "تھینک یو کیپٹن! ممکن ہے میں آپ کو پھر زحمت دوں۔" یہ کہہ کر میں جلدی سے انور کی طرف بڑھ گیا۔

"کیا ان لوگوں کا پھر کوئی ٹیلی فون آیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں آیا ہے تو آجائے گا۔" انور نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"یار سات بجنے والے ہیں۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے اور تو نہ جانے کیا کر رہا ہے؟"

"میں انہیں پکڑنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اچھا سن... اب اگر ٹیلی فون آئے تو پہلے تو ان سے تاوان کی رقم کم کرانے کی کوشش کرنا، پھر کہنا کہ ابھی تک چھ کروڑ کا بندوبست ہو سکا ہے۔ میں رات تک مزید کوشش کر لیتا ہوں۔ اگر مزید رقم کا بندوبست ہو گیا تو تمہیں مل جائے گی ورنہ چھ کروڑ ہی پر بات کرو۔"

"وہ کہیں گے کہ ہمیں پوری رقم چاہیے پھر؟" انور نے مایوسی سے کہا۔ "اور چھ کروڑ بھی کہاں ہیں؟" اس نے کہا۔ "ڈیڈی نے اور میں نے بہت مشکل سے تین کروڑ روپے کا انتظام کیا ہے۔"

"ارے، تو میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ ہم رقم ان کے حوالے کر دیں گے۔" میں نے کہا۔ "اگر وہ دس کروڑ روپے پر اصرار کریں تو ان سے تم کم از کم دو دن کی مہلت لے لو۔ کہنا کہ اگر مجھے دو دن مزید مل گئے تو میں پورے دس کروڑ کا انتظام کر دوں گا۔"

"اور وہ مان جائیں گے؟"

"لالچی آدمی مان ہی جاتا ہے۔ تم کوشش تو کرو۔"

"کمال! یہاں ایک ایک لمحہ بھاری گزر رہا ہے۔ تم مزید دو دن کی بات کر رہے ہو۔" انور نے کہا۔

"ابے تمہاری عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اگر تمہارے پاس دس کروڑ ہیں تو ان کی مہلت گزرنے کا انتظار ہی کیوں کر رہے ہو؟ ابھی پیسے دو اور یاسر کو لے آؤ۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ میں چند گھنٹوں میں ان کی گردن دبوچ لوں گا۔"

"یار! اب تو میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔" وہ شکستہ لہجے میں بولا۔

"بس، تم ایسی رونی صورت لے کر بھابی کے پاس مت جانا۔ اب جاؤ... مجھے ڈاکٹر نسرین سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

انور کو بہلا پھسلا کر میں نے مریم کے کمرے میں بھیج دیا اور خود ڈاکٹر نسرین کے آفس میں پہنچ گیا۔ اس وقت میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر دوڑائی۔ سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ڈاکٹر نسرین کی آواز سنائی دی۔ "یس کم ان!" اس کے دروازے پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا تو اس پر لکھا تھا۔ "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز!" میں نے اس بورڈ کو سیدھا کر دیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

"آیئے آفیسر!" ڈاکٹر نسرین خوش دلی سے بولی۔ "آپ تو وقت کے بہت پابند ہیں۔ ٹھیک سات بجے یہاں پہنچ گئے۔"

"ڈاکٹر صاحبہ! جیسے میں اپنے وقت کو قیمتی سمجھتا ہوں، اسی طرح دوسروں کے وقت کا بھی خیال رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اچھا پوچھیے، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ ویسے آپ سے پہلے جو آفیسر اس کیس پر کام کر رہے تھے، میں نے سب کچھ انہیں بتا دیا تھا۔"

میں نے غیر محسوس طور پر جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا خفیہ ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا اور بولا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! آپ اس اسپتال میں کب سے ہیں؟"

"میں نے یہ اسپتال باقاعدہ طور پر تو ابھی تین سال پہلے ہی جوائن کیا ہے۔" ڈاکٹر نسرین نے کہا۔

"باقاعدہ طور پر؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ میں پہلے اس اسپتال کے ڈاکٹرز کی لسٹ میں تو تھی لیکن کنسلٹنٹ کی حیثیت سے۔" ڈاکٹر نسرین نے کہا۔ "میں کلفٹن اور محمد علی سوسائٹی کے دو اسپتالوں میں اب بھی ہفتے میں ایک دفعہ بیٹھتی ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے جاب کی آفر کی تو میں نے قبول کر لی کیونکہ یہاں سیلری پیکیج بہت اچھا ہے۔"

"سنا ہے آپ ایک وقت میں لگاتار کئی کئی آپریشن کرتی ہیں؟"

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نسرین نے کہا۔ "میں جب تک کسی بھی آپریشن کی خود نگرانی نہ کروں، مطمئن نہیں ہوتی۔ میں گزشتہ اٹھارہ سال سے اسی طرح کام کر رہی ہوں۔"

"اس طرح تو آپ کی فیملی بہت متاثر ہوتی ہوگی؟ آپ کے شوہر بھی..."

"آفیسر!" ڈاکٹر نسرین نے میری بات کاٹ دی۔ "میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔" وہ افسردہ سی ہو گئی۔ "اب یہ مت پوچھیے گا کہ کیوں نہیں کی۔"

"بالکل نہیں پوچھوں گا۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔" پھر میں سنجیدہ ہو کر بولا۔ "مسز مریم بیگ کے کیس میں کیا پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی؟"

"اگر کوئی ڈاکٹر ہوتا تو میں اپنی بات اسے سمجھا سکتی تھی۔ ویسے میں یہ بتا سکتی ہوں کہ اس کی ایک اندرونی رگ غلطی سے کٹ گئی تھی اور خون بہنے لگا تھا۔ اس کے لیے ہمیں اس کا دوسرا آپریشن کرنا پڑا ورنہ وہ اب تک گھر جا چکی ہوتی۔"

"آپ نے جب آخری بار وارڈ کا راؤنڈ لگایا تو بچہ موجود تھا؟" میں اصل موضوع پر آ گیا۔

"جی ہاں، بچہ ماں کے نزدیک ہی کاٹ میں سو رہا تھا۔ ویسے نوزائیدہ بچے زیادہ تر سوتے ہی رہتے ہیں۔ وہ صرف اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب انہیں بھوک محسوس ہوتی ہے۔"

"آپ نے آخری راؤنڈ کب لگایا تھا؟ آپ تو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلتی ہیں۔"

"میں نے بارہ بج کر دو منٹ پر راؤنڈ شروع کیا تھا اور سب سے پہلے مسز انور بیگ ہی کے کمرے میں گئی تھی۔ ان کا چیک اپ کرنے اور انجکشن دینے میں مجھے پانچ منٹ لگے تھے پھر میں نے دو مزید مریضوں کو دیکھا تھا اور بارہ بج کر بیس منٹ پر واپس اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔"

"آپ کو کب معلوم ہوا کہ بچہ غائب ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں کھانا کھا کر فارغ ہوئی تھی۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں رات کا کھانا تمام آپریشنز اور ڈیلیوریز سے فارغ ہونے کے بعد کھاتی ہوں۔ اکثر میرے ساتھ ڈاکٹر شائستہ اور ڈاکٹر سلمیٰ بھی ہوتی ہیں لیکن اس دن وہ کھانا گھر سے کھا کر آئی تھیں اس لیے مجھے اکیلے ہی کھانا پڑا تھا۔"

"بچہ یہاں سے باہر نہیں گیا۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "یہاں بھی موجود نہیں ہے پھر وہ آخر جا کہاں سکتا ہے؟"

"یہ معلوم کرنا تو آپ کا اور اسپتال کی سیکیورٹی کا کام ہے۔" ڈاکٹر نسرین نے کہا۔

"جی ہاں، میں وہی کر رہا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا کیونکہ ڈاکٹر نسرین کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"آپ کو عموماً ڈاکٹر شائستہ اسسٹ کرتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر شائستہ تو کبھی کبھی مجھے اسسٹ کرتی ہے۔ عموماً میرے ساتھ ڈاکٹر سلمیٰ یا ڈاکٹر ثمینہ ہوتی ہیں۔ ہاں، میرے آپریشنز اور ڈیلیوریز کا ریکارڈ ڈاکٹر شائستہ رکھتی ہے۔"

"آپ عموماً کس وقت تک گھر جاتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کمرا ہی میرا گھر ہے۔" ڈاکٹر نسرین ایک مرتبہ پھر افسردگی سے بولی۔ "اور یہاں آنے والے مریض میرے بچے ہیں۔"

"آپ کے والدین، بہن بھائی، کوئی تو ہوگا؟" میں نے پوچھا۔ "سوری ڈاکٹر! یہ سوال اس کیس سے متعلق نہیں ہے۔ بس میں نے یونہی پوچھ لیا۔"

"میرے پیرنٹس تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ دو بہنیں ہیں۔ وہ دونوں بھی ڈاکٹر ہیں اور اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ دو بھائی ہیں۔ ان کے بچے ہیں، بھابیاں ہیں۔ وہ سب اپنی اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ میری ان کے گھروں میں کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نسرین آب دیدہ ہو گئی۔ "میں نے بھی اپنی دنیا الگ بسا لی۔" پھر وہ چونک کر بولی۔ "آپ اتنی دیر سے میرے پاس بیٹھے ہیں اور میں اتنی بد اخلاق ہوں کہ آپ سے چائے تک کو نہیں پوچھا۔" پھر اس نے انٹرکام پر چائے کے لیے کہا اور بولی۔ "آپ ماشاءاللہ بہت محنتی اور ذہین آفیسر ہیں۔ آپ کئی گھنٹے سے

www.pkdigest.com

اس اسپتال میں ہیں۔ پولیس کے تمام آفیسرز اگر اتنے ہی محنتی اور فرض شناس ہو جائیں تو ہمارا معاشرہ جنت بن جائے۔''

مجھے ڈاکٹر نسرین سے کوئی بھی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی تھی۔ میں نے وہاں آکر اپنا وقت ہی ضائع کیا تھا۔

اچانک سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے چونک کر اپنی جیب کی طرف دیکھا لیکن رنگ ٹون سے اندازہ ہوا کہ وہ میرا سیل فون نہیں تھا، ڈاکٹر نسرین کا سیل فون تھا۔

اس نے میز پر رکھا ہوا سیل فون اٹھایا اور مجھ سے بولی۔ ''ایک تو یہ سیل فون اب زحمت بنتا جارہا ہے۔ آدمی کسی طور اب کسی سے بچ ہی نہیں سکتا۔'' اس نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی، پھر میں نے اسے چونکتے ہوئے دیکھا۔ ''ہاں بشریٰ!'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا پیلیا کی علامات ہیں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے، ایسا ہو جاتا ہے۔ بچے کو دھوپ ضرور لگاؤ اور یہ دوا لکھو اور اس کے دو دو ڈراپس ہر چھ گھنٹے بعد پلا دو۔ نہیں، دودھ تبدیل مت کرنا۔ اور ہاں ایک وقت میں ایک اونس سے زیادہ دودھ مت پلانا۔ دودھ اسی وقت دینا جب اسے ضرورت ہو۔ ہاں چھوٹے بچے عموماً سوتے ہی رہتے ہیں، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ بس تم فوراً یہ دوا منگوا لو۔'' اس نے دوا لکھوائی اور رابطہ منقطع کر کے مجھ سے بولی۔ ''یہ مائیں بھی بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں۔ ابھی پرسوں ہی ڈلیوری ہوئی ہے۔ اب اتنا چھوٹا بچہ سوئے گا نہیں تو کیا اچھل کود کرے گا۔ خیر، چھوڑیں... آپ کچھ پوچھ رہے تھے؟''

''میں جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی، میں نے آپ کے لیے چائے منگوائی ہے بلکہ ایسا کریں آپ آج کھانا بھی میرے ساتھ کھالیں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ ویسے آج کوئی آپریشن بھی نہیں ہے۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ پہلے ہی بول پڑی۔

''نہیں آفیسر! انکار مت کیجیے گا۔ میں کھانا ہی منگوا لیتی ہوں۔ آپ نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔''

''میں نے لنچ کر لیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ارے، وہ تو کب کا ہضم ہو گیا ہوگا۔'' پھر اس نے انٹر کام پر کہا۔ ''احمد بخش! ایسا کرو، ابھی چائے رہنے دو.... میرے لیے کھانا لے آؤ۔ ہاں، میرے ساتھ ایک مہمان بھی ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''آپ چاہیں تو ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جائیں۔''

''میں مسز بیگ کے کمرے میں ہاتھ منہ دھو چکا ہوں۔''

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں فریش ہو جاؤں۔''

''شیور ڈاکٹر!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نے مجھے اتنا قیمتی وقت دیا ہے۔ یہ وقت آپ کے آرام کا ہے اور...''

''ارے بس رہنے دیں آفیسر! کوئی فارمیلٹی نہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ آپ چلے مت جائیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ واش روم میں چلی گئی۔

اس کے جاتے ہی میں نے اس کا سیل فون اٹھا لیا۔ یہ انتہائی غیر شریفانہ حرکت تھی لیکن پولیس میں رہ کر تو اس قسم کی غیر شریفانہ حرکتیں کرنا ہی پڑتی ہیں۔ میں نے موصول ہونے والی آخری کال دیکھی۔ وہ کال واقعی کسی بشریٰ کی تھی۔ میں نے اپنا سیل فون نکال کر وہ نمبر بہت پھرتی سے اپنے سیل فون میں محفوظ کیا اور اس کا سیل فون دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

پھر وقت گزاری کو میں نے وہاں رکھا ہوا ایک میگزین اٹھا لیا لیکن وہ میڈیکل کا کوئی میگزین تھا۔ اس لیے میں نے ورق گردانی کرنے کے بعد دوبارہ میز پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نسرین بھی واش روم سے نکل آئی۔ وہ اب خاصی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اب سے پندرہ بیس سال پہلے وہ خاصی حسین رہی ہوگی۔ اب بھی اس کے چہرے پر خاصی کشش تھی اور وہ خاصی باوقار خاتون تھی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور اسپتال کا ایک ملازم اندر آ گیا۔

''احمد بخش! پہلے یہ میز صاف کرو۔'' اس نے وہاں رکھی ہوئی میز کی طرف اشارہ کیا جس پر گلاس، جگ، بسکٹ کے پیکٹ وغیرہ پڑے تھے۔

احمد بخش نے لمحوں میں میز کا سامان وہاں سے ہٹا کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر منتقل کر دیا۔

وہ کھانے کی ٹرالی باہر ہی چھوڑ آیا تھا۔ اس نے ٹرالی میں سے کھانے کی ٹرے نکالی اور ڈشیں میز پر رکھ کر باہر نکل گیا۔

میں نے دیکھا، کھانے کی ٹرالی اتنی بڑی تھی کہ اگر اس میں کوئی جوان لڑکی بھی چھپ کر بیٹھ جاتی تو کسی کے علم میں آئے بغیر وہاں سے نکل سکتی تھی۔

احمد بخش ٹرالی میں سے مزید ڈشیں، پلیٹیں وغیرہ نکال کر ٹیبل پر رکھ رہا تھا۔

میں نے غور سے احمد بخش کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے سادہ اور معصوم آدمی لگا۔ ایسے لوگ کسی بچے کو اغوا کرنا تو درکنار کسی جانور کو بھی اغوا نہیں کر سکتے۔

اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نسرین نے مجھ سے کہا۔ ''شروع کریں آفیسر!''

''ڈاکٹر صاحبہ! میرا نام کمال ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ مجھے کمال کہہ سکتی ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا اور کھانا کھانے لگا۔ کھانا واقعی بہت اچھا تھا اور میرے مطلب کا تھا۔

''آپ کو یہ روکھا پھیکا کھانا پسند تو نہیں آئے گا لیکن مجبوری ہے۔ یہاں اسی قسم کا کھانا ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر نسرین نے کہا۔

''ارے، یہ کھانا تو میرے مطلب کا ہے۔ مجھے تیز مرچوں اور مسالوں والے کھانے اچھے نہیں لگتے۔ میں تو گھر میں بھی اسی قسم کا کھانا کھاتا ہوں۔ زیادہ مرچیں تو مجھ سے کھائی ہی نہیں جاتیں۔''

ہم کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ احمد بخش چائے لے آیا۔ چائے پی کر مجھے ایسا لگا جیسے میری دن بھر کی تھکن اتر گئی ہو۔

''کمال!'' ڈاکٹر نسرین نے مجھے پہلی دفعہ نام سے مخاطب کیا۔ ''اگر آپ اسموکنگ کرتے ہیں تو کرلیں۔''

''نہیں ڈاکٹر!'' میں نے کہا۔ ''میں تمباکو نوشی کا عادی نہیں ہوں۔ میں اتنی دیر سے آپ کے ساتھ ہوں، آپ نے مجھے سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا؟''

''بہت اچھی بات ہے۔ آپ کی بیگم بہت خوش قسمت ہیں۔ اسموکنگ کرنے والے مرد مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔''

''فرحانہ... میری بیوی کا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ کبھی آپ کے پاس وقت ہو تو میرے غریب خانے پر تشریف ضرور لائیں۔'' میں نے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر دے دیا۔

''ضرور... ضرور۔'' ڈاکٹر نسرین نے کہا۔ ''میں آپ کے گھر ضرور آؤں گی۔''

ایک مرتبہ پھر ڈاکٹر نسرین کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے مجھ سے معذرت کر کے سیل فون اٹھایا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ میں نے پھر اسے چونکتے دیکھا۔ اس مرتبہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر چلی گئی۔ مجھے اس کی آواز تو سنائی دے رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ٹیپ ریکارڈر کا حساس مائکروفون وہ گفتگو ریکارڈ کر لے گا۔ یہ مائکروفون بھی انسپکٹر رحمان نے خصوصی طور پر بنایا تھا۔ حسبِ ضرورت اس کی ریکارڈنگ کے فاصلے کو بڑھایا جا سکتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ٹیپ ریکارڈر کی وہ ناب گھما دی جس سے مائکروفون دور کی آوازوں کو بھی بہت واضح طور پر ریکارڈ کر سکتا تھا۔

مجھے صرف اتنا سنائی دیا۔ ''اسے مہلت دے دو۔''

میں روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ میں ڈاکٹر نسرین سے رخصت ہو کر باہر نکلا اور کیفے ٹیریا میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر کا ہیڈ فون کان میں لگایا اور پلے کا بٹن آن کر دیا۔ مجھے ڈاکٹر نسرین اور اپنی گفتگو سنائی دی۔ جب میں اسے گھر آنے کی دعوت دے رہا تھا پھر سیل فون کی گھنٹی بجی اور چند لمحے بعد ڈاکٹر نسرین کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔ ''ہاں سکندر! کیا بات ہے؟... کیا... چھ کروڑ کا بندوبست کر لیا ہے... نہیں... دس کروڑ سے ایک پیسا کم نہیں... کتنی مہلت مانگ رہا ہے... لیکن رقم میں کمی مت کرنا۔ دس کروڑ کا بندوبست کرتے کرتے اس کا گھر، گاڑیاں، زیورات سب کچھ نیلام ہو جائے گا اور وہ لوگ فٹ پاتھ پر آجائیں گے۔ مجھے تو حیرت یہ ہے کہ اس نے چھ کروڑ کا بندوبست بھی کیسے کر لیا؟... ہاں، میں سن رہی ہوں... ٹھیک ہے اس کے لیے دو دن مزید اذیت سہی، اسے مہلت دے دو۔''

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر نسرین ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ابھی جا کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دوں لیکن اس طرح انور کے بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ پہلے مجھے بچے تک پہنچنا تھا۔ میں نے انسپکٹر رحمان کو ٹیلی فون کیا اور کہا۔ ''میں ایک سیل نمبر دے رہا ہوں۔ فوری طور پر اسے ٹریس کر کے مجھے بتاؤ کہ یہ نمبر کس کا ہے اور اس کا ایڈریس کیا ہے؟''

''او کے سر! میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''سر! میں آپ کو کال کرنے ہی والا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اغوا کرنے والوں نے کسی نئے نمبر سے انور صاحب کے سیل پر کال کی ہے۔ اس کال کی لوکیشن بھی وہی ہے جو اس سے پہلی کال کی تھی۔ ان لوگوں نے شاہ فیصل کالونی یا اس کے اردگرد کے علاقے سے فون کیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اس نمبر کے بارے میں مجھے جلد از جلد رپورٹ دو جو میں نے تمہیں ابھی لکھوایا ہے۔'' میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ تھکن کے مارے میرا برا حال تھا۔ صبح سے مجھے کہیں کمر لگانے کا وقت بھی نہیں ملا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نیم گرم پانی سے نہاؤں، ہلکے پھلکے کپڑے پہنوں اور لمبی تان کر سو جاؤں... لیکن میں ڈیوٹی پر تھا۔ ڈیوٹی بھی ایسی کہ میرے انتہائی عزیز دوست کی جان پر بنی ہوئی تھی۔

پھر مجھے سکندر کا خیال آیا۔ میں نے ابھی تک یہ نام کسی جرم کے حوالے سے نہیں سنا تھا۔ ممکن ہے انسپکٹر اقبال کو اس

www.pkdigest.com

بارے میں کوئی علم ہو۔ یوں بھی اس واقعے کے بعد میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

میں نے انسپکٹر اقبال کے نمبر پر کال کی تو دوسری طرف بیل بجتی رہی۔ اقبال فون اٹھانے میں اتنی دیر تو نہیں کرتا تھا۔

پھر اچانک کسی نے فون اٹھا لیا اور کوئی غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہیلو!“

”آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے اقبال کو دوسرے سیل سے کال کی تھی۔ یہ نمبر شاید اس کے سیل فون میں محفوظ نہیں تھا۔

”آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟“

”مجھے کاظمی صاحب سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہاں کوئی کاظمی صاحب نہیں رہتے۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

مجھے اقبال کی طرف سے پریشانی ہو رہی تھی۔ میں نے سب انسپکٹر راحیلہ کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی کال وصول کر لی اور بولی۔ ”یس سر!“

”راحیلہ! انسپکٹر اقبال کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟“

”سر! انہیں گولی لگی ہے اور وہ اس وقت لیاقت نیشنل اسپتال میں ہیں۔“

”اور یہ بات آپ اب مجھے بتا رہی ہیں؟“ میں نے غصے سے کہا۔

”سر! میرا خیال تھا کہ آپ کو معلوم ہوگا۔“ راحیلہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

”اپنے خیال پر چلنے کے بجائے وہ کیا کریں جو آپ سے کہا جائے۔ آپ انسپکٹر اقبال کے ساتھ تھیں۔ آپ کو رپورٹ دینا چاہیے تھی۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب آپ میری ٹیم میں زیادہ دن تک چل نہیں سکیں گی۔“

”سوری سر! میں...“

”کوئی ضرورت نہیں ہے سوری کی۔“ میں نے اسے ایک مرتبہ پھر جھڑک دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

وہاں سیلف سروس سسٹم تھا۔ میں نے کاؤنٹر سے چائے نہیں لی تھی اس لیے یونہی بیٹھا تھا۔ اس وقت وہاں رش بھی بہت کم تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور بہترین تراش کے سفاری سوٹ میں ملبوس ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں نہ صرف انتہائی قیمتی گھڑی تھی بلکہ اس کا سیل فون بھی بہت قیمتی تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نظر کیفے ٹیریا پر ڈالی پھر سیل فون سے کسی کا نمبر ڈائل کیا اور مختصر سی بات کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سوچا کہ میں اقبال ہی کو دیکھ آؤں۔ لیاقت نیشنل اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

سفاری سوٹ والا باہر نکل چکا تھا۔ اب مجھے اس کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی عمر چالیس اور پینتالیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی لیکن وہ اس عمر میں بھی خاصا باوقار اور ہینڈسم تھا۔

کوریڈور میں آگے اندھیرا تھا۔ شاید وہاں کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔

اچانک میری نظر اوپر جانے والے زینے پر پڑی۔ مجھے ڈاکٹر شائستہ دکھائی دی۔ وہ مشتبہ انداز میں ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اوپر جا رہی تھی۔ میں ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا کیونکہ وہ زینے کے آخری سرے پر پہنچ کر کوریڈور کا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر مجھے وہی سفاری سوٹ والا دکھائی دیا۔ اس کا رخ بھی اوپر جانے والے زینے کی طرف تھا۔ اس نے ڈاکٹر شائستہ کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی آگے بڑھنے لگا۔

میرا تجسس بیدار ہو گیا۔ میں نے اپنے دونوں سیل فون سائلنٹ پر لگائے اور خود بھی بہت احتیاط سے زینہ چڑھنے لگا۔

میں اوپر پہنچا تو سفاری سوٹ والا اور ڈاکٹر شائستہ پانی کے اوور ہیڈ ٹینک کے پاس کھڑے تھے۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے، صرف آوازیں آ رہی تھیں۔ اوپر یوں بھی اندھیرا تھا۔ میں بلی کی طرح دبے پاؤں چلتا ہوا ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ اب ان دونوں کے اور میرے درمیان صرف ایک ستون حائل تھا۔

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ شائستہ کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میں تمہیں چاہتا ہوں، تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس آدمی کی آواز سنائی دی۔

”اور تمہاری بیوی اور بچے... ان کا کیا بنے گا؟“ شائستہ نے کہا۔

”وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے جان!“ وہ آدمی ایک دم رومینٹک ہو گیا۔

”تم کچھ تو شرم کرو شاہد! تمہاری بڑی بیٹی عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹی ہوگی۔ پھر میرے والدین اس شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔“

”انہیں راضی ہونا پڑے گا۔“ شاہد بولا۔ ”جب میں انہیں تمہاری وہ تصویریں بھیجوں گا تو ان کا کیا حال ہوگا... وہ راضی نہیں ہوں گے تو کیا اپنی ذلت کے اشتہارات دیوار پر دیکھیں گے۔ میں ان تصویروں میں سے صرف دو تصویروں کے پوسٹر چھپوا کر شہر کی دیواروں پر لگوا دوں گا۔ پھر کیا ہوگا؟ نہ تمہاری ملازمت رہے گی، نہ تم کہیں اور جاب کرنے کے قابل رہو گی۔ مجھے آج ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔“

”شاہد! تمہیں اللہ کا واسطہ۔“ شائستہ نے رو دینے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے تو اب تک تمہاری ہر بات مانی ہے، تم مجھے لے کر فارم ہاؤس پر گئے۔ میں نے اپنے والدین کی عزت کی خاطر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمہاری گاڑی تحفے کے طور پر قبول کر لوں۔ میں نے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ وہ گاڑی ہی میرے لیے بدنامی اور رسوائی کا چلتا پھرتا اشتہار ہے۔“

”پھر تمہارے والدین کہاں ہوں گے؟ تمہاری بہنوں کا مستقبل کیا ہوگا... کبھی سوچا ہے تم نے؟“ شاہد کی مکروہ آواز سنائی دے رہی تھی اور میرا خون کھول رہا تھا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے، میں تم پر اب تک کتنا پیسا خرچ کر چکا ہوں؟ اٹھارہ لاکھ کی تو صرف گاڑی ہے۔ میں نے تمہارے نام سے گلشن میں ایک لگژری فلیٹ بھی خریدا ہے، تمہارے اکاؤنٹ میں لاکھوں روپیا جمع کرایا ہے۔“

”تم اپنا سب کچھ واپس لے لو۔ اپنی گاڑی، اپنا فلیٹ، اپنا پیسا لیکن اللہ کے واسطے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یوں بھی تم مجھے بے آبرو کر چکے ہو، اب تو میں بالکل تہی دست ہوں۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا؟“ ڈاکٹر شائستہ غالباً رو رہی تھی۔ ”میں نے تم پر اتنی مہربانیاں کیں اور تم نے ان پولیس والوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔“

”پولیس والوں کو؟“ شائستہ نے حیرت سے کہا۔

”آج ایک پولیس والا تمہارے بارے میں معلوم کرتا ہوا تمہارے گھر تک پہنچ گیا تھا لیکن میرے آدمیوں نے بھی اسے ایسا سبق سکھایا ہے کہ اگر وہ زندہ رہا تو ہمیشہ یاد رکھے گا۔“

”اول تو مجھے کچھ علم نہیں ہے کہ کون میرے گھر گیا تھا... پھر پولیس والا میرے ہی گھر گیا تھا، تم کیوں پریشان ہو رہے ہو؟“

”ارے، میں ان پولیس والوں کو خوب جانتا ہوں۔ وہ خاص طور پر تمہارے پاس تو جانے سے رہے، وہ تمہارے ذریعے مجھ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ ایک بات اور اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ وہ کنگلا کیپٹن علی آئندہ تمہارے اردگرد نظر نہ آئے ورنہ اس کا وہ حشر کروں گا کہ وہ پوری زندگی وہیل چیئر پر گزارے گا۔ وہ خود کو بہت ہیرو سمجھتا ہے۔ میں تمہارے بھی

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

بارش کی بوندوں کے ہمراہ
اگست 2010ء ساون نمبر کی ایک جھلک

انجم انصار اور عالیہ بخاری کے سلسلے وار ناول

مادی دنیا کی ضرورتوں سے قطع نظر ایک آواز ہماری صداقت و سچائی کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہے
کچھ اسی تناظر میں قیصرہ حیات کا ناول

ماضی کے آئینے میں جھلملاتے عکس کو وقت کی دبیز تہیں بھی منعکس ہونے سے نہیں روک سکتیں...... زندگی کے نشیب و فراز میں اپنی منزل کو ڈھونڈتی لڑکی کی کہانی......
ذکیہ بلگرامی کا دلچسپ ناول

امید ایسی چھاؤں ہے جو اپنے دامن میں پناہ ہی نہیں دیتی بلکہ مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبنے سے بچاتی ہے......
امید کی کرنوں سے منور عطیہ عمر کا مکمل ناول

ہر موسم دل کے موسم کا مرہون منت ہے لیکن بارش کی بوندیں دل کا موسم بدل دینے کی طاقت رکھتی ہیں کچھ ایسی ہی یادیں اور باتیں...... شائستہ زریں اور
عظمیٰ آفاق سعید کے سروے

غلام محی الدین اور منور سلطانہ،
رضوانہ پرنس کے برجستہ انداز کے ہمراہ

افسانے

سعدیہ رئیس، عالیہ حرا، صائمہ قیصر،
قانتہ رابعہ، سیما بنت عاصم،
قرۃ العین رائے اور تحسین اختر کے دلچسپ افسانے

آپ کی آراء و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''یہ پولیس اسپتال میں کیا کر رہی ہے۔ اسپتال کے باہر بھی پولیس کی ایک موبائل وین کھڑی ہے۔ کینٹے ٹیریا میں بھی مجھے پولیس کا ایک ایس ایس پی نظر آیا تھا۔ کیا پولیس کو تم نے بلایا ہے؟''

''میں پولیس کو کیسے بلا سکتی ہوں؟ یہاں سے ایک بچہ اغوا ہو گیا ہے۔ بچہ بھی وزارتِ خارجہ کے ایک بڑے افسر کا بیٹا اور وفاقی وزارت داخلہ کے چیف سیکریٹری کا پوتا ہے۔''

''تم نے اب تک میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' شاہد نے کہا۔ ''مجھ سے شادی کرو گی یا نہیں؟''

میرا دماغ تو اسی وقت گھوم گیا تھا جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ اقبال کو اسی منحوس کے آدمیوں نے زخمی کیا ہے۔ میں نے جیب سے اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

''دیکھو شاہد! اس وقت تم جاؤ۔ اسپتال میں اس وقت پولیس کا ایک ایس ایس پی موجود ہے۔ اس موضوع پر پھر کسی وقت بات کریں گے۔''

''ارے وہ حرام زادہ ایس ایس پی میرا کیا بگاڑے گا؟ تم جتا وہاں یا تہ؟''

میں اچانک سامنے آ گیا اور زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تمہیں جواب چاہیے تو سن لو کہ یہ... اور یہ حرام زادہ ایس ایس پی تمہاری پیشانی کے عین وسط میں سوراخ کر سکتا ہے۔''

''اپنے کام سے کام رکھو آفیسر!'' شاہد نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو۔''

''میں جانتا ہوں کہ تم امریکا کے صدر اوباما ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اب خاموشی سے میرے ساتھ چلو ورنہ کتے کی طرح گھسیٹتا ہوا یہاں سے لے جاؤں گا۔''

''تم میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔'' اس نے نخوت سے کہا۔

میں نے جواب میں اس کے جبڑے پر اتنا زبردست تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر بری طرح ستون سے ٹکرا گیا۔ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میرے بھاری بوٹ کی ٹھوکر نے اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا۔

''تم یہاں سے جاؤ۔'' میں نے ڈپٹ کر ڈاکٹر شائستہ سے کہا۔

وہ بے چاری گرتی پڑتی وہاں سے بھاگ گئی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اسپتال کے باہر کھڑی ہوئی پولیس موبائل کے انچارج اے ایس آئی شہاب کا نمبر ملا لیا۔

''یس سر!'' دوسرے ہی لمحے اس کی مستعد آواز سنائی دی۔

''تم ایک سپاہی کو لے کر اسپتال کے پرائیویٹ ونگ کی چھت پر آ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''او کے سر!'' اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں شاہد کو ہوش آ چکا تھا۔ میں اس کی تلاشی لے چکا تھا۔ اس کے پاس پرس، کریڈٹ کارڈ، اے ٹی ایم کارڈ، سیل فون اور گاڑی کی چابیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ تین منٹ کے اندر اندر وہاں بھاگتے ہوئے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ مجھے اے ایس آئی شہاب پر غصہ بھی آیا کہ وہ اپنے آنے کا اعلان کیوں کر رہا ہے؟

پھر شہاب اور ایک سپاہی چھت پر پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔

''زیادہ ایکشن میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرف آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے وہ دونوں میرے سامنے تھے۔ شاہد اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے بھاری بوٹ کی ٹھوکر سے اس کے سامنے کے دو تین دانت جھڑ گئے تھے۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں مجھے سب کچھ واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

''اسے لے جا کر بند کر دو۔'' میں نے اے ایس آئی شہاب سے کہا۔ ''ابھی کسی بھی قسم کا پرچہ کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صبح خود اس سے نمٹ لوں گا۔''

''دیکھو آفیسر! تم بہت پچھتاؤ گے۔'' شاہد نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں۔''

''میں نے یہ جملہ اتنی بار سنا ہے کہ اب اس سے چڑ سی ہونے لگی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے لپک کر اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔

اسی وقت شہاب نے بیلٹ سے بندھی ہوئی ہتھکڑیاں کھولیں اور شاہد کے ہاتھ میں ڈال دیں۔ وہ لوگ اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔

میں نے سوچا کہ میں کہاں پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالتا پھروں گا، شہاب سے کہوں گا... وہ مجھے لیاقت نیشنل چھوڑ دے گا۔

☆☆☆

انسپکٹر اقبال کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اس کا آپریشن کر کے گولی نکالی جا چکی تھی۔ اس کا خون بہت ضائع ہو گیا تھا لیکن اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ ابھی تک آئی سی یو میں تھا۔ میں نے شیشے کے دروازے کے باہر ہی سے اس پر ایک نظر ڈالی۔ وہ اس وقت بے ہوش تھا۔ انسپکٹر اقبال اتنا کمزور آدمی نہیں تھا۔ یقیناً اسے لگنے والی گولی بہت کاری ہوگی۔

ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ گولی نے انسپکٹر صاحب کے گردوں اور جگر کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ گولی کا رخ اگر چند ملی میٹر اور بڑھ جاتا تو اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہو جاتی۔

میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ اخراجات کی پروا مت کیجیے گا اور انسپکٹر صاحب کا بہت اچھی طرح علاج کیجیے گا۔ انسانی جان بہت قیمتی ہوتی ہے اور یہ تو میرا انتہائی قیمتی آدمی ہے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں سر!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اب انسپکٹر صاحب کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

سپاہی جان محمد اس کے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کچھ پیسے دیے اور کہا۔ ''اگر مزید رقم کی ضرورت پڑے تو مجھے ٹیلی فون کر دینا۔''

وہاں سے فارغ ہو کر میں نے ٹیکسی پکڑی اور دوبارہ اس اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا جہاں مریم بھابی داخل تھیں۔

پولیس کی موبائل وین شاہد کو لاک اپ میں بند کر کے واپس آ چکی تھی۔ اے ایس آئی شہاب نے مجھے بتایا کہ وہ آدمی بہت شور شرابا کر رہا ہے۔ ہمیں انتہائی غلیظ گالیاں دے رہا ہے۔ خاص طور پر آپ کو وہ ملازمت سے برطرف کرانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

''وہاں موجود ڈیوٹی افسر کو ٹیلی فون کر کے کہہ دو کہ ملزم زیادہ چھٹے جان ہے تو اس کی خوب اچھی طرح ''خاطر تواضع'' کر دے۔ یہ بھی بتا دینا کہ ہم نے کسی بھی شخص کو گرفتار نہیں کیا ہے۔''

یہ کہہ کر میں اسپتال میں داخل ہو گیا۔ وہاں موجود سیکیورٹی گارڈ نے مجھے سیلیوٹ کیا۔ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسی وقت میرا سیل فون وائبریٹ کرنے لگا۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ انسپکٹر رحمان کی کال تھی۔

''ہاں انسپکٹر صاحب! کیا رپورٹ ہے؟''

''سر! وہ نمبر جو آپ نے مجھے دیا تھا، وہ اسلام آباد کا نمبر ہے اور کسی محمد ارشاد کے نام پر ہے۔''

''اور اغوا کنندگان کی طرف سے انور کو تو کوئی کال موصول نہیں ہوئی؟''

''نہیں کال ملی ہے سر!'' رحمان نے بتایا۔ ''میں نے شاید آپ کو پہلے اس کی رپورٹ دے دی تھی۔''

''اچھا ٹھیک ہے، آپ اپنی ڈیوٹی پر موجود رہیں۔ کسی بھی وقت آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' میں نے کہا پھر اچانک مجھے سکندر کا خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

اسرائیل کے علاوہ
دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
ٹورنٹو سے لنڈی کوتل تک
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 600 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 5500 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 4500 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
رقم ڈیمانڈ ڈرافٹ، منی آرڈر یا ویسٹرن یونین کے ذریعے بھیجی جا سکتی ہے۔ مقامی حضرات دفتر میں نقد ادائیگی کر کے رسید حاصل کر سکتے ہیں
رابطہ: ثمر عباس
(فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

www.pkdigest.com

"انسپکٹر صاحب! سکندر نامی کوئی شخص ہماری ہسٹری شیٹ پر موجود ہے یا اس کا کوئی ریکارڈ ہے؟"

"سر! یہ تو سب انسپکٹر محمد خان سے معلوم کرنا پڑے گا۔ تمام ملزمان اور ہسٹری شیٹرز کا ریکارڈ وہی مرتب کرتے ہیں۔ میں ان سے معلوم کر کے بتاتا ہوں۔"

"وہ اس وقت ڈیوٹی پر ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! وہاں کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ آج کل تو سارا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ ہے۔ کوئی نہ بھی ہوا تو میں خود سرچ کر لوں گا۔ میں آپ کو آدھے گھنٹے کے اندر اندر اطلاع دیتا ہوں۔"

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں پرائیویٹ ونگ میں پہنچا تو انور باہر ہی کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔

"ان لوگوں کا فون آیا تھا کمال!" اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "میں نے ان سے یہی کہا کہ میرے پاس فی الحال چھ کروڑ روپے ہیں۔ ان کا بندوبست بھی میں نے بہت مشکل سے کیا ہے۔ ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہمیں دس کروڑ روپے میں سے ایک روپیا بھی کم نہیں چاہیے۔ میں نے تمہاری ہدایت کے مطابق ان سے کہا کہ اچھا، ایک مہربانی کرو۔ میں تم لوگوں کو پورے دس کروڑ روپے دوں گا — کم از کم مجھے دو دن کی مہلت اور دے دو۔ اس پر اس مکروہ آواز والے نے کہا کہ ہم نے مہلت نہ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم نے جتنی بھی وارداتیں کی ہیں، ان میں مہلت کبھی نہیں دی اسی لیے ہمارے اغوا کیے ہوئے بیشتر مغوی بے موت مارے گئے۔ تمہارا بچہ بہت چھوٹا ہے اس لیے صرف تمہارے ساتھ یہ رعایت کر رہے ہیں۔ چلو، تمہیں دو دن کی مہلت اور دیتے ہیں لیکن دس کروڑ میں اب ایک روپیا بھی کم نہیں ہوگا۔"

"انور! تو پریشان مت ہو۔" میں نے کہا۔ "میں ان خبیثوں تک پہنچ چکا ہوں۔ بس مجھے ایک موقع کی تلاش ہے۔ یہ موقع بھی وہ جلد ہی دیں گے، پھر یہ... کھیل ختم ہو جائے گا۔ یہ بتا، کیفے ٹیریا کھلا ہے یا بند ہو گیا؟"

"میں نے ادھر توجہ نہیں دی۔" انور نے کہا۔

"اچھا چل، باہر چلتے ہیں۔ تو نے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔"

"میرا موڈ بالکل نہیں ہے۔" انور نے کہا۔ "تجھے کچھ کھانا ہے تو کھا لے۔"

"یار! اب یہ عورتوں کی طرح نخرے مت کر... چل میرے ساتھ۔"

"اچھا مجھے اپنی گاڑی تو لینے دے۔ یہاں نزدیک تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

"تو گاڑی کی فکر مت کر، ہم پولیس موبائل میں چلیں گے۔"

میں انور کو زبردستی گلشن اقبال لے گیا۔ وہاں کئی اچھے ہوٹل رات گئے تک کھلے رہتے تھے۔

میں خود تو کھانا کھا چکا تھا لیکن انور کی وجہ سے دوبارہ تھوڑا بہت کھانا پڑا۔ انور صبح سے واقعی بھوکا تھا۔ اس نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ میں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ میں آج رات ہی ان لوگوں تک پہنچ جاؤں گا۔

اے ایس آئی شہاب اور دوسرے سپاہیوں نے بھی کھانا کھایا اور چائے کا ایک ایک کپ پی کر ہم باہر نکلے تو گویا کھوئی ہوئی توانائی لوٹ آئی۔

میں کھانے کے دوران میں مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ بشریٰ نامی اس عورت تک کیسے پہنچا جائے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر مجھے بشریٰ کا سراغ نہ ملا تو میں ڈاکٹر نسرین کو گرفتار کر لوں گا۔ میرے ٹیپ ریکارڈر میں اس کی وہ گفتگو موجود تھی جو اس نے بشریٰ سے کی تھی اور جو بعد میں ان لوگوں سے کی تھی جو انور سے تاوان طلب کر رہے تھے۔

میرے پاس خصوصی اختیارات ضرور تھے لیکن میں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر کارروائی کرنا چاہتا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر کے ثبوت کو تو وہ جھٹلا نہیں سکتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں ڈاکٹر نسرین کو گرفتار کرتا تو انور کے نوزائیدہ بیٹے کی جان خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ لوگ جو کروڑوں کی آس لگائے بیٹھے تھے، وہ جھنجلا کر کچھ بھی کر سکتے تھے۔

"کیا سوچ رہا ہے کمال؟" انور نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ان لوگوں کو گرفتار کرنے کی پلاننگ کر رہا ہوں۔"

اسپتال واپسی میں بھی سارا وقت میں یہی سوچتا رہا کہ بشریٰ تک کیسے پہنچا جائے؟

پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آ ہی گئی۔ اسپتال پہنچ کر میں نے سب انسپکٹر راحیلہ کو ٹیلی فون کیا۔ وہ شاید سو چکی تھی۔ ٹیلی فون پر اس کی غنودہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"سب انسپکٹر راحیلہ!" میں نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "یس سر... جی سر..." وہ ہڑبڑا کر بولی۔

"آپ ابھی دس منٹ کے اندر اندر اسپتال پہنچیں۔" میں نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "آپ کے پاس کوئی سواری تو نہیں ہوگی۔ ایسا کریں آپ تیار ہو کر گھر پر انتظار کریں۔ میں پولیس کی موبائل وین بھیج رہا ہوں۔"

"سر میں وردی پہنوں یا..."

"وردی کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"او کے سر!" راحیلہ نے جلدی سے کہا۔ میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

پھر میں نے انسپکٹر رحمان کو کال کرنا چاہی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی کال آ گئی۔ "سر! سکندر نام کا کوئی بدمعاش اس وقت نہیں ہے۔ اب سے دو سال پہلے سکندر بخش نام کا ایک شخص تھا، اس نے بہت اودھم مچایا تھا۔ دو سال پہلے وہ ایک پولیس مقابلے میں مارا جا چکا ہے۔ ایک اور بدمعاش علی سکندر تھا۔ وہ بھی سکندر کے نام سے مشہور تھا لیکن وہ آج کل جیل میں ہے اور عمر قید کی سزا کاٹ رہا ہے۔ سندھ کا ایک بدمعاش سکندر عرف سکو بھی تھا، وہ پچھلے سال پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ اس وقت سکندر نام کے کسی بدمعاش یا انڈر ورلڈ کے کسی شخص کا وجود نہیں ہے۔"

"اچھا انسپکٹر! ایک کام کریں۔ ابھی کچھ دیر میں سب انسپکٹر راحیلہ اس اسلام آباد والے نمبر پر کال کریں گی۔ وہ نمبر اسلام آباد سے جاری ضرور ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت کراچی میں موجود ہے۔ آپ اس نمبر کو ٹریک کریں اور لوکیشن بتائیں۔ میں وہاں چھاپا مارنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"او کے سر! میں سب انسپکٹر راحیلہ کی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

میں نے اے ایس آئی شہاب کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ آپ ابھی موبائل وین لے کر جائیں اور ایس آئی راحیلہ کو یہاں لے آئیں۔"

"سر! ان کا ایڈریس؟" شہاب نے پوچھا۔

"آپ ان کا سیل نمبر نوٹ کر لیں اور ان سے ایڈریس معلوم کر کے وہاں پہنچ جائیں۔ وہ گلستان جوہر میں رہتی ہیں۔ آپ کو وہاں آنے اور جانے میں زیادہ سے زیادہ بیس منٹ لگیں گے۔" پھر میں نے دوسرا سیل فون نکالا اور سب انسپکٹر راحیلہ کا سیل نمبر اسے نوٹ کرا دیا۔

"او کے سر! میں ابھی جا کر انہیں لے آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے ایک علاقے کے پولیس اسٹیشن ٹیلی فون کیا۔ کافی دیر تک گھنٹی بجتی رہی، پھر کسی کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ "ہیلو!"

"کون بول رہا ہے؟" میں نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"میں اے ایس آئی شکور ہوں سر! آپ کون؟"

"اے ایس آئی شکور صاحب! آپ اس وقت ڈیوٹی پر ہیں شاید؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ڈیوٹی پر ہوں جناب اسی لیے تو آپ سے بات کر رہا ہوں۔ آپ فرمائیے کیا پرابلم ہے؟"

"اے ایس آئی شکور صاحب! محکمہ آپ کو پولیس اسٹیشن میں سونے کی تنخواہ نہیں دیتا۔ میں ایس ایس پی کمال بول رہا ہوں۔"

"سر!" اے ایس آئی نے مستعد لہجے میں کہا۔ اس کی نیند اچانک اڑ گئی اور لہجے میں وہ طنز بھی نہیں رہا جو پہلے تھا۔ "سر! میں سو نہیں رہا تھا بلکہ باتھ روم میں تھا۔"

"تھانے میں اس وقت کتنی نفری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! یہاں آٹھ سپاہی اور دو اے ایس آئی، ایک سب انسپکٹر اور انچارج صاحب کو ملا کر کل بارہ آدمیوں کی نفری ہے۔"

"اور گاڑیاں کتنی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سر فی الوقت ایک ہی موبائل ہے۔" شکور نے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ انچارج صاحب بھی سو رہے ہوں گے۔ انہیں جگاؤ اور کہو کہ وہ مجھ سے ٹیلی فون پر بات کریں۔"

"بہتر سر!" اے ایس آئی نے کہا۔

میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر میں نے اپنے علاقے کے ایک دوسرے پولیس اسٹیشن میں ٹیلی فون کیا۔ وہاں دوسری ہی گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔ "ایس آئی فرید خان اسپیکنگ!" دوسری طرف سے جواب آیا۔

"ایس آئی فرید خان صاحب! میں ایس ایس پی کمال بول رہا ہوں۔"

"حکم سر!" ایسا لگا جیسے میرا نام سنتے ہی فرید خان اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا ہو۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ اس وقت بھی ڈیوٹی پر موجود ہیں اور چاق و چوبند ہیں۔ یہ بتائیے کہ اس وقت آپ کے پاس نفری کتنی ہے؟"

"سر! بارہ سپاہی ہیں جن میں سے ایک چھٹی پر ہے۔ تین اے ایس آئی ہیں، دو سب انسپکٹر اور انچارج صاحب۔"

"اس نفری میں آپ شامل نہیں ہیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"سر! میں نے بتایا تو ہے کہ دو سب انسپکٹر ہیں۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔"

"گویا سترہ افراد کی نفری ہے۔" میں نے کہا۔ "اور گاڑیاں کتنی ہیں؟"

"سر! ہمارے پاس دو پولیس وین ہیں اور ایک انچارج صاحب کی ذاتی جیپ ہے۔"

www.pkdigest.com

''انچارج صاحب کو اٹھائیں اور ان سے کہیں کہ وہ مجھے ٹیلی فون کریں۔''

''انچارج صاحب علاقہ گشت پر ہیں سر!'' اس نے جواب دیا۔

''اگر وہ علاقہ گشت پر ہیں تو انہیں سیل فون یا وائرلیس پر اطلاع دے دیں۔''

''اوکے سر!'' فرید خان نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کیا ہی تھا کہ پہلے پولیس اسٹیشن کے انچارج کا ٹیلی فون آگیا۔

''سر! میں انسپکٹر عزیز احمد بول رہا ہوں۔ ابھی اے ایس آئی شکور نے بتایا ہے کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب! ابھی تھوڑی دیر میں ہمیں شاید ایک جگہ چھاپا مارنے کی ضرورت پڑے۔ آپ ہر طرح سے تیار رہیں اور میرے ٹیلی فون کا انتظار کریں۔''

میں نے سلسلہ منقطع کیا ہی تھا کہ دوسرے ایس ایچ او کا ٹیلی فون آگیا۔

''سر! میں انسپکٹر اللہ بچایو بول رہا ہوں۔ ابھی سب انسپکٹر فرید خان نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''انسپکٹر صاحب! آپ اپنی پوری نفری سمیت تیار رہیں۔ ممکن ہے ہمیں ایک جگہ چھاپا مارنے کی ضرورت پڑے۔''

''بہتر ہے سر!'' انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''میں ابھی سب کو تیار رہنے کا حکم دے دیتا ہوں۔''

سب انسپکٹر راحیلہ پہنچ گئی تھی۔ وہ خاصی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا اور خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہوگئی۔

''راحیلہ! میں آپ کو ایک ٹیلی فون نمبر دے رہا ہوں۔ آپ اس سے بات کریں گی اور دیر تک باتوں میں الجھا کر رکھیں گی۔''

''اوکے سر!'' راحیلہ نے کہا۔ ''مجھے نمبر بتائیں۔''

''پہلے یہ تو اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے کیا کہنا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اس عورت کا نام بشریٰ ہے۔ آپ اس سے یہ کہیں گی کہ میں ڈاکٹر نسرین کی اسسٹنٹ ڈاکٹر سلمیٰ بول رہی ہوں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کی خیریت معلوم کرلوں۔ اب اس کی طبیعت کیسی ہے۔ اسے پیلیا ہوگیا ہے نا! آپ ایسا کریں کہ صبح اسے ڈاکٹر فرزانہ کو دکھا دیں۔ ڈاکٹر فرزانہ کا کلینک آپ کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے آپ انہیں میرا حوالہ دیجیے گا۔''

''ٹھیک سر! میں سمجھ گئی۔'' راحیلہ نے کہا۔ میں نے اپنا دوسرا سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کر کے راحیلہ کو دے دیا اور کہا۔ ''بیل جا رہی ہے۔'' میں نے سیل فون کا اسپیکر آن کر رکھا تھا۔

''تین چار گھنٹیوں کے بعد دوسری طرف سے ٹیلی فون اٹھالیا گیا اور کسی عورت کی غنودہ آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''ہیلو!'' راحیلہ نے لہجے کو حیرت انگیز طور پر باوقار بنا لیا۔ ''میں ڈاکٹر سلمیٰ بول رہی ہوں۔''

''کون ڈاکٹر سلمیٰ؟'' دوسری طرف سے بولنے والی کی آواز میں حیرت تھی۔

''آپ بشریٰ بول رہی ہیں نا؟'' راحیلہ نے کہا۔

''جی ہاں۔'' بشریٰ کی نیند اب اڑ چکی تھی۔ ''میں بشریٰ ہوں لیکن میں آپ کو پہچانی نہیں۔''

''آپ مجھے پہچان بھی نہیں سکتیں۔'' راحیلہ نے کہا۔ ''کافی عرصہ پہلے ملاقات ہوئی تھی۔''

میں نے راحیلہ کو یوں گھورا جیسے کوئی ڈائریکٹر، آرٹسٹ کو اس وقت گھورتا ہے جب وہ پہلے سے طے شدہ اسکرپٹ کے خلاف ڈائیلاگ بولتا ہے لیکن وہ اس کا کچھ نہیں کرسکتا کہ شو براہِ راست دکھایا جا رہا ہوتا ہے۔ میں بھی تلملا کر رہ گیا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ میں راحیلہ کو بری طرح جھڑک دوں۔

''دیکھیے، میں لاہور سے آئی ہوں۔'' راحیلہ اپنے ہی طور پر بول رہی تھی۔

اس کی طرف سے مایوس ہوکر میں نے کچھ فاصلے پر جا کر انسپکٹر رحمان کو کال کی۔ اس نے فوراً ہی میری کال ریسیو کرلی اور بولا۔ ''سر! میں ٹریکنگ کر رہا ہوں۔ یہ نمبر اس وقت کراچی کے مشرقی علاقے میں موجود ہے۔ جی ہاں، اب واضح ہوگیا۔ یہ علاقہ حسن اسکوائر اور نیپا چورنگی کے درمیان ہے ___ جی ہاں... اب مزید واضح ہوگیا جہاں اس وقت اردو سائنس کالج ہے، یہ اس علاقے میں موجود ہے... جی ہاں، یہ اردو سائنس کالج کے بالکل ساتھ والا علاقہ ہے... ہاں... اب یہ واضح طور پر ٹریک ہو رہا ہے۔ یہ نمبر اس وقت اسی علاقے میں ہے۔ آپ ایسا کریں، وہاں ابھی اور اسی وقت پہنچیں۔ میں بھی اپنا لیپ ٹاپ اور ٹریکر لے کر پہنچتا ہوں۔ اس نمبر سے دوبارہ بات ہوگی تو نہ صرف وہ گلی واضح ہو جائے گی بلکہ وہ مکان بھی واضح ہو جائے گا جہاں سے بات ہو رہی ہے۔ آپ سب انسپکٹر راحیلہ کو بات کرنے سے روکیں اور اس سے کہیں کہ وہ ابھی کچھ دیر بعد پھر فون کرے گی۔''

میں نے جیب سے اپنی ڈائری نکالی۔ اس پر لکھا کہ اب کسی طرح گفتگو بند کر دو اور بشریٰ سے کہو کہ میں ابھی تھوڑی دیر میں کال کرتی ہوں۔

پھر میں تیزی سے راحیلہ کی طرف بڑھا۔ وہ ابھی تک لگی ہوئی تھی۔ ''ارے آپ کوشش تو کریں۔''

میں نے اس دوران میں اپنی ڈائری راحیلہ کے آگے بڑھا دی۔

اس نے میری ہدایات پڑھیں پھر بولی۔ ''اچھا آپ اچھی طرح غور کریں، میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو فون کرتی ہوں۔ میرا بچہ اٹھ گیا ہے، وہ ابھی رونا شروع کر دے گا۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا راحیلہ!'' میں ''آپ'' سے تم پر آگیا۔ مارے غصے کے میرا برا حال تھا۔ ''تم نے اس سے اپنے طور پر گفتگو شروع کر دی۔''

پھر ہم لوگ بہت عجلت میں وہاں سے نکلے۔ اردو سائنس کالج وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

انسپکٹر رحمان ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ہم اس کی راہنمائی میں اردو سائنس کالج کے بالکل ساتھ بنے ہوئے بنگلوں کی طرف بڑھے۔

ایک گلی میں پہنچ کر اس نے کچھ حساب کتاب لگایا اور بولا۔ ''سب انسپکٹر راحیلہ! اب آپ ایک مرتبہ پھر اسی نمبر پر کال کریں۔ اگر اس نے ایک دفعہ بھی چند لمحوں کے لیے ہی کال ریسیو کرلی تو مجھے معلوم ہو جائے گا کہ کال کس بنگلے سے کی جا رہی ہے۔''

راحیلہ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارے سے اجازت دی اور اپنا سیل فون اس کے حوالے کر دیا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر نمبر ملایا اور فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر رحمان اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا اور اس میں مختلف قسم کے میٹرز وغیرہ فٹ کرنے لگا۔

اچانک دوسری طرف کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو!'' اس مرتبہ کسی مرد کی کرخت آواز سنائی دی۔

انسپکٹر رحمان نے پُرجوش انداز میں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ ہم لوگ مزید آگے بڑھ گئے۔ انسپکٹر رحمان پولیس کی ایک وین میں سوار تھا جو الیکٹرانک کے مختلف آلات سے لیس تھی۔ وہ گاڑی کے عقب میں تھا۔ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔

''دیکھیے جی! مجھے بشریٰ سے بات کرنی ہے۔'' راحیلہ نے کہا۔

''بشریٰ سو چکی ہے۔'' بولنے والے نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''یہ بھی کوئی وقت ہے بات کرنے کا؟''

انسپکٹر رحمان نے پُرجوش انداز میں ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں لاہور سے آئی ہوں اور....''

''صبح بات کیجیے گا۔'' کرخت مردانہ آواز نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

انسپکٹر رحمان نے فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ سیاہ گیٹ والا مکان ہے۔ کال یہیں ریسیو کی گئی ہے۔ بولنے والا یہاں سے مشکل سے چند میٹر کے فاصلے پر ہوگا۔''

میرے ساتھ شہاب اور اس کے چار آدمی تھے۔ انسپکٹر رحمان تھا۔ سب انسپکٹر راحیلہ تھی۔ میں اگر مزید نفری طلب کرتا تو اس میں خاصی دیر لگ جاتی۔ یوں بھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اے ایس آئی شہاب اور دو سپاہیوں کو بنگلے کی پشت پر بھیج دیا اور ان لوگوں کو ہدایت کر دی کہ مجھ سے سیل فون پر رابطہ رکھیں۔

پھر میں نے انسپکٹر رحمان کو دو آدمیوں کے ساتھ سامنے کے رخ پر چھوڑا اور خود انسپکٹر راحیلہ کو لے کر بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ ڈور بیل بجاؤں لیکن پھر خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا اور بنگلے کی باؤنڈری وال پر نظر ڈالی۔ وہ زیادہ اونچی نہیں تھی، بس شرط یہ تھی کہ بنگلے میں کتے موجود نہ ہوں۔ مجھے کتوں سے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ اس کے بعد جو انجکشن لگتے ہیں، وہ بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ پھر کتے اندر موجود لوگوں کو ہوشیار بھی کر سکتے تھے۔ بنگلے میں بشریٰ کے سوا نہ جانے کتنے آدمی تھے۔

میں نے گیٹ سے کچھ فاصلے پر جا کر باؤنڈری وال کا جائزہ لیا۔ وہاں قدرے اندھیرا تھا، ورنہ گیٹ سے بائیں طرف اسٹریٹ لیمپ روشن تھا اور وہاں خاصی روشنی تھی۔

میں تھوڑا سا اچھلا اور دیوار کے اوپری حصے کو پکڑ لیا۔ پھر میں نے اپنے جسم کا پورا بوجھ ہاتھوں پر ڈالا اور آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ یہ کام خاصا مشکل ہوتا ہے لیکن یہاں میری پولیس کی ٹریننگ کام آئی اور میں بہت آسانی سے دیوار پر چڑھ گیا۔ پھر میں نے ہاتھ نیچے بڑھا کر انسپکٹر راحیلہ کو بھی اوپر کھینچ لیا۔

''تمہارے پاس ریوالور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ریوالور تو نہیں ہے سر!'' اس نے جواب دیا۔ ''اگر

www.pkdigest.com

آپ...''

میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بہت احتیاط سے اندر کود گیا۔ وہ شاید کوئی کیاری تھی۔ یہاں کی زمین نرم اور مٹی بھربھری تھی۔ شاید وہاں کوئی چیز بونے کے لیے زمین کھودی گئی تھی۔ میرے کودنے سے ہلکی سی دھپ کی آواز آئی۔ میں نے راحیلہ کو بھی نیچے کودنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی پنجوں کے بل بے آواز کود گئی۔ اس قسم کے ایکشن میں تو وہ ماہر تھی۔

میں نے اپنی جیب سے دوسرا پسٹل نکال کر اسے دیا اور کہا۔ ''اس میں صرف نو راؤنڈز ہیں۔ کوشش کرنا کہ انہی سے کام چل جائے۔''

ہم دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے بنگلے کے اقامتی حصے کی طرف بڑھے۔ وہ بنگلا خاصا وسیع و عریض تھا لیکن اقامتی حصہ چھوٹا تھا۔ بقیہ حصے میں لان تھا۔ لان بھی کیا، اس وقت تو وہ خودرو جھاڑیوں اور گھاس پھوس کا جنگل لگ رہا تھا۔ البتہ لان کا کچھ حصہ قدرے بہتر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے سنوارنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں گھوم کر بنگلے کی عقبی سمت میں چلا گیا۔ ہم کسی بھی بنگلے میں اگر چوری چھپے داخل ہوں تو عقبی حصہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ راحیلہ میرے ساتھ ساتھ تھی اور اب وہ بہت چوکنا نظر آ رہی تھی۔

مجھے کسی ایسی کھڑکی کی تلاش تھی جو اندر سے بند نہ ہو مگر ابھی تک مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

پھر آخر میری کوشش رنگ لائی اور میں نے ایک کھڑکی پر دباؤ ڈالا تو اس کے دونوں پٹ کھل گئے۔

میں نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ اس کی روشنی میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کچن کی کھڑکی ہے۔ میں اچھل کر کھڑکی کی چوکھٹ پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ چند لمحے تک میں نے سن گن لینے کی کوشش کی کہ شاید وہاں پہلے سے کوئی موجود ہو مگر وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے راحیلہ کو بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی اچھل کر چوکھٹ پر چڑھی اور اندر آ گئی۔

میں نے سب سے پہلے کچن کا بغلی دروازہ کھول دیا کہ اگر ہنگامی صورت میں وہاں سے نکلنا پڑے تو آسانی رہے۔

پھر ہم دونوں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ اس وقت سب سے زیادہ مسئلہ میرے بھاری لانگ بوٹس کی وجہ سے تھا۔ میں اس قسم کی مہمات پر کریپ سول کے جوتے استعمال کرتا ہوں لیکن یہ مہم تو ہنگامی طور پر گلے پڑ گئی تھی۔

راحیلہ نے بھی سینڈلیس پہن رکھی تھیں لیکن اس نے ایک عقل مندی یہ کی کہ اپنی سینڈلیس کچن میں چھوڑ دیں۔

وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ میں دبے قدموں اسی کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر سے کسی مرد کی آواز آ رہی تھی۔ ''تو نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ لاہور میں تیرے کون سے رشتے دار رہتے ہیں؟''

''لاہور میں میرا کوئی رشتے دار کیا، جاننے والا بھی نہیں رہتا۔ وہ عورت نہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی؟''

''دیکھ بشریٰ! مجھے یہ معاملہ بہت خطرناک لگ رہا ہے۔ بھلا اس ڈاکٹر کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنا اتنا بڑا بنگلا تجھے رہنے کو دے دے، ساتھ میں ایک لاکھ روپے بھی دے اور بچے کے خرچے کے ایک ہزار روپے روزانہ دے۔ یہ کوئی لمبا چکر لگ رہا ہے۔''

''میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔ اس عورت کا فون آتے ہی میں نے ڈاکٹر نسرین کو ٹیلی فون کیا تھا۔ میں نے انہیں اس ٹیلی فون کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ بچے کو وہاں سے ہٹا دو بلکہ میں وہاں کسی کو بھیجتی ہوں۔ وہ فوری طور پر بچے کو وہاں سے لے جائے گا۔''

''پر ابھی تک کوئی آیا نہیں؟''

''ہاں، ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔'' بشریٰ نے جواب دیا پھر مسکرا کر بولی۔ ''تو جو آ گیا۔ اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''میں تو ٹرک لے کر ابھی تھوڑی دیر پہلے کراچی پہنچا تھا۔ سوچا تھا کہ تیرے ہاتھ کی پکی ہوئی گرم گرم روٹی کھاؤں گا اور...''

''اور کچھ نہیں۔'' بشریٰ نے چہک کر کہا۔

''اچھا، اب روٹی کھلا دی ہے تو گرما گرم چائے بھی پلا دے پھر...''

میں نے کہا نا کہ آج کچھ نہیں۔ جب تک وہ بچہ یہاں ہے میں سکون سے سو بھی نہیں سکتی۔''

''تو نے یہ مصیبت مول ہی کیوں لی ہے؟'' مرد نے کہا۔

''بچہ اس وقت کہاں ہے؟''

''وہ دوسرے کمرے میں سو رہا ہے منحوس! وہ یا تو سوتا رہتا ہے یا پھر روتا رہتا ہے۔''

''بشریٰ! وہ معصوم ہے، اسے ایسا نہ کہہ۔'' مرد نے کہا۔ ''اور پھر بچے تو سوتے ہی رہتے ہیں۔ تجھے اس کے سونے سے کیا پریشانی ہے؟''

میں نے راحیلہ کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں نے اپنے

اپنے پسٹل سنبھالے پھر میں نے دروازے پر زوردار لات ماری۔ دروازہ ایک لات میں چوپٹ کھل گیا۔ وہ اندر سے بند نہیں تھا۔

مجھے دیکھ کر اس عورت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ عورت کیا بلکہ بائیس تیئیس سال کی لڑکی تھی۔ مرد کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ وہ بھی شکل سے تیس سال کا ہو گا۔ اس کے ہاتھ پیر مضبوط اور بدن کسرتی تھا۔ وہ اس وقت سکتے کی سی حالت میں مجھے اور راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔

''تم بشریٰ ہو؟'' میں نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' راحیلہ نے مرد سے سوال کیا۔

''میرا نام مراد ہے جی! میں ٹرک ڈرائیور ہوں اور یہ بشریٰ میری بچپن کی منگ ہے۔'' اس نے ایک ہی سانس میں اپنا تعارف کرا دیا۔ وہ سیدھا سادہ محنت کش آدمی تھا۔

''بچہ کہاں ہے؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''کون سا بچہ؟'' بشریٰ اب خاصی سنبھل چکی تھی۔

راحیلہ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''سیدھی طرح بتائے گی یا پھر...'' راحیلہ نے اچانک اس کے کھلے بال پکڑ کر اسے زوردار جھٹکا دیا۔

''بچہ دوسرے کمرے میں ہے جی!'' بشریٰ کے بجائے مراد نے جواب دیا۔

میں نے راحیلہ کو دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا، وہ وہاں سے بچے کو اٹھا لائی۔ بچہ ابھی تک اسپتال کے کمبل میں تھا۔ بشریٰ نے اس کے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے۔ وہ اس معاملے میں ناتجربے کار تھی۔ اسے بچے پالنے کا سلیقہ کب ہو گا۔

''یہ بچہ کس کا ہے؟'' میں نے گرج کر پوچھا۔

''یہ جی، ڈاکٹر نسرین نے میرے حوالے کیا تھا اور کہا تھا کہ ایک دو دن اس بچے کو اپنے پاس رکھ لو۔ میں اس کے بدلے میں انعام کے طور پر تمہیں ایک لاکھ روپیا دوں گی۔''

''اور تم راضی ہو گئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تو جی میں یہ سمجھی کہ شاید ڈاکٹر صاحبہ کسی لاوارث بچے کی مدد کرنا چاہتی ہیں لیکن جب دوسرے دن میں نے ٹی وی پر خبریں دیکھیں تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بچہ کون ہے؟ میں نے گھبرا کر ڈاکٹر صاحبہ کو ٹیلی فون کیا اور ان سے کہا کہ میں یہ خطرناک کام نہیں کر سکتی۔ انہوں نے کہا کہ تم بس دو دن بچے کو سنبھال لو۔ میں تمہیں پانچ لاکھ روپے دوں گی۔ پھر انہوں نے ایک آدمی کے ذریعے دو لاکھ روپے مجھے بھجوا بھی دیے۔''

''تم ڈاکٹر نسرین کو کیسے جانتی ہو؟''

''لو جی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں تو بڑے صاحب کے زمانے سے ان کے گھر میں ہوں۔ میری ماں بڑے صاحب کی ملازمہ تھی۔ میں تو بچپن ہی سے ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ رہی ہوں۔''

''یہ بنگلا کس کا ہے؟''

''یہ بنگلا ڈاکٹر صاحبہ کا ہے لیکن وہ آج تک اس بنگلے میں نہیں رہیں۔ ان کا ایک بنگلا ڈیفنس میں بھی ہے۔ وہ کبھی کبھار چھٹی گزارنے کے لیے وہاں چلی جاتی ہیں۔ یہاں صرف ایک چوکیدار رہتا ہے۔ جب وہ بچہ لے کر آئیں تو انہوں نے چوکیدار کو بھی اپنے ڈیفنس والے بنگلے پر بھیج دیا اور مجھے بچے کے ساتھ یہاں چھوڑ گئیں۔

میں نے غور سے بچے کا جائزہ لیا۔ میں اس بچے کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کے چہرے میں ماں کے ساتھ ساتھ باپ کی شباہت تھی اور سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال سیاہ۔ وہ مجھے اس وقت کچھ کمزور اور بیمار لگ رہا تھا۔ میں نے پیدائش کے فوراً بعد اسے دیکھا تھا۔ وہ خاصا ایکٹو تھا۔

''راحیلہ! تم بچے کو لے کر باہر جاؤ اور گاڑی میں بیٹھو۔''

راحیلہ بچے کو لے کر باہر چلی گئی۔

میں نے بشریٰ سے کہا۔ ''تم ابھی ڈاکٹر نسرین کو ٹیلی فون کرو اور ان سے کہو کہ کوئی نامعلوم عورت بار بار ٹیلی فون کر رہی ہے اور بچے کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔''

بشریٰ نمبر ڈائل کر رہی تھی کہ ایک سپاہی اندر آیا اور بولا۔ ''سر! اے ایس آئی شہاب نے ایک بندے کو پکڑ لیا ہے۔ وہ بنگلے کے پیچھے سے باؤنڈری وال پر چڑھ رہا تھا۔''

''اس سے کہو کہ وہ اس شخص کو یہیں لے آئے۔''

اس دوران میں بشریٰ ڈاکٹر نسرین کا نمبر ملا چکی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سیل فون کا اسپیکر کھول دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی دوسری طرف سے ٹیلی فون اٹھا لیا گیا اور ڈاکٹر نسرین کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''اب کیا بات ہے بشریٰ؟''

''ڈاکٹر صاحبہ! کوئی اجنبی عورت کئی بار ٹیلی فون کر چکی ہے۔ اور وہ...''

''کیا ابھی تک دلاور وہاں نہیں پہنچا؟''

''نہیں جی! یہاں تو کوئی نہیں پہنچا۔'' بشریٰ نے جواب دیا۔

www.pkdigest.com

’’ابھی تھوڑی دیر میں دلاور وہاں پہنچ جائے گا۔ ہاں، اب اس عورت کا ٹیلی فون آئے تو تم جواب ہی مت دینا۔ بچہ تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

’’جی ہاں، بچہ ٹھیک ہے۔‘‘ بشریٰ نے کہا۔

’’ابھی تھوڑی دیر میں دلاور وہاں پہنچ جائے گا۔ تم بچے کو لے کر اس کے ساتھ چلی جانا اور اب بار بار مجھے پریشان مت کرو۔ میں صبح خود تم سے بات کرلوں گی۔‘‘ یہ کہہ کر ڈاکٹر نسرین نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اسی وقت انسپکٹر شہاب ایک شخص کو گھسیٹتا ہوا وہاں لے آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔

’’آپ لوگوں نے مجھے کیوں پکڑا ہے؟‘‘ نوجوان نے کہا۔ وہ اپنے حلیے اور چہرے مہرے سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔

’’رات کے اس پہر کسی بنگلے کی دیوار پھلانگنا کوئی نیک کام نہیں ہے۔ تم اس بنگلے میں گھسنے کی کوشش کیوں کررہے تھے؟‘‘

’’یہ میرا اپنا بنگلا ہے۔‘‘ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ’’باہر والے تالے کی ایک چابی میرے پاس بھی ہوتی ہے۔ آج میں چابی لے جانا بھول گیا تھا اس لیے...‘‘

اے ایس آئی شہاب کا زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ ’’کبھی کہتا ہے کہ میرا بنگلا ہے، کبھی کہتا ہے کہ میں اپنے دوست کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔‘‘

’’تمہارا نام کیا ہے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’میرا نام دلاور ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں جھپٹ کر سیل فون اس سے لے لیا اور اسے کان سے لگا کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’ہیلو!‘‘

’’دلاور! تم کہاں ہو؟ کیا ابھی تک اس بنگلے پر نہیں پہنچے؟‘‘

میں بری طرح کھانسنے لگا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ’’میں وہاں پہنچ چکا ہوں اور اس عورت اور بچے کو لے کر آرہا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر میں پھر کھانسنے لگا۔

’’ٹھیک ہے، فوراً پہنچو۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا ناک میں دم کردیا ہے کہ دلاور ابھی تک وہاں کیوں نہیں پہنچا۔ جلدی پہنچو۔ میں ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دے دیتی ہوں کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

☆☆☆

میں نے سب سے پہلے بچے کو انور کے حوالے کیا پھر ڈاکٹر نسرین کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد دلاور کی مدد سے کورنگی کے اس مکان پر چھاپا مارا جہاں وہ لوگ موجود تھے جو انور سے تاوان کا مطالبہ کررہے تھے۔ وہ سب عادی چور اور بدمعاش تھے۔ ان میں سکندر بھی تھا۔ وہ یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹس تھا۔ دیکھنے میں وہ خاصا معقول لگتا تھا لیکن غلط صحبت میں پڑ کر ایسا ہوگیا تھا۔ وہ ڈاکٹر نسرین کے ایک جاننے والے کا بیٹا تھا اور اکثر ڈاکٹر نسرین کے پاس آتا رہتا تھا۔

☆☆☆

’’ایک سوال تو رہ ہی گیا؟‘‘ انور نے پوچھا۔ ’’ڈاکٹر نسرین نے بچے کو یہاں سے باہر کیسے نکالا؟‘‘

’’ہاں، یہ لاکھ روپے کا سوال ہے۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’ڈاکٹر نسرین کی عادت ہے کہ وہ اوٹی سے فارغ ہونے کے بعد کھانا کھاتی ہے۔ اس نے راؤنڈ کے موقع پر مریم بھابی کو جو انجکشن دیا تھا، وہ خواب آور دوا کا انجکشن تھا۔ پھر راؤنڈ کے بعد وہ دوبارہ چھپتی چھپاتی بھابی کے کمرے میں پہنچی اور بچے کو بھی خواب آور دوا کا انجکشن لگا دیا۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے اسے معلوم تھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ دوا کی کتنی مقدار برداشت کرسکتا ہے اور کتنی دیر تک بے ہوش رہ سکتا ہے۔ یہ کارروائی کرنے کے بعد وہ دوبارہ روم میں آئی۔ اس وقت احمد بخش اس کے لیے کھانا لے آیا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ احمد بخش کھانے کے بعد چائے یا کافی لے کر آتا تھا تو اپنی ٹرالی وہیں چھوڑ جاتا تھا۔ پھر وہ خالی برتن ٹرالی کے اوپری حصے میں رکھ کر کچن میں لے جاتا تھا۔ مجھے احمد بخش ہی کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہاں سے کچن کو بھی ایک راستہ جاتا ہے جس کا دروازہ رات کو بند ہوتا ہے لیکن وہ دروازہ اندر سے بند ہوتا ہے۔ جب احمد بخش ڈاکٹر نسرین کے لیے چائے لینے گیا تو ڈاکٹر نسرین نے پھرتی سے بچے کو بھابی کے کمرے سے اٹھایا اور اسے گدے سمیت ٹرالی کے نچلے خانے میں رکھ کر اوپر سے پردہ ڈال دیا۔ احمد بخش آیا اور خالی برتن ٹرالی کے اوپری حصے میں رکھ کر چلا گیا۔

’’اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نسرین بھی کمرے سے نکلی۔ وہ مین گیٹ سے گزرے بغیر اندرونی دروازے سے کچن میں پہنچی اور وہاں سے بچے کو لے کر باہر نکل گئی۔ بچے کو اس نے اپنی گاڑی میں ڈالا اور خود اسی راستے سے واپس آگئی۔ پھر کچھ دیر بعد اس نے سکندر کو ٹیلی فون کیا اور کہا کہ اسپتال کے پارکنگ لاٹ میں میری گاڑی کھڑی ہے۔ اس میں ایک بچہ بھی ہے۔ تم ابھی اسپتال پہنچو اور اس بچے کو میرے گلشن اقبال والے بنگلے پر پہنچا دو۔ وہاں بشریٰ موجود ہوگی۔ تم اسے بشریٰ کے حوالے کردینا۔‘‘

’’لیکن اس نے ایسا کیوں کیا؟‘‘ انور نے پوچھا۔

’’اس کا جواب تو ڈاکٹر نسرین خود ہی دے گی۔‘‘ میں نے کہا۔

☆☆☆

ڈاکٹر نسرین کو عدالت میں پیش کیا گیا تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ وہاں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے لوگ بھی موجود تھے۔ جب جج نے اس سے بیان دینے کو کہا تو وہ بولی۔

’’جج صاحب! محبت بہت بری بلا ہے۔ یہ ایک روگ ہے۔ ایک کینسر ہے۔ انسان اس میں مبتلا ہوجائے تو کہیں کا نہیں رہتا۔ میں بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ جی ہاں، یہی اسد جواب مرزا اسد بیگ کہلاتا ہے اور وفاقی وزارت داخلہ کا چیف سیکریٹری ہے۔ میں اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ اس نے ہمیشہ میری محبت کا جواب نفرت سے دیا۔

’’میں اس کی محبت میں اندھی ہورہی تھی۔ میں نے اسد کی خوشامدیں کیں، منتیں کیں لیکن اس سنگدل کو مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ حالانکہ میں اس کی بیوی سے حسن میں کسی بھی طور کم نہیں تھی۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا کہ میری منگنی ہوچکی ہے ورنہ شاید میں تم سے شادی کرلیتا۔

’’میں نے اس کی محبت میں زندگی بھر شادی نہیں کی اور بار بار اس سے یہی کہا کہ اگر تمہاری شادی ہوگئی ہے تو کیا ہوا... مرد تو چار چار شادیاں کرسکتے ہیں۔ اس ظالم پر اس بات کا اثر بھی نہیں ہوا۔

’’اصل میں شروع میں اس کا رویہ ایسا تھا کہ میں خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ اسد مجھ سے محبت کرتا ہے۔ وہ مجھ سے ذومعنی باتیں کرتا تھا، مجھے عشقیہ شعر سناتا تھا۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ آؤٹنگ پر بھی لے جاتا تھا لیکن جب اس نے صاف صاف انکار کردیا تو میں یہ سمجھی کہ اسد محض میرے ساتھ فلرٹ کررہا تھا۔ اسی وقت سے میرے دل میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ عورت چاہے کسی بھی طبقے کی ہو، پڑھی لکھی ہو یا جاہل... انتقام میں اندھی ہوجاتی ہے۔ اس دوران میں اسد اسلام آباد چلا گیا۔ میں بھی اپنی مصروفیات میں گم ہوگئی لیکن میں اس کے بارے میں خبریں رکھتی تھی۔

’’اس کے بیٹے کی شادی ہوئی۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ شادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد بھی انور اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔ یہ سن کر مجھے نہ جانے کیوں خوشی ہوئی۔

’’اب یہ انور کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو ڈلیوری کے لیے میرے پاس ہی لایا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں انتقام کی آگ میں سلگ رہی ہوں۔ میں چاہتی تو ماں اور بچے دونوں کو آپریشن ٹیبل پر ہی ختم کرسکتی تھی لیکن ایک ڈاکٹر کبھی ایسا نہیں کرسکتا۔ میں نے اسد اور اس کے گھر والوں کو اذیت دینے کا ایک اور پروگرام بنایا۔ میں نے انور کے بچے کو اغوا کرلیا۔ میں اس سے تاوان بھی ضرور لیتی۔ میں جانتی تھی کہ دس کروڑ ان لوگوں کے پاس نہیں ہوں گے لیکن ان کی ساری جائداد، گاڑیاں اور زیورات بکنے کے بعد چھ سات کروڑ تو ہو ہی سکتے تھے۔ میں انہیں کنگال کردینا چاہتی تھی لیکن ایس ایس پی کمال نے میرا سارا پروگرام چوپٹ کردیا۔‘‘

ڈاکٹر بولتے بولتے تھک گئی تھی۔ اس لیے نڈھال سی ہوکر وہیں بیٹھ گئی۔

کئی پیشیوں کے بعد عدالت نے اسے پانچ سال قید بامشقت اور پچاس لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنادی۔ سکندر اور اس کے ساتھیوں کو اغوا میں معاونت کرنے پر تین تین سال کی قید بامشقت سنائی گئی۔

یوں میں نے انور سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر شائستہ آج بھی میری احسان مند ہے۔ میں نے شاہد سے نہ صرف اس کی تصویروں کے تمام پرنٹ حاصل کرلیے بلکہ ان کے نیگیٹیو بھی لے لیے۔ شاہد کو بھی بلیک میلنگ اور ایک لڑکی کو ہراساں کرنے کی پاداش میں سزا ہوچکی ہے۔

ڈاکٹر شائستہ اکثر فرحانہ کے پاس آجاتی ہے اور کہتی ہے۔ ’’مسز کمال! آپ بہت لکی ہیں کہ آپ کو مسٹر کمال جیسے شوہر ملے۔‘‘

فرحانہ مسکرا دیتی ہے لیکن بعد میں طنزیہ انداز میں مجھ سے کہتی ہے۔ ’’کہیں یہ خود تو ’’لکی‘‘ نہیں بننا چاہ رہی؟‘‘

’’اگر چاہے بھی تو کیا حرج ہے؟‘‘ میں اسے چھیڑتا ہوں۔

’’میں ڈاکٹر نسرین نہیں ہوں کہ آپ کے بچے کو اغوا کروں گی۔ آپ ضرور شائستہ سے شادی کریں۔ میں اپنے بچے کو بمع ٹینک وغیرہ یہاں سے لے کر چلی جاؤں گی۔‘‘

میں اس کی بات پر ہنسنے لگتا ہوں۔ راقم بات سمجھ میں نہ آنا کے باوجود کھلکھلانے لگتا ہے۔ اسے ہنستا دیکھ کر فرحانہ بھی مسکرانے لگتی ہے۔

www.pkdigest.com

سلسلۂ خواب

ساجد امجد

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان ہر اس راہ سے گزرتا ہے جو اس کے قدم جکڑ کر ہمیشہ کے لیے اُسے اپنا بنا سکتی ہے لیکن جب ذہن دھندلا اور دل میں کسک ہو تو زمین پاؤں نہیں پکڑتی اور خلش کی آندھی اُسے ہمیشہ در در بھٹکائے پھرتی ہے۔ اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر زندگی کی گاڑی کو دھکیلتے ہوئے منزل کی واضح تصویر ذہن میں نہ رہے تو پھر منزل مل کر بھی نہیں ملتی۔ اس کی تقدیر میں بھی کچھ ایسا ہی لکھا تھا

خوابوں کے بھنور میں گھرے اس جفا گزیدہ کا ماجرا جس کی سرشت میں وفا تھی

یتیم خانے کا مرکزی دروازہ چلتی سڑک پر تھا لیکن یہ ایسی شاہراہ نہیں تھی جس پر گاڑیوں کی لمبی قطاریں راستہ روکے رہتیں... البتہ پچھلا دروازہ ایک وسیع میدان کی جانب کھلتا تھا۔ سرخ رنگ کی اس عمارت سے ملحق، یتیم خانے کے منیجر افضال شاہ کا مکان تھا۔

برسات کے دنوں میں یہ میدان خودرو جھاڑیوں سے بھر جاتا تھا اور بالکل جنگل کا سماں پیش کرتا تھا۔ لوگوں کی آمدورفت بھی کم ہو جاتی تھی۔ فٹ بال کھیلنے والے لڑکے بھی غائب ہو جاتے تھے۔ یہ بھی برسات کے دن تھے لہٰذا میدان، جنگل بنا ہوا تھا۔

یتیم خانے کا پچھلا دروازہ صرف افضال شاہ کے استعمال میں تھا یا پھر وہ لڑکے استعمال کرتے تھے جو میدان میں کھیلنے کے لیے نکلتے تھے۔ اس وقت بھی افضال شاہ کسی کام سے اپنے گھر جانے کے لیے نکلا تھا کہ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر روتے ہوئے بچے پر پڑی... بچے کی عمر کسی طرح بھی تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ بچہ افضال شاہ کو دیکھتے ہی سہم گیا اور اس نے رونا بند کر دیا۔

افضال شاہ نے بچے کو دیکھ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ اسے ایک عورت نظر آئی جس نے افضال شاہ کو دیکھ کر تیز تیز دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ افضال شاہ اس عورت کی طرف جانے ہی والا تھا کہ بچے نے دوسری سمت بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ اس بچے کی طرف متوجہ ہوا، اتنی دیر میں وہ عورت نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاید وہی عورت اس بچے کو یہاں چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ اس وقت تک وہاں کھڑی رہی جب تک کوئی اس عمارت سے نکل کر بچے کو دیکھ نہ لے اور جونہی افضال شاہ دروازے سے نکلا اور اس کی نظر بچے پر پڑی، وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

افضال شاہ نے اس بچے کو پکڑا اور دوبارہ یتیم خانے کے دروازے پر لے آیا۔ گود میں اٹھاتے ہوئے اس کی نظر بچے کی جیب میں رکھے کاغذ پر پڑی۔ اس نے کاغذ نکالا اور پڑھنے لگا۔

”آپ جو کوئی بھی ہیں اس بچے کو یتیم خانے میں داخل کرا دیں اور اس کی تعلیم کا بندوبست بھی کر دیں۔ میں نے اس کے باپ کو مار دیا ہے۔ یہ بتانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ کیوں؟ میں خودکشی کرنے جا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں میرا بیٹا زندہ رہے۔ اگر میں بچ گئی یا مجھے جیل ہو گئی تو جیل سے چھوٹ کر اسے لینے آ جاؤں گی۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ میرا بیٹا آپ کے سپرد۔ اس کا نام تصویر خان ہے۔ آپ چاہیں تو اسے کوئی اور نام بھی دے سکتے ہیں۔

ایک بدنصیب ماں!“

افضال شاہ نے اس تحریر کو پڑھا اور پھر بچے کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی کسی ماہر آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ اس نے ایسا خوب صورت بچہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

تحریر پڑھتے ہی اس کی سمجھ میں پوری بات آ گئی۔ یہ عورت اس بچے کو یتیم خانے داخل کرانے آئی تھی لیکن خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟“

”تصویر خان۔“

”تمہارے ابو کا نام کیا ہے؟“

”نادر۔“

”اور امی کا؟“

”خانم۔“

”اچھا یہ بتاؤ، تم رہتے کہاں ہو؟“

”گھر میں۔“ اس نے کہا تو افضال شاہ کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”میرے گھر رہو گے؟“

”امی پاس جاؤں گا۔“

افضال شاہ نے پہلے تو یہ سوچا کہ اسے یتیم خانے میں داخل کر لے لیکن پھر کچھ سوچ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور گھر کی طرف چل دیا۔ اس نے اس کی ماں کی طرف سے لکھا ہوا پرچہ اپنے پاس رکھ لیا تاکہ اگر کسی وقت کوئی قضیہ کھڑا ہو تو کام آئے۔

افضال شاہ کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی شادی کو پندرہ سال ہو چکے تھے لیکن وہ ابھی تک اولاد سے محروم تھا۔ بچے کو دیکھ کر اسے ایسا پیار آیا کہ اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے اپنا بیٹا بنائے گا، اسے اپنا نام دے گا۔ اسے یتیم خانے میں نہیں کسی بڑے اسکول میں تعلیم دلائے گا۔ قدرت کے کام نرالے ہوتے ہیں۔ خدا نے مجھے بیٹھے بٹھائے اولاد دے دی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی بیوی افضال شاہ کی گود میں بچے کو دیکھ کر چونک پڑی۔

www.pkdigest.com

"اب یتیم خانے کے بچوں کو تم گھر بھی لانے لگے۔"

"یہ یتیم خانے کا بچہ نہیں ہے۔"

"پھر کہاں سے اٹھا لائے؟"

"یہ میرا بیٹا ہے۔ میرا ولی عہد تصویر خان۔ ہے نا بالکل تصویر۔"

"ہاں، ہے تو خوب صورت لیکن تمہارا بیٹا کہاں سے ہوگیا؟ جب قدرت نے مجھے محروم رکھا تو میں مانگے تانگے کی اولاد کو اپنا بیٹا کیوں کہوں؟"

"رہیں جاہل کی جاہل...... پوری بات تو سنو۔"

"مجھے نہیں سننی کوئی بات۔"

افضال شاہ نے دروازہ بند کیا تاکہ تصویر خان باہر نہ نکل جائے اور خود اپنی بیوی کو سمجھانے کمرے میں چلا آیا۔ وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھی لیکن افضال شاہ نے جلدی جلدی پورا قصہ سنا دیا۔

"اچھا ہوا یہ قصہ آپ نے مجھے سنا دیا۔ اب تو اور خطرے کی بات ہے۔ آپ فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرائیں۔ قتل ہوا ہے، کل کو وہ عورت پکڑی گئی تو الزام آپ پر بھی آسکتا ہے۔"

"مجھ پر الزام ایسے ہی آجائے گا؟ اس کی ماں خود اسے میرے پاس چھوڑ کر گئی ہے۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ میرے پاس ثبوت ہے۔"

"معاف کرنا افضال شاہ! اس کی ماں اسے یتیم خانے چھوڑ کر گئی ہے، تمہارے گھر میں نہیں۔ یتیم خانے کے رجسٹر میں اس کا اندراج تک نہیں۔"

"اندراج میں کرلوں گا لیکن یہ رہے گا اسی گھر میں۔"

"کوئی پوچھے گا نہیں کہ تم اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"میں کچھ بھی کہہ دوں گا۔ اس وقت میرا دماغ مت خراب کرو۔"

"کوئی وقت پڑا تو یہ پرچہ تم پولیس کو دکھا بھی نہیں سکتے۔"

"وہ کیوں؟ کیوں نہیں دکھا سکتا؟"

"اس لیے کہ اس پرچے میں ایک قتل کا ذکر ہوا ہے۔ پولیس کہے گی نہیں کہ تم نے اس قتل کی اطلاع پولیس کو کیوں نہیں دی؟ شاید قاتل عورت پکڑی جاتی۔"

"میں یہ پرچہ بھی ضائع کردوں گا اور پولیس مجھ تک پہنچے گی کیوں؟" افضال شاہ نے کہا۔ "تم سے بس اتنی درخواست ہے کہ اسے اپنا بیٹا سمجھو کیونکہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے ساتھ تم نے اگر کوئی زیادتی کی تو میں تمہیں اپنی بیوی سمجھنا چھوڑ دوں گا۔"

"یہ اچھی زبردستی ہے۔"

"زبردستی ہے تو زبردستی سہی۔" افضال شاہ نے کہا پھر خوشامد پر اتر آیا۔ "دیکھو راحیلہ! بن ماں باپ کا بچہ ہے اور بہت چھوٹا ہے۔ یہ ماں سے بچھڑ گیا ہے۔ تم اس سے پیار کرو گی تو یہ تمہیں ماں سمجھے گا۔ جس طرح تم اس کا خیال رکھ سکتی ہو وہ میں نہیں رکھ سکتا۔ تم ثواب سمجھ کر اسے قبول کرلو۔ میں تم سے راضی، میرا خدا تم سے راضی۔"

"تمہاری خاطر خیال بھی رکھ لوں گی لیکن بیٹا نہیں سمجھوں گی۔ کہہ دیا ہے میں نے۔"

افضال شاہ یتیم خانے جانے کے لیے کمرے سے نکلا تو اس نے دیکھا، بچہ فرش پر بے سدھ سو رہا ہے۔ وہ بڑی دیر تک اس خوب صورت بچے کو دیکھتا رہا پھر قدرے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور کمرے میں لے آیا۔

"یہ سوگیا ہے۔ اسے میں بستر پر لٹا رہا ہوں۔ اٹھ جائے تو اسے کچھ کھلا دینا۔"

"کیا کھلا دوں؟"

"گھر میں سب ہی کچھ تو ہے۔ کچھ بھی کھلا دینا۔ دودھ دے دینا، دودھ تو پیتا ہی ہوگا۔ ضروری کام نمٹا کر جلد ہی آتا ہوں پھر اسے کہیں گھمانے لے جاؤں گا۔"

افضال شاہ کے جانے کے بعد اس کی بیوی سوتے ہوئے بچے کو دیکھنے لگی۔ کتنا خوب صورت بچہ ہے۔ نہ جانے کس کے گھر کا اجالا ہوگا؟ کیسی ماں ہے جو اسے چھوڑ کر چلی گئی؟ وہ آگے بڑھی اور بچے کے رخساروں پر اپنے لب رکھ دیے۔

اس کی مجبوری تھی کہ اس نے افضال شاہ کے سامنے بچے کو برا بھلا کہہ دیا تھا لیکن اب اس کے اندر چھپی ہوئی ممتا نے ہاتھ پھیلا دیے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بچے کے رخساروں کو بوسہ دیا اور آہستہ سے اس کے برابر ہی لیٹ گئی۔ بچہ تھوڑا سا کسمسایا اور پھر سو گیا۔

افضال شاہ یتیم خانے پہنچا تو گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے کوئی خزانہ چرایا ہو اور گھر کے کسی کونے میں چھپا کر آگیا ہو اور اب چوری پکڑے جانے کا اندیشہ ہو۔ وہ اپنی بیوی کی باتوں سے ڈر گیا تھا۔ راحیلہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے پولیس میں رپورٹ درج کرانی چاہیے۔ قتل ہوا ہے تو قاتل پکڑا بھی جانا چاہیے اور یہ کام پولیس کرسکتی ہے اور تصویر خان؟ اس چکر میں کہیں وہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ وہ کیوں چھن جائے گا؟ پولیس اسے کہاں رکھے گی؟ عدالت یہی کہے گی کہ بچے کو یتیم خانے میں رہنے دیا جائے۔ خدا کرے اس کی ماں نے خودکشی کرلی ہو۔

پھر تو یہ بچہ ہمیشہ کے لیے میرے پاس ہی رہے گا۔ وہ بڑی دیر تک اپنے خیالوں سے لڑتا رہا۔ پھر اسے اسلم ایڈووکیٹ کا خیال آیا۔ اسلم ایڈووکیٹ، یتیم خانے کے قانونی معاملات کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گیا۔

"میں وکیل صاحب کی طرف جارہا ہوں۔" اس نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا اور دفتر سے نکل گیا۔

وہ وکیل کے دفتر میں بیٹھا تھا اور اسے اب تک کے تمام واقعات سے آگاہ کر رہا تھا۔ تمام واقعات سن کر وکیل کا مشورہ بھی یہی تھا کہ پولیس میں رپورٹ کرنی چاہیے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔" افضال شاہ نے کہا۔ "لیکن ہم کہاں رپورٹ درج کرائیں گے...... میرا مطلب ہے کس تھانے میں؟ ہمیں کیا معلوم کہ قتل کس علاقے میں ہوا ہے۔ بچے کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا گھر کہاں ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" وکیل نے کہا۔ "ہم اپنے علاقے کے تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے پابند ہیں کیونکہ وہ عورت اپنا بچہ یہاں چھوڑ کر گئی ہے۔ پولیس اپنے طور پر تفتیش کرے گی کہ قتل کہاں ہوا ہے۔"

"میں نے بچے کو اپنے بیٹے کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ وہ مجھ سے چھن تو نہیں جائے گا؟"

"اگر اس کے ماں باپ اس دنیا میں نہیں رہے تو وہ تم [illegible] کرے گا؟"

"اس کے رشتے دار بھی تو ہوں گے۔ وہ دعویٰ کریں گے؟"

"اگر رشتے دار ہوتے تو اس کی ماں اسے یتیم خانے چھوڑ کر نہ جاتی۔ بہرحال، یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے ہم پولیس کو اطلاع کردیں کہ بچہ ہمارے پاس ہے۔"

اسلم ایڈووکیٹ اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن گیا۔ اتفاق کہ یہ کیس اسی علاقے کا تھا۔ پولیس کو اس قتل کی اطلاع پہلے ہی ہوچکی تھی۔ محلے والوں نے ایف آئی آر بھی درج کرا دی تھی جس میں مقتول کی بیوہ کو نامزد کیا گیا تھا۔ پولیس نے افضال شاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کو پابند کیا کہ وہ عورت اگر اپنے بچے سے ملنے آئے تو فوراً اطلاع کرے۔

دوسرے دن اس عورت کی لاش ایک کنوئیں سے مل گئی۔ کسی نے اسے کنوئیں میں کودتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن جب تک لوگ جمع ہوتے اور اسے نکالنے کا بندوبست کیا جاتا، وہ مر چکی تھی۔ محلے والوں نے اس کی شناخت بھی کرلی۔

اسلم ایڈووکیٹ نے افضال شاہ کی طرف سے عدالت میں درخواست پیش کی کہ تصویر خان کے ماں باپ مر چکے ہیں اور چونکہ اس کی ماں اسے یتیم خانے میں چھوڑ گئی تھی اس لیے اسے کسی رشتے دار کے حوالے نہ کیا جائے۔ افضال شاہ لاولد ہے اس لیے اجازت دی جائے کہ وہ تصویر خان کو اپنی فرزندی میں لے لے۔

چند سماعتیں ہوئیں۔ افضال شاہ بھی پیش ہوا اور اس کی بیوی بھی۔ افضال شاہ کو ڈر تھا کہ کہیں اس کی بیوی عدالت میں یہ نہ کہہ دے کہ وہ تصویر خان کو گود لینے پر تیار نہیں ہے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ راحیلہ نے جج کے سامنے رو رو کر کہا کہ وہ بے اولاد ہے۔ اگر یہ بچہ اسے مل جائے تو وہ سمجھے گی یہ اسی کا بیٹا ہے۔ اس کا اور افضال شاہ کا بیٹا۔

"تم نے میری لاج رکھ لی راحیلہ۔" افضال شاہ نے عدالت سے واپس آتے ہوئے کہا۔

"اب اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں کسی کی اولاد کو اپنا بیٹا سمجھوں گی۔"

"بیگم...... خدا کے دینے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ اس نے ہمیں اس طرح بیٹا دے دیا۔"

"تم ہی سمجھو اسے بیٹا...... میرا بیٹا تو وہی ہوگا جو میری کوکھ سے جنم لے گا۔"

افضال شاہ چپ ہوگیا۔ یہی بہت ہے کہ وہ اسے گھر میں رکھنے کو رضامند ہے۔ اسے کھانے پینے کو بھی دے ہی دیتی ہے۔ یہ بھی نہ کرتی تو میں کیا کرلیتا؟

تاخیر کا سبب

ٹیگور کا ذاتی ملازم ایک صبح کام پر نہ آیا جب دو گھنٹے گزر گئے تو ٹیگور سوچنے لگا کہ ملازم کو کیا سزا دی جائے۔ جب پانچ گھنٹوں کے بعد بھی وہ نہ آیا تو ٹیگور نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اسے آج ملازمت سے برطرف کر دے گا۔ کوئی چھ گھنٹے تاخیر سے ملازم آیا اور آتے ہی چپ چاپ کام شروع کردیا ٹیگور اس کی بے نیازی سے بہت مشتعل ہوا۔ مگر وہ بدستور خاموشی سے کام میں مصروف رہا۔ آخر وہ برس پڑا۔

"تم صبح سے اب تک کہاں تھے، یہ تمہارے آنے کا وقت ہے؟"

ملازم خاموشی سے کام میں لگا رہا۔ پھر دو تین منٹ کے وقفے کے بعد دھیمی آواز میں بولا۔

"بابو جی آج صبح میری ننھی سی بٹیا مرگئی اس کی تجہیز و تکفین کرتے دیر ہوگئی۔"

(مرسلہ: عبدالکریم خالد ضلع جھنگ)

www.pkdigest.com

راحیلہ کی نفسیات اس کے ساتھ عجیب کھیل، کھیل رہی تھی۔ وہ افضال شاہ سے تو یہی کہتی تھی کہ تصویر خان کا وجود اسے ناگوار گزرتا ہے لیکن جونہی افضال شاہ گھر سے نکلتا، وہ اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتی۔ اسے پیار کرتی۔ گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ پلکوں پر جگہ دے یا آنکھوں میں بٹھائے۔ دراصل وہ اس کے سامنے تصویر خان کو پیار کرکے یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ اولاد پیدا نہیں کرسکتی اس لیے پرائی اولاد کو پیار کررہی ہے۔ اکیلے میں اس کے اندر چھپا ہوا ممتا کا جذبہ پوری شدت سے ظاہر ہوجاتا تھا۔ افضال شاہ اس کی اس کیفیت کو دیکھ بھی رہا تھا اور لطف اندوز بھی ہورہا تھا۔

تصویر خان اتنا چھوٹا تھا کہ ایک حد تک ہی احتجاج کرسکتا تھا۔ کئی راتوں تک اس نے افضال شاہ اور راحیلہ کو جگائے رکھا۔ جب آنکھ کھلتی، اٹھ کر رونے لگتا۔ بس ایک ہی رٹ تھی۔ ''امی پاس جاؤں گا۔'' رفتہ رفتہ وہ اپنی ماں کو بھولتا گیا اور راحیلہ کو اپنی نئی ماں سمجھ کر اس کے پاس سونے لگا اور پھر تو جیسے وہ اپنی ماں کو بالکل ہی بھول گیا۔ شاید اس کے نخرے اٹھانے والے اس کے پچھلے گھر سے زیادہ اس گھر میں تھے۔ افضال شاہ تو اس کے ساتھ بچہ بن کر رہ گیا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ تصویر خان پڑھنے کی عمر کو پہنچا تو اسے اسکول میں داخل کرادیا گیا۔ افضال شاہ کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ اسے اچھے سے اچھے اسکول میں داخل کراسکتا تھا اور زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا سکتا تھا۔ اس نے سوچا بھی یہی تھا۔ اسی لیے شہر کے سب سے مہنگے اسکول میں داخل کرایا تھا لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہورہی تھی کہ اس کا پڑھنے میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ کھیل کود میں تو بڑا مشتاق تھا لیکن افضال شاہ اسے پڑھنے کے لیے بٹھاتا تو روتے رہنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں ہوتا۔ راحیلہ جل کر کہہ دیا کرتی تھی، کیا خبر کس خاندان کا ہے۔ اس کا باپ پڑھا لکھا نہیں ہوگا اسی لیے اس کا دل بھی پڑھائی میں نہیں لگتا۔ افضال شاہ کو اس کا کہنا برا ضرور لگتا لیکن دل ہی دل میں وہ بھی سوچتا تھا کہ شاید یہی بات ہو۔

کسی نہ کسی طرح وہ کلاسیں پھلانگتا رہا اور آٹھویں کلاس میں آگیا۔ افضال شاہ خوش تھا کہ بہر حال وہ یہاں تک پہنچ ہی گیا۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کا شوق اور بڑھے گا لیکن ایک روز افضال شاہ نے اس کی کتابوں میں فلمی رسالے رکھے ہوئے دیکھے تو وہ چونک گیا۔ بارہ سال کی عمر میں وہ ایسے فلمی رسالے پڑھتا ہے۔ راحیلہ تو کہہ رہی تھی اسے پڑھنے کا ایسا شوق ہوگیا ہے کہ ہر وقت کتاب منہ سے لگی رہتی ہے۔ کتاب نہیں فلمی رسالے تھے جنہیں وہ پڑھتا رہتا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ اس سے سختی سے بات کی اور پوچھنا چاہا کہ وہ کتابوں کے بجائے فلمی رسالے کیوں پڑھتا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تصویر خان کی آنکھوں میں ذرا بھی خوف نہیں تھا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب دیا کہ کتابیں اسے اچھی نہیں لگتیں اس لیے وہ فلمی رسالے پڑھتا ہے۔

''فلمی رسالوں سے زندگی نہیں بنتی۔ تعلیم مکمل کرو اور اچھی زندگی گزارو۔''

''میں فلموں میں کام کرکے آپ سے زیادہ دولت کما سکتا ہوں۔''

''فلموں میں کام کرنے کے لیے بھی تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔''

''جی نہیں، میں نے بہت سے اداکاروں کے بارے میں پڑھا ہے۔ وہ بالکل بھی پڑھے لکھے نہیں تھے۔''

''ان اداکاروں کے بارے میں بھی تو پڑھا ہوگا جو پڑھے لکھے تھے؟''

''پڑھا تو ہے لیکن ان کی طرح میرا دل پڑھائی میں لگتا ہی نہیں۔ میں کیا کروں؟''

''یہ تیرا قصور نہیں بیٹا، اس تعلیم کا قصور ہے جو تو حاصل کررہا ہے۔ تجھے تو بڑوں سے بات کرنا بھی نہیں آیا۔ کاش میں تجھے یتیم خانے میں رکھتا اور دینی تعلیم دلاتا۔''

اس رات افضال شاہ کی بے چینی عروج پر تھی۔ راحیلہ بار بار پوچھ رہی تھی لیکن اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا دل بس ایک ہی جواب دے رہا تھا کہ اب مجھے تصویر خان پر سختی کرنی چاہیے۔ یہ میرا ہی لاڈ پیار ہے جس نے اسے بگاڑ دیا ہے۔

وہ سوچ کر تو یہی سویا تھا لیکن صبح اٹھتے ہی سب کچھ بھول گیا۔ یتیم بچہ ہے، اس پر کیا سختی کرنی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ فلموں کا جنون چڑھا ہوا ہے، ایک دن اتر جائے گا۔

فلمی رسالے پڑھتے ہوئے بہت دن ہوگئے تھے۔ اب اس سے آگے کا سفر تھا۔ تصویر خان نے گھر سے پیسے چرائے اور پکچر ہال میں جاکر بیٹھ گیا۔ یہ سوچنے کی فرصت کہاں تھی کہ اس کے پیچھے اس کی تلاش ہوگی۔ افضال شاہ گھر آیا تو راحیلہ بیٹھی رو رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تصویر خان نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔ افضال شاہ نے اسے تسلی دی لیکن خود بھی پریشان ہوگیا۔ جہاں جہاں تلاش کرسکتا تھا، کر آیا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں تھا اور پھر ایک گانے کے بول گاتا ہوا

تصویر خان گھر میں داخل ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا جب افضال شاہ نے اس پر ہاتھ اٹھایا۔ وہ بھی اس وقت جب اسے معلوم ہوا کہ وہ فلم دیکھنے گیا تھا۔

افضال شاہ اور نہ جانے کتنی مرتبہ اس پر ہاتھ اٹھاتا لیکن یہ نوبت ہی نہیں آئی۔ افضال شاہ اچھا خاصا سویا تھا۔ رات میں کسی وقت اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ راحیلہ نے صبح اسے اٹھایا تو وہ مرچکا تھا۔

افضال شاہ کے انتقال کے بعد تصویر خان بہ مشکل چھ مہینے اس گھر میں رہ سکا تھا۔ فلمی رسالوں میں اس نے حسن پور کا نام بہت پڑھا تھا۔ یہ شہر فلمی منڈی تھا۔ یہاں کئی اسٹوڈیوز تھے۔ اس کے من پسند اداکار بھی اسی شہر میں رہتے تھے۔ تصویر خان نے سوچا، وہ کب تک اداکاروں کی تصویریں دیکھتا رہے گا۔ اگر وہ حسن پور چلا جائے تو ان اداکاروں کو سامنے سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔

وہ کبھی شہر سے باہر نہیں گیا تھا۔ کبھی ریل میں نہیں بیٹھا تھا لیکن اداکاروں کے دیدار کا ایسا شوق تھا کہ گھر سے بھاگ کر حسن پور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ عمر ہی کیا تھی، بارہ ساڑھے بارہ سال۔ اس عمر میں کوئی تانگے کا سفر بھی اکیلا نہیں کرسکتا جبکہ وہ رستے کی خبر ہو نہ منزل کا علم۔ تصویر خان نے ایک بیگ میں چند کپڑے پہلے ہی رکھ لیے تھے۔ کئی دن سے تاک میں لگا ہوا تھا۔ ماں کے رکھے ہوئے دو سو روپے بھی ہاتھ لگ گئے تھے۔ اسٹیشن جاکر یہ بھی معلوم کرآیا تھا کہ حسن پور جانے والی گاڑی کتنے بجے آتی ہے۔ وہ یہ سن کر خوش ہوا تھا کہ حسن پور کی گاڑی رات کے وقت روانہ ہوتی ہے۔ رات کے وقت ماں کے سونے کے بعد گھر سے نکلنے میں آسانی ہوتی اور نئے شہر میں صبح کے وقت پہنچنا بھی اچھا ہی تھا۔

راحیلہ کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ دس بجتے ہی بستر پر چلی جاتی تھی۔ افضال شاہ کے انتقال کے بعد تصویر خان اس کے کمرے ہی میں سونے لگا تھا لیکن وہ اتنی جلدی نہیں سوسکتا تھا۔ اس لیے وہ اس وقت کمرے میں آتا جب اسے نیند آنے لگتی۔ اس وقت بھی راحیلہ کے کمرے میں اس کا بستر لگا ہوا تھا۔ راحیلہ یہی سمجھ رہی تھی کہ جب اسے نیند آئے گی وہ آجائے گا جبکہ وہ اس وقت اسٹیشن پر تھا۔ گاڑی آنے ہی والی تھی۔ اسے حسن پور جانا تھا۔

☆☆☆

سیٹ بالکل تیار تھا۔ کیمرے کئی مرتبہ آنکھیں جھپکا کر اپنی درستی کا اعلان کرچکے تھے۔ فلم کا ہیرو اپنے گیٹ اپ میں تیار ایک طرف کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ منوہر جوشی جس کی اداکاری کی دھوم مچی ہوئی تھی، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ اس فلم میں دادا کا رول کررہا تھا۔ خلاف معمول وہ بھی وقت پر پہنچ گیا تھا۔ شوٹنگ دیکھنے والے بھی بے چینی سے انتظار کررہے تھے کہ کب کیمروں کی لائٹس روشن ہوتی ہیں اور کب سین فلمایا جاتا ہے۔ ہیروئن نوشین میک اپ روم سے نکلی تو یہ آس بندھ گئی کہ بس اب کچھ ہی دیر میں شوٹنگ کا آغاز ہوجائے گا کہ اچانک فلم کا ڈائریکٹر کسی طرف سے نمودار ہوا اور اپنے اسسٹنٹ کو ایک طرف لے جاکر اس سے کچھ مشورہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد منوہر جوشی بھی شامل ہوگیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔ فیصل کے بغیر تو یہ سین فلمایا ہی نہیں جاسکتا۔''

''اگر شوٹنگ کینسل کرتا ہوں تو ہزاروں کا نقصان ہوجائے گا۔''

''کینسل تو کرنا ہی پڑے گی۔ فیصل کے بغیر کیسے ہوگا؟''

''ایسا کرتے ہیں۔'' ہدایت کار نے مشورہ دیا۔ ''کہانی میں کچھ تبدیلی کردیتے ہیں۔ فیصل کا رول اس سین میں نہیں ڈالتے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ فیصل کی ٹانگ کئی جگہ سے ٹوٹ گئی ہے۔ اسے ٹھیک ہوتے ہوتے کئی مہینے لگ جائیں گے۔ تو کیا میں اس کے انتظار میں فلم روکے رکھوں؟ مجھے کسی اور بچے کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔'' ہدایت کار نے پھر کہا۔ ''یہ ہماری فلم کا پہلا سین ہے۔ اب تک فیصل کا کوئی سین نہیں فلمایا گیا ہے جو ہمیں یہ پریشانی ہو کہ اب چہرہ کیسے بدلیں۔ آج کا سین اس کے بغیر گزارلو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ کسی لڑکے کا انتخاب کرلیں گے۔ ویسے بھی اس سین میں فیصل کے صرف دو ڈائیلاگ تھے۔''

منوہر جوشی اس طویل مشاورت سے تنگ آچکا تھا۔ اس نے بھی دھمکی دے دی۔ ''آپ لوگوں کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کیجیے، میرا انتظار دوسرے سیٹ پر بھی ہورہا ہے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ یہاں گزار رہا ہوں۔''

''منوہر جی! آپ کے بغیر یہ سین کیسے ہوگا؟ میرا تو ہزاروں کا نقصان ہوجائے گا۔''

''مت کیجیے نقصان۔ شروع کیجیے شوٹنگ۔ ٹانگ برابر لونڈے کے لیے میرا وقت کیوں برباد کرتے ہیں؟''

''چلیے، اسکرپٹ میں کچھ تبدیلی کرلیتے ہیں۔ آپ فیصل کو آواز دیں گے اور آپ کی بہو کہے گی کہ وہ کہیں باہر کھیلنے کے لیے نکل گیا ہے۔ کھانے کی محفل پر آپ اس سے

www.pkdigest.com

جتنی باتیں کرنے والے تھے، وہ باتیں بھی کٹ جائیں گی۔"

ڈائریکٹر محمود شارب نے سین کی نوعیت بدل تو دی تھی لیکن وہ کچھ افسردہ نظر آرہا تھا۔ پہلا سین تھا اور وہی فیصل کی عدم موجودگی سے کچھ پھیکا پھیکا ہو گیا تھا۔

محمود شارب تھکے تھکے قدموں سے سیٹ کی طرف آرہا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی جو نہ جانے کہاں سے سیٹ پر آگیا تھا اور محویت سے کیمروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محمود شارب اس کی محویت میں جھانک کر اس کے چہرے کے خطوط کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس کے تجربے نے اس کے دل پر دستک دی۔ یہی وہ لڑکا ہے جو اس سین کی ڈیمانڈ پر پورا اترتا ہے۔ اس نے نظروں نظروں میں اسے تولا...... یہ تو فیصل سے بھی زیادہ مناسب رہے گا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟"

"جی، کچھ نہیں۔ یہ کیمرے دیکھ رہا تھا۔"

"کس کے ساتھ آئے ہو؟"

"کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ میں تو اکیلا آیا ہوں۔"

"تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟"

"آپ ماریں گے تو نہیں؟"

"نہیں بیٹا! میں کیوں ماروں گا؟"

"چوکیدار کسی سے باتیں کرنے لگا تھا، میں اس سے نظر بچا کر اندر بھاگ آیا۔"

"کیوں آئے ہو؟"

"یہاں کوئی کیوں آتا ہے؟ شوٹنگ دیکھنے آیا ہوں۔"

"فلم میں کام کرو گے؟"

"شوق تو بہت ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکنے لگے۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا اس کے دفتر میں آگیا۔ محمود شارب اسے دفتر میں اس لیے لایا تھا کہ اس کے گھر کا فون نمبر وغیرہ لے کر اس کے والدین سے بات کرلے گا۔

"تم رہتے کہاں ہو...... کوئی فون نمبر وغیرہ ہے؟"

"سچ بتاؤں؟"

"سچ ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں۔"

"پھر بھی کہیں تو ہوگا تمہارا گھر؟"

"اس شہر میں نہیں ہے۔ ہم لوگ بلال آباد میں رہتے ہیں۔ میرے والد اور والدہ دونوں کا انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے جان بوجھ کر آدھا سچ آدھا جھوٹ بولا۔

"تم پھر کس کے ساتھ رہتے تھے؟"

"کسی کے گھر کام کرتا تھا۔ وہی مجھے سونے کے لیے جگہ دے دیتے تھے۔"

اتنی گفتگو کرنے کے بعد محمود شارب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکا ذہین بھی ہے اور اس میں بلا کی خود اعتمادی بھی ہے اور پھر اس کا کوئی سرپرست بھی نہیں ہے جو معاوضے وغیرہ میں ٹانگ اڑائے گا۔

محمود شارب کی پوری ٹیم سیٹ پر اس کا انتظار کر رہی تھی لیکن کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی جو اس کے دفتر میں داخل ہو کر اسے جلدی چلنے کو کہتا۔ منوہر جوشی ہی وہ اداکار تھا جو اس سے بات کر سکتا تھا لہٰذا وہی دفتر میں داخل ہوا۔

"منوہر جی! اس لڑکے سے تو ملیے۔ خدا کسی کسی کو اداکار بنا کر بھیجتا ہے۔ یہ لڑکا پیدائشی اداکار ہے۔"

"محمود صاحب! جتنا وقت مجھے آپ کو دینا تھا، میں نے دے دیا۔ آپ اس شوٹنگ کو کل پر اٹھا رکھیے۔ میں اب چلا۔ میری دوسری فلم کی بھی آج ہی کی ڈیٹ ہے۔"

"منوہر جی! میں تو پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوں کہ آج کی شوٹنگ کینسل۔ سیٹ اسی طرح لگا رہے گا۔ کل اس پر یہ لڑکا جلوہ گر ہوگا۔"

"محمود صاحب! آپ اس لڑکے کے لیے اتنا نقصان برداشت کر رہے ہیں؟"

"میں نے اپنی پوری عمر فلموں میں لگائی ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ لڑکا کیا ہے۔ اس کے بغیر یہ سین نہیں ہو سکتا اور اس کی تیاری کے لیے مجھے کم از کم ایک دن تو درکار ہوگا۔"

"میرے پاس کل کا وقت نہیں۔" منوہر نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم پرسوں کی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ اچھا ہے اس لڑکے کو تیار کرنے کے لیے مجھے مزید وقت مل جائے گا۔"

"محمود صاحب! لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ آپ کچھ کھسکے ہوئے ہیں۔ دو دن سیٹ خالی رہے گا اور آپ کرایہ دیں گے۔ وہ بھی ایک نوآموز لڑکے کے لیے؟"

"یہ لڑکا میرا سارا نقصان پورا کردے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

محمود شارب نے شوٹنگ ملتوی کردی۔ سب کو حیرت تھی کہ اس نے ایک لڑکے میں ایسی کیا بات دیکھ لی کہ اپنا نقصان کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کا دفتر یونٹ کے لوگوں سے بھر گیا۔ لڑکے کی خوب صورتی تو سب ہی دیکھ رہے تھے لیکن وہ کوئی نہیں دیکھ رہا تھا جو محمود شارب کی تجربہ کار آنکھوں نے دیکھ لیا تھا۔

فلمی صحافی اسٹوڈیو میں ہر وقت ہی موجود رہتے تھے۔ ان کے لیے بھی یہ ایک "خبر" تھی۔ اس کے دفتر میں کئی صحافی گھس آئے۔ ایک ساتھ کئی کیمرے چلے اور دوسرے دن کے اخباروں میں "ایک نئی دریافت" کے عنوان سے تصویر خان کی کئی تصویریں لگیں۔

محمود شارب اسے لے کر اپنی شان دار کوٹھی میں آیا تو اس کی بیوی کو بھی ویسا ہی تعجب ہوا جیسا تعجب افضال شاہ کی بیوی کو ہوا تھا۔

"یہ کون ہے شارب؟"

"ہمارا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ خدا نے اچانک اتنا بڑا بیٹا دے دیا۔"

"مذاق مت کریں۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "اللہ رکھے ہمارا بیٹا ہے تو...... یہاں نہیں تو کیا ہوا؟"

"بتاتا ہوں بابا...... بتاتا ہوں۔ سکون سے بیٹھنے تو دو۔"

اس نے بیوی کو پوری بات بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب یہ ہمارا بیٹا بن کر ہمارے ساتھ رہے گا۔ اس کا اپنا بیٹا عرصہ دراز سے امریکا میں تھا۔ دو بیٹیاں تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اتنی بڑی کوٹھی میں دونوں میاں بیوی تنہا تھے، انہیں ایک ساتھی مل گیا تھا۔

"بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟" اس کی بیوی نے کہا۔

"تصویر خان!"

یہ نام محمود شارب کو اچھا نہیں لگا۔ غیر فلمی سا نام تھا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ اس کا کوئی اور نام تجویز کرے گا اور بعد میں اس نے اس کا نام عالش رکھ دیا تھا۔

تصویر خان کو اپنے ساتھ لانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ ڈائیلاگ کی ڈلیوری دیکھنا چاہتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا اندازہ کتنا درست ہے۔ وہ مکالموں کو کس طرح ادا کرتا ہے۔ اس کی حرکات و سکنات کیسی ہیں۔ وہ اسے اپنے روم میں لے گیا جو اس کی لیبارٹری بھی تھا اور اسٹڈی بھی۔

"عالش بیٹا! تم اردو تو پڑھ لیتے ہو؟"

"جی ہاں، میں نے ایک رسالے میں آپ کا نام بھی پڑھا تھا۔"

"گڈ! یہ اسکرپٹ ہے۔ جہاں جہاں فیصل کے مکالمے لکھے ہیں، انہیں پڑھو۔"

عالش نے پڑھنا شروع کیا لیکن اس طرح جیسے کوئی اخبار پڑھتا ہے۔ محمود شارب نے اسے روک دیا۔ غلطی اسی کی تھی۔ اس نے پڑھنے کو کہا اور وہ پڑھنے لگا۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ پھر اس نے یہی کیا۔ اسے سمجھایا کہ وہ ایک شرارتی بچہ ہے۔ اس کے دادا اس سے کچھ پوچھ رہے ہیں اور وہ جواب دے رہا ہے۔

"اچھا، میں دادا بن جاتا ہوں۔ میں تم سے پوچھوں گا اور تم اس اسکرپٹ میں جو جواب لکھے ہیں، وہ دو گے۔"

عالش نے اثبات میں گردن ہلا دی اور اسکرپٹ ہاتھ میں لے لیا۔ دونوں کے درمیان گفتگو ہونے لگی۔ اس نے اس خوب صورتی سے مکالمے ادا کیے اور چہرے پر ایسے تاثرات لانے میں کامیاب ہو گیا کہ محمود شارب جیسے کہنہ مشق ہدایت کار کو اس کی تعریف کرنی پڑی۔

"عالش! تم ایک دن فلمی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہو گے۔ تمہاری وجہ سے میرا نام بھی زندہ رہے گا کہ میں نے تمہیں متعارف کرایا ہے۔"

اب محمود شارب کو وہ کرنا تھا جو اس نے ابھی ابھی سوچا تھا۔ اس نے روشن حیات کو فون کیا اور شام کو ملاقات کا وقت طے ہوا۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے اور منظرنامہ روشن حیات ہی نے تحریر کیا تھا۔

شام ہوئی تو کوٹھی کے اندر سبزہ زار پر کرسیاں بچھا دی گئیں۔ ملازم نے روشن حیات کی آمد کی اطلاع دی۔ محمود شارب نے عالش کو اندر رہنے کا حکم دیا اور خود روشن حیات سے ملاقات کے لیے سبزہ زار میں آگیا۔

"روشن صاحب! آپ کی ضرورت پڑ گئی ہے۔"

"اس سے مجھے اپنی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔"

"ہم نے تو ہمیشہ آپ کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے۔ فرمائیے...... کیا حکم ہے؟"

"آپ نے جو "من چلی" کا اسکرپٹ تحریر کیا ہے اس میں کچھ تبدیلی درکار ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔"

"اس میں جو ایک لڑکے فیصل کا کردار ہے اسے ذرا پھیلانا ہے۔ اس کی زبانی بولے جانے والے مکالموں میں اضافہ بھی کرنا ہے۔"

"آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ بچہ ہے، زیادہ مکالمے یاد نہیں رکھ سکے گا۔ بار بار ری ٹیک کرنا پڑے گا ورنہ کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق لڑکے کا کردار مرکزی ہونا چاہیے تھا۔"

"اب اس کو ویسا ہی بنا دیں جیسا آپ نے سوچا تھا۔ اور یہ کام کل تک ہو جانا چاہیے۔ سیٹ لگا ہوا چھوڑ کر آیا ہوں۔ صرف اسکرپٹ کی وجہ سے میں نے شوٹنگ ملتوی کی ہے۔"

"جناب! کام ذرا مشکل ہے۔ بہت محنت مانگتا ہے۔

www.pkdigest.com

اسکرپٹ چاہیے بھی آپ کو کل۔"

"میں اس کا معاوضہ دوں گا آپ کو۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ آپ تو ہمیشہ ایڈوانس دیتے ہیں۔"

"یہ دس ہزار میں نے آپ کے لیے نکال کر رکھ رکھے تھے۔"

"اسکرپٹ کل مل جائے گا۔"

محمود شارب اپنی ذاتی فلم "من چلی" کے نام سے بنا رہا تھا۔ اس فلم میں ایک بچے کا کردار بھی تھا جس کے لیے اس نے فیصل نام کے ایک لڑکے کا انتخاب کیا تھا۔ سیٹ پر اسی لڑکے کا انتظار ہو رہا تھا لیکن عین وقت پر فون آیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ بائیک پر اسٹوڈیو آ رہا تھا۔ اس کی بائیک سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ اس کا بھائی ہلاک ہو گیا جبکہ فیصل کی دونوں ٹانگیں کچل گئیں۔ اب سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ آئندہ چند مہینوں تک سیٹ پر آ سکے۔ محمود شارب کی نظر تصویر خان پر پڑی اور اب وہ عائش بن کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

"تم ابھی میرے سیکریٹری کے ساتھ جاؤ گے۔ وہ تمہیں کپڑے وغیرہ دلا دے گا۔ کچھ اور لینا ہو تو اسے بتا دینا۔ کل اسکرپٹ تیار ہو کر آ جائے گا۔ اس کے بعد میں تم سے بات کروں گا۔"

دوسرے دن روشن حیات اسکرپٹ لے کر آ گیا۔ محمود شارب نے اسے کہیں کہیں سے پڑھا اور مطمئن ہونے کے بعد اسے رخصت کر دیا۔

چند سین عائش کو سمجھائے اور اسے ایکٹ کرنے کے لیے کہا۔ ایک آدھ مرتبہ سمجھانے کے بعد اس نے مکالموں کی ادائیگی اس پُرانداز طریقے سے کی کہ محمود شارب کے اندازے پیچھے رہ گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی منجھا ہوا اداکار اس کے سامنے کھڑا ہے اور اسے حیرت زدہ کرنے کے لیے ایک ایک لائن کو کئی کئی طریقوں سے پڑھ رہا ہے۔

اس اسکرپٹ میں اس کا کردار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہیرو اور ہیروئن دونوں کو اعتراض ہوا تھا لیکن شارب کے سمجھانے بجھانے پر بات بگڑنے سے بچ گئی۔

شوٹنگ والے دن وہ سیٹ پر آیا تو اس کا اعتماد دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے مکالمے بولے تو سب دنگ رہ گئے۔ منوہر جیسے اداکار نے آگے بڑھ کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

یہ فلم جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی تھی، اس کے جوہر کھلتے جا رہے تھے۔ اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ فلم کے آخری سین میں جب اسے رونے کی ضرورت پڑی اور حقیقت میں اس کے آنسو نکل آئے تو پورا سیٹ تالیوں سے گونج اٹھا۔

فلم مکمل ہو گئی تھی۔ اب ایڈیٹنگ وغیرہ کے مراحل سے گزرنے کے بعد اسے نمائش کے لیے پیش ہونا تھا جس میں ایک...... سے ڈیڑھ مہینا لگ سکتا تھا۔ محمود شارب اسے لے کر تھائی لینڈ چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ فنکار کسی بھی میدان کا ہو، اس کا مشاہدہ جتنا وسیع ہوگا، اس کے فن میں اتنا ہی نکھار آئے گا۔ یہ سفر بھی عائش کی تربیت کا حصہ تھا۔

وہ لوٹ کر آیا اور فلم نمائش کے لیے سینما گھروں تک پہنچی تو پہلے شو ہی سے اندازہ ہو گیا کہ یہ فلم کیا قیامت برپا کرے گی۔

اخباروں میں تبصرے شائع ہوئے تو ایک ہی دن میں عائش، سپر اسٹار بن گیا۔ اس فلم کے تمام کردار پس پردہ چلے گئے۔ ہر طرف اسی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

عائش کو وہ دن یاد آ گئے جب وہ اداکاروں کے پوسٹر دیکھتا پھرتا تھا۔ آج خود اس کے پوسٹر جگہ جگہ لگے ہوئے تھے۔ ایک دن اس کا جی چاہا، اسی طرح کسی سینما ہاؤس پر جائے اور اپنے پوسٹر دیکھے۔ محمود شارب نے کہہ رکھا تھا کہ وہ جہاں بھی جائے گا، ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں جائے گا۔ وہ اس ہدایت پر پوری طرح عمل کر رہا تھا لیکن اپنے پوسٹر دیکھنے کی بات الگ تھی۔ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور چپکے سے نکل گیا۔ قریب ہی ایک پکچر ہاؤس تھا، وہ وہاں پہنچ گیا۔ اس کے قدِ آدم پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ ویسے ہی پوسٹر جیسے وہ دوسرے اداکاروں کے دیکھا کرتا تھا۔ وہ ایک پوسٹر کے نیچے کھڑا ہو گیا اور خوش ہونے لگا۔

کسی نے اسے پہچان لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک ایک کر کے لوگ جمع ہونے لگے۔ اس کے گرد ایک بھیڑ لگ گئی۔ لوگ طرح طرح کے سوالات پوچھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر تو جواب دیتا رہا پھر اسے وحشت سی ہونے لگی۔ اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر لوگ اسے راستہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ ہر شخص اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کئی لوگ آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ اتنا ہنگامہ ہوا کہ انتظامیہ کو پولیس بلانی پڑ گئی۔

پولیس نے بڑی مشکل سے مجمع پر قابو پایا اور عائش کو وہاں سے نکال کر اس کے گھر پہنچایا۔ اس وقت تک محمود شارب بھی گھر آ چکا تھا۔ پولیس نے اس سے بھی بات کی کہ عائش کو اکیلے باہر نہ جانے دیا جائے ورنہ کسی دن نقصِ امن کا کوئی بڑا واقعہ سامنے آ جائے گا۔ محمود شارب نے بھی اسے سمجھایا کہ وہ کوئی عام بچہ نہیں ہے، اسٹار بن چکا ہے۔ وہ جب بھی باہر نکلے،

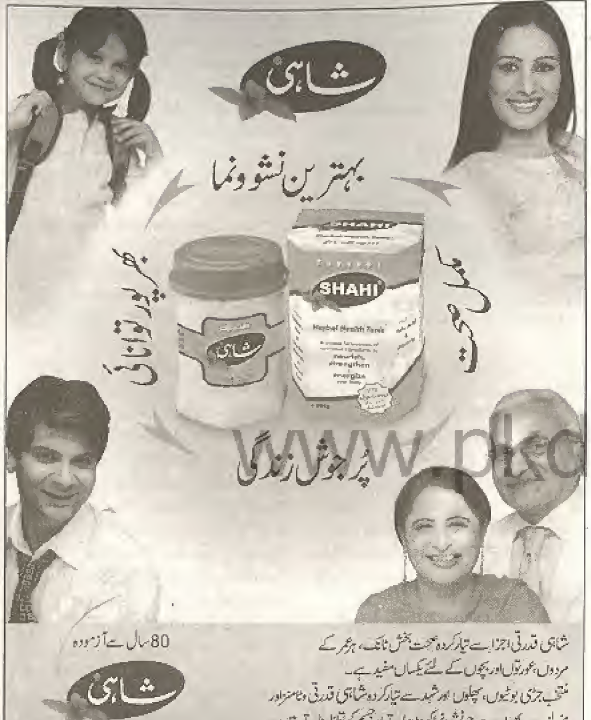

سیکریٹری کے ساتھ جائے۔

اس کی عمر ایسی تھی کہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے لیے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ یہ پابندیاں اسے برداشت نہیں تھیں لیکن وہ باہر نکلنے کا نتیجہ دیکھ چکا تھا۔ اسے اپنا شہر یاد آرہا تھا جہاں وہ باہر نکل کر گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا۔ اسی دن اسے اپنی ماں بہت یاد آئی تھی۔ میرے بعد وہ اکیلی رہ گئی ہوگی۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ محمود شارب سے کہے گا کہ وہ اس کو اس کی ماں کے پاس لے چلے لیکن پھر اچانک اسے یاد آگیا کہ وہ تو ان سے یہ کہہ چکا ہے کہ اس کے ماں باپ مرچکے ہیں۔ میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو ماں سے ملنے خود چلا جاؤں گا۔

☆☆☆

اس کی پہلی فلم نے اتنا بزنس کیا کہ اگر محمود شارب چار فلمیں بھی بیک وقت بناتا تو اتنا نہیں کما سکتا تھا۔ اب اسے عائش کی شکل میں ایک ایسا اداکار مل گیا تھا جو اس کی تجوریاں بھر سکتا تھا۔ اس نے اس کے لیے دوسری فلم لکھوا بھی لی تھی۔ یہ پوری فلم عائش کے گرد گھومتی۔ دوسرے کردار محض ضمنی حیثیت رکھتے تھے لیکن اس موقع پر عائش کی بغاوت سامنے آگئی۔ وہ غالباً اپنے اوپر لگنے والی پابندیوں سے گھبرا گیا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اب وہ مزید مشہور ہونا نہیں چاہتا اس لیے کسی فلم میں کام نہیں کرے گا۔ محمود شارب اس پر سختی بھی کر سکتا تھا لیکن اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ گھر چھوڑ کر ہی نہ چلا جائے۔ جو بچہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آسکتا تھا، وہ یہاں سے بھی بھاگ سکتا تھا۔ اس نے اس سے بات کی کہ اگر اسے اسکول میں داخل کرا دیا جائے تو کیسا رہے گا۔ عائش کو پڑھنے کا شوق قطعی نہیں تھا لیکن اس بہانے اسے گھر سے نکلنے اور ہم عمر لڑکوں سے ملنے کا موقع مل سکتا تھا اس لیے اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ محمود شارب کا بھی یہی مقصد تھا کہ اس کی یکسانیت کو ختم کیا جائے۔ اسکول میں کچھ وقت گزارے گا، کھیلے کودے گا تو اس کی یکسانیت ختم ہوگی۔

وہ شہر کا سب سے بڑا اسکول تھا۔ اتنا مہنگا کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے بچے ہی یہاں تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ فلم لائن کے لوگوں کے بچے بھی اسی اسکول میں تھے۔ عائش کو بھی یہیں داخل کرا دیا گیا۔ اسے اپنا پرانا اسکول یاد آگیا جہاں افضال شاہ نے اسے داخل کرایا تھا۔ وہ اسکول اس کے سامنے جھونپڑا تھا۔ عائش کو پہلی مرتبہ اپنی قسمت پر رشک آیا کہ وہ اتنے اچھے اسکول میں پڑھنے کے لیے آیا ہے۔

وہ بڑے اشتیاق سے یہاں آیا تھا لیکن ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد ہی اسے مایوس ہونا پڑا۔ وہ سمجھ رہا تھا، بچے اس طرح اس کے گرد جمع ہو جائیں گے جیسے وہ پوسٹر دیکھنے گیا تھا تو لوگوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ یہاں تو اسے کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ ایک آدھ ٹیچر نے اس کی فلم کی تعریف ضرور کی تھی مگر وہ بھی برائے نام۔ بچوں نے ظاہر ہے اس کی فلم دیکھی ہی نہیں تھی اور پھر وہ اتنے بڑے گھروں کے لڑکے تھے کہ دولت کا نشہ ان پر بھی چڑھا ہوا تھا۔

اسے اپنی ناقدری کا احساس بری طرح ستانے لگا۔ کبھی کبھی تو خیال آتا کہ ان بچوں کو جمع کر کے کہے، تم لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو۔ تم نے تو اسٹوڈیو کی شکل تک نہیں دیکھی ہوگی۔ میں فلموں میں کام کرتا ہوں۔ بعض بچے وہ گانا گاتے ہوئے نظر آتے جو اس پر فلمایا گیا تھا لیکن ظاہر ہے ان بچوں نے صرف گانا سنا تھا اور بول یاد کر لیے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ گانا عائش پر فلمایا گیا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا، ان سے کہے کہ یہ گانا اس پر فلمایا گیا ہے لیکن وہ کسی سے کچھ نہ کہہ سکا۔

ایک روز وہ کلاس سے نکل کر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ اسی کی کلاس کی ایک لڑکی اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ عائش نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''اے...... تم وہی عائش ہو جس نے فلم میں کام کیا ہے؟''

''ہاں اور وہ فلم مشہور بھی بہت ہوئی ہے۔ تم نے دیکھی ہے؟''

''ہاں...... میں اپنی مما کے ساتھ کل فلم دیکھنے گئی تھی۔ او مائی گاڈ...... وہ تو تم تھے۔ میں نے مما کو بتایا تھا، یہ تو میری کلاس میں پڑھتا ہے۔''

''تم اپنی مما کو یہاں لے کر آنا۔ وہ مجھ سے ملیں گی تو انہیں یقین آجائے گا۔''

''تم نے تو بہت اچھی ایکٹنگ کی ہے۔ کیسے کر لیتے ہو تم؟''

''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں ایک اور فلم میں کام کر رہا ہوں۔ وہ دیکھنا...... کیا زبردست کام کیا ہے میں نے۔''

''میرا نام شرمین ہے۔ مجھ سے دوستی کرو گے؟'' اس نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ عائش اب اتنا بڑا ضرور ہو گیا تھا کہ کسی لڑکی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے شرم آرہی تھی لیکن اس نے جھجکتے ہوئے ہاتھ ملا لیا۔

وہ لڑکی اس سے کم از کم تین سال چھوٹی ہوگی۔ عائش کا چونکہ بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا اس لیے وہ اپنی کلاس

کے بچوں سے، عمر میں دو تین سال آگے بڑھ گیا تھا۔ شاید اسی لیے لڑکے لڑکیاں اس کے زیادہ قریب نہیں آتے تھے۔

شرمین سے اس کی دوستی کیا ہوئی، اسکول میں اس کی شہرت کو پر لگ گئے۔ شرمین نے تمام بچوں میں اس کی اداکاری کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ بعض بچوں نے اپنے والدین سے ضد کر کے اس کی فلم دیکھی اور شرمین کی بات سچ نکلی۔ وہ تو واقعی فلموں میں آتا تھا۔ شرمین ہی کے کہنے پر اسکول کے اساتذہ نے ایک ڈراما اسٹیج کیا۔ یہ اسکول کی تاریخ کا پہلا اردو ڈراما تھا۔ اس سے پہلے دو ایک ڈرامے اسٹیج ہوئے تھے لیکن وہ انگریزی میں تھے۔ یہ اردو میں اس لیے تھا کہ اسے عائش نے لکھا تھا۔ عائش نے اس ڈرامے میں شرمین کے لیے نہایت اہم کردار لکھا تھا۔ جب اس ڈرامے میں کچھ غنڈے عائش کو ایک تہ خانے میں بند کر دیتے ہیں تو شرمین اپنی جان پر کھیل کر اسے تہ خانے سے باہر نکالتی ہے۔

اس ڈرامے میں ان دونوں نے ایسی جذباتی اور پختہ اداکاری کا مظاہرہ کیا کہ کھیل کے اختتام پر دیر تک عائش اور شرمین کے نعرے گونجتے رہے۔

اس ڈرامے کو دیکھنے محمود شارب بھی آیا تھا۔ اسے شرمین کی اداکاری اتنی پسند آئی تھی کہ وہ اسے اپنی فلم میں چانس دینے کا خواہاں تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اس کے والدین سے بھی بات کی تھی لیکن انہوں نے اجازت نہیں دی۔

☆☆☆

عائش کی دوسری فلم بڑی تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھی۔ محمود شارب نے اس کی شوٹنگ کے اوقات ایسے رکھے تھے کہ اس کے اسکول سے متصادم نہ ہوں لیکن اس کے باوجود ان مصروفیات نے اس کی تعلیم پر بہت برا اثر ڈالا اور اس سے پہلے کہ فلم ریلیز ہوتی، اس کے امتحان شروع ہو گئے اور وہ ایک پرچے میں فیل ہو گیا۔ اسے یا شارب کو ذرا بھی افسوس نہیں ہوا کیونکہ ان کی منزل کچھ اور تھی۔

اس کی شہرت کو دیکھتے ہوئے اسکول والوں نے گریس مارکس دے کر فیل شدہ پرچے میں پاس کر دیا ورنہ وہ اسکول چھوڑ دیتا یا اسی کلاس میں ایک سال اور گزارتا۔

وہ اور شرمین پھر ایک کلاس میں آگئے تھے۔ اس کی دوسری فلم نے کامیابی کے ایسے جھنڈے گاڑے کہ گلی گلی میں اس کے چرچے ہو رہے تھے۔ شرمین اس کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھ کر خوش ہو رہی تھی مگر یہ خوشی اسے زیادہ دن راس نہ آسکی۔ اس کے گھر والے کینیڈا شفٹ ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے اسے بھی جانا تھا۔ اس کے والد بہت بڑے بزنس مین تھے۔ ان کا کاروبار کینیڈا تک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں رہ کر وہ کینیڈا کے کاروبار کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے سوچا ہوگا، کینیڈا میں بیٹھ کر یہاں کے کاروبار کی نگرانی بھی تو کی جا سکتی ہے۔ یہاں سیاسی حالات ایسے تھے کہ انہوں نے اپنا بیشتر کاروبار کینیڈا منتقل کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔

شرمین اچھی یادیں اپنے ساتھ لے کر اسکول سے اور پھر ملک سے چلی گئی۔ جاتے وقت صرف تصویروں کا تبادلہ ہو سکا۔ عائش نے اپنی تصویر اسے دی اور شرمین کی تصویر اس کے پاس آگئی۔

اسے فطری طور پر اداس ہونا تھا۔ اسکول سے آیا تو سخت رنجیدہ تھا لیکن ڈرائنگ روم میں دو ایسی شخصیات کو دیکھ کر شرمین کی رخصتی کو بھول گیا جو محمود شارب کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتے تھے اور اس وقت وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ یہ دونوں نامور فلم ساز تھے لیکن محمود شارب سے ان کی نہیں بنتی تھی۔

اس نے ابھی کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے کہ اسے بھی بلا لیا گیا۔ وہ دونوں اس سے اس طرح ملے جیسے کوئی وزیر اپنے وزیراعظم سے ملتا ہے۔

تھوڑی دیر میں یہ عقدہ بھی کھل گیا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ یہ عقدہ خود محمود صاحب کی زبانی حل ہوا۔

''عائش بیٹا! یہ دونوں حضرات تمہیں اپنی اپنی فلموں میں کاسٹ کرنا چاہتے ہیں۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ ہی ان لوگوں سے جو چاہیں طے کر لیں۔''

''میں نے کہانیاں تو سن لی ہیں۔ تمہارا کردار دونوں کہانیوں میں دلچسپ ہے۔''

''میں تو وہی کروں گا جو آپ کہیں گے۔''

''تم ہمارے درمیان دوستی کا نیا پل تعمیر کرو گے برخوردار!'' دونوں فلم ساز بیک وقت بولے۔

اس کی طرف سے اجازت تھی۔ باقی معاملات محمود شارب نے طے کر لیے۔ عائش نے دونوں فلمیں سائن کر لیں۔ ایک فلم شروع سے آخر تک اس کے گرد گھومتی تھی جبکہ دوسری فلم میں اس کا بہت کم کام تھا۔

ان فلموں کو لینے کے بعد وہ پڑھائی کی طرف سے غافل ہوتا چلا گیا۔ شرمین کے چلے جانے کے بعد اس کی اسکول میں کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ کبھی اسکول جاتا، کبھی نہیں جاتا۔ رفتہ رفتہ اسکول کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیا۔ دو ایک

www.pkdigest.com

فلمیں اور مل گئیں۔ اب وہ بالکل ہی اسٹوڈیوز کی نذر ہو کر رہ گیا۔ آج اس سیٹ پر ہے تو کل دوسرے سیٹ پر۔

یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا۔ فلموں پر فلمیں بنتی رہیں۔ اس نے کتنی دولت کمائی اس کا حساب اس کے پاس نہیں، محمود شارب کے پاس تھا۔

اس پر جوانی آئی تو فلم سازوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ہر طرف سے آفرز کی برسات ہونے لگی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ پہلی فلم وہ اس کی سائن کرے۔ بولیاں لگ رہی تھیں۔ قسمت اور دولت کی ریس ہو رہی تھی۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا۔ انڈسٹری کے تمام داؤ پیچ سے واقف تھا۔ محمود شارب اسے ہیرو لے کر اپنی فلم بنانے پر بضد تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس سے وہ اپنی قیمت وصول نہیں کر سکے گا۔ محض احسانات اس کی قیمت ہوگی۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب دونوں کے درمیان بے اعتباری پیدا ہوئی۔ اس کا اظہار نہ تو محمود شارب نے کیا اور نہ اس کی طرف سے ہوا لیکن دونوں ایک نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ محمود شارب کو یقین ہو گیا تھا کہ جلد یا بہ دیر وہ اس سے الگ ہو جائے گا۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب وہ محمود شارب کے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ اس کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب عاتش نے اپنا سیکریٹری اپائنٹ کیا۔ اب تک محمود شارب کا سیکریٹری ہی اس کے معاملات بھی دیکھتا تھا۔

جب اس نے بیک وقت دو فلمیں سائن کیں تو ایڈوانس میں ملنے والی رقم اس نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کی۔ محمود شارب کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ محمود شارب کو یقیناً اس کا دکھ ہوا۔ وہ تمام احسانات اس کے سامنے آ گئے جو اس نے عاتش پر کیے تھے۔ وہ اسے کوڑے دان سے اٹھا کر اپنی کوٹھی تک لے آیا تھا۔ اسے زمین کی دھول سے آسمان کا ستارہ بنا دیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ محمود شارب ایک نئی فلم بنانے والا تھا اور عاتش کے پاس اس کی فلم میں کام کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے ایک دوسرے ہیرو کو لے کر فلم کا آغاز کر دیا۔ اس واقعے کو فلمی جرائد نے بھی خوب اچھالا۔ تجزیہ نگاروں نے صاف لکھ دیا کہ محمود شارب اور عاتش کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ ایک مبصر نے تو باقاعدہ اسٹوری اپنی جانب سے گھڑ دی کہ کس طرح محمود شارب سے اس کی تلخ کلامی ہوئی۔ عاتش نے اب تک جو کمایا ہے، اس کا حساب مانگا۔ محمود شارب نے ایک پیسا بھی دینے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کی دولت پر سانپ بن کر بیٹھا ہوا ہے۔ عاتش کو یہ زیادتی برداشت نہیں۔ اب کوئی دن جاتا ہے کہ دونوں کے راستے جدا ہو جائیں گے۔

اس مبصر کی یہ اسٹوری اندازوں پر مبنی تھی لیکن جلد ہی درست ثابت ہوئی۔ عاتش نے ساحلِ سمندر پر ایک شاندار فلیٹ خریدا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ محمود شارب نے اس وقت بھی اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اب وہ دولت و شہرت کے نشے میں ایسا سرشار تھا کہ کسی کی نصیحت اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ اس کا دورِ عروج تھا۔ فلم ساز اس کے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ لڑکیوں سے اس کا فلیٹ بھرا رہتا تھا۔ اس کے مداح گھنٹوں اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے نیچے اترنے کا انتظار کرتے تھے۔

جب وہ اس فلیٹ میں منتقل ہوا تو اسے اپنی ماں کی یاد آئی۔ وہ افضال شاہ کی بیوی راحیلہ ہی کو اپنی ماں سمجھتا تھا۔ اس کی اصلی ماں اس کی یادداشت کے کسی کونے میں بھی موجود نہیں تھی۔ افضال شاہ کی بیوی ہی کو امی کہتا تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا، کتنے برس بیت گئے۔ امی نہ جانے کس حال میں ہوں۔ میں اگر انہیں اپنے پاس بلا لوں تو ان خوشامدیوں سے بھی نجات مل جائے جو ہر وقت مجھے گھیرے رہتے ہیں اور امی کا بڑھاپا بھی آرام سے کٹ جائے گا۔

اس نے ایک روز کسی کو بتائے بغیر اپنی گاڑی کا رخ بلال آباد کی طرف موڑ دیا۔ بچپن کی سیکڑوں یادیں تھیں جو دل میں خیمہ زن تھیں اور اب ایک ایک کر کے حافظے کی سلیٹ پر لکیریں کھینچ رہی تھیں۔ اس کی ماں تو اکثر اسے یاد آتی تھی لیکن اس وقت اسے افضال شاہ بھی یاد آ رہا تھا۔ میرا باپ مجھ سے کتنی محبت کرتا تھا۔ محبت تو ہر باپ کرتا ہے لیکن وہ تو میرا دیوانہ تھا۔ امی جب مجھے ڈانٹتی تھیں تو دونوں کے درمیان کیسا جھگڑا ہوتا تھا۔ افسوس کہ بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ آج وہ ہوتے تو دیکھتے کہ جن فلمی رسالوں کی وجہ سے وہ مجھ سے ناراض رہتے تھے، انہی کی بدولت آج میں شہرت کی کن بلندیوں پر ہوں۔ میں ان کی ذرا بھی خدمت نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

یتیم خانے کے صدر دروازے سے گزرتا ہوا وہ بائیں طرف مڑ گیا۔ وہ میدان سامنے تھا جہاں وہ لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ کسی نے بھی توجہ نہیں دی کہ گاڑی میں کون بیٹھا ہے۔

اس کے بائیں طرف یتیم خانے کی سرخ عمارت تھی اور سامنے عمارت سے ملحق وہ مکان تھا جس میں اس کا بچپن

کھیلا کرتا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا اور مکان کی طرف چل دیا۔ اب تو امی مجھے پہچان بھی نہیں سکیں گی۔ میں بھی خوب پریشان کروں گا۔ بہت بعد میں بتاؤں گا کہ میں ان کا بیٹا تصویر خان ہوں جو اب عاتش بن گیا ہے۔ اپنے ساتھ حسن پور لے جا کر اپنی فلم بھی دکھاؤں گا۔

اس نے یہ دیکھے بغیر کہ دروازے پر تالا جھول رہا ہے، دستک کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ جواب کیسے ملتا اور جواب ملا تو یہ ملا کہ تالے پر نظر پڑ گئی۔ امی کہاں چلی گئیں۔ پھر اسے یتیم خانے کا خیال آیا۔ کچھ دیر وہاں چل کر بیٹھا جائے۔ شاید اتنی دیر میں امی آ جائیں۔ اس زمانے کا کوئی نہ کوئی ملازم تو ہو گا۔ میں اپنا تعارف کراؤں گا تو مجھے پہچان ہی لے گا۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہوا اور سیدھا اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا جہاں افضال شاہ بیٹھا کرتا تھا۔ اب یہاں کسی اور کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

"فرمائیے؟" منیجر نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر کہا۔

"میرا نام تصویر خان ہے۔"

"میں کیا خدمت کروں آپ کی؟"

"کئی برس پہلے یہاں کے منیجر ہوا کرتے تھے افضال شاہ۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"میرے یہاں آنے سے پہلے کی بات ہوگی۔ بہرحال آپ بتائیں کیا کام ہے آپ کو؟"

"یہاں ایک چپراسی تھا فضل دین۔"

"اچھا، اس سے کام ہے آپ کو۔ برابر کے کمرے میں چلے جائیے۔ کرسی ڈالے بیٹھا ہوگا۔"

"مہربانی فرما کر آپ اسے یہاں بلوا سکتے ہیں؟"

"جی، کیوں نہیں۔"

اس نے گھنٹی بجائی اور فضل دین حاضر ہو گیا۔ عاتش تو اسے ایک ہی نظر میں پہچان گیا لیکن وہ آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھئی، یہ تم سے ملنے آئے ہیں۔"

"مجھ سے؟ مگر میں تو انہیں نہیں جانتا۔"

"میں تصویر خان ہوں۔"

"کون تصویر خان؟"

"افضال شاہ کا بیٹا۔"

"آپ... افضال شاہ۔" بس وہ اتنا ہی کہہ سکا اور اس کی کرسی کے قریب زمین پر بیٹھ گیا۔ "تصویر خان! یہ تم ہو۔ کہاں چلے گئے تھے؟ کتنے برسوں بعد آئے ہو۔ ماشاء اللہ روپ تو خوب نکالا ہے۔"

"بس فضل دین! چلا گیا تھا کہیں۔ تم لوگوں کی یاد آئی تو چلا آیا۔"

"راحیلہ بی بی آپ کو یاد کر کر کے دنیا سے چلی گئیں اور آپ اب آئے ہیں۔"

"کیا کہا تم نے؟" عاتش اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میری امی!" وہ پھر کرسی پر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"صبر کیجیے چھوٹے صاحب! وہ آپ کو بہت یاد کرتی تھیں۔ ابھی پچھلے مہینے ہی انتقال ہوا ہے۔ اگر آپ ایک مہینے پہلے آ جاتے..." تھوڑی دیر میں سب کو خبر ہو گئی کہ افضال شاہ کا بیٹا آیا ہے۔ منیجر کے علاوہ سب وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کا بچپن دیکھا تھا۔ سب جمع ہو گئے تھے اور اسے تسلیاں دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اسے پہچان بھی لیا تھا لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا اس پر اپنی پہچان ظاہر کرنے کا۔

"میں اپنے گھر کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تالے کی چابی مل سکتی ہے؟"

منیجر نے دراز سے ایک چابی نکالی اور اس کے حوالے کر دی۔ کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے سب کو روک دیا۔ وہ اپنی یادوں کی کرچیاں اکیلے سمیٹنا چاہتا تھا۔

اس نے کانپتے ہاتھوں سے چابی گھمائی۔ کسی طرف سے آواز آئی۔ "تصویر! تو آ گیا۔" ظاہر ہے یہ اس کا وہم تھا۔ وہ صحن سے گزرتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ اس بستر کے قریب آیا جہاں اس کی ماں سویا کرتی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا، بس ماں نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ اس کی کتابیں اور فلمی رسالے کچھ سلیقے سے سجے کچھ ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ وہ کچھ دیر ساکت کھڑا رہا۔ اس کے کپڑے کھونٹی پر ٹنگے ہوئے تھے۔ اس کی ماں نے اس کی کسی بھی چیز کو اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیا تھا۔ اس نے ان کپڑوں پر پچکارنے کے انداز میں ہاتھ پھیرا اور تیزی سے باہر نکل آیا... جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر کچھ دیر اور ٹھہرا تو اس کا دل بند ہو جائے گا۔ پھر وہ اپنی ماں کے کمرے میں آ گیا۔ دیوار میں بنے طاق پر افضال شاہ اور راحیلہ کی تصویر رکھی تھی۔ اس گھر میں سب سے قیمتی چیز یہی تھی۔ اس نے اسے اٹھا لیا اور باہر نکل آیا۔ صحن عبور کیا، دروازے کو پھر سے تالا لگایا اور چابی واپس کرنے منیجر کے کمرے میں آ گیا۔

"میرے گھر میں جو سامان ہے، میں اسے یتیم خانے کی ملکیت میں دیتا ہوں۔ چاہیں تو اسے فروخت کر کے اس

www.pkdigest.com

کی رقم یتیم خانے کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیں، چاہیں تو غریبوں میں تقسیم کردیں۔'' اس کے علاوہ اس نے بڑی رقم کا چیک کاٹ کر منیجر کے حوالے کردیا۔

''یہ رقم اتنی ہے کہ اس سے کم از کم دس کمرے بہ آسانی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ ان کمروں پر میری والدہ راحیلہ اور افضال شاہ کے نام کی تختی لگوا دیجیے گا۔ میں اگلے سال آکر دیکھ لوں گا۔''

وہ باہر نکلا تو سورج ڈھلنے لگا تھا۔ میدان لڑکوں سے بھر گیا تھا۔ وہ کچھ دیر ان بچوں کے درمیان خود کو دوڑتا ہوا دیکھتا رہا اور پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

اس کی یکے بعد دیگرے دو فلمیں فلاپ ہوگئی تھیں۔ وہی تجزیہ نگار جو اسے اداکاری کا بادشاہ قرار دیتے تھے، اب اس کے خلاف لکھ رہے تھے۔ یہ تک لکھا جا رہا تھا کہ اس میں اداکاری کی صلاحیت قطعی نہیں۔ یہ محض اتفاق تھا یا قسمت تھی کہ اب تک چلتا رہا۔ اتفاق ہو یا قسمت، ہمیشہ ساتھ نہیں رہتے۔ فلمی نجومی اس کے تاریک مستقبل کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔ وہ بدلتی ہوئی ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا اور اپنے فلیٹ کے دروازے تمام دوستوں پر بند کر دیے تھے۔

صحافیوں کے قلم کا زہر ختم ہوا تو انہوں نے اس کے خلاف بھی لکھنا چھوڑ دیا۔ اب وہ بالکل ہی گم نام ہو کر رہ گیا۔ فلم انڈسٹری کے کرتا دھرتا نہایت توہم پرست ہوتے ہیں۔ جس ہیرو یا ہیروئن کی گرم بازاری دیکھتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اس کے سر پر ہما پرندہ بیٹھ گیا ہے اور جو بھی اس کی چھاؤں میں آجائے گا اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ جسے منحوس قرار دے دیا جاتا ہے اس کے سائے سے بھی بچتے ہیں۔ اسی صورتِ حال سے عاتش دوچار تھا۔ اس کی نحوست سے سب ہی بچ رہے تھے۔ وہی پروڈیوسر جو اس کے تلوے چاٹتے تھے، اب اس کے قریب آنے سے بھی کترا رہے تھے... جیسے وہ کسی ایسی بیماری کا شکار ہو کہ اگر وہ اس کے قریب گئے تو انہیں بھی یہ بیماری لگ جائے گی۔ ایکسٹرا لڑکیاں جو کبھی اس کے فلیٹ کا طواف کیا کرتی تھیں، چڑیوں کی طرح اڑ گئی تھیں۔ دوسرے درجے کے وہ ہیرو جو اپنا چراغ ہواؤں سے بچاتے پھرتے تھے، اب پوری توانائی سے روشن تھے۔ مخالفوں کی اس بھیڑ میں اسے محمود شارب بھی نظر آیا۔ کئی لوگوں کی زبانی اس نے سنا کہ وہ پروڈیوسرز کو مشورے دیتا پھر رہا تھا کہ ہارنے والے گھوڑے پر اپنی رقم مت لگاؤ۔ اس نے سنا تو تھا کہ مشکل وقت میں سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے مگر دیکھ اب رہا تھا۔

یہی وہ دن تھے جب اس نے خود فراموشی کے لیے شراب کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ شراب اگر اچھے دنوں کی ساتھی ہو تو نشاط کے لمحات فراہم کرتی ہے لیکن اگر برے دنوں میں ہاتھ پکڑے تو بے خودی کی انتہا اس کی منزل ہوتی ہے۔ عاتش کو جب سب کچھ میسر تھا تو شراب اس سے دور تھی۔ اب کچھ نہیں تھا تو شراب ہی اس کی دوست بن کر اس کے بیڈ روم میں آگئی۔ دوست جب تک ڈرائنگ روم میں ہو دوست رہتا ہے، بیڈ روم میں آجائے تو جیون ساتھی بن جاتا ہے۔ وہ اسے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اب وہی اس کی ساتھی تھی۔ وہ کسی وقت ہوش میں ہوتا ہی نہیں تھا جو مستقبل کے بارے میں کچھ سوچتا۔ کچھ نئے دوست بن گئے تھے جو اس کے پاس شراب پینے آتے تھے، جینے کا حوصلہ دینے نہیں۔ رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ کسی نے اگر سوچا بھی ہوگا کہ چانس دیا جائے تو بے ہوش کو ہوش میں کون لائے؟

ایک سال گزر گیا۔ اسے ہوش تو اس وقت آیا جب اس کے بینک اکاؤنٹ نے اسے جواب دیا۔ دھندلی آنکھوں میں نشے کے ڈورے کچھ کم ہوئے تو اس نے سوچا، کوئی فلم نہیں ملتی تو نہ ملے... میں اپنی فلم بھی تو بنا سکتا ہوں۔ وہ اسی دیوانگی میں ایک کہانی پر کام کرتا رہا۔ اس نے سوچا تھا، کہانی مکمل کر کے کسی اچھے ادیب سے مکالمے لکھوائے گا۔

کہانی مکمل ہونے کے بعد وہ ایسے لوگوں کی تلاش میں نکلا جو اس کے لیے سرمائے کا بندوبست کر سکتے تھے۔ یہ اس شہر کے وہ بڑے لوگ تھے جو کبھی خود کو اس کا دوست کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اپنی پارٹیوں میں بلا کر اپنی پارٹیوں کی رونق بڑھاتے تھے۔ اس کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کو تیار تھے لیکن اب جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے کی مثال بنے ہوئے تھے۔

اس نے خوب ٹھوکریں کھائیں اور بالآخر ایک فیصلہ کر لیا۔ اس کے اچھے دنوں کی یادگار اس کا فلیٹ، گاڑی اور اس کے بینک اکاؤنٹ کی باقی ماندہ رقم تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنا فلیٹ بیچ کر کسی معمولی سے فلیٹ میں کرائے پر رہ لے گا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دے دیا کہ وہ اپنا فلیٹ بیچنا چاہتا ہے۔ مجبوریوں کا سودا کرنے والے بہت ہوتے ہیں۔ خریدار آنا شروع ہو گئے لیکن قیمت اتنی کم لگ رہی تھی کہ وہ ایک مرتبہ پھر پریشان ہو گیا۔

کئی دن بعد اس نے پھر شراب سے گفتگو کی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوائیں اسے اکسا رہی تھیں۔ اس نے ایک پیگ کے بعد دوسرا ختم کیا تھا کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ اس بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر استقبالیہ

تھا۔ جب کوئی کسی سے ملنے آتا تھا، انٹرکام پر مطلع کیا جاتا۔ اجازت ملنے کے بعد مہمان کو اجازت دے دی جاتی تھی۔ اسے بھی انٹرکام پر بتایا گیا کہ کوئی خاتون ہیں۔ اپنا نام بتانا نہیں چاہتیں اور آپ سے ملنے کی متمنی ہیں۔ ان دنوں اس کے فلیٹ کے خریدار مسلسل آرہے تھے۔ یہ خاتون بھی اپنے پرس میں روپے ڈال کر آئی ہوں گی۔ اس نے سوچا اور اجازت دے دی۔ تھوڑی دیر بعد ڈور بیل نے شور مچایا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ریموٹ کا بٹن دبایا تو دروازہ کھل گیا۔ بائیس تئیس سال کی لڑکی قدرے مغربی لباس میں ملبوس اندر داخل ہوئی۔ عاتش نے انٹرکام سننے کے بعد ہی گلاس اور بوتل اٹھا کر رکھ دیے تھے۔ اس وقت الکحل کی ہلکی سی بو کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ لڑکی چلتی ہوئی آئی اور عاتش کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''مسٹر عاتش آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں، میں ہی تھا۔''

''اب نہیں ہیں؟''

''میں جو کچھ تھا ماضی میں تھا، اب تو اپنا سایہ ہوں۔ بہرحال، آپ بتائیں کیسے زحمت کی؟'' عاتش کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

''کیا میں آپ کا فلیٹ خرید سکتی ہوں؟''

''مجھے خوشی ہوگی... اگر آپ اس میں رہیں۔''

''میں ڈھائی کروڑ تک دے سکتی ہوں۔''

''آپ اتنی زیادہ قیمت کیوں دے رہی ہیں؟ اس فلیٹ کی قیمت ایک کروڑ سے زیادہ نہیں ہے۔''

''یہ صرف فلیٹ نہیں ہے، آپ کا فلیٹ ہے۔ اسی لیے قیمت زیادہ ہے۔''

''آپ کو کسی نے مجھ سے مذاق کرنے کے لیے بھیجا ہے؟''

''جی ہاں... ایک مذاق اور سنا دوں۔ میں بیرونِ ملک رہتی ہوں اس لیے فلیٹ میں خریدوں گی، رہیں گے آپ۔''

''کرایہ کتنا دینا ہوگا؟''

''مجھے کرائے کی ضرورت نہیں۔''

وہ نہایت بے تکلف ثابت ہو رہی تھی جیسے برسوں سے اس گھر میں آتی جاتی رہی ہو۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور فریج کھول کر پانی کی بوتل نکال لائی۔

''سنا ہے آپ کوئی فلم بنا رہے ہیں، جس کے لیے آپ کو رقم کی ضرورت ہے... اسی لیے آپ فلیٹ بیچ رہے ہیں؟''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے۔''

''تو پھر آپ فلیٹ نہ بیچیں۔ فلم بنانے کے لیے جتنی رقم آپ کو درکار ہے، میرے اکاؤنٹ میں اس سے زیادہ رقم ہو گی۔ میں آپ کو بلینک چیک دینے آئی ہوں۔ رقم آپ خود بھر لیجیے گا۔''

''محترمہ! سچ بتایئے، آپ کو کس نے میرے پاس بھیجا ہے اور بلینک چیک دینے میں کیا چال پوشیدہ ہے؟''

''کیا چال پوشیدہ ہو سکتی ہے؟''

''میں آپ کو جانتا تک نہیں اور میں آپ سے چیک لے لوں؟ یہاں سے نکلتے ہی آپ رپورٹ درج کرا دیں کہ آپ کی چیک بک گم ہو گئی ہے۔ میں کیش کرانے جاؤں اور پکڑا جاؤں۔''

''آپ تو اب بہت دور اندیش ہو گئے ہیں۔ بچپن میں تو ایسے نہیں تھے۔''

''بہت خوب! تو آپ مجھے بچپن سے جانتی ہیں؟''

''جانتے تو آپ بھی ہیں لیکن مداحوں کی بھیڑ میں مجھے کہاں پہچانیں گے آپ؟''

''آپ کچھ زیادہ ہوشیاری کا مظاہرہ نہیں کر رہیں؟ ہم دونوں کا بچپن اتنی دور نہیں چلا گیا کہ آپ کو پہچان بھی نہ سکوں اور پھر میرا بچپن تو قلم کے پردے پر گزرا ہے۔''

''آپ کو شرمین یاد ہے؟''

''کون شرمین؟''

''وہی جو آپ کے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی۔''

عاتش نے اس کی طرف چونک کر دیکھا۔ پھر جیسے اس کا ذہن تتلیوں کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ ایک لڑکی اس کے قریب آکر بیٹھی تھی اور اس سے پوچھ رہی تھی، تم فلموں میں کام کرتے ہو؟

''تم شرمین ہو؟ وہی جو میرے ساتھ اسکول میں پڑھتی تھی؟''

''ہاں عاتش... میں وہی ہوں۔''

''تم کتنی بدل گئی ہو۔''

''کچھ نہیں بدلا۔ تم نے اپنی مصروفیت میں مجھے یاد نہیں رکھا ورنہ کچھ بھی نہیں بدلا۔ تم نے تو میری وہ تصویر بھی گم کر دی ہو گی جو چلتے وقت میں نے تمہیں دی تھی جبکہ میں تمہاری تصویر... اب بھی اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ یہ دیکھو۔'' اس نے اپنے پرس سے تصویر نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔

عاتش اس تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو اس نے شرمین کو دی تھی۔ اگر وہ شرمین نہ ہوتی تو یہ تصویر اس کے پاس نہیں ہو سکتی تھی۔

''شرمین! اس مصروفیت کا برا ہو۔ میں واقعی تمہیں

www.pkdigest.com

بھول چکا تھا۔"

"بھول تو میں بھی گئی تھی۔ ہمارا تمہارا ساتھ ہی کتنا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی حسن پور آئی تھی۔ مجھے تم یاد بھی آئے تھے لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم سے کیسے ملا جا سکتا ہے۔ اب جو میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا تو مجھے تمہارا پتا مل گیا۔"

"اور تم فلیٹ خریدنے چلی آئیں؟" عائش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا تم اجازت نہیں دو گے کہ اس وقت میں تمہاری مدد کروں؟"

"تم فلیٹ خرید سکتی ہو۔"

"یہ سلوک تو غیر کرتے ہیں عائش! میں تم سے دور رہنے کا مع سود اتارنا چاہتی ہوں۔ تمہیں جتنی رقم کی ضرورت ہو، اس چیک پر خود بھر لینا۔"

"میں اتنی بڑی رقم تم سے کیسے لے لوں؟"

"قرض سمجھ کر لے لو۔"

"میں خود تو ڈوب رہا ہوں... میرے ساتھ تمہاری رقم بھی ڈوب گئی تو میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

"مجھے تمہاری صلاحیتوں پر اعتبار ہے عائش! تم ضرور کامیاب ہو گے۔ بس انکار مت کرو۔ یہ چیک رکھ لو۔"

"نہیں شرمین! اتنا بڑا رسک میں نہیں لے سکتا۔"

"تم فلیٹ بیچ رہے ہو نا؟"

"بیچ تو رہا تھا۔"

"اگر تمہیں نقصان ہو جائے تو اس وقت فلیٹ بیچ دینا اور میرا نقصان پورا کر دینا۔ اس وقت تو یہ فلیٹ بچ جائے گا۔" شرمین نے چیک پر اپنا نام لکھ کر ڈیڑھ کروڑ کی رقم لکھ دی اور چیک اس کی ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے کے نیچے دبا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں کل یہ ملک چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ دو مہینے بعد مجھے پھر آنا ہے۔ اس وقت تک تمہاری فلم بھی شروع ہو چکی ہو گی۔ اب کے آئی تو زیادہ دن کے لیے آؤں گی۔ خوب باتیں کریں گے۔"

"کچھ دیر تو اور ٹھہر جاؤ شرمین! مجھے اس احسان پر حیران تو ہونے دو۔"

"یہ احسان نہیں۔ آئندہ جو تم مجھے اپنا وقت دو گے اس کا ایڈوانس ہے۔ مجھے کل کے لیے تیاری کرنی ہے۔ اس وعدے کے ساتھ مجھے رخصت کرو کہ اپنا بہت خیال رکھو گے۔"

اس کے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک فریم میں لگی تصویر کی طرح بیٹھا رہا۔ شرمین نے مجھ پر رحم کھایا ہے یا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے؟ خیرات میں اتنے چیک نہیں دیے جاتے۔ یہ اس کی محبت ہے جو اسے یہاں تک لے آئی۔ میں اس کی محبت کا احترام کروں گا... اس کے بے لوث احسان کی قدر کرتا رہوں گا۔

اس نے دوسرے دن بینک جا کر چیک کیش کرا لیا۔

اب اسے ان تمام مراحل سے گزرنا تھا جن سے ایک فلم ساز کو گزرنا ہوتا ہے۔ یہ مراحل اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ بچپن سے انہی رستوں پر چلتا آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ خالی تھے تو دوستوں نے اپنی جیبیں بھی خالی کر لی تھیں کہ وہ کچھ مانگ نہ لے۔ اب اسے خفیہ خزانہ مل گیا تھا تو دوست پھر قریب آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ دوست وہ سایہ ہیں جو دھوپ میں ساتھ چھوڑ جاتا ہے لیکن کام بھی انہی سے نکلتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنے دروازے بند نہیں کیے البتہ احتیاط کو چوکیدار بنا لیا۔ جب آدمی محتاط ہو جائے تو دھوکے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ چوری ہمیشہ سوتے میں ہوتی ہے۔

کاسٹ مکمل ہو گئی تھی۔ کچھ گانے بھی ریکارڈ کر لیے گئے تھے۔ بس شوٹنگ کا آغاز ہونا تھا۔ اس کے لیے اس نے سیٹ بھی بک کروا لیا تھا۔ آؤٹ ڈور سین وہ بعد میں فلمانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے لوکیشن وغیرہ کا انتخاب ہو چکا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ اس کا فلیٹ اسی طرح کچھ بھی یاروں سے آباد تھا جس طرح کبھی ہوا کرتا تھا کہ ڈوربیل نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔ عائش کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ شرمین ہو گی۔ وہ اسے دیکھ کر پریشان تو بالکل نہیں ہوا کیونکہ وہ کہہ گئی تھی کہ دو مہینے بعد آئے گی لیکن حیران ضرور ہو گیا۔ اس کے دوست اس سے زیادہ حیران تھے۔ وہ آنے والی لڑکی سے واقف نہیں تھے اور یہ دیکھ رہے تھے کہ عائش اس کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

عائش نے اپنے دوستوں کا تعارف اس سے کرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ شرمین کے بارے میں کچھ بتاتا اور اپنی سادگی میں یہ بھی بتا دیتا کہ شرمین ہی وہ شخصیت ہے جس نے اس کی مالی مدد کی ہے، شرمین نے عائش کے ہونٹوں سے جملہ چھا لیا۔

"میرا نام شرمین ہے اور میں عائش صاحب کی معمولی سی مداح ہوں۔ میں کینیڈا میں رہتی ہوں۔ کل ہی حسن پور پہنچی ہوں اور آج یہاں ہوں۔"

فلمی دنیا شکوک کی پرچھائیوں سے آباد ہے۔ اسی لیے قدم قدم پر اسکینڈلز ساتھ چلتے ہیں۔ یہاں موجود لوگوں نے

شرمین کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ عائش نے کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات بھی اس کے دوستوں کو شک میں مبتلا کرنے کے لیے بہت تھی۔

"کیسے ہو عائش؟"

"تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی۔"

"میں تو دو مہینے پہلے ہی اطلاع دے چکی تھی۔"

"میرا مطلب ہے کہ حسن پور پہنچ کر مطلع تو کرتیں۔"

"سرپرائز دینے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

"اچھا ہوا جو تم آ گئیں۔ کل میری فلم کا پہلا سین فلمایا جا رہا ہے۔ تم بھی سیٹ پر ہو گی تو چار چاند لگ جائیں گے۔"

"عائش! میں شوٹنگ دیکھنے نہیں آ سکتی۔ فلم والے سوئی کا بھالا بنا دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ اسکینڈل بن جائے گا اس لیے میں اسٹوڈیو نہیں گئی، تمہارے فلیٹ پر آ گئی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تمہارا فلیٹ پھر سے آباد ہو گیا ہے۔ تمہارے دوست پھر سے آ ملے ہیں۔"

"انہیں دوست مت کہو شرمین! یہ مطلب کی منڈی ہے۔ خلوص سے کوئی بھی نہیں ملتا۔ دوست تو وہ ہوتا ہے جو مشکل میں کام آئے۔" عائش نے فرط جذبات سے شرمین کا ہاتھ تھام لیا۔ "دوست تو تم ہو شرمین!"

"کچھ پینے کے لیے نہیں کہو گے؟"

"چائے یا کافی تو یہاں بھی بن سکتی ہے لیکن ہم یہاں بیٹھے رہے تو کوئی نہ کوئی دوست آ دھمکے گا۔ چلو، کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"باہر تمہارے پرستار تمہیں گھیر لیں گے۔"

"ایسا کرتے ہیں حسن پور سے باہر لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔ راستے میں کہیں کچھ کھا پی بھی لیں گے۔ کوئی ڈسٹرب کرنے والا بھی نہیں ہو گا۔" عائش نے کہا تو شرمین نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔

حسن پور سے باہر کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ ایک دو اچھے ہوٹل بھی بنے ہوئے تھے جہاں بیٹھ کر چائے پی جا سکتی تھی۔ عائش نے گاڑی نکالی اور شیشے چڑھا کر اے سی آن کر دیا۔

"تمہاری فلم میں کوئی آؤٹ ڈور شوٹنگ بھی ہے؟" شرمین نے شہر سے باہر نکل کر پوچھا۔

"یہی دکھانے لایا ہوں۔ یہاں کئی ایسے مقام ہیں جو فلم کے اعتبار سے بہترین لوکیشن رہتی ہیں۔"

"تم کچھ سین کینیڈا میں کیوں نہیں فلماتے؟"

"جانتی ہو، یہ سودا کتنا مہنگا پڑے گا؟ پورے یونٹ کو لے جانا... وہاں ان کو ٹھہرانا کوئی مذاق ہے؟"

"یہ بھی تو سوچو کینیڈا کے نام پر یہ فلم بزنس کتنا کرے گی۔"

"وہ تو جب کرے گی تب کرے گی، فی الحال تو خرچ کرنا پڑے گا۔"

"یہ اخراجات میں برداشت کروں گی۔ تم بس یہ بتا دینا کہ کب آ رہے ہو اور کتنے لوگ ہیں؟"

"اگر ایک گانا بھی فلماؤں تو پندرہ بیس آدمیوں کی بھیڑ ہو گی میرے ساتھ۔ تم نہیں جانتیں فلم کے جھنجٹ کو۔"

"کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لوں گی، کیا یہ کم ہے۔"

"کیوں اتنی زیر بار ہوتی ہو؟"

"فکر مت کرو۔ ڈیڈی کے پاس بہت پیسے ہیں۔ مجھے اختیار ہے، جتنا چاہوں خرچ کروں۔ میں یہاں ایک مہینے رہوں گی... اس کے بعد انتظار کروں گی کہ تم کب کینیڈا آتے ہو۔"

ان باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ حسن پور سے بہت دور آ گئے تھے اور ابھی واپس بھی آنا تھا۔ ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور پھر حسن پور واپس آ گئے۔ دیر تک ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساحل پر چہل قدمی کرتے رہے پھر شرمین اپنے گھر چلی گئی اور عائش اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

اس کے بعد عائش بہت مصروف ہو گیا لیکن شرمین کے لیے اس کے پاس بہت وقت تھا۔ جب بھی شوٹنگ سے فرصت ملتی، وہ اسے فون کر دیتا۔ فلیٹ کا چوکیدار بڑی دلچسپی سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا کہ شرمین اس کے ساتھ آتی ہے اور پھر وہ دونوں رات گئے تک کے لیے فلیٹ میں بند ہو جاتے ہیں۔

وہ صرف پندرہ دن کے لیے آئی تھی۔ اس وعدے کے ساتھ چلی گئی کہ عائش اپنے یونٹ کو لے کر کینیڈا آئے گا۔ اس کا اسٹاف کسی ہوٹل میں ٹھہرے گا اور شرمین، عائش کی میزبانی کرے گی۔

فلم آدھی سے زیادہ بن چکی تھی کہ اس نے اپنے یونٹ کو خوش خبری سنائی کہ ہم دو گانے کینیڈا میں فلمائیں گے۔ یہ خبر اس نے صحافیوں کے کانوں میں بھی ڈال دی تاکہ فلم بینوں میں بھی اس کی شہرت ہو جائے اور جب فلم ریلیز ہو تو عوام اس پر ٹوٹ پڑیں۔

وہ پندرہ آدمیوں کا قافلہ لے کر کینیڈا کے شہر کیلگری پہنچ گیا۔ اس شہر کے مضافات میں کئی خوب صورت پوائنٹ تھے جہاں وہ شوٹنگ کر سکتا تھا۔

شرمین نے اس کے اسٹاف کے لیے ایک ہوٹل میں کمرے بک کرا دیے تھے۔ وہ سب وہاں ٹھہر گئے، عائش...

www.pkdigest.com

اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر چلی آئی۔ یہاں وہ اس کے والدین سے ملا۔ شرمین ان کی واحد اولاد تھی۔ شرمین کے والد اب کاروبار کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں انہیں خود کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ان کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا جسے سنبھالنے کے لیے ان کے ملازمین موجود تھے۔ وہ صرف کمپیوٹر پر بیٹھ کر اس کی نگرانی کیا کرتے تھے۔ شرمین ان کی معاون تھی۔ کینیڈا میں کئی ایکڑ پر پھیلا ہوا ان کا گھر ان کی بے پناہ دولت کا گواہ تھا۔

کینیڈا میں شرمین نے وہ شرط بھی ختم کر دی کہ وہ سیٹ پر موجود نہیں رہے گی۔ شوٹنگ شروع ہوئی تو وہ بھی عائش کے ساتھ ان مقامات پر موجود رہی۔ یہ کینیڈا تھا۔ یہاں اسکینڈلز کا کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے وہ بے فکر تھی۔

عائش اس کے گھر میں شہزادوں کی طرح رہ رہا تھا۔ شرمین اس کی خاطر داری میں دن رات ایک کر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ آسمان سے تارے توڑ کر لے آئے۔

دونوں گانے فلمائے جا چکے تھے۔ اب اسے واپس جانا تھا لیکن شرمین کا دل ابھی نہیں بھرا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کچھ دن اور گزارنا چاہتی تھی۔ عائش نے اپنے اسٹاف کو روانہ کر دیا اور خود کچھ دنوں کے لیے ٹھہر گیا۔

وہ اسے لے کر کینیڈا گھومنے نکل کھڑی ہوئی۔ ہر شہر میں اسے لے کر گئی۔ اس کے لیے خریداری کرتی رہی۔ سامان سے لدے پھندے، مختلف ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہوئے وہ واپس کیلگری آئے تو دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ چکے تھے۔ اتنے قریب کہ وہ اسے مستقبل کے لیے مشورے دے سکتی تھی۔

"ان فلموں میں کیا رکھا ہے عائش! ڈیڈی کا اتنا بڑا کاروبار ہے، اسے سنبھالو۔ میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں۔"

"کاروبار میرے بس کا کہاں؟ اس کے لیے ایک خاص ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"ہر کام شروع میں مشکل لگتا ہے۔ ذہن کا کیا ہے، بن ہی جاتا ہے۔ یہ تو دیکھو اس میں دولت کتنی ہے؟"

"فلم سے ملنے والی شہرت بڑی ظالم ہوتی ہے شرمین!"

"یہ بھی سوچو، یہ دنیا کتنی بے وفا ہے۔ وہ وقت یاد کرو جب لوگ تمہیں بھول چکے تھے۔"

"میری یہ فلم آنے دو۔ یہ فلم میرے لیے کوئی راستہ متعین کرے گی۔"

"میں تمہیں مجبور نہیں کر رہی عائش! مجھے معلوم ہے کہ تم اداکاری کے لیے بنے ہو۔ مجھے تم ہر حال میں عزیز ہو۔ اتنے عزیز کہ میں تم سے دور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میں تو ڈیڈی کو بھی مجبور کر رہی ہوں کہ وہ حسن پور چل کر رہیں تاکہ میں تم سے قریب رہ سکوں یا پھر تم کینیڈا چلے آؤ۔"

"تم مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو؟"

"ابھی تک تمہیں اندازہ ہی نہیں ہوا؟"

"دعا کرو، میری یہ فلم کامیاب ہو جائے۔ میں دنیا کو ایک مرتبہ بتا دوں کہ مجھ میں صلاحیت ہے پھر ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔"

وہ کینیڈا سے واپس آیا تو اسکینڈل تیار تھا۔ صحافیوں کو بھنک پڑ گئی تھی کہ ایک لڑکی نے اس کی اور اس کے یونٹ کی میزبانی کی ہے۔ انہوں نے اپنی جانب سے یہ اضافہ بھی کر دیا تھا کہ عنقریب عائش اس لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔

اس قسم کے اسکینڈلز کی جتنی تردید کی جائے، صحافی اسے اتنا ہی اچھالتے ہیں۔ لہٰذا اس نے ضروری نہیں سمجھا کہ اس پر کوئی تبصرہ کرے۔ کئی صحافیوں نے اس سے پوچھنا بھی چاہا تو اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔

شرمین اسے تقریباً روز ہی فون کرتی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کی داستانیں بھی سنا رہا تھا اور آئندہ کے لیے اپنے منصوبوں سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔ ان ٹیلی فونک ملاقاتوں میں وہ دونوں تقریباً طے کر چکے تھے کہ وہ شادی کر لیں گے۔

☆☆☆

ذیشان علی ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ شہر کے مشہور صنعت کار کا بیٹا تھا لیکن گلوکاری کے شوق نے اسے باپ کے کاروبار سے دور کر دیا تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی لیکن قسمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ٹی وی کے چند گیت اس کی پہچان بن سکے تھے جبکہ وہ پلے بیک سنگر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دن بھر اسٹوڈیوز کے چکر لگاتا رہتا لیکن کامیابی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ اس جدوجہد کا صرف ایک فائدہ ہوا تھا کہ اس کی ملاقات ایک گل پوش نامی لڑکی سے ہو گئی تھی جو اداکاری کے شوق میں دیوانی بنی ہوئی تھی۔ خوب صورت اتنی تھی کہ دیکھنے والا سانس لینا بھول جائے۔ اس کی یہی خوب صورتی بتاتی تھی کہ وہ بہت جلد ترقی کر لے گی۔ یہی ہوا بھی۔ وہ ایک ہدایت کار کی نظروں میں آ گئی اور اسے ایک فلم میں سائڈ ہیروئن کا رول مل گیا۔

ذیشان علی سے اس کی ملاقاتیں دوستی میں بدل گئی تھیں۔ گل پوش ہی کی کوششوں سے اسے بھی ایک فلم میں گانا مل گیا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت کہ گانا مقبول نہ ہو سکا۔ وہ اس

ناکامی سے ایسا بددل ہوا کہ راستے سے لوٹ گیا۔ اپنے باپ کا کاروبار سنبھال لیا اور پھر کبھی اسٹوڈیو میں نظر نہ آیا لیکن گل پوش سے دوستی برقرار رہی۔ وہ دونوں اکثر ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ اسٹوڈیو کی مصروفیت کے بعد گل پوش کا تمام وقت ذیشان کے ساتھ ہی گزرتا۔ ذیشان علی نے بہت چاہا کہ وہ اس سے شادی کر لے لیکن گل پوش ابھی اس بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔

"فلمی دنیا میں شادی کسی موت سے کم نہیں ہوتی۔ مجھے ابھی بہت آگے جانا ہے۔ میں اپنا لوہا منوا لوں، اپنی جگہ بنا لوں پھر شادی بھی کر لوں گی۔"

"ہم خفیہ شادی کر لیتے ہیں... کسی اعلان کے بغیر۔"

"یہاں کوئی کام خفیہ نہیں رہ سکتا۔ ہمارے اٹھنے بیٹھنے پر بھی نظر رہتی ہے۔ تمہیں نہیں معلوم پریس والے کس طرح ہماری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔"

"شادی کر لو۔ فلم میں کیا رکھا ہے؟ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے جو میں تمہیں نہیں دے سکتا؟"

"ذیشان! تمہیں معلوم ہے فلم میرا شوق ہے۔ کتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں یہاں تک پہنچی ہوں۔"

"کیا تمہیں فلم مجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے؟"

"موازنے کی بات نہیں ہے۔ میں دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہوں۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے، فلم بھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

"میں صرف محبت کا قائل نہیں۔ تم سے شادی بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں فلم سازوں کی کمزوری بن جاؤں پھر شادی بھی کر لوں گی۔"

"مجھے ڈر ہے شہرت کہیں تمہیں مجھ سے چھین نہ لے۔"

"ذیشان! تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں جب تم سے اپنی شادی کے حق میں نہیں تو کسی اور سے کیا کروں گی۔ پتا ہے مجھے کتنا اچھا چانس مل رہا ہے۔ مجھے ایک فلم کی آفر ہوئی ہے جس کا ہیرو عائش ہے۔"

☆☆☆

شرمین پورے آٹھ ماہ بعد حسن پور آئی تھی۔ عائش نے جو کچھ اسے فون پر بتایا تھا، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ پورا حسن پور اس کے پوسٹروں سے آراستہ تھا۔ اس کی فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم میں چونکہ ہیرو بھی وہ خود تھا اس لیے ہر طرف اس کے چرچے تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر سپر اسٹار بن گیا تھا۔ اس نے اپنا معاوضہ اتنا بڑھا دیا تھا کہ ہر فلم ساز اسے لینے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہمت کی تھی تو محمود شارب نے جو کبھی اس کا سرپرست رہ چکا تھا۔ دونوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے لیکن فلم انڈسٹری میں تو مفادات کی حکمرانی ہوتی ہے۔ محمود شارب نے گل پوش کو ہیروئن لیا تھا جو فلم بینوں کے لیے بالکل نیا چہرہ تھا۔ اس کی کامیابی اسی وقت ہو سکتی تھی جب اس کے مقابل عائش جیسا ہیرو ہو۔ یہی ضرورت تھی جو محمود شارب کو عائش کے پاس لے آئی تھی۔

شرمین دیکھ رہی تھی کہ کچھ پوسٹرز ایسے بھی نظر آ رہے ہیں جن میں وہ ایک نئی لڑکی کے ساتھ ہے لیکن یہ ایسی بات نہیں تھی جس کا وہ کوئی نوٹس لیتی۔ تعجب تو اسے اس وقت ہوا جب اس نے عائش کو فون کیا اور اس نے معذرت کر لی کہ آج وہ بہت مصروف ہے، کل کسی وقت مل سکتا ہے۔ اس کی آواز میں بھی وہ سرخوشی نہیں تھی۔

دوسرے دن وہ اس سے ملی تو اس نے بیٹھتے ہی کہہ دیا کہ اس کے پاس صرف ایک گھنٹا ہے۔ شرمین کو جھٹکا سا لگا۔ اب اس کی یہ اہمیت ہو گئی کہ عائش کے پاس اس کے لیے وقت نہیں۔

"عائش! تمہیں کیا ہو گیا ہے... میرے لیے تمہارے پاس صرف ایک گھنٹا ہے؟"

"سمجھا کرو شرمین! میرا کام بھی تو ضروری ہے۔ میں نے کئی فلمیں بیک وقت سائن کر لی ہیں۔ سب کو وقت دینا پڑتا ہے۔"

"میں چند دنوں کے لیے آئی ہوں پھر تمہارے پاس وقت ہی وقت ہو گا۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں، تم ہمیشہ کے لیے آ گئی ہو۔"

"فکر مت کرو۔ ہمیشہ کے لیے آنے والی ہوں۔ میں نے ڈیڈی کو راضی کر لیا ہے۔ چھ ماہ بعد ہم ہمیشہ کے لیے حسن پور شفٹ ہو جائیں گے۔ وہ تمہاری بہت تعریف کر رہے تھے۔ تم جلدی جلدی اپنی فلمیں نمٹا لو پھر ہم شادی کر لیں گے۔"

"میں اسی وقت تک ہیرو ہوں جب تک شادی نہیں کی ہے۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ اس کا مطلب ہے بندہ شادی ہی نہ کرے؟"

"میں تو کم از کم فی الحال شادی کے موڈ میں نہیں۔"

"مجھے حسن پور آنے دو۔ پھر دیکھتی ہوں کیسے شادی نہیں کرتے۔"

وہ صرف چند دن کے لیے آئی تھی۔ وہ چند دنوں میں بہ مشکل تین مرتبہ عائش سے مل سکی۔ اسے اچھا نہیں لگا لیکن وہ

www.pkdigest.com

اس کی مجبوری بھی سمجھتی تھی۔ وہ واقعی بہت مصروف تھا۔

محمود شارب نے اپنی فلم کا آغاز کر دیا تھا۔ عاشر ہیرو تھا اور گل پوش ہیروئن۔ عاشر لڑکیوں کے معاملے میں حریص نہیں تھا۔ اس نے اپنے وقت کی مشہور ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا تھا لیکن بس کام کیا تھا۔ کوئی لڑکی اسے متاثر نہیں کر سکی تھی۔ کسی کے ساتھ اس کا اسکینڈل مشہور نہیں ہوا تھا لیکن گل پوش کو دیکھ کر وہ مبہوت ہو گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے تربیت یافتہ بچے کی طرح تھی۔ وہ صرف اس کے ساتھ کام نہیں کر رہی تھی بلکہ اس سے سیکھ بھی رہی تھی۔ شوٹنگ کے بعد بھی وہ اپنا بیشتر وقت اس کے ساتھ گزارنے پر مجبور تھی۔ کون سا مکالمہ کس طرح ادا کرنا ہے... کس سچویشن میں چہرے کے تاثرات کیا ہوں... یہ سب کچھ وہ عاشر علی سے پوچھتی تھی۔ اکثر اس کے فلیٹ پر آجاتی اور اس کے سامنے اپنے مکالموں کی ریہرسل کرتی۔

جب دو اداکار سیٹ پر ہوتے ہیں تو حقیقت سے بہت دور ہوتے ہیں۔ محض دو کردار ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے جو وہ کہہ رہے ہیں، وہ نہیں کہہ رہے ان کا کردار کہہ رہا ہے لیکن جب یہ ملاقاتیں سیٹ سے اتر کر تنہائی تک آجائیں تو پھر کردار ہٹ جاتا ہے، ان کی ذات رہ جاتی ہے۔ یہی عاشر اور گل پوش کے ساتھ ہوا۔ وہ فلمی مکالمے بولتے بولتے اصلی مکالمے بولنے لگے۔ حقیقت کا یہ رنگ سیٹ پر بھی نظر آرہا تھا۔ وہ جذباتی سین ایک دوسرے میں ڈوب کر اس طرح ادا کر رہے تھے کہ تجربہ کار آنکھیں کہنے لگی تھیں کہ دونوں کے درمیان معاشقے کا آغاز ہو چکا ہے۔

ذیشان علی تک بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس نے گل پوش کی زبانی حقیقت جاننے کی کوشش بھی کی لیکن اس نے اس خبر کو سختی سے جھٹلا دیا تھا۔

ذیشان کسی قیمت پر گل پوش کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ گل پوش کے سامنے اس کا اظہار کئی مرتبہ کر چکا تھا۔ یہ تک کہہ چکا تھا کہ اگر عاشر کو راہ سے ہٹانا پڑا تو وہ اس سے بھی نہیں چوکے گا۔

محض دھمکی ہی کیوں نہ ہو لیکن گل پوش بہت سنجیدہ ہو گئی تھی۔ عاشر کی جان کو خطرہ ہے۔ اس کی چھٹی حس نے پکار پکار کر اس سے کہا۔ عاشر اس وقت نہ جانے کہاں ہو۔ اسے ڈھونڈنے میں دیر نہ لگ جائے۔ اس نے فون پر اس سے رابطہ کیا۔

"عاشر! تمہاری جان کو خطرہ ہے، ذرا محتاط رہنا۔"

"میری جان تو تم ہو... تم فوراً میرے پاس چلی آؤ تاکہ میں تمہیں احتیاط سے حفاظت کے ساتھ رکھوں۔ میں بے ضرر آدمی، میرا دشمن کون ہوگا؟"

"مذاق مت کرو عاشر! میں بہت سنجیدہ ہوں۔ ملوں گی تو بتاؤں گی کہ تمہیں کس سے خطرہ ہے۔"

"ملوگی تو بتاؤ گی، کیا مطلب؟ ابھی چلی آؤ۔ میں فلیٹ پر ہوں۔"

"اب رات بہت ہو گئی ہے۔ کیوں بدنام کرو گے؟"

"تم مجھے بدنام بھی قبول ہو۔"

"تمہیں معلوم ہے، میں بہن بہنوئی کے ساتھ رہتی ہوں اور وہ اس وقت سو چکے ہیں۔"

"پھر تو اور اچھا ہے۔ پرچہ لکھ کر چھوڑ دو کہ شوٹنگ نکل آئی ہے، تم صبح آؤ گی۔"

"اچھا، آتی ہوں۔ میں تمہیں انکار کیسے کروں؟"

آدھے گھنٹے بعد ہی وہ اس کے فلیٹ میں تھی۔

"تم گلوکار ذیشان علی کو جانتے ہو؟"

"نہیں، میں تو نہیں جانتا۔"

"خیر، وہ اتنا بڑا آرٹسٹ ہے بھی نہیں کہ تم اسے جانتے ہو گے۔ اسے تم سے پرخاش ہو گئی ہے۔ اسی نے تمہیں دھمکی دی ہے۔"

"اس کو مجھ سے کیا پرخاش ہو گئی جبکہ میں اسے یا وہ مجھے جانتے تک نہیں۔"

"تم اسے نہ جانتے ہو مگر وہ تمہیں جانتا ہے۔"

"جانتا ہوگا مگر ملے تو کبھی نہیں۔ جب تک کسی سے ملو نہیں، دوستی یا دشمنی نہیں ہوتی۔"

"دشمنی کی وجہ میں ہوں۔"

"تم؟"

"وہ صرف گلوکار نہیں ہے، سیٹھ عنایت کا بیٹا ہے۔ پیسے کے نشے میں مجھے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میرے انکار پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے مجھ پر بھی ہاتھ اٹھایا اور یہ دھمکی بھی دی کہ وہ تمہیں راستے سے ہٹا دے گا۔"

"وہ مجھے تو کیا راستے سے ہٹائے گا مگر اس نے تم پر ہاتھ اٹھایا، اس کا بدلہ میں اس سے ضرور لوں گا۔"

"نہیں عاشر! تم اس جھگڑے سے دور رہو، بس احتیاط سے کام لو۔ وہ بہت بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ دولت کے بل پر کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں کر سکتا۔" عاشر نے ٹیبل پر رکھے دو گلاسوں میں شراب انڈیلتے ہوئے کہا۔ "آج ذیشان کی ہونے والی پٹائی کے نام پر تم بھی میرے ساتھ ایک پیگ پیو گی۔"

"عاشر! تم جانتے ہو میں نہیں پیتی۔"

"ارے، اتنی بڑی اداکارہ ہوتے ہوئے اس نعمت سے دور ہو۔ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو یہ تو کرنا پڑے گا۔"

گل پوش انکار نہ کر سکی اور گلاس کے کناروں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

"تم ذیشان کو کب سے جانتی ہو؟"

"جب میں فلم لائن میں آنے کی کوشش کر رہی تھی، وہ بھی اسی سفر پر نکلا تھا۔ اسی راستے میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔"

"یہ ملاقات کتنی دور گئی تھی؟"

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"شک نہیں یقین کرنا چاہتا ہوں کہ زیادتی کس کی ہے؟"

"میری قسمت نے ساتھ دیا، وہ واپس لوٹ گیا۔ ہمارا ملنا جلنا بھی نہیں رہا۔ اب جو میری قسمت نے یاوری کی تو وہ مجھ سے شادی کر کے اپنا مستقبل سنوارنا چاہتا ہے جبکہ میرے اور اس کے درمیان کوئی جذباتی رشتہ تھا ہی نہیں۔"

"ہوں۔" عاشر نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو تم میرے لیے اور بھی قیمتی ہو گئی ہو۔ اب میں ایک سیٹھ کے بیٹے سے چھین کر تمہیں اپناؤں گا۔ کہو، کب شادی کر رہی ہو؟"

"عاشر! کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے؟"

"اس میں حرج بھی کیا ہے؟"

"کیا اس کے بعد میرا فنی سفر باقی رہے گا؟"

"کتنے ہی جوڑے ہیں جو کامیابی سے پردۂ سیمیں پر جلوہ گر ہو رہے ہیں۔"

"میری تو ابھی پہلی ہی فلم ہے۔"

"ہماری شادی ہو جائے گی تو ذیشان بھی خاموش ہو کر بیٹھ جائے گا۔"

"عاشر! اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت تو چاہیے ہوگا۔"

"اس فلم کی تکمیل تک۔"

"میں سوچوں گی۔"

باتوں باتوں میں وہ اتنی پی گئی تھی کہ قدم اٹھنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ وہ جس صوفے پر بیٹھی تھی، اسی پر لیٹ گئی۔ پہلے پہل کا نشہ تھا، اٹھنے کی سکت ہی کہاں تھی۔ عاشر نے کسی نہ کسی طرح اسے بیڈ تک پہنچایا۔

وہ صبح سو کر اٹھی۔ لازمی ہو گیا کہ عاشر کی نظر بدلنے سے پہلے وہ اس سے شادی کر لے۔

عاشر اسے اس کے گھر چھوڑ آیا۔ شام کو انہیں سیٹ پر دوبارہ ملنا تھا۔

چند دن اسی بحث و تمحیص میں گزر گئے کہ شادی کب کی جائے۔ یہ خبریں اسٹوڈیو سے باہر بھی نکل گئی تھیں۔ کئی اخباروں نے یہ خبر لگا دی کہ وہ گل پوش سے شادی کرنے والا ہے۔

وہ محمود شارب کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ذیشان علی دندناتا ہوا کمرے میں گھس آیا۔ اس وقت گل پوش وہاں موجود نہیں تھی۔ ذیشان نے آتے ہی ان خبروں کے بارے میں پوچھا جو اس کی اور گل پوش کی شادی کے بارے میں چھپ رہی تھیں۔ عاشر نے انکار کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"مسٹر عاشر! تم ایسی خبریں لگوا کر گل پوش کو بدنام نہیں کر سکتے۔"

"شادی میں کون سی بدنامی؟"

"یہ گل پوش کی مرضی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"محبت تم سے کرتی ہو گی مگر شادی مجھ سے کر رہی ہے۔"

"اس نے یہی وعدہ مجھ سے بھی کیا تھا۔"

"مگر اب مجھ سے کیا ہے۔"

"تم نے اسے ورغلایا ہے۔ اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ گل پوش میری ہے۔ اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"نہیں ہٹوں تو کیا کر لو گے؟"

"میں تمہیں اس لائق نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ غالباً وہ اپنا پستول اپنے ساتھ لایا تھا۔

عاشر کو یاد آیا، گل پوش کہہ رہی تھی کہ ذیشان نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس شخص کے ناپاک ہاتھوں نے اس کے رخسار پر نیل ڈال دیے ہوں گے۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں نے گھونسے کی شکل اختیار کی اور ذیشان کی کنپٹی کو اپنی زد میں لے لیا۔ عاشر ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی تھا۔ مذاق میں کہا کرتا تھا، ہر کام میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس وقت بھی اس کے بائیں ہاتھ نے کام دکھا دیا۔ گھونسا اتنا زوردار تھا کہ ذیشان کا منہ ایک جھٹکے سے دوسری طرف مڑ گیا۔ وہ پستول والا ہاتھ جیب سے باہر نکال چکا تھا لیکن گھونسے کے جھٹکے سے پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ شور سن کر پٹھان چوکیدار بھی اندر آگیا اور ذیشان پر قابو پا لیا گیا۔

ذیشان نے اقدام قتل کیا تھا۔ یہ پولیس کیس بنتا تھا۔ عاشر پولیس کو بلانے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بڑھا ہی تھا

www.pkdigest.com

لیکن محمود شارب نے اسے روک دیا۔

"یہ آپس کا معاملہ ہے، بیٹھ کر طے کر لیا جائے تو اچھا ہے۔"

ایک فریق گل پوش بھی تھی لہٰذا اسے بھی بلوا لیا گیا۔ ذیشان کے سامنے اس سے پوچھا گیا کہ وہ عائش اور ذیشان میں سے کس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس نے عائش کے حق میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ذیشان ایک مرتبہ پھر برہم ہوا لیکن پٹھان چوکیدار نے اپنی بندوق کے زور پر اسے روک لیا۔ محمود شارب نے بھی اسے سمجھایا کہ گل پوش کی مرضی وہ جس سے چاہے شادی کرے۔

"گل پوش صرف ایک مرتبہ کہہ دے کہ یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔"

سب نے سوالیہ نگاہوں سے گل پوش کی جانب دیکھا۔ وہ خاموش تھی۔ اتنی بڑی بات کیسے کہہ سکتی تھی؟ یہ بھی سوچ رہی ہوگی کہ انکار یا اقرار کی صورت میں نہ جانے کس کا ردعمل کیا ہو۔ اس نے محمود شارب کی طرف دیکھا پھر عائش کو دیکھا۔ عائش نے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو، کہہ دو۔

"ذیشان! میں تم سے محبت ضرور کرتی تھی لیکن میرے پیشے کا تقاضا تھا کہ عائش سے شادی کر لوں، سو میں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ تم مجھے معاف کر سکتے ہو تو کر دینا۔"

"بس مجھے یہی سننا تھا۔ اب میں بھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔ کبھی اس شخص سے شادی کر کے پچھتاؤ تو مجھے بلا لینا۔" اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

اب ضروری ہو گیا تھا کہ وہ دونوں جلد سے جلد شادی کر لیں۔

محمود شارب تو اب بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ شادی ان کی فلم مکمل ہونے کے بعد ہونی چاہیے لیکن ذیشان کو مکمل مایوس کرنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ شادی فوراً ہو جائے۔ عائش نے اسے کسی نہ کسی طرح قائل کر ہی لیا۔

فلمی شادیاں عموماً چوری چھپے ہو جایا کرتی ہیں اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس شادی کی تصدیق ہو، اس وقت تک علیحدگی ہو چکی ہوتی ہے۔ عائش نے بھی اس شادی کو اس حد تک ضرور خفیہ رکھا کہ تمام رسمیں اسٹوڈیو ہی میں ادا ہو گئیں اور وہ وہیں سے رخصت ہو کر عائش کے فلیٹ میں آ گئی۔

محمود شارب جس بات سے ڈر رہا تھا، وہی ہوئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی وہ گل پوش کو لے کر ہنی مون کے لیے سنگاپور چلا گیا۔

وہ ابھی سنگاپور سے آیا نہیں تھا کہ شرمین حسن پور آ گئی۔ اس مرتبہ اس کے والدین مکمل طور پر کینیڈا سے شفٹ ہو کر آ گئے تھے۔ آتے ہی اسے معلوم ہو گیا کہ عائش نے شادی کر لی ہے۔ یہ خبر ایسی نہیں تھی جسے وہ آسانی سے سن لیتی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ سنگاپور جائے اور عائش کو تلاش کرے لیکن پھر وہ حسن پور میں رہ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

عائش اس کی آمد سے بے خبر حسن پور پہنچا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ شادی کے ہنگاموں میں ڈوب کر اس کا دھیان شرمین کی طرف گیا ہی نہیں تھا لیکن اب وہ چیختی جاگتی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"عائش! تم نے تو کہا تھا، میں اسی وقت تک ہیرو ہوں جب تک شادی نہیں کرتا۔ اب کیوں کر لی شادی؟"

"شادی کرنا میری ذاتی پسند ناپسند کا سوال ہے۔ گل پوش مجھے اچھی لگی اور میں نے شادی کر لی۔"

"یاد ہے، یہ وعدہ تم نے مجھ سے کیا تھا؟"

"میں نے تم سے شادی کا وعدہ کبھی نہیں کیا تھا۔"

"تم نے صرف یہ کہا تھا، فی الحال شادی کے موڈ میں نہیں۔ میں نے کہا تھا، حسن پور آ جاؤں پھر دیکھتی ہوں۔ دیکھا تو یہ کہ تم شادی کر چکے ہو۔"

"تمہیں تو مبارک باد دینی چاہیے۔"

"تمہیں یہ کہتے ہوئے میرا ذرا بھی لحاظ نہیں آتا؟"

"شرمین! خفا کیوں ہوتی ہو؟ ہم اچھے دوستوں کی طرح بھی تو رہ سکتے ہیں۔"

"یہ دوستی اسی وقت رہ سکتی ہے کہ گل پوش کو فوراً طلاق دو۔ تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ گل پوش میری محبت ہے۔"

"اور میں؟"

"میں نے تم سے محبت کبھی نہیں کی۔ میں تمہاری محبت تھا اور گل پوش میری محبت ہے۔"

"یہ کہہ کر تم نے بات ہی ختم کر دی۔ اب تم سے میری ملاقات عدالت میں ہوگی۔" وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"عدالت کو یہ بتاؤ گی کہ میں تم سے شادی نہیں کر رہا؟"

"اب جو بتائے گا میرا وکیل بتائے گا۔" وہ چلی گئی۔

وہ اس کے جانے کے بعد ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔ بے وقوف لڑکی! میری شادی کو عدالت میں چیلنج کرے گی۔ کیا ثبوت پیش کرے گی کہ میں نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔

دو دن خیریت سے گزر گئے۔ ایک دن صبح ہی صبح محمود شارب کا فون آ گیا۔ "تم نے آج کا اخبار دیکھا؟"

"آپ کو معلوم ہے، میں اخبار پڑھتا ہی نہیں ہوں۔"

"مگر آج پڑھ لو۔ شرمین نے پریس کانفرنس کی ہے جس کی روداد چھپی ہے۔ اس نے تم پر سنگین الزامات لگائے ہیں۔"

اس نے اسی وقت اخبار منگوایا۔ شرمین نے اپنے بیان میں کہا تھا۔ "عائش میرا کلاس فیلو تھا۔ اسی وجہ سے میرے اور اس کے درمیان جان پہچان کا رشتہ تھا۔ جب اس کی فلمیں فلاپ ہونے لگیں اور اسے کوئی کام نہیں دے رہا تھا تو وہ میرے پاس آیا اور اس نے ڈیڑھ کروڑ روپے کی خطیر رقم مجھ سے طلب کی۔ میں نے وہ رقم بطور قرض اسے فراہم کر دی۔ اس کا ثبوت بینک ریکارڈ میں موجود ہوگا۔

"میں اس کی پریشانی کے دنوں میں کام آئی۔ میرے پیسوں سے اس نے فلم کا آغاز کر دیا۔ اسی دوران اس نے یہ چاہا کہ فلم کے کچھ سین کینیڈا میں فلمائے جائیں جہاں میں مقیم تھی۔ اس نے پھر مجھ سے رجوع کیا۔ میں نے پھر مدد کی۔ اس کے پورے یونٹ کو ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اس کے ثبوت بھی میرے پاس ہیں۔ اس نے فلم سے پیسے کمائے لیکن اب میرے پیسے لوٹانے سے گریز کر رہا ہے۔"

اس کے جواب میں عائش نے بھی پریس کانفرنس کی۔ "شرمین مجھ سے شادی کے لیے بضد تھی۔ میں نے گل پوش سے شادی کر لی تو وہ جل گئی۔ میں نے اس سے کوئی قرض نہیں لیا۔ اگر اس نے کچھ خرچ کیا ہوگا تو اپنی مرضی سے کیا ہوگا۔ اس کا میں ذمے دار نہیں۔"

شرمین نے میڈیا کا سہارا لیا اور ٹی وی پر آ کر مطالبہ کیا کہ عائش میری رقم واپس کرے۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ ہفتوں چلتا رہا۔ پھر ایک دن شرمین کی طرف سے اسے لیگل نوٹس وصول ہوا۔ عائش نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ شرمین نے اس کے خلاف دھوکا دہی اور جعلسازی کا مقدمہ درج کرا دیا۔

اخبار والوں کو مسالے دار اسٹوری ہاتھ لگ گئی۔ روزانہ خبریں شائع ہو رہی تھیں۔ عائش اسے بھی اپنی شہرت کا سبب سمجھ رہا تھا لیکن جب عدالت سے اس کے نام سمن آیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ شرمین معمولی باپ کی بیٹی نہیں تھی۔ وہ پانی کی طرح روپے بہا کر اچھے سے اچھا وکیل کر سکتی تھی۔ جتنا وہ اس پر خرچ کر چکی تھی، اگر اسے لوٹانا پڑ جاتا تو اسے فلیٹ تک بیچنا پڑتا۔ اب اس نے ایک مرتبہ پھر محمود شارب کو درمیان میں ڈالا۔ معاملہ عدالت تک نہ جائے، آپس میں طے ہو جائے تو اچھا ہے۔ محمود شارب نے شرمین سے رابطہ کیا۔ وہ بڑی مشکل سے تیار ہوئی کہ عائش کے سامنے بیٹھ کر اس سے بات کرے۔ یہ ملاقات محمود شارب کے گھر پر طے ہوئی۔

شرمین فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اندر داخل ہوئی تو عائش نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

"تم نے دوست ہو کر مجھے عدالت میں گھسیٹنا چاہا ہے؟"

"تم نے کون سی دوستی کی لاج رکھ لی؟"

"میں تو تمہیں اب بھی دوست سمجھتا ہوں۔"

"تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ مجھ سے وعدہ کر کے گل پوش سے شادی کی ہے۔"

"میں مجبور ہو گیا تھا۔ ایک ایسا قدم اٹھا بیٹھا تھا کہ اس سے شادی پر مجبور ہو گیا۔"

"تم اسے چھوڑ بھی تو سکتے ہو۔"

"اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہوگا۔"

اس کے بعد محمود شارب بھی گفتگو میں شامل ہو گیا۔ اس نے دونوں سے صلح کی درخواست کی تاکہ دونوں تماشا بننے سے بچ جائیں... اور بالآخر یہ طے ہوا کہ عائش قسطوں میں اس کی رقم لوٹا دے گا اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف بیان نہیں دیں گے۔

یہ معاملہ طے ہو چکا تھا کہ اچانک شرمین نے حیران کن دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔

"مجھے بس یہ باور کرانا تھا کہ میں یہ بھی کر سکتی ہوں۔ وہ میں نے دکھا دیا۔ میں نے عائش پر جو خرچ کیا، وہ میری دوستی کا تقاضا تھا۔ وہ رقم مجھے واپس نہیں چاہیے۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح رہیں گے۔ کبھی کبھی ملتے رہیں گے۔ مجھے عائش کی دوستی چاہیے اور کچھ نہیں۔"

یہی بات اس نے پریس کانفرنس میں بھی کہی۔ پڑھنے والے پھر حیران ہو گئے کہ اس کا پہلا بیان درست تھا یا یہ بیان درست ہے۔ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اس نے ہر سوال کا جواب دیا اور واضح کر دیا کہ عائش اس کا دوست ہے اور دوستوں کے درمیان غلط فہمیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس نے ایک نامعلوم کردار کا بھی ذکر کیا کہ وہ اسے عائش کے خلاف بھڑکا رہا تھا لیکن اصرار کے باوجود وہ اس کا نام نہ بتا سکی۔ شاید اس کا کوئی نام تھا ہی نہیں۔ یہ وہ خود ہی تھی جو اپنے آپ کو عائش کے خلاف بھڑکا رہی تھی۔ یہ اس کا دل تھا جس نے اسے صلح پر مجبور کر دیا تھا۔

دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بحال ہو گیا تھا لیکن اب پہلے جیسی گرم جوشی نہیں تھی۔ کبھی کبھی وہ ملتے ضرور تھے لیکن خلوص کا دونوں طرف فقدان تھا۔

☆☆☆

ایک نوجوان عورت اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے برابر اس کا بچہ سو رہا تھا۔ کمرے میں ایک آدمی داخل ہوا۔ وہ

www.pkdigest.com

یقیناً اس عورت کا شوہر تھا۔ اس نے آتے ہی عورت کو مارنا شروع کر دیا۔ وہ عورت بستر سے نیچے گر گئی اور بچہ اٹھ کر رونے لگا۔

''تو اس سے ملنا نہیں چھوڑے گی؟'' وہ آدمی جب مارتے مارتے تھک گیا تو اپنی بیوی سے کہا۔

''میں اس سے ملی ضرور تھی لیکن یہ اتفاقیہ ملاقات تھی... میرا اس سے کوئی بُرا تعلق نہیں ہے۔''

''کل نہیں تھی، ملتی رہتی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مجھ سے شادی سے پہلے تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔''

''شادی کے بعد میں نے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا لیکن تم مجھ پر شک کرو گے تو میں اس سے ضرور ملوں گی۔ دیکھتی ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو۔ تنگ آ گئی ہوں میں تمہارے شکی مزاج سے۔''

''میں شکی ہوں؟''

''تم نے مجھے قیدی بنا کر گھر میں بند کر دیا ہے۔ یہ شک نہیں تو اور کیا ہے؟''

''تو آوارہ ہے، بدچلن ہے۔ ایسی عورتوں کے ساتھ یہی کرنا چاہیے۔''

''میں آوارہ ہوں تو چھوڑ دو مجھے۔ رکھا ہوا کیوں ہے؟''

''چھوڑوں گا نہیں، تجھے جان سے مار کر نشانِ عبرت بنا دوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے عورت کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ عورت نے ہاتھ پاؤں چلائے اور لات مار کر مرد کو دور پھینک دیا اور پھر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر پستول نکال لیا۔ دھائیں دھائیں۔ دو فائر ہوئے۔ ایک گولی مرد کے سر میں لگی دوسری اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ عورت کچھ دیر آنکھیں پھاڑے مرد کی لاش کو دیکھتی رہی پھر جیسے اسے ہوش آ گیا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور گھر سے نکل گئی۔

عاتش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ اے سی میں سو رہا تھا لیکن اس کے باوجود اس کا بدن پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس نے شکر کیا کہ یہ ایک خواب تھا۔ وہ کچھ دیر اس خواب پر غور کرتا رہا اور پھر سو گیا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد اس نے پھر یہی خواب دیکھا۔ اس خواب میں ذرا سا بھی ردوبدل نہیں ہوا تھا۔ جیسے ایک فلم کو کوئی دوبارہ چلا دیتا ہے۔ کون تھی وہ عورت؟ اس نے اپنے شوہر کو مار دیا... یہ ڈراؤنا خواب جانے دوبارہ کیوں دیکھا؟

دو دن گزرے ہوں گے کہ یہ خواب پھر نظر آیا۔ اب وہ خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ایک ہی خواب میں کیوں بار بار دیکھ رہا ہوں؟ کہیں میرے ساتھ بھی یہی سب کچھ تو نہیں ہونے والا؟ ڈاکٹر عادل مشہور سائیکولوجسٹ تھے۔ عاتش نے ان سے ٹائم لیا اور اس خواب کو ان کے سامنے دہرایا۔ خواب میں کوئی بات ہوتی ہو لیکن اہم بات یہ تھی کہ وہ ایک ہی خواب تواتر سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کو اپنے بچپن کا کوئی ایسا واقعہ یاد آتا ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''میرے والدین تو طبعی موت مرے ہیں۔''

''ضروری نہیں کہ خواب میں نظر آنے والے آپ کے والدین ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسا یا کوئی اس سے ملتا جلتا واقعہ آپ نے کبھی دیکھا ہے... یاد آتا ہے؟''

''مجھے تو ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں آتا۔''

''ہو سکتا ہے، یہ واقعہ آپ کی اس عمر کا ہو جس عمر کی باتیں بڑے ہو کر آدمی بھول جاتا ہے۔ یہ عمر تین چار سال تک کی ہوتی ہے۔ اس عمر کی بہت سی باتیں ہمارے لاشعور میں دفن ہو جاتی ہیں۔ خواب میں جب شعور سو جاتا ہے تو لاشعور بیدار ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی لاشعور غیر معمولی طور پر متحرک ہو جاتا ہے اور کوئی خاص واقعہ خواب میں نظر آ جاتا ہے۔ یہی آپ کے ساتھ ہوا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب! میں ہر روز یہی خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

''دماغی خلیوں میں کوئی غیر معمولی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ میں کچھ دوائیں لکھ دیتا ہوں، انہیں استعمال کریں اور سونے سے پہلے کسی اچھی سی کتاب کے چند صفحے پڑھ کر سویا کیجیے۔''

وہ کچھ مطمئن ہوا، کچھ نہیں ہوا... بہرحال گھر چلا آیا۔ آج اس کی ڈیٹ بھی تھی۔ اسے گھنٹا بھر کے اندر اندر سیٹ پر موجود ہونا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو اس نے گل پوش کو کسی سے فون پر باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ شاید اس کی پروا نہ کرتا لیکن گل پوش نے اسے دیکھ کر فوراً فون بند کر دیا تو نہ جانے کیوں اسے شک ہوا۔

''کس کا فون تھا؟''

''میری ایک بہت پرانی سہیلی تھی۔ نہ جانے یہاں کا نمبر اسے کیسے مل گیا۔''

''سہیلی تھی یا ذیشان تھا؟''

''عاتش! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ وہ کیوں کرے گا مجھے فون؟''

''پھر تم نے مجھے دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے فون بند کیوں کر دیا؟''

''میں خود جلدی میں تھی۔ فون رکھنے ہی والی تھی کہ

تم آ گئے۔''

''دیکھو اگر مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی تو بہت برا ہوگا۔''

''میری کوئی بات تم سے چھپی ہوئی ہے؟''

''تم ذیشان سے محبت کرتی ہو۔ اس کا اقرار تم میرے سامنے کر چکی ہو۔ اس لیے مجھے یہ خیال آیا۔''

''تم نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے مجھے خود اشارہ سے کہا تھا کہ میں محبت کا اقرار کر لوں۔ اب الزام مجھے دے رہے ہو؟''

''بکواس مت کرو۔ اشارے کے باوجود کوئی عورت کسی اجنبی سے محبت کا اقرار نہیں کر سکتی۔ تم اس سے محبت کرتی تھیں اسی لیے تو اقرار کیا تھا۔''

''ذیشان میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔''

''ہاں، یہ ہوئی نا بات۔ وہ اجنبی نہیں تھا۔ تمہارا دوست تھا۔ تم سے محبت کرتا تھا اور شادی تم نے مجھ سے کر لی کیونکہ میں بڑا ہیرو تھا... ہے نا یہی بات؟''

''میری اس سے دوستی ضرور تھی لیکن اب میں تمہاری بیوی ہوں۔ اب میں نہ اس سے ملتی ہوں نہ فون کرتی ہوں اور نہ وہ مجھے فون کرتا ہے۔ ایسے تو میں بھی کہہ سکتی ہوں کہ تم یمن سے محبت کرتے تھے اور شادی مجھ سے کر لی کیونکہ میں اس سے زیادہ خوب صورت تھی... ہے نا یہی بات؟''

''یہی بات تھی لیکن میں مرد ہوں، کچھ بھی کر سکتا ہوں... لیکن تمہیں یہ اجازت نہیں دوں گا کہ تم ذیشان سے ملتی پھرو۔ ضرورت پڑی تو میں تمہارے باہر نکلنے پر بھی پابندی لگا دوں گا۔''

''عاتش! تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟ میں ذیشان سے نہیں ملتی ہوں۔''

''آئندہ اس سے ملنا تو احتیاط سے ملنا۔ میں کھوج لگا ہی لوں گا۔''

دونوں کو شوٹنگ کے لیے گھر سے نکلنا تھا۔ آج انہیں ایک رومانٹک سین فلمانا تھا لیکن دونوں کا موڈ آف ہو گیا۔ دونوں تیار ہو رہے تھے لیکن آپس میں بات چیت بند تھی۔ آخر عاتش کو احساس ہوا کہ اگر وہ اسی طرح بنے رہے تو سیٹ پر کیا ہوگا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی گل پوش کے گلے میں اپنے بازو حمائل کر دیے۔

''ابھی تک ناراض ہو؟''

''ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے؟''

''چلو معاف کر دو۔

''وعدہ کرو آئندہ مجھ پر شک نہیں کرو گے۔''

''وعدہ۔''

تیاری کو آخری رنگ ملا تو دونوں پہلے کی طرح تھے۔

☆☆☆

سیٹھ عنایت کی بلیک مرسیڈیز آ کر رکی تو جواد علی کے سفید السیشین نے ہلکی سی آواز نکالی اور پھر دم ہلاتا ہوا... گاڑی کے گرد چکر لگانے لگا۔ جواد علی بھی ملازم کی اطلاع پر باہر نکل آیا تھا۔

''بھئی ان کتوں کا حافظہ بھی خوب ہوتا ہے۔ پورے چھ مہینے بعد آیا ہوں لیکن یہ میری گاڑی تک پہچان گیا۔''

''جی ہاں، یہ آپ کو بتا رہا ہے کہ آپ سے تو کتے اچھے کہ دوستوں کو یاد رکھتے ہیں۔ تم چھ مہینے بعد مجھے یاد کرتے ہوئے آئے ہو۔''

''ارے، میں ملک میں تھا ہی کب۔ کل پہنچا ہوں اور آج آ گیا۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کرسیاں باہر نکلواؤں یا ڈرائنگ روم میں بیٹھو گے؟''

''بھئی، آج میں جتنا اہم آدمی بن کر آیا ہوں اسے تو تمہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانا چاہیے۔''

''کیا کوئی نئی فیکٹری کی بنیاد ڈال دی؟''

''ارے نہیں یار... یہ کاروباری بات نہیں۔''

''تیسری شادی کر لی کیا؟''

''تمہارے منہ میں گھی شکر مگر اب ہماری تمہاری کہاں، اولادوں کی باری ہے شادی کرنے کی۔''

دونوں باتیں کرتے ہوئے ڈرائنگ روم تک آ گئے۔ ملازم نے ناشتے کی ٹرے پہلے ہی سجا دی تھی۔ جواد علی کے ملازم جانتے تھے کہ سیٹھ عنایت کا جب تک منہ چلتا رہتا ہے اس کا دماغ چلتا رہتا ہے۔

''سنا بھئی سیٹھ عنایت... تو اہم آدمی کس طرح بن گیا؟''

''بتاتا ہوں پہلے کچھ کھا تو لوں۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر سمی ابھر کا جوا اٹھا لیے۔

''تمہاری بیٹی ثمرین کہاں ہے؟ اس کا کہیں رشتہ وغیرہ طے ہوا؟''

''ابھی تو کہیں کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ سب دوستوں سے کہہ تو رکھا ہے۔ ہماری کلاس کے لوگوں کی یہ بہت بڑی پرابلم ہے۔ برابر کے رشتے ہیں کہاں؟''

''جواد علی! کیا تم مجھے اپنے برابر کا سمجھتے ہو؟''

''تم تو خاندانی رئیس ہو۔ میں نے تو سب کچھ اپنی

www.pkdigest.com

محنت سے حاصل کیا ہے۔ برابر کیا تم تو مجھ سے ایک درجہ اونچے ہی ہو۔“

”میں اپنے بیٹے ذیشان کے لیے شرمین کو مانگنے آیا ہوں۔“

”میرے لیے یہ فخر کی بات ہوتی مگر تمہارا بیٹا تو فلموں ولموں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔“

”یہ تو پرانی بات ہوگئی۔ فلموں کا بھوت اس پر سوار ضرور ہوا تھا لیکن جلد ہی اتر بھی گیا۔ اب تو وہ میرا آدھا کاروبار سنبھال رہا ہے۔“

”یار! گھر کی سی بات ہے۔ ایک بات بتاؤں، شرمین شادی پر تیار ہی نہیں ہوتی۔“

”یہ کیا بات ہوئی... کیسے نہیں کرے گی شادی؟ میں سمجھاؤں گا اسے۔“

”میں اس سے خود بات کر کے دیکھتا ہوں۔ میرے ایک چچا ہیں، ان کی بات بھی وہ بہت مانتی ہے۔ ان سے کہوں گا، وہ سمجھائیں گے۔“

”تمہاری طرف سے تو انکار نہیں ہے؟“

”میں کیوں انکار کروں گا؟“

یہ ایک آئیڈیل رشتہ تھا۔ شرمین کی عمر بھی اب بڑھتی جارہی تھی۔ پچھلے دنوں جو وہ خبروں کی زینت بنی رہی تھی، اس سے بھی وہ پریشان تھا۔ ان حالات میں سیٹھ عنایت جیسے صنعت کار کے گھر سے رشتہ آنا خوش قسمتی نہیں تو اور کیا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے شرمین کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ تو شادی کے نام ہی سے چراغ پا ہوگئی۔ وہ کسی صورت شادی پر تیار نہیں تھی۔

گھر میں تھا ہی کون۔ والد تھے یا والدہ۔ ان دونوں سے لڑنا اس کے لیے بہت آسان تھا۔ ان دونوں نے بھی شاید قسم کھائی تھی کہ اسے آمادہ کر کے ہی رہیں گے۔ جواد علی نے اپنے چچا کو بھی درمیان میں ڈالا۔ خلافِ معمول اس نے ان کی بات بھی ٹال دی لیکن جھکنے والے وہ بھی نہیں تھے۔ ہر دوسرے دن اسے سمجھانے چلے آتے۔ اسے اس کا اچھا برا بتاتے اور چلے جاتے۔ اس کوشش میں کئی مہینے گزر گئے بالآخر اس نے مسلسل تقاضوں کے آگے سر جھکا دیا۔

سیٹھ عنایت پڑھا لکھا تو کم تھا لیکن اتنا بڑا کاروبار چلا رہا تھا۔ اس سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ اتنا وہم پرست ہوگا۔ یہ خبر سنتے ہی کہ شرمین شادی پر تیار ہوگئی ہے، اس نے اپنے خاندانی نجومی کو بلالیا۔ اس نے حساب کتاب لگا کر بتایا کہ یہ شادی چھ مہینے بعد ہونی چاہیے۔ یہ خبر سیٹھ عنایت کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بہت تھی۔ خدا خدا کر کے شرمین تیار ہوئی تھی۔ اگر کچھ مہینے بعد شرمین کا ارادہ بدل گیا تو کیا ہوگا؟ وہ پریشان ضرور تھا لیکن نجومی کے مشورے کے برعکس عمل بھی نہیں کرسکتا تھا اس کے لیے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ فی الحال منگنی کرلی جائے۔ چھ مہینے بعد شادی ہوجائے گی۔

جواد علی نے منگنی کا سنا تو تعجب کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

”سیٹھ عنایت! منگنی کے چکر میں کیوں پڑ رہے ہو۔ سیدھی سیدھی شادی کرو۔“

”بھائی! یہ ہماری خاندانی روایت ہے۔ ہم لوگ منگنی ضرور کرتے ہیں۔“

”منگنی بھی کرلو لیکن یہ چھ مہینے کی کیا شرط ہے؟ آج منگنی کرو، پندرہ دن بعد شادی کرلو۔“

”تم نہیں سمجھو گے۔ ہمارے گھر کی عورتیں یہی کہتی ہیں کہ منگنی کے کم از کم چھ مہینے بعد شادی ہو تو مبارک ثابت ہوتی ہے۔“

”کہاں عورتوں کی باتوں میں آگئے؟ یہ سب تو وہم پرستی ہے۔“

”میں کہاں مانتا ہوں ان باتوں کو مگر کیا کروں عورتوں کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔ اب تک یہی ہوتا آیا ہے۔ خاندان میں ایک شادی چھ مہینے سے پہلے ہوئی تھی، چھ دن بھی نہیں چلی۔ بس اسی دن سے دل میں وہم آگیا ہے۔“

جواد علی کو اس کی بات ماننی پڑی۔ منگنی کی رسم نہایت سادگی سے کوٹھی کے لان ہی میں ادا ہوگئی۔

☆☆☆

عائش اور گل پوش کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جارہے تھے۔ عائش نے گل پوش پر یہ پابندی بھی لگا دی تھی کہ وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی۔ اس کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے گل پوش نے یہ پابندی بھی قبول کرلی تھی اور صحافیوں کو یہ بتایا تھا کہ وہ روشنیوں کی دنیا سے اکتا گئی ہے لہٰذا فلموں سے کنارہ کشی اختیار کررہی ہے۔ اس پابندی میں اس کے شوہر کا کوئی ہاتھ نہیں۔

عائش کے خواب اسے مسلسل پریشان کررہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن یہ خواب اسے نظر آجاتا تھا۔ ایک بیوی اپنے شوہر کو گولی مارتی ہے اور بچے کو لے کر بھاگتی ہے۔

عائش اس خواب کے ایک ایک پہلو پر غور کرتا تھا۔ اپنے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کرتا لیکن کوئی بات یاد نہیں آتی تھی۔ وہ ذہنی مریض بن کر رہ گیا تھا۔ تنہائی میں اپنے بال نوچ ڈالتا۔ شراب بھی اتنی زیادہ پینے لگا تھا کہ گل پوش اسے روکتے روکتے تھک گئی تھی۔ نشے کی حالت میں اس کا غصہ گل پوش پر اترتا تھا۔ وہ اس پر تشدد کرتا۔ وہ فلموں سے آئی تھی لیکن گھریلو عورتوں کی طرح برداشت کررہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فلمی دنیا میں ہر بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ اگر ایک بات بھی صحافیوں کے ہاتھ لگ گئی تو کہانیاں گھڑی جانے لگیں گی۔

عائش نے یہ خواب ایک روز دن کے وقت دیکھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو گل پوش فون پر کسی سے بات کررہی تھی۔ اس کے دل میں پھر وہم نے سر اٹھایا۔ ہو نہ ہو یہ ذیشان کا فون ہوگا۔

”کس کا فون تھا؟“

”محمود شارب صاحب تھے۔“

”کمال ہے، انہوں نے کیوں فون کرلیا اور وہ بھی تمہیں؟“

”کہہ رہے تھے، میں اپنے فیصلے پر نظرثانی کروں اور دوبارہ فلموں میں آجاؤں۔“

”اچھا! یہ کہہ رہے تھے۔ پھر تم نے کیا کہا؟“

”فکر مت کریں۔ میں نے آپ کا نام نہیں لیا۔ کہہ دیا، میرا دل اکتا گیا ہے۔“

عائش نے اپنے دل میں کہا۔ ہوشیار عورت... میں محمود شارب سے خود پوچھ لوں گا کہ اس نے تجھ سے کیا پوچھا ہے۔ وہ شام کے وقت اسٹوڈیو گیا بھی تھا لیکن محمود شارب سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ تین دن بعد ملاقات ہوئی تو غالباً اسے یاد بھی نہیں رہا تھا کہ اس نے گل پوش کو فون کیا تھا۔ چنانچہ عائش نے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کردیا۔ یہ بات اتنی معمولی نہیں تھی کہ عائش اسے بھول جاتا۔ اس نے گل پوش سے کچھ نہیں کہا لیکن شک نے جڑ پکڑ لی کہ فون ذیشان کا تھا۔ میں جب بھی سو جاتا ہوں، وہ ذیشان کو فون کرتی ہے۔ پکڑی جاتی ہے تو جھوٹ بول دیتی ہے۔

ڈاکٹر نے اس سے کہا تھا، آپ اپنے خواب پر جتنا غور کریں گے یہ خواب اتنا ہی آپ کا پیچھا کرے گا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب بھی خواب دیکھتا، غور کرنے بیٹھ جاتا کہ یہی ایک خواب وہ بار بار کیوں دیکھتا ہے۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر غور کرنے بیٹھ جاتا تھا۔ اندھیرے کے سوا اسے کچھ نہ ملتا۔ ایک دن اس اندھیرے میں اسے روشنی کی جھلک نظر آگئی۔ وہ غور کرنے لگا۔ خواب میں ایک بیوی اپنے شوہر کو قتل کرتی ہے۔ کہیں وہ عورت میری بیوی گل پوش تو نہیں۔ ذیشان کی خاطر کہیں ایک دن مجھے قتل نہ کردے۔ یہ خواب نہیں، یہ کوئی اشارہ ہے۔ مجھے ہوشیار کیا جارہا ہے کہ میں ہوشیار ہو جاؤں۔ یہ حادثہ کسی دن بھی ہوسکتا ہے۔ خواب میں وہ عورت اپنے کسی آشنا سے ملتی ہے۔ شوہر باز پرس کرتا ہے تو مارا جاتا ہے۔ گل پوش بھی یقیناً ذیشان سے ملتی ہے۔ میں نے اگر کسی دن سختی دکھائی تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے مارے، میں ہی کیوں نہ اسے موت کی نیند سلا دوں۔

یہ خواب دراصل اس کے لاشعور میں دبی ہوئی وہ یاد تھی جو اس کے بچپن سے وابستہ تھی۔ خواب میں اس عورت کے برابر لیٹے ہوئے جس بچے کو وہ دیکھ رہا تھا، یہ بچہ وہ خود تھا۔ وہ عورت اس کی ماں تھی اور جو قتل ہوا، وہ اس کا باپ تھا... لیکن یہ واقعہ اس کی ایسی عمر میں پیش آیا تھا جس عمر کا بچہ بڑا ہو کر اس عمر کے کسی واقعے کو پوری طرح یاد نہیں رکھ سکتا۔ کوئی اہم ترین بات اس کے ذہن میں دبی رہ جاتی ہے۔ وہ بھی پوری طرح نہیں۔ اسے اپنے ماں باپ کی شکلیں یاد نہیں تھیں لیکن یہ واقعہ یاد رہ گیا تھا۔ وہ تو افضال شاہ اور اس کی بیوی راحیلہ کو اپنے ماں باپ سمجھتا رہا تھا۔

اس نے طے کرلیا تھا کہ وہ گل پوش کو قتل کردے گا۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو گل پوش اسے قتل کردے گی۔ اس کے بعد سے وہ کسی ایسے منصوبے پر غور کرنے لگا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ گل پوش کو قتل بھی کردے اور پکڑا بھی نہ جائے۔ اس نے کئی منصوبے تخلیق کیے لیکن ہر ایک میں کوئی نہ کوئی جھول رہ جاتا تھا۔ پھر ایک روز ایک منصوبے نے دل میں جگہ بنا ہی لی۔

اس نے آئی جی، ڈی آئی جی اور اپنے علاقے کے ایس پی کو درخواستیں لکھیں کہ اسے ایک نامعلوم کال موصول ہورہی ہے۔ کوئی شخص دھمکی دے رہا ہے کہ موقع ملتے ہی اس کی بیوی کو قتل کردیا جائے گا۔

وہ کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ نامور ہیرو تھا۔ جانی پہچانی شخصیت تھا۔ سرکاری مشینری فوراً حرکت میں آگئی۔ ایک پولیس موبائل آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ گل پوش کے ساتھ باہر نکلتا تو بھی یہ موبائل ان کے ساتھ چلتی۔

عائش کو معلوم تھا کہ یہ پہرے داری ہمیشہ برقرار نہیں رہے گی۔ وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ہر آنے جانے والے سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ اس اپارٹمنٹ کے دوسرے مکینوں کی جان عذاب میں تھی اور عائش مزے لے رہا تھا۔

جب ایک مہینا گزر گیا اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا... عائش کے بقول کوئی کال بھی موصول نہیں ہوئی تو موبائل میں بیٹھے ہوئے پولیس والے اونگھتے اونگھتے سونے لگے۔ مطمئن ہو کر موبائل وہاں سے ہٹ گئی۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد چکر لگانے لگی پھر یہ تکلف بھی ختم ہوگیا۔ دوسرے مکینوں کے ساتھ

www.pkdigest.com

ساتھ عانش نے بھی سکون کا سانس لیا۔

وہ اس عرصے میں فلیٹ تبدیل کرنے کے بارے میں غور کرتا رہا تھا۔ اس نے کئی اپارٹمنٹ دیکھے بھی تھے۔ ایک اپارٹمنٹ ایسا تھا جس کی اندرونی دیواریں ساؤنڈ پروف تھیں تاکہ دوسرے لوگ ڈسٹرب نہ ہوں۔ نہایت جدید طرز کے بنے ہوئے یہ فلیٹ اس کے لیے نہایت کارآمد تھے۔ سیکیورٹی کا نظام بھی تھا۔ باقاعدہ استقبالیہ تھا جہاں ہر آنے جانے والے کا اندراج کیا جاتا تھا۔ وہ رہائش بدل کر یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کی جان کو خطرہ ہے اس لیے وہ یہاں شفٹ ہوگیا۔ اس نے اپنے فلیٹ پر تالا ڈالا اور اس نئے اپارٹمنٹ میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر شفٹ ہوگیا۔

اسے معلوم تھا کہ صرف پندرہ دن بعد اسے اپنی نئی فلم کی شوٹنگ کے لیے ساؤتھ افریقا روانہ ہونا ہے۔ یہ دورہ کم از کم ایک مہینے کے دورانیے پر مشتمل ہوگا۔ اس عرصے میں اسے جلدی جلدی کچھ کام نمٹانے ہوں گے۔ وہ ان کاموں میں لگ گیا۔ یہ کام اس کی مرضی کے مطابق ہو بھی گئے۔

اب اسے سب سے اہم منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ اس کام میں اسے گل پوش کے تعاون کی ضرورت تھی۔ اس عرصے میں اس نے گل پوش کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ وہ اس کی ہر بات ماننے کو تیار تھی۔

اس رات عانش نے گل پوش کو رات کا کھانا فائیو اسٹار میں کھلایا۔ گل پوش بے حد خوش تھی۔ عانش پھر پہلے جیسا ہوگیا تھا۔ اس نے گل پوش کو یہ خوش خبری بھی سنائی تھی کہ اس کی طرف سے اجازت ہے، وہ دوبارہ فلموں میں کام کرسکتی ہے۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک اسے سبز باغ دکھاتا رہا پھر اچانک اداس ہوگیا۔

"میں نے تمہارے ساتھ اب تک بہت زیادتی کی ہے۔"

"کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ نے کوئی جان بوجھ کر تھوڑی کیا ہے۔ وہ تو آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"میں نے تم پر شک کیا ہے۔ اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔"

"آپ کو احساس ہوگیا بس یہی ازالہ ہے۔"

"ذیشان بے قصور تھا۔ میں نے اس پر بھی ہاتھ اٹھایا۔"

"چھوڑیے اسے۔ ہمیں اپنا دیکھنا چاہیے۔"

"نہیں... جب تک میں اس سے معافی نہیں مانگ لوں گا، میرا ضمیر مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"آپ کیوں معافی مانگیں... جو ہوگیا سو ہوگیا۔"

"نہیں۔ میں اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں اور اس کا موقع تم فراہم کرسکتی ہو۔"

"میں، میں کیا کرسکتی ہوں؟"

"تم اسے فون کرکے یہاں، اپنے گھر مدعو کرو۔ تم اس سے کہو کہ تم اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھانوں سے اس کی ضیافت کروں گی۔"

"جب کھانا پکانے والی آتی ہے تو میں کیوں پکاؤں؟"

"کھانا پکانے والی کی چھٹی کردینا۔ کھانا تم پکاؤ گی۔"

"اچھا بابا! میں پکالوں گی لیکن فون کرنا مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"تمہاری تو دوستی رہی ہے۔ فون کرنے میں کیا حرج ہے؟"

"اتنے دن گزر گئے نا۔ اس لیے عجیب لگ رہا ہے اور پھر جھگڑا آپ کا تھا۔ فون آپ کو کرنا چاہیے۔"

"میں بھی بات کرلوں گا لیکن تم فون کرو گی تو اسے یہ احساس ہوگا کہ تمہاری مرضی شامل ہے۔"

"اب تو رات ہوگئی ہے۔ کل کروں گی۔"

"کل جلدی کرلینا تاکہ اس کا کوئی پروگرام ہو تو وہ ایڈجسٹ کرسکے... بلکہ میری رائے تو یہ ہے کہ ابھی کرلو۔ کل کی پھر کل پڑ جاتی ہے۔"

"چلو، ابھی کیے لیتی ہوں۔ آپ بھی بات کریں گے؟"

"ہاں، ہاں کروں گا۔ تم ملاؤ تو۔"

گل پوش نے فون ملایا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔

"میں کہہ رہی تھی نا کہ رات بہت ہوگئی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ سوگیا ہو۔" پھر جیسے اچانک گل پوش کو کچھ یاد آگیا۔ "میرے پاس اس کا ایک دوسرا نمبر ہے۔ شاید اس پر اٹھالے۔" وہ اپنی ڈائری لینے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے پاس اس کا دوسرا نمبر بھی ہے۔ یہ دوسرا نمبر ہی تو اصل نمبر ہے۔ اسی پر تو باتیں ہوتی ہوں گی۔ اب یہ تیری آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد تو بات کرنے کے لائق رہے گی ہی نہیں۔

وہ ڈائری لے کر آگئی۔ نمبر ملایا اور کچھ دیر میں دوسری طرف سے ذیشان نے اٹھالیا۔

"ہیلو ذیشان! میں گل پوش بول رہی ہوں۔ کیا مطلب... نہیں نہیں... عانش کی اجازت ہی سے بات کررہی ہوں بلکہ وہ سامنے ہی بیٹھے ہیں۔ فون پر کیا بتاؤں۔ ملاقات کرو نا... میں نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ تم پرسوں ہمارے گھر آجاؤ۔ کھانا ہمارے ساتھ ہی کھانا۔ عانش بھی ہوں گے... نہیں نہیں... وہ شرمندہ ہیں۔ لو خود بات کرلو۔"

www.pkdigest.com

گل پوش نے عانش کی طرف فون بڑھا دیا۔

"ہیلو ذیشان! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ غلطی میری تھی۔ یقین کرو ہمیشہ مجھے پچھتاوا رہا ہے۔ اب اس کا ازالہ یہی ہے کہ گھر آجاؤ۔ گلے شکوے بھی ہوجائیں گے اور ساتھ بیٹھ کر گل پوش کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا بھی کھالیں گے۔ نہیں یار! ہوٹل میں دس تکلفات ہوتے ہیں۔ یہاں آرام سے بیٹھیں گے اور جب تک جی چاہے گا بیٹھیں گے... ساڑھے آٹھ تک آجاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ آنا ضرور... اگر نہیں آئے تو میں سمجھوں گا کہ تمہارا دل صاف نہیں ہوا، پھر شاید میں بھی پیچھے ہٹ جاؤں۔ نہیں نہیں فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں یاد رہے گا۔ تمہیں معلوم ہے میں شفٹ ہوگیا ہوں۔ ہاں مینا بلڈنگ ہے۔ ایف-19 فلیٹ نمبر ہے۔"

ایک مرتبہ پھر گل پوش نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا اور پھر ذیشان کو تاکید کی کہ وہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جائے۔ پھر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ گل پوش نے بے تحاشا قہقہہ لگایا اور فون بند کردیا۔ عانش کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ یہ تیرا آخری قہقہہ ہوگا مکار عورت!

اب اس کے پاس دو دن تھے۔ اسے اپنی پلاننگ کے کچھ اور عمل کرنے تھے۔ ایک دن گزر گیا پھر وہ دن آگیا جس رات ساڑھے آٹھ بجے ذیشان کو آنا تھا۔ وہ اسٹوڈیو گیا ہوا تھا۔ پلاننگ کے مطابق دوپہر کو گھر آگیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔

"خیریت تو ہے... آپ پریشان نظر آرہے ہیں؟"

"پریشانی کی تو بات ہی ہے یار! آج رات دس بجے کی فلائٹ سے مجھے روانہ ہونا تھا اور میں ذیشان کو بھی مدعو کر بیٹھا۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا تھا۔ آج اسٹوڈیو گیا تو پتا چلا پورا یونٹ جارہا ہے۔ سیٹیں بک ہوچکی ہیں۔"

"جانا کہاں ہے؟"

"ساؤتھ افریقا۔ مین لوکیشن تو جوہانسبرگ ہے۔ پھر دیکھو کن جنگلات کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔"

"آپ کہہ دیں۔ آپ ایک دن بعد کی فلائٹ سے چلے جائیے گا۔"

"نہیں کہہ سکتا یار۔"

"تو پھر ذیشان کو اپنی مجبوری بتادیتے ہیں۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا... آپ کے آنے کے بعد۔"

"نہیں، یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ وہ سمجھے گا کہ ہمارے درمیان پھر کوئی تکرار ہوگئی۔ ہم اسے ٹال رہے ہیں۔ آنے کے بعد اسے بتاؤ گی تو وہ خود دیکھ لے گا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

"یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ میں گھر پر اکیلی ہوں گی۔"

"مجھے تم پر بھروسا ہے ڈارلنگ! وہ عقل مند ہے، خود ہی زیادہ دیر نہیں بیٹھے گا۔"

گل پوش مان گئی۔ عانش نے پھر دل میں سوچا۔ دل میں تو خوش ہو رہی ہوگی کہ اچھا ہے تیری مصیبت ٹلی... لیکن یہ نہیں معلوم کہ کل ہی نہیں سکے گی۔

اس کے گھر سے نکلنے میں صرف چار گھنٹے رہ گئے تھے۔ گل پوش نے پیکنگ میں اس کی مدد کی اور پھر ساتھ بیٹھ کر چائے پی۔ عانش نے ادھر ادھر کچھ فون گھمائے۔ اب ساڑھے سات بج رہے تھے۔

"تم ایک مرتبہ ذیشان کو پھر یاددہانی کرادو کہ وہ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پہنچ جائے۔ دس بجے کی فلائٹ ہے، مجھے آٹھ بجے تو نکلنا ہوگا۔"

وہ ذیشان کو فون کرکے پلٹی تو عانش تیار ہوکر جانے ہی والا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے گل پوش کی گردن میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرا ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔ وہ اسے بیڈروم میں لے آیا۔

"تکیے کے نیچے دیکھو۔ میں نے وہاں تمہارے لیے ایک تحفہ رکھا ہے۔"

گل پوش تکیہ اٹھانے کے لیے جھکی ہی تھی کہ عانش کا دوسرا ہاتھ جیب سے باہر آیا۔ پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں اور گل پوش کے سر کے پچھلے حصے میں پیوست ہوگئیں۔ وہ بستر پر اس طرح گرگئی کہ اس کے پاؤں بستر سے نیچے تھے۔ عانش نے ہاتھ لگائے بغیر دور کھڑے ہوکر اچھی طرح اطمینان کرلیا کہ وہ مرچکی ہے۔ پھر اس نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا کہ خون کی کوئی چھینٹ تو اس کے کپڑوں پر نہیں ہے۔ پھر وہ اطمینان سے بیڈروم سے نکل آیا۔ اس نے سوٹ کیس اٹھایا اور باہر آگیا۔ دروازہ اس طرح بند کیا کہ لاک نہ ہو، صرف یہ معلوم ہو کہ بند ہے۔ اگر کوئی دھکا دے تو کھل جائے۔

استقبالیہ پر پہنچ کر اس نے چوکیدار ارباز خان کو ٹیکسی لانے کے لیے بھیج دیا اور خود استقبالیہ پر کھڑے کلرک سے باتیں کرنے لگا۔

ٹیکسی لینے کے لیے ذرا دور جانا پڑتا تھا اس لیے ارباز خان سائیکل پر گیا تھا۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر جاکر اس نے ٹیکسی والے کو پتا سمجھا دیا تھا۔ غالباً اسی لیے ارباز خان بعد میں آیا،

ٹیکسی پہلے آگئی۔
تیس پچیس منٹ بعد ذیشان وہاں پہنچ گیا۔ استقبالیہ پر اس کا نام پوچھا گیا۔ اس نے سوچا، وہ اپنا نام ریکارڈ میں کیوں ڈلوائے۔ کیوں کسی پر ظاہر کرے کہ وہ یہاں آتا رہا ہے۔ اگر غلط نام لکھوا دے تو کون پوچھنے والا ہے۔ اس نے اپنا نام فرحان بتایا۔
کلرک اس کا نام پتا لکھنے میں مصروف تھا کہ ارباز خان نے آگے بڑھ کر انٹرکام اٹھالیا۔ ''جی بھیجے دیتے ہیں۔'' انٹرکام رکھ کر اس نے ذیشان سے کہا جائیے۔
ذیشان نے اوپر پہنچ کر کال بیل کا بزر دبایا۔ جب دو تین بیلوں کے بعد بھی کوئی دروازے پر نہیں آیا تو اس نے سوچا شاید بیل خراب ہے۔ اس نے دروازہ ''ناک'' کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ذرا سا دھکا دیا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے ایک قدم اندر رکھ کر عاتش کو آواز دی، پھر گل پوش کو پکارا۔ اس کا مطلب ہے، یہ لوگ مجھے پریشان کرنے کے لیے کسی کمرے میں چھپ گئے ہیں۔ وہ نہایت احتیاط سے چلتا ہوا اندر آیا۔ ایک کمرے میں جھانکا۔ یہ ڈرائنگ روم تھا۔ اسے دیکھ بھال کر وہ دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر جونہی تیسرے کمرے میں پہنچا، اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بیڈ پر خون پڑا ہوا تھا اور گل پوش کی لاش آدھی بستر سے نیچے آدھی اوپر پڑی ہوئی تھی۔ وہ چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ دروازے کا ہینڈل اس کے ہاتھ میں آگیا۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ وہ کسی بڑی سازش کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ تیزی سے پلٹا اور مین دروازہ بند کرتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا مگر ایک اطمینان تھا کہ اس نے اپنا نام غلط لکھوایا ہے اور پتا بھی فرضی ہے۔
گراؤنڈ فلور پر اتر کر اس نے استقبالیے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اسے یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ ارباز خان باہر نکلا ہے اور اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔
وہ رات یونہی گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت ایک آدمی بڑے بڑے سرخ پھولوں کا ایک ''بُکے'' لے کر استقبالیہ پر آیا اور کلرک سے درخواست کی کہ یہ ''بُکے'' گل پوش کو پہنچا دیا جائے۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ فلمستان اسٹوڈیو میں سیٹ ڈیزائنر ہے۔ عاتش صاحب جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ آج ان کی بیگم کی سالگرہ ہے۔ ایک ''بُکے'' خرید کر ان کی طرف سے میں ان کی بیگم کو پہنچا دوں۔ کلرک نے اس آدمی کے سامنے انٹرکام پر گل پوش سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔
''ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ واش روم وغیرہ میں ہوں یا سو رہی ہوں۔ آپ یہ ''بُکے'' یہاں چھوڑ جائیں۔ میں بعد میں اطلاع کرکے انہیں پہنچا دوں گا۔''
کلرک نے اس آدمی کے جانے کے بعد کئی مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن خاموشی کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ جب اسے تشویش ہوئی تو اس نے ارباز خان کو اوپر بھیجا۔ اس نے بھی آکر جواب دیا کہ ڈور بیل کی آواز کوئی نہیں سن رہا ہے۔ دروازے پر ''آؤٹ'' کی تختی بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے بیگم صاحبہ باہر بھی نہیں گئی ہیں۔ اب کلرک کو تشویش ہوئی اس نے پولیس کو فون کردیا۔ پولیس نے لاک میکر کو بلوا کر تالا کھلوایا اور اندر داخل ہوتے ہی بدبو کے بھبکے نے انہیں باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ پھر ناک پر رومال رکھ کر اندر گئے تو وہی منظر دیکھا جو اس سے پہلے ذیشان دیکھ چکا تھا۔ اسی وقت ایمبولینس کو کال کیا گیا۔ لاش کو اسپتال روانہ کیا گیا اور پولیس نے استقبالیہ کلرک اور چوکیدار ارباز خان کے ابتدائی بیان قلم بند کیے۔
''مسٹر عاتش کس وقت گھر سے نکلے تھے؟''
''تقریباً آٹھ بجے۔''
''قتل کس وقت ہوا؟''
''جناب! ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟''
''اس کے بعد کوئی اور تو نہیں آیا اس گھر میں؟''
''یہ تو ریکارڈ دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا ہے۔''
''دیکھیے ریکارڈ۔''
کلرک نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا۔ ''کوئی فرحان نامی صاحب آئے تھے۔ وہ خود کو عاتش صاحب کا دوست کہہ رہے تھے۔''
''وہ اوپر گئے تھے؟''
''جی ہاں اور ریکارڈ کے مطابق تقریباً بارہ منٹ بعد ہی واپس آگئے تھے۔''
''آپ نے انہیں اوپر بھیجنے سے پہلے انٹرکام پر بیگم عاتش کو بتایا تھا؟''
کلرک خاموش ہوگیا لیکن ارباز خان نے بتایا۔ ''میں نے انہیں انٹرکام پر بتادیا تھا۔''
''وہ فرحان کو جانتی تھیں؟''
''جانتی ہی ہوں گی۔ اسی لیے تو انہوں نے کہا تھا، بھیج دو۔'' ارباز خان نے کہا اور ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دی۔ ''میں نے فرحان کی گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے۔''

''آپ نے نمبر کیوں نوٹ کیا... کیا آپ کو معلوم تھا کہ یہ شخص قاتل ہے؟''
''یہ کوئی لازمی نہیں لیکن ہم اکثر گاڑیوں کے نمبر نوٹ کرلیتے ہیں۔''
''یہ شخص کتنے بجے آیا تھا؟''
''آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر۔''
ایک پولیس آفیسر نے دوسرے کی جانب دیکھا۔
''اس کا مطلب ہے، یہ قتل عاتش نے نہیں کیا۔ وہ تو آٹھ بجے نکل گیا تھا اور چوکیدار کے مطابق بیگم عاتش ساڑھے آٹھ بجے تک زندہ تھیں۔''
''ابھی کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے یہ کڑیاں عاتش تک بھی پہنچتی ہوں۔'' دوسرے پولیس آفیسر نے کہا اور پھر استقبالیہ کلرک کی طرف متوجہ ہوگیا۔
''یہ بتائیے، صبح جو شخص ''بُکے'' لے کر آیا تھا اس کا نام آپ نے پوچھا تھا؟''
''اس نے اپنا نام ممتاز بتایا تھا۔ یہ بھی بتایا تھا کہ وہ فلمستان اسٹوڈیو میں سیٹ ڈیزائنر ہے۔''
ان تمام معلومات کی روشنی میں پولیس نے اپنی مدعیت میں اس واقعے کی ایف آئی آر درج کرلی۔ اس میں فرحان نامی شخص اور عاتش کو بطور ملزم نامزد کیا گیا۔ ارباز خان، استقبالیہ کلرک اور ممتاز سیٹ ڈیزائنر کو شامل تفتیش کیا گیا۔
''اگر فرحان تمہارے سامنے آئے تو پہچان لوگے؟'' پولیس آفیسر نے ارباز خان سے پوچھا۔
''ایک نظر میں پہچان لوں گا۔ اس کا منہ گول اور ہونٹ موٹے تھے۔ سر کے بال گھنگریالے تھے۔ درمیانہ قد تھا۔ رنگ گورا تھا... ویسے تھا خوب صورت۔''
''کوئی اور نئی بات سامنے آئے تو ہمیں بتانا۔''
''جی صاحب!'' ارباز خان اور استقبالیہ کلرک نے کہا۔
گل پوش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہوگیا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے کیونکہ سر کے پچھلی طرف گولیاں لگی تھیں۔ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ دونوں گولیاں نہایت قریب سے چلائی گئی ہیں۔
پولیس نے فنگر پرنٹس وغیرہ بھی لے لیے۔
اسی رات شہر کی ناکا بندی کردی گئی کہ اگر قاتل ابھی تک شہر میں ہے تو باہر نہ جاسکے۔
پولیس نے چالان عدالت میں پیش کرکے تفتیش کے احکامات حاصل کرلیے تھے۔ گل پوش کی لاش خراب ہونے لگی تھی اور عاتش کا جلدی واپس آنا ممکن نہیں تھا لہٰذا گل پوش کو اس کی بہن اور بہنوئی کے سپرد کردیا گیا کہ وہ اسے دفن کردیں۔
سیٹ ڈیزائنر ممتاز کا بیان ریکارڈ کیا جاچکا تھا۔ اب فرحان کی تلاش جاری تھی۔ اس نے جو پتا لکھوایا تھا، وہ جعلی ثابت ہوا۔ گاڑی کے نمبر کے مطابق وہ گاڑی فرحان کی نہیں ذیشان ولد سیٹھ عنایت کی تھی۔ یہ فرحان کون ہے جو قتل کی رات یہاں آیا تھا؟ کہیں فرحان اور ذیشان ایک ہی تو نہیں؟
ذیشان بہت بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ اس پر آسانی سے ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا تھا لیکن یہ بھی درست تھا کہ معاملہ قتل کا تھا اور پھر محمود شارب عاتش کے سرپرست کے طور پر سامنے آگیا تھا۔ اس کے پاس دولت بھی تھی اور تعلقات بھی۔ اس نے پولیس کے ہائی آفیشلز کو مجبور کردیا کہ وہ فرحان اور ذیشان کو ایک ہی آدمی تصور کریں اور اس کی گرفتاری عمل میں لاکر تفتیش کریں۔ اس جھگڑے کا حوالہ بھی دیا گیا جو اس کے اور عاتش کے درمیان ہوا تھا اور ذیشان نے عاتش کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے گواہ بھی موجود تھے بالآخر ذیشان کو گرفتار کرلیا گیا۔
اس کی تضاد بیانی نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ جلد ہی ثابت ہوگیا کہ ذیشان ہی فرحان ہے لیکن اس کے بیان کے مطابق قاتل وہ نہیں۔ قتل اس کے پہنچنے سے پہلے ہو چکا تھا۔
''آپ وہاں کیوں گئے تھے؟''
''مجھے بلایا گیا تھا۔ گل پوش اور عاتش نے مجھے مدعو کیا تھا۔''
''کیوں مدعو کیا تھا؟''
''ہمارے تعلقات خوش گوار نہیں تھے۔ عاتش کو اس کا پچھتاوا تھا اور وہ یہ جھگڑا ختم کرنا چاہتا تھا۔''
''آپ نے استقبالیہ کے رجسٹر میں غلط نام کیوں لکھوایا؟''
''میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو یہ معلوم ہو کہ میں اب بھی گل پوش سے ملتا ہوں۔''
''آپ بیڈ روم کے اندر گئے تھے یا باہر ہی سے لاش دیکھ کر پلٹ آئے تھے؟''
''میں دروازے ہی سے لوٹ آیا تھا۔''
''آپ کے فنگر پرنٹس تو بیڈ روم کے اندر سے بھی ملے ہیں؟''
''مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید میں اندر چلا گیا ہوں کہ لاش کو قریب سے دیکھ لوں۔''
اس کے بیان میں اتنے تضادات تھے کہ پولیس نے اسے جیل بھیج دیا لیکن سیٹھ عنایت نے دوسرے ہی دن اس کی ضمانت کرالی۔

www.pkdigest.com

پولیس کو عائش پر بھی شک تھا۔ وہ کسی مہمان کو بلا کر خود بیرون ملک چلا گیا تھا۔ پولیس کو یہ سن گن بھی مل گئی تھی کہ عائش کا معاشقہ شرمین نامی لڑکی سے چلا تھا۔ ان میں ناچاقی ہو گئی تھی اور پھر صلح ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے اس لڑکی سے شادی کرنے کے لیے اس نے گل پوش کو راستے سے ہٹا دیا ہو۔

پولیس نے کسی نہ کسی طرح عائش سے رابطہ کیا۔ اب تمام معاملات نمٹ چکے تھے۔ گل پوش کی تدفین ہو چکی تھی۔ الزام ذیشان پر آچکا تھا۔ اب اسے واپس آنے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

اس کے واپس آتے ہی پولیس نے تفتیش کا دائرہ اس تک پھیلا دیا۔ اس نے یہ جال اتنی خوب صورتی سے بُنا تھا کہ صاف بچ کر نکلتا نظر آ رہا تھا۔

اس نے آتے ہی ضمانت قبل از گرفتاری کرا لی تھی اس لیے گرفتار تو نہ ہو سکا لیکن پولیس نے طرح طرح کے سوالات پوچھ کر اس کا ناطقہ ضرور بند کر رکھا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے پولیس کو شک نہیں بلکہ یقین ہو کہ یہ قتل اسی نے کیا ہے۔ وہ اس کے کسی بیان سے مطمئن ہوتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

شرمین اب تک اس معاملے سے الگ تھلگ رہی تھی لیکن عائش کے آنے کے بعد اس کا متحرک ہونا لازمی تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا منگیتر اس قتل میں غلط پھنس رہا ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہ قتل خود عائش نے کیا ہے مگر اس چالاکی سے کہ کوئی ثبوت نہیں چھوڑا ہے۔ شرمین اس سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچ گئی۔ وہ اس توقع پر گئی تھی کہ جو بات وہ پولیس کو نہیں بتا سکا ہے شاید اس کے سامنے اگل دے۔

مشکل میں جب سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کوئی دوست اگر آنسو پونچھے تو اس کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ یقین ہو جاتا ہے کہ وہی اس کا سچا دوست ہے۔ شرمین کو سامنے دیکھ کر عائش کا بھی یہی حال ہوا اور عائش نے اس کے سامنے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

''شرمین! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ تم واقعی مخلص دوست ہو ورنہ اس وقت مجھ سے ملنے کیوں آتیں۔''

''میں نے تم سے کہا تھا، تم پر جب بھی کوئی برا وقت پڑا مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔ میں اپنی ساری دولت لٹا کر بھی تمہیں بچا لوں گی۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب گل پوش کا کانٹا تو درمیان سے نکل ہی گیا ہے۔ یہ کیس ذرا ختم ہو جائے پھر میں تم سے شادی کر لوں گا۔ مجھے پہلے ہی یہ کر لینا چاہیے تھا لیکن خیر۔''

''میں تمہیں یہی تو بتانے آئی ہوں۔ کانٹا ابھی نہیں نکلا۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ گل پوش مری نہیں ہے، زندہ ہے۔''

''کیوں مذاق کر رہی ہو؟''

''میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ کس کے پاس ہے، میں یہ بھی تمہیں بتا دوں گی۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ دونوں گولیاں اس کے سر میں...'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ جذبات کے دھارے میں کس بری طرح بہہ گیا ہے۔

''تمہارے خلاف کوئی زبردست سازش ہوئی ہے۔''

''پولیس تفتیش کر تو رہی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''جب تک تو بہت وقت گزر چکا ہو گا۔ ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ گولیاں سر میں لگی ہیں؟''

''میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ اتنا خون بہہ رہا تھا کہ بندہ ویسے ہی مر جائے۔''

''چوکیدار باز خان کا کہنا بھی یہی ہے کہ جس وقت ذیشان یہاں پہنچا تھا، وہ زندہ تھی۔ اس کی بات ہوئی تھی انٹر کام پر۔''

''یہ بیان دینے کے لیے میں نے اسے دس ہزار روپے دیے تھے۔''

''تم کتنے چالاک ہو عائش!''

''دیکھ لو، تم سے شادی کرنے کے لیے مجھے کیا نہیں کرنا پڑا... مگر تم کہہ رہی ہو گل پوش زندہ ہے۔''

''دو گولیاں سر میں کھا کر کوئی زندہ رہ سکتا ہے؟ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ اچھا، میں چلتی ہوں۔ یہ نگرانی بھی ہو رہی ہو گی کہ تم سے کون کون ملنے آتا ہے۔''

عائش کی نظر بچتے ہی اس نے اپنی گھڑی میں لگا ہوا وہ چھوٹا سا وائس ریکارڈر (VOICE RECORDER) جو اس نے کچھ دنوں پہلے امریکا سے خریدا تھا، آف کیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

وہ اب بھی عائش سے محبت کرتی تھی لیکن ایک تو اس نے قتل کیا تھا... دوسرے اس کا منگیتر پھنس رہا تھا جو بے قصور تھا۔ اس لیے مجبوری میں اسے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ عائش کے ساتھ اب کیا ہونے والا ہے۔ ہتھکڑیاں اور پھر پھانسی کا پھندا...!